سلمیٰ کنول
دل کی چوکھٹ پر

# 1

اس نے پیلا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے لمبے بالوں کی چوٹی میں پراندے کے ساتھ ساتھ موتیے اور چنبیلی کی کلیاں گندھی ہوئی تھیں۔ دونوں بازو کلائیوں سے لے کر کہنیوں تک سبز چوڑیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔

وہ انتہائی حسین لگ رہی تھی......!!

لیکن اس ساری سج دھج اور حسن و دلربائی کے باوجود اس کے رخ سے خوشی و مسرت مفقود تھی اور خوبصورتی کی چمک کے بجائے خفگی کے آثار نمایاں تھے۔ پرکشش کالی آنکھوں میں کاجل کی ڈوریوں کے ساتھ ساتھ نمی کی جگمگاہٹ تھی۔ سفید گال کچھ اس طرح دہک رہے تھے جیسے گلابوں پر سورج کی کرنیں رقصاں ہوں۔

بہت خوبصورت منظر تھا!!

''قسم سے ماھم! تم اب بالکل ہی ناقابل برداشت ہوئی جا رہی ہو۔'' وہ آئینے میں اپنا سراپا دیکھتے ہوئے تلملائی۔ اک غصہ بھری نگاہ ماھم پر ڈالی۔

''دیکھ رہی ہو لوگوں کی نظریں اور میرا حلیہ؟''

''ہاں حد سے زیادہ خوبصورت ہو۔ اور خوبصورتی کو دیکھنے کا حق ہر کسی کو ہے۔ نظریں تو اٹھیں گی ہی'' ماھم ہنستے ہوئے قدرے ڈھٹائی سے بولی۔

اس کے کان کا اک بندہ ٹوٹ گیا تھا۔ نجانے کیسے۔؟ اور یہ کس طرح ممکن تھا کہ بہن کی مایوں ہو' بے شمار لوگ مدعو ہوں' اور ماھم نے پیلے جوڑے کے

ساتھ میچ کرتے ہوئے بندے نہ پہنے ہوں۔ بندے‘ جو اس کے چہرے پر سجتے
بھی بہت ہوں۔ لہذا رسم شروع ہونے سے پہلے پہلے وہ ان کا متبادل انتظام
کرنے کے لیے ایمان کو ساتھ گھسیٹ لائی تھی۔ وہ فنکشن کے لیے تیار ہو چکی تھی‘
اس لباس اور اس حلیئے میں وہ کیسے بے پردہ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی۔ وہ چیختی
چلاتی رہ گئی۔ مگر ماھم نے تو اسے چادر بھی نہیں اوڑھنے دی۔ اتنی جلدی میں تھی وہ
تبھی ایمان لالو لال ہو رہی تھی۔

اور اب۔ وہ شہر کی سب سے بڑی جیولر شاپ میں کھڑی تھیں۔ زیورات
کے یہ یہاں سے وہاں تک کاؤنٹر تھے۔ اردگرد دیواروں پر بڑے بڑے آئینے چسپاں
تھے۔ بہت ساری نظریں ان کی طرف اٹھ رہی تھیں اور ایمان بوکھلائی جا رہی تھی۔ حیا
وحجاب کے مارے پلکیں جھکی جا رہی تھیں۔ پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ ہونٹوں پر
کپکپاہٹ تھی۔

لیکن ماھم کو اس کی پریشانی کا ذرا احساس نہ تھا۔ سیلز مین سے مزید
زیورات نکلوا نکلوا کر دیکھے جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے بڑی لاپرواہ طبیعت کی مالک تھی۔

”تمہیں خواہ مخواہ ہی غصہ آئے جا رہا ہے۔ جانو! میں نے تو تم سے بندے
پسند کرانا تھے۔“

”میری پسند کوئی اتنی ارفع و اعلیٰ نہیں ہے۔ کسی اور کو لے آتیں۔“ وہ الجھی
رہی۔

”واہ! تمہاری پسند اعلیٰ نہیں ہے۔؟ ارے میں تو تمہاری پسند کی قائل ہو چکی
ہوں۔ جب سے ہمایوں بھائی کی تصویر دیکھی ہے۔“

”وہ میری پسند نہیں ہے۔ ہزار بار تم سب کو میں بتا چکی ہوں۔ وہ ایک
مذاق تھا جو سنجیدگی اختیار کر گیا۔ یا پھر اک رسم تھی جو میرے گلے کا طوق بن گئی۔“

”اتنا خوبصورت طوق۔ کاش! کوئی ہمیں بھی پہنا دے۔ بصد شوق پہنوں
گی۔“ ماھم نے اک طویل آہ بھری‘ ساتھ ہی اک بندہ اٹھا کر کان میں ڈالا۔

”یہ کیسا رہے گا.....؟“ وہ آئینے میں سے ہی ایمان کو کان کا بندہ دکھا کر
پوچھ رہی تھی۔



”بہت خوبصورت۔ اے ون۔“ ایمان ابھی کوئی جواب نہیں دے پائی تھی
کہ دونوں کی سماعتوں سے اک مردانہ بھاری سی آواز ٹکرائی۔ ”فوراً لے لیں۔“

یکلخت گھبرا کر‘ سٹپٹا کر دونوں نے ہی اپنی اپنی گردن پیچھے موڑی۔ بولا ایک
تھا مگر وہاں‘ ان کے قریب ہی دو اشخاص موجود تھے۔

”یہ کس نے بکواس کی ہے۔؟“ ماھم کو تپ چڑھ گئی۔ کون تھا جو ان کی گفتگو
میں مداخلت کرنے کی جرأت کر بیٹھا تھا۔؟ ماھم کبھی کسی کا لحاظ نہیں کیا کرتی تھی۔

”بکواس تو نہیں کی۔ سچا بیان دیا تھا۔“ ان دونوں میں سے ایک خاموش
کھڑا تھا‘ دوسرے نے مسکراتے لبوں سے جواب دیا۔ ”بے شک کسی سے تصدیق کر
لیں۔“

ماھم مزید کچھ کہتی۔ اس کے جواب کا بھی اچھی طرح جواب دے ڈالتی کہ
وہ خاصی خونخوار قسم کی لڑکی تھی۔ اسے لڑائی جھگڑا بھی کرنا آتا تھا۔ بولنے کے لیے ہر
قسم کے الفاظ کا ذخیرہ بھی اس کے پاس موجود رہتا تھا۔ نڈر اور دلیر بھی بہت تھی۔
اجنبی لوگوں سے مروت لحاظ کی بھی قائل نہ تھی۔

مگر یہ جو ڈرپوک اور بزدل سی ایمان آفریدی اس کے ساتھ کھڑی تھی۔
اس نے اس کے بولنے سے پہلے ہی اس کی پسلی میں اپنی تیکھی سی کہنی جڑ دی تھی۔ اسی
وجہ سے بس وہ ہلکا سا کراہ کر خاموش سی ہو گئی تھی۔ دوسرے بولنے والے کی نظروں
میں کوئی لوفرپن نہ تھا۔ انداز میں کوئی خباثت نہ تھی۔ لباس سے بھی وہ دونوں شرفاء
کے طبقے سے تعلق رکھنے والے لگ رہے تھے۔

”ہمیں جلدی گھر پہنچنا ہے۔ رسم ہونے سے پہلے۔“ کہنی کے ٹھوکے کے
ساتھ ہی ایمان ماھم کے کان میں بڑبڑائی تھی۔ اسے یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ
ہمیشہ کی طرح اس نے اگر جھگڑا شروع کر دیا تو بات بڑھ جانے کے خدشے کے ساتھ
ساتھ رسم شروع ہو جانے کا بھی خدشہ تھا۔

”ہمیں جلدی ہے بہت۔“ ماھم تو مصلحتوں کی بندھی خاموش رہ گئی تھی مگر وہ
مسکراہٹیں بکھیرنے والا کسی مصلحت کا پابند نہیں تھا۔ نہ ہی اس کی پسلی میں کسی کہنی کی
ضرب لگی تھی۔ ”آپ دیر لگا رہی تھیں مس.....“

"ماھم۔" ماھم نے روا روی میں اس کے بولے گئے لفظ مس کے ساتھ اپنا نام لگا دیا۔ "اوہ۔!" پھر گڑبڑا بھی گئی۔ ایمان کی کہنی کا ٹھوکا پھر اس کی پسلی میں گڑ گیا تھا۔ پہلے بھی ایمان نے اسے ہزار بار اس بات سے ٹوکا تھا کہ وہ ہر کسی کو' کسی اجنبی کو' غیر کو' اپنا نام بتانے کی غلطی نہ کیا کرے۔ اس بے تکلفی کا نتیجہ غلط بھی نکل سکتا تھا۔ مگر وہ پھر وہی غلطی دھرا گئی تھی۔ قدرے تاسف سے اس نے ایمان کی جانب دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں سوری بولا۔

"ہاں مس ماھم! میں نے سوچا تھا جلدی سے آپ کی مشکل آسان کر دوں۔ تاکہ پھر ہم بھی جلد فارغ ہو جائیں۔ دراصل خواتین کی قوت فیصلہ ذرا کمزور ہوتی ہے۔" وہ بڑے خوشگوار لہجے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن ماھم کے مزاج کا کیا کیا کیجیے۔؟ وہ عورتوں کی کسی کمزوری کی بات' کسی مرد کے منہ سے سن ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے خیال میں' عورت ہر معاملے میں مرد سے زیادہ بہادر اور برداشت والی تھی۔ مرد جو عورت کو خود سے عقل میں ناقص اور ہمت میں کم تر ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا تو یہ صرف اس کا حاسدانہ جذبہ تھا۔ اور اس خوشگوار لہجے والے نے بھی ایسی بات کر دی تھی۔ ماھم کو تو پتنگے سے لگ گئے۔

"خبردار! جو خواتین کی شان میں کوئی گستاخی کی تو مسٹر......"

"اجلال حیدر۔" وہ بھی ماھم ہی کی طرح بے اختیاری میں اپنا تعارف کر گیا۔

"ہاں مسٹر اجلال جیدر۔!" ماھم کے جب دماغ میں خناس گستا تھا تو وہ عقل وخرد کھو بیٹھتی تھی۔ "یہ آپ مرد لوگ آخر ہر وقت خواتین کے خلاف کیوں بولتے رہتے ہیں۔؟"

"ماھم! پلیز بس کرو۔" پاس کھڑی ایمان تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ "جھگڑا نہ کرنا۔ آؤ ہم یہاں سے چلیں۔" اس نے ماھم کا بازو پکڑ لیا۔ "کسی دوسری دکان پر۔"

"ہم کیوں کسی دوسری دکان پر چلیں۔ یہ کیوں نہیں چلے جاتے۔؟" ماھم نے اک جھٹکے کے ساتھ ایمان کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ وہ تو جیسے لڑنے مرنے تیار ہو چکی تھی



"ہم نہیں جائیں گے۔" مقابل والا حریف بھی جیسے ڈٹ گیا۔"

"نہیں نہیں اجلال! جھگڑا نہیں۔" اب اس کے ساتھ والے نے امن کا جھنڈا لہرایا۔ "آؤ اس وقت چلیں۔ اگر اس دکان سے خریداری کرنی ہے تو ہم کل آ کر لیں گے۔" بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے اس نے اجلال کا بازو تھام لیا۔

"ہاں ہاں لے جائیں ان کو' خس کم جہاں پاک۔ ویسے بھی ہم پہلے کی آئی ہوئی ہیں۔" ماھم کا لہجہ اور الفاظ جھگڑے کو طول دینے کے لیے کافی تھے۔

اور وہ' جس نے اپنا نام اجلال حیدر بتایا تھا۔ وہ بھی جیسے ماھم ہی کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ فسادی۔ جھگڑالو۔ غصیلا۔ بھڑکیلا۔ ساری خوشگواریاں اور مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔

"خس کم جہاں پاک۔ مجھے کہہ رہی ہیں۔" وہ اپنے ساتھی کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے یوں آگے بڑھا جیسے ابھی ماھم سے گتھم گتھا ہو جائے گا۔

"خدا کے لئے ماھم۔! کیا کر رہی ہو۔؟" ایمان اک مختصر سی چیخ کے ساتھ اپنے خوفزدہ لرزتے کپکپاتے وجود کو بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے ماھم کے آگے آن کھڑی ہوئی۔ "پلیز! آپ جائیے یہاں سے۔ ہٹ جائیے ادھر سے۔" ماھم کی جوشیلی' تیز اور غصیلی عادت سے واقف تھی' اس لیے اجلال حیدر سے ہی التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "میری دوست دل کی بری نہیں ہے۔ پھر پتہ نہیں کیوں جھگڑا ہو جاتا ہے ہمیشہ۔" مایوں کے لباس والے سجے سنورے وجود کو تو اس نے سنبھال لیا تھا لیکن گلاب جیسے گالوں پر بے اختیار پھسل آنے والے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ وہ بہت بزدل تھی۔

"دل کے تو ہم بھی برے نہیں ہیں۔"

چڑیا جیسا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کہ اجلال حیدر کی آواز کی نرمی نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔

"سچ جانئے ہم بھی دل کے بہت اچھے ہیں۔" اس کے لبوں پر جھگڑے اور غصے کی بجائے اک واضح سی' دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔

ماھم تو یونہی طیش میں آئے جا رہی تھی۔ اندر ہی اندر ماھم کی طبیعت' اور

مزاج کو کوستے ہوئے ایمان بھی مسکرا پڑی۔

''پھر دوستی ہو گئی نا۔؟'' ایمان کی مسکراہٹ میں نجانے کیسا جادو تھا کہ اجلال حیدر مزید پھیل گیا۔ فوراً دوستی کی آفر کر ڈالی۔

ایمان کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ان چند لمحات کی ملاقات میں گرگٹ کی طرح اتنے رنگ بدل لے گا۔ اور ملاقات بھی کیا تھی۔ جھگڑا ہی جھگڑا تھا۔ ماھم اور اس کے مابین۔ اتنی ذرا سی بات پر۔ کہ پہلے وہ خریداری کرے گی اور پہلے وہ کرے گا۔ انہیں بھی مایوں کی رسم کے لیے واپس جانے کی جلدی تھی۔ اور انہیں بھی کوئی ایسا ہی مسئلہ درپیش رہا ہو گا۔ اس کے دوستی کے لیے پھیلے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے ایمان کے ذہن میں ایماندارانہ سی سوچ آئی۔ وہ گھبرا کر پرے ہٹ گئی۔ بے شک وہ دوستی کا ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا مگر ایمان نے اس اجنبی سے ہاتھ تو نہیں ملا لینا تھا۔؟

وہ گھبراہٹوں میں گھری ہوئی دونوں کے درمیان میں سے ہٹی تو وہ' اجلال حیدر اور ماھم' دونوں لڑاکو مرغے پھر ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

''اسے کیا کہہ رہے ہو۔ اللہ میاں کی گائے۔ ہے یہ تو۔'' ماھم آستینیں چڑھاتے ہوئے پھنکاری۔ ایمان اور اجلال حیدر کی نظروں ہی نظروں میں جو دوستی کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ اس کا تو ماھم کو علم ہی نہیں تھا۔

''آؤ تمہیں دوستی کر کے بتاتی ہوں۔'' اسے ایک زور دار تھپڑ لگانے کے لیے ہاتھ بلند کیا تو اجلال نے اس کا بازو آہستگی سے تھام لیا۔

''کہا نا جھگڑا ختم۔ میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔ ہم شریف لوگ ہیں کوئی لوفر' لفنگے' آوارہ نہیں ہیں۔ آپ اپنے بندے خریدیں اور پھر اک لیڈیز رنگ خریدنے میں ہماری مدد کریں۔''

''کیوں۔ لیڈیز رنگ آپ نے کیا کرنی ہے۔؟'' ماھم نے اپنا بازو اس کی نرم گرفت سے چھڑاتے ہوئے پھر اسے مشکوک نظروں سے بھی دیکھا۔ شاید وہ اسے بلف کر رہا تھا۔

''توبہ بھئی توبہ! میرا خیال تھا اس پوری دنیا میں مجھ سے زیادہ جھگڑالو اور کوئی نہیں ہو گا۔ مگر یہاں تو مجھ سے بھی بڑے بڑے......''



اجلال حیدر نے مسکراتے ہوئے اک مخلصانہ سی نگاہ ایمان پر اور اپنے ساتھی پر ڈالی۔ وہ جو اب تک ہر جذبے سے عاری' نہ چہرے پر صلح کے آثار تھے نہ جھگڑے کے' چپ چاپ کھڑا تھا۔ اک خاموش تماشائی بنا ہوا۔ اس لمحے بے اختیار مسکرا پڑا تھا۔ بس اسی لمحے ایمان کی نظر اس کی طرف اٹھتی تھی۔

''یہ بھی بھلا کوئی اعتراض کرنے کی بات ہے کہ لیڈیز رنگ کیوں خرید رہے ہیں۔؟ بھئی کسی کو تحفہ دینا ہے'' اجلال بڑی نرمی سے' بڑی صلح سے ماھم کو سمجھا رہا تھا۔

''کس کو۔؟'' بڑی عجلت سے اگلا سوال ماھم نے داغ دیا تو اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

''خدایا! میں کہاں آن پھنسا۔ مس ماھم صاحبہ! ہمارے اک دوست کی شادی ہے۔ اس کی مسز کو ہم دونوں دوست ایک قیمتی سی رنگ لے کر دے رہے ہیں۔'' اجلال حیدر نے وضاحت کی۔

''دونوں دوست صرف ایک رنگ دیں گے۔؟'' ماھم کا غصہ تو جھاگ جیسا ہوتا تھا۔ بڑی جلدی اتر بھی جاتا تھا پھر دوستی بھی اک پل میں ہو جایا کرتی تھی۔ اور اب وہ اسی دوستی کے ناطے اجلال حیدر کے ساتھ سوال جواب کیے جا رہی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ صرف ایک رنگ۔ اور دونوں دوست مل کر۔؟ یہ تو فاؤل ہے نا۔''

''ہائے ہائے۔'' اجلال حیدر جھنجھلا پڑا۔'' کوئی مجھے ان کی اس باز پرس سے بچائے۔ لوگو! اس آفت زدہ بندے کی مدد کو پہنچو۔'' وہ واقعی بہت شریر تھا۔ شور مچانے لگا۔

اجلال حیدر کی مضحکہ خیز جھنجھلاہٹ پر ایمان اور وہ خاموش تماشائی' جو پہلے صرف مسکرا رہے تھے' اب ایک دم ہنس پڑے۔ پھر ہنستے ہنستے ہی دونوں کی نظریں دوسری بار ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔

یہ۔ یہ کیسی ہنسی تھی۔ جو صرف اس کے ہونٹوں پر تھی۔ آنکھوں کے اندر مگر عجیب سی اداسیاں تھیں۔ کچھ گہرے سناٹے۔ کچھ ویرانے۔ یہ ایک ہی چہرے پر متضاد سی کیفیات۔ ایمان کی نگاہیں اس پر جمی کی جمی رہ گئیں۔

وہ پرے ہٹ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ ذہن و دماغ گہری سوچوں میں غرق تھا اور ادھر ماھم اور اجلال حیدر انجانے میں ہی دوستی کی منازل طے کر رہے تھے۔

''یہی لے لیں۔ بہت خوبصورت ہے۔'' بہن کے مایوں کی رسم اور اپنے بندے بھول بھال ماھم اجلال حیدر کو انگوٹھیاں پسند کر کے دکھائے جا رہی تھی۔

''نہیں یہ نہیں۔ یہ والی زیادہ اچھی رہے گی۔ اس میں زیادہ ڈائمنڈ ہیں۔''

''مہنگی بہت ہے۔''

''تو کیا ہوا۔؟ دونوں نے مل کر ایک تو دینی ہے۔ اب اتنی بھی کنجوسی تو نہ کریں۔''

''سمجھیں نا مس ماھم! ہم تنخواہ دار لوگ ہیں۔ زیادہ افورڈ بھی نہیں کر سکتے۔ اور ڈائمنڈ کی انگوٹھی ہمارے متوسط طبقے کے دوست کی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی محبوبہ کی فرمائش ہے۔ ہمارے دوست کا بھرم بھی رہ جائے گا کہ آسمان سے تارے بھی توڑ کر اسے دے سکتا ہے۔ اور ہمارا بھی کہ ہم اس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔''

ان کی دوستی کی منزلیں ان کی انتہائی نجی زندگی کے متعلق گفتگو تک پہنچ گئی تھیں۔ ''تنخواہ کا پوچھتی ہیں۔ کہ کہاں جاتی ہے تو وہ تو بجلی' گیس' پانی کے بلوں کا پیٹ ہی بھرتے بھرتے ختم ہو جاتی ہے۔''

''پھر باقی اخراجات کا کیا کرتے ہیں۔؟'' اب وہ گھر گرہستی کو بھی ڈسکس کر رہے تھے۔ ''باقی مہینہ خود کو خرچ کرتے رہتے ہیں۔'' دوسروں ہی کو نہیں' اجلال حیدر خود اپنے آپ کو بھی مذاق کا نشانہ بنا کر ہنس رہا تھا۔

''وہ کس طرح......؟'' ماھم اس کی گفتگو پوری دلچسپی سے سن رہی تھی۔

''خالی جیب دیکھ دیکھ کر دل جلاتے رہتے ہیں اور اس کی بھڑکتی آگ میں گردے' پھیپھڑے اور کلیجہ بھون بھون کر کھاتے رہتے ہیں۔''

''ارے واہ! آپ تو بہت مزے کرتے ہیں۔ کسی دن گردوں' پھیپھڑوں کے ساتھ ساتھ بھیجے سے بھی شوق فرما کر دیکھیں۔ مزہ دوبالا ہو جائے گا اور سب



فکروں' سوچوں سے آزاد بھی ہو جائیں گے۔''

''تو کیا آپ اپنے کو خرچ کر چکیں۔ جو تجربہ بیان کر رہی ہیں۔''

''کب کا۔'' وہ زور سے ہنسی۔ ستائشی نگاہوں سے اجلال حیدر کو دیکھا۔ باتیں مزے کی کرتا تھا۔ ایسے ہی اس کے ساتھ جھگڑا کیا۔

''یہ تو دوست بنانے کے قابل ہے۔'' اندر سے اک سوچ سی ابھری۔

''تبھی اب میرے والے پر نظر ہے۔ مبارک ہو۔ آپ نے آج میرے سر کو بھی اس سے فارغ کر دیا۔''

''ریئلی؟'' اجلال حیدر کی بات پر وہ کتنی ہی دیر ہنستی رہی۔ ''خیر مبارک۔''

ڈائمنڈ رنگ پسند کر کے خریدنے کے بعد بندے بھی دونوں نے مل کر ہی منتخب کیے۔ تب اس وقت ماھم کو ایمان کا خیال آیا۔ اور اسی وقت اجلال حیدر نے بھی مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ پیلے سوٹ' سبز چوڑیوں اور موتیے چنبیلی کی کلیوں سے سجی لمبی چوٹی کو آگے لٹکائے وہ اک بے حد دلنشین روپ کے ساتھ' اک خوبصورت مجسمے کی طرح ایستادہ تھی۔

''کیا آج ان کا مایوں ہے۔؟'' اجلال حیدر نے ماھم سے رازدارانہ پوچھا۔

''مایوں والی لڑکی' اپنے مایوں کے دن یوں دکان دکان نہیں پھرا کرتی۔'' ماھم نے ہنستے ہوئے اجلال حیدر کی کم علمی پر طنز کیا۔ ''اتنے بڑے ہو گئے ابھی تک یہ بھی نہیں پتہ۔ ارے! مایوں تو میری آپا کا ہے۔ اور یہ میری دوست ہے۔ ہم نے ایک جیسا لباس بنوایا ہے۔ ابھی جا کر میں بھی اسی طرح تیار ہوں گی۔''

''تو آپ بھی تیار ہو کر آتیں۔ ہم بھی آپ کو دیکھ لیتے۔''

''اس وقت بھلا مجھے معلوم تھا کہ آپ آئے ہوں گے اور۔ اور۔'' آگے پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ پھر وہ یکدم مڑ کر ایمان کی جانب لپکی۔ تو ماھم نے اس کی ایک ہی جگہ پر مرکوز نگاہوں کا تعاقب کیا۔ آخر اس کی محویت کی وجہ کیا تھی جو وہ اس کے دو تین بار پکارنے پر بھی بولی نہیں تھی۔

اور ماھم یہ دیکھ کر کچھ حیران' کچھ پریشان سی ہو گئی تھی کہ اس کا مرکز نگاہ وہ

تھا۔ اجلال حیدر کا دوست۔ بلاشبہ ایمان کی نظریں اسی پر گڑی تھیں۔ ماھم نے ایک دم زور سے اس کا کندھا ہلا دیا۔

"کیا ہوا۔؟" ایمان نے چونک کر ماھم کو دیکھا۔

"چلنا نہیں۔ چلو۔ چلو۔" ماھم اجلال حیدر کو بائے بائے کرتی' ایمان کو بازو سے پکڑے' اسے گھسیٹتے ہوئے دکان سے باہر کی سمت چل دی۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے ایمان گردن موڑ موڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے غور سے اس شخص کو دیکھا ہے؟" ایمان نے سرگوشی میں ماھم سے پوچھا۔

"نہ دیکھا ہے نہ دیکھنے کی خواہش ہے۔" جواب میں ماھم تند سے لہجے میں بولی۔ "اور تم بھی عقل کرو۔ کچھ پتہ ہے تمہیں کہ تم انگیجڈ ہو۔ تمہیں ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔"

"کیا۔؟" ایمان چلا سی پڑی۔ "یہ تم کیسی بات کر رہی ہو۔؟ کیا میری نظروں کا اندازہ کچھ غلط تھا۔؟ افسوس ماھم! تم اپنی اور میری اتنی لمبی دوستی اور اتنی پرخلوص رفاقت کے باوجود مجھے آج تک سمجھ ہی نہیں ہو۔"

ایمان اس سے روٹھ کر لمبے لمبے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نہ صرف دکان سے باہر نکلی بلکہ سامنے سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گئی تو اس میں بیٹھی۔ اور کوئی ایڈریس بتا کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔

نجانے اس اجنبی کی ہستی میں کیا تھا کہ وہ بار بار اسے دیکھنے پر مجبور اور بے اختیار سی ہو رہی تھی۔ بلاشبہ وہ اک گریس فل پرسنالٹی کا مالک تھا۔ پر اس نے تو اس سے بھی اچھی اچھی شخصیتوں والے لوگ دیکھے ہوئے تھے۔ پھر اس میں آخر ایسی کیا بات تھی۔؟

ایمان سیٹ کی بیک کے ساتھ سر ٹکائے' آنکھیں موندے سوچ رہی تھی شاید اس کی وہ اداس آنکھیں' ایمان کی توجہ کا مرکز بنی تھیں۔ براؤن پتلیوں والی ذہین مگر اداس آنکھیں۔ جو اسے اک لمحے کو نہیں بھول رہی تھیں۔ وہ اب تک انہیں میں کھوئی ہوئی تھی۔



اور ٹیکسی اس کے بتائے ہوئے پتہ کی طرف تیزی سے رواں تھی۔

## 2

امریکہ ہمایوں کو بہت پسند آ گیا تھا۔

وہاں کی آب و ہوا' وہاں کا صاف ستھرا ماحول' وہاں کی آسائشیں' وہاں کی آزادی بھری فضائیں اور سب سے بڑھ کر وہاں اردگرد بکھری خوبصورتیاں!!

وہ کمپیوٹر کورس کرنے امریکہ آیا تھا۔

اس کے ساتھ لڑکوں کے علاوہ بہت ساری لڑکیاں بھی تھیں۔ خوبصورت اور ہنس مکھ۔ زندہ دل اور خوش مزاج۔

تقریباً ہر ایک کے ساتھ اس کی ہیلو ہائے' تھی۔ کچھ کے ساتھ تو بہت گہری دوستی بھی تھی۔ کلاسز کے اوقات کے علاوہ شامیں بھی اکٹھی گزر جاتی تھیں۔ کچھ کے ساتھ سیر و تفریح اور پکنک وغیرہ کے پروگراموں میں بھی شرکت ہو جاتی تھی۔ اس نے ایک کلب جوائن کیا ہوا تھا۔ وہاں بھی اس کی دوستی لڑکوں کی نسبت لڑکیوں سے زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ بہت ہینڈسم تھا۔ جواں اور خوبرو تھا۔ بلند و بالا وجود رکھتا تھا۔ تبھی شخصیت میں ایسی کشش اور سحر تھا کہ جنس مخالف اس کی طرف آپ ہی آپ کھنچی چلی آتی۔ اس لیے وہ سب میں بہت پاپولر تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بہت ناز و نعم میں پلا تھا۔ یوں بھی باپ بہت ساری زمینوں جائدادوں کا مالک تھا۔ جو کہ سب کچھ اسی کا تھا۔ اور اسی کے لیے آسائشیں اور زندگی کی نعمتیں فراہم کرنے کے لیے وقف تھا۔ لہذا وہ اپنے وطن سے دور رہ کر بھی شہزادوں جیسی زندگی گزار رہا تھا اور نوابوں جیسے طور و اطوار اپنائے ہوئے تھا۔

امریکہ کی فضاؤں میں سانس لینے کے بعد ہمایوں کو اپنا پاکستان سخت ناپسند ہو گیا تھا۔ بے شک وہاں اس کے والدین تھے اور دوسرے رشتہ دار اور اقربا بھی تھے۔ کچھ بہت گہرے دوست بھی تھے۔ لیکن پھر بھی۔ زندگی گزارنے کے لیے اسے

امریکہ ہی کا ماحول پسند تھا۔

اور اسے ماما کے خطوں پر خط آئے چلے جا رہے تھے۔ ''ہمایوں! اب مجھ سے تمہاری جدائی مزید برداشت نہیں ہو رہی۔ میرے بچے! اب واپس آ جاؤ۔ میری آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔''

ماؤں کی آنکھیں تو ہر لمحہ اولاد کو سامنے دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن اس جوانی کے عالم کا جو اک اک لمحہ وہ یہاں امریکہ میں گزار رہا تھا' وہ پاکستان میں اسے کہاں میسر آ سکتا تھا۔ کہ وہاں کی تو لڑکیاں ہی بڑی بدمزاج تھیں۔

ذرا کسی سے بے تکلف ہونے کی کوشش تو کجا رہی نظر بھر کر دیکھ بھی لیتا تھا تو وہ آنکھیں ہی نکالنے کو تیار ہو جاتی تھیں۔ یہ اس کا ذاتی تجربہ تھا اور مقابلے میں وہاں کی لڑکیاں بڑی براڈ مائنڈڈ تھیں۔ مسکراہٹیں تو وہ بلاتکلف جانے انجانے پر بھی نچھاور کر دیتی تھیں۔ پھر دوستی کا معاملہ آتا تو وہ اس سے بھی زیادہ فراخ دل تھیں۔ اپنا سب کچھ ہار دیتی تھیں۔ پھر بھی خوش رہتی تھیں۔ اس تین سال کے عرصے میں چار لڑکیاں تو دو دو ماہ کے لیے اس کے اپارٹمنٹ میں اس کے ساتھ بھی رہی تھیں۔ صرف دوستی نبھانے کی خاطر۔ ایسی وفادار اور مخلص تھیں وہ۔ ایسی بھلا پاکستان میں کوئی مل سکتی تھیں۔ ایسی دوستیاں نبھانے والی۔ ایسی وفادار۔ ایسی مخلص۔

یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ عین عالم شباب میں یہاں امریکہ آ گیا تھا۔ جبکہ اس کے زندگی انجوائے کرنے کے دن تھے۔ اور یہاں کا ماحول بڑا سازگار تھا۔ انہیں خلوص و وفا کی پتلیوں کی وجہ سے۔ ورنہ ''وہاں پاکستان میں۔ وہاں تو یار! پابندی ہی پابندی۔ نگاہ اٹھانے کی' بات کرنے کی' مسکراہٹیں نچھاور کرنے کی۔''

ہمایوں کا اک پاکستانی دوست اپنے دکھڑے بیان کر رہا تھا۔ اور وہ اس سے پوری طرح متفق تھا۔

''وہاں پاکستان میں کسی کلاس فیلو کو یا دفتر میں ساتھ جاب کرنے والی کسی لڑکی کو چائے پلانے کی پیش کش کر دیں تو جواب میں گالیاں کھانے کو ملتی ہیں۔ دوسرے کی مہمان نوازی اور فراخ دلی کی تعریف نہیں کی جاتی' الٹا اسے کوسنے دیئے جاتے ہیں۔ اس کی ماں بہنیں گنی جاتی ہیں۔''



کتنا واضح فرق تھا پاکستان اور امریکہ کے ماحول میں۔ ہمایوں ماما کو کیسے یہ سب کچھ بتاتا۔ کہ پاکستان کی زندگی' زندگی گزارنا نہیں' عذاب کاٹنے کا نام تھا۔ ماما کا واپسی کا مطالبہ کس قدر ظالم تھا۔ پاکستان میں گزارا ہوا زندگی کا اک اک لمحہ اس کی یادوں میں تازہ تھا اب تک۔ پاکستان میں ہر قدم پر پابندی ہی پابندی تھی۔ کھانے پینے سے لے کر زندگی کے ہر ڈھنگ تک پر۔ سگریٹ پیتا تھا تو ماں باپ سے چوری۔ کتنی معمولی سی بات تھی جس کے لیے اسے چوری جتنا بڑا گناہ کرنا پڑتا تھا۔ شام خوبصورت گزارنے کے لیے وہ اگر دوستوں کے ساتھ کسی محفل میں جا بیٹھتا تو فوراً پاپا کی عدالت میں طلبی ہو جاتی۔

''خبردار! جو آئندہ تم کسی ایسی جگہ پر گئے تو۔ بند کر دوں گا تمہارا جیب خرچ۔''

جیب خرچ بند ہو گیا تو۔؟ پیسے بغیر زندگی کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور پاپا کی یہ دھمکی ایسی ہوتی تھی کہ وہ فوراً ڈر جاتا۔ ان دولتوں ہی کے دم قدم سے تو اس کی زندگی کی ساری رونقیں تھیں۔ ساری دلیریاں تھیں۔ ساری دلآویزیاں تھیں۔ ساری دلکشیاں تھیں۔ جنہیں چھوڑنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

پھر اس دن تو حد ہو گئی۔ توفیق کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ پینے پلانے کی محفل تھی۔ مشروب تو پینا ہو گا۔ یہ اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ بہت چھپ چھپ کر' سب سے چھپا کر توفیق کے کچھ دوستوں نے یہ پارٹی ارینج کی تھی۔ تب توفیق کے اصرار پر اس نے صرف دو گھونٹ لئے تھے۔ جو بعد میں تھوک بھی دیئے تھے۔ ہمایوں شہر میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر پینے پلانے کا شغل بھی کرتا تھا۔ پاپا تک یہ خبر جانے کیسے پہنچ گئی۔ وہ بے بھاؤ کی پڑی تھیں کہ الاماں والحفیظ۔ لگتا تھا اس کے اور پاپا کے درمیان میلوں فاصلہ ہونے کے باوجود بھی کوئی ایسا جادو ان کے پاس تھا کہ ان کی آنکھیں ہر وقت اسے اپنے حصار میں لیے رہتی تھیں۔

یہ معاملہ تو ماما تک بھی جا پہنچا تھا۔ تبھی تو ماما کا ایک طویل سا خط اسے ملا تھا۔ جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ اس کی اس قبیح حرکت نے انہیں اتنا دکھ پہنچایا تھا کہ وہ کئی دن بیمار رہی تھیں۔ پھر جب وہ چھٹیوں میں گھر گیا تو اس طویل خط سے بھی کہیں لمبا لیکچر اسے سننے کو ملا تھا۔

"اگر بات تمہارے سسرال تک جا پہنچی تو......؟" ماما کو تو ہر معاملے میں ا
کی سسرال کا ہی فکر لاحق رہتا تھا۔

"تو آپ نے بھلا بچپن سے ہی یہ منگنی کا پھندا میرے گلے میں کیوں ڈا
دیا۔؟ آزادی کا اک سانس لینا کبھی نصیب میں نہیں ہوا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم کہتے ہو تو ہمیشہ کے لیے تمہیں اس رشتے سے آزاد
دیتی ہوں۔ ہم دونوں بہن بھائی میں بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ تمہاری نسبت ٹو
سے ہماری رشتہ داری میں کوئی دراڑ نہیں آئے گی۔" ماما اسے بلیک میل کرنے لگ
جاتیں۔ جانتی تھیں۔ ہمایوں کو ایمان پسند بھی بہت تھی۔ اس کی شکل و صورت' اس
عادات و اطوار۔ اس کی ذہانت۔ اس کی خوش طبعی۔ خاندان کی سب لڑکیوں میں
علیحدہ اور منفرد تھی وہ۔! اور ہمایوں اسے کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جا
تھا۔ یہ جوانی کی جذبات بھری زندگی جس طرح بھی وہ گزار دے آخر میں اسے لو
کر ایمان کے پاس ہی آنا تھا۔

اس کی آنے والی نسل کی جیسی تربیت اور پرورش وہ کرنا چاہتا تھا وہ صر
ایمان کی گود میں سانس لینے والے اور پلنے بڑھنے والے بچے ہی اس کے ضا
تھے۔ وہی ہمایوں کے سارے خواب پورے کر سکتے تھے۔ وہی ہمایوں کے بڑھاپے
خوشیوں اور مسرتوں کے امین ہو سکتے تھے۔ یوں۔ صرف ایمان ہی تھی' پورے امر
میں' پورے پاکستان میں' پوری دنیا میں' اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا' وہ اس کی حیا
کی رعنائی اور توانائی تھی۔ صرف ایمان۔!! یہ احساس اسے امریکہ آ کر ہی ہوا تھا۔

لیکن۔ جوانی بڑی منہ زور ہوتی ہے۔ تین سال گزارنے کے بعد جب
سے ماما کے خطوط مسلسل آنے لگے۔ "اکیلے رہ رہ کر میں تھک گئی ہوں۔ اور چا
ہوں۔ اب بہو گھر میں آ جائے۔ ہمارے بھی سونے آنگن میں پھول کھلیں۔ زندگی
کوئی بہار ہم بھی دیکھ لیں۔" تو وہ واپسی کے متعلق سوچنے لگا۔ لیکن۔ یہ کیا۔؟ اسے
امریکہ کی معاشرتی آزادیوں نے کچھ اس طرح اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا کہ دل
بھی طرح واپس جانے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

وہ یہاں سگریٹ کھلے عام پیتا تھا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے یا دوستو



اور جاننے والوں والیوں کی محفل میں یا ذہنی آسودگی یا سکون کے لیے وقتاً فوقتاً مے
نوشی کر لیتا تھا تو کوئی جھاڑنے جھڑکنے والا نہ تھا۔ نہ سسرال والوں کا ڈر خوف تھا۔ کسی
ہنس مکھ اور خوبصورت دوشیزہ کے ساتھ کچھ وقت گزار لیتا تو یہ فعل شخصی آزادی پر محمول
ہوتا۔ کوئی روک ٹوک نہ کرتا۔ یہ سب کچھ۔ یہ سب کچھ پاکستان میں کہاں تھا۔؟ کچھ
وقت اور۔ ایک سال۔ دو سال۔ اگر یہاں کے پر فضا ماحول میں اور گزار لے تو کیا
بگڑ جائے گا۔؟

ابھی ایمان کی تعلیم مکمل ہونے میں بھی دو سال تھے۔ یہ وقت بھی امریکہ
میں ہی رہ کر کیوں نہ لطف و مستی کی نظر کر دیا جائے۔ کیا فرق پڑ جائے گا۔؟

ماما کے لئے ہر ہفتے ایک کال' ہر دس پندرہ دن بعد ایک طویل سا خط' پاپا
کے لئے ان کے دفتر میں کبھی ای میل اور کبھی فیکس کے ذریعے اپنی خیریت کی اطلاع'
کافی تھا اتنا ہی اور اگر پھر بھی ان کی تسلی نہیں ہو گی تو پھر۔ اتنی دور بیٹھے وہ اس کا کیا
بگاڑ سکتے تھی۔؟ اس کا ماہانہ خرچ بند کر دینے سے تو وہ رہے کہ وہ ان کی اکلوتی اولاد
تھا۔ وہ اس کی محبت میں کچھ اس طرح گرفتار تھے کہ اس کے ساتھ وہ کوئی بھی ظلم و
زیادتی نہیں کر سکتے تھے۔

اور ہمایوں ان کی محبتوں کو' اپنے اکلوتے پن کو' پوری طرح کیش کر رہا تھا۔
اور اپنا حق سمجھ کر وصول کر رہا تھا۔

## 3

خاصے دھوم دھڑکے کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ دھڑام سے
دروازہ کھلا۔ ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابی اس سے ٹکرائی۔ ساتھ چوڑیوں کی جھنکار
تھی۔ ہونٹوں پر کوئی طربیہ گیت تھا۔ یوں ساز سروں کے ساتھ وہ اس کے سامنے
کھڑی تھی۔

ایمان حیرت بھری نگاہوں سے اسے تکنے لگی۔

"چلو اٹھو۔ جلدی سے۔" ایمان کے ہاتھ سے فائل اور قلم اک جھٹکے سے کھینچا اور بیڈ پر پھینک دیا۔

"کیوں۔؟ کیا کوئی طوفان آ رہا ہے۔؟" ایمان کی تیوری چڑھ گئی۔

اس وقت اس کا کہیں بھی جانے کا موڈ نہیں تھا۔ کل ٹیسٹ تھا اور وہ اس کی تیاری میں مصروف تھی۔ ٹیسٹ تو ماھم کا بھی تھا مگر وہ تعلیم کے معاملے میں آج تک کبھی سنجیدہ نہیں ہوئی تھی۔ نجانے ایم۔ اے تک کیسے پہنچ گئی تھی۔؟

"ماھم اور طوفان ایک ہی چیز کے دو نام سمجھو۔" ماھم کھلکھلا پڑی۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔"

"تو پھر اٹھ جاؤ۔" فائل قلم پرے پرے پھینکنے کے بعد ماھم نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"خدا کیلئے ماھم!"

"اونہوں کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ اک لفظ نہیں سنوں گی۔ یہاں تک کہ خدا کے واسطے وغیرہ بھی ان سنے۔ بہری ہو چکی ہوں میں۔"

"توبہ توبہ! اللہ کے نام سے بھی منکر۔" ایمان نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو وہ مزید بگڑ گئی۔

"یہ تم کیسی برف کی بنی لڑکی ہو۔ نہ جذبات میں گرمی' نہ مزاج میں لطافت و نفاست۔ چھٹی کے دن بھی چھٹی نہیں۔ ہمایوں بھائی کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔"

ہمایوں کے ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے ایمان نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "یہ تو بتاؤ مجھے لے جا کہاں رہی ہو۔؟"

"سرپرائز میری جان سرپرائز۔" ماھم گنگنائی۔ "بس تم جلدی سے تیاری پکڑو۔" پھر اسے اپنے بالمقابل کھڑا کر کے بغور اس کا معائنہ کرنے لگی۔ "کپڑے بھی ٹھیک ہیں۔ بالکل فٹ فاٹ۔ چہرہ بھی نکھرا ہوا ہے۔ غسل کیا ہے شاید۔ بال بھیگے بھیگے اور کچھ لٹیں پیشانی کے ساتھ چپکی ہوئیں۔ یہ انداز بھی چلے گا۔ اچھا لگ رہا ہے۔ بس تو گویا سب ٹھیک ہے۔"

چیختی چلاتی ایمان کا بازو مضبوطی سے تھاما اور اسے کھینچتے ہوئے ساتھ لئے



کمرے سے نکل گئی۔

"ارے! کمرے کا دروازہ تو بند کر لینے دو۔"

"یہاں کوئی چور اچکے نہیں بستے۔ ہوسٹل کا کمرہ ہے۔ اردگرد پڑھی لکھی لڑکیاں رہتی ہیں۔ یوں بھی تمہاری سب سے زیادہ قیمتی متاع تو امریکہ میں ہے۔ یہاں سے تمہارا کوئی کیا چرا لے گا؟"

ایمان کا اک لفظ نہیں سنا۔ خود ہی بولتی بکتی اسے کھینچے لئے گئی۔ پارکنگ میں پہنچ کر اسے گاڑی میں پٹخا۔ کھٹاک سے دروازہ بند کیا۔ پھر گاڑی کی کھڑکی میں سے اپنا پرس اس کی گود میں پھینکتے ہوئے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"میرا پرس کھولو اور اپنے چہرے کو تھوڑا سا فریش کر لو۔" اگلا حکم جاری ہوا۔

ایمان پیشانی پر بل لئے اسے تکتی رہی۔ نہ کوئی جواب دیا۔ نہ پرس کو ہاتھ لگایا۔

"ناراض ہو۔؟ ہم سا حسین ہونا چاہتی ہو۔؟" ماھم آنکھوں کے گوشوں سے اسے دیکھتے ہوئے گنگنائی۔ "تو جانو! کہاناں۔ پرس کھولو اور......"

ایمان کے اک مکے سے اس کی گنگناہٹ تھم گئی۔ اور پھر دونوں کا مشترکہ قہقہہ گاڑی میں گونج اٹھا۔

"تم بھی بس کمال کی ہو۔" کافی دیر ہنسنے کے بعد ایمان ماھم کی شان میں بولی۔ "وہی مثال ہے تمہاری۔ آٹھ دن نو میلے۔ بتاؤ اس وقت کونسا میلہ لگایا ہے۔؟ یعنی آج کے میلے کا عنوان کیا ہے۔؟"

"تمہیں بتایا تھا نا۔ کزن نے نئے اسٹائل کے ریسٹورنٹ کا افتتاح کیا ہے۔"

"کیا ہم وہاں جا رہے ہیں۔؟" ماھم کی پوری بات سنے بنا' ایمان سٹپٹا کر بول پڑی۔

"ہاں۔ بس وہیں تک۔ تھوڑی دیر کیلئے۔"

"لیکن مجھے تو گھر سے اجازت نہیں ہوٹلوں یا ریستورانوں میں جانے کی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میرے ساتھ تمہیں ہر جگہ جانے کی اجازت ہے۔ آنٹی سے میں نے پوچھ لیا ہوا ہے۔" بولتی وہ ہمیشہ سچ تھی۔ بڑا اعتبار تھا اس کا۔ سب پر ہی

جما لیتی تھی۔ پتہ نہیں کیا کرتی تھی۔ ایمان اس کے چہرے کو اعتبار' بے اعتباری کی ملی
جلی کیفیت میں تکتی رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اسے ہوسٹل کا' کمرے کا' ٹیسٹ کا' خیال
آ گیا۔ اب تک کتنا کچھ پڑھ لیا ہوتا۔ اور۔ کمرے کا دروازہ کیسے چوپٹ چھوڑ آئی
تھی۔ ''ارے! وارڈن سے بھی تو پوچھنا تھا۔ پھر واپسی......''

''سب پوچھ لیا ہے۔'' ماھم نے اس کی بڑبڑاہٹ بھی قطع کر ڈالی۔

''مروتم۔'' ایمان کو سچ مچ ہی غصہ آ گیا۔ سارے قواعد وضوابط بھی پورے
کر لئے تھے۔ کوئی بھی تو اس کیلئے عذر بہانہ نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اسے ریسٹورنٹ میں
جانے سے منع کرتی۔ ایمان نے سیٹ کی بیک کے ساتھ سر ٹیک لیا اور دور تک جاتی
سڑک کو دیکھنے لگی۔

''ہاں تو کیا ہے آج اس مصیبت خانے میں۔ جب سے تمہارے کزن نے
ریسٹورنٹ شروع کیا ہے تبھی سے تمہیں شوق چڑھا ہوا تھا وہاں جانے کا۔ اور مجھے'
مفت کا کچھ بھی کھا پی لوں' کبھی ہضم نہیں ہوتا۔''

''بدہضمی' زود ہضمی' مفت کا مال یا اپنا' یا خیرات کا یا چوری کا۔ سب کچھ مجھ
پر چھوڑو۔ اللہ کو میں جواب دونگی۔''

''تم پر کیوں چھوڑ دوں۔ ہر بندے نے اپنے اعمال کا جواب خود اللہ کو دینا
ہو گا۔''

''اور تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے کوئی برا عمل کرا کے تمہیں اللہ کے
سامنے کھڑا کرونگی حساب کتاب کے لئے۔ او پاگل لڑکی! ایمان کے ساتھ بھلا کوئی بے
ایمانی کر سکتا ہے۔ لو جی منزل آ گئی۔''

ایک دم گاڑی کو بریک لگی۔ ایمان کو پتہ ہی نہیں چلا کب گاڑی ریسٹورنٹ
کے احاطے میں داخل ہوئی تھی۔ نظریں اٹھائیں تو ہر طرف جگمگ جگمگ ہو رہی تھی۔
اس نے گھبرا کر ماھم کی جانب دیکھا۔ کچھ بولنے کیلئے لب کھولے مگر وہ اسے نو لفٹ
کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے لب کھلے کے کھلے رہ
گئے۔ پھر جس طرح ماھم اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمرے سے گاڑی تک لے آئی
تھی اسی طرح گاڑی لاک کر کے اس کا بازو تھاما اور ساتھ لئے لئے ریسٹورنٹ کے



مین گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ہال کے آخری کونے میں اک علیحدہ سی میز کے پاس وہ اسے لئے کھڑی
تھی۔ ''یہ۔ یہ۔'' میز پر موم بتیوں کے درمیان سجے اک خوبصورت سے کیک کو دیکھتے
ہی ایمان گڑبڑا سی گئی۔ ''یہ کیا۔؟''

''خدا کی قسم اپنی جیب سے ساری پے منٹ کی ہے۔ کزن کے ناطے مفت
خوری بالکل نہیں کی۔ صرف اس ریسٹورنٹ کا انتخاب سیکیوریٹی کی خاطر کیا ہے۔'' ماھم
بڑی عجلت سے صفائی پیش کرنے لگی۔ ''اکیلی ہیں دونوں لڑکیاں۔''

''لیکن ماھم! آج تو تمہاری سالگرہ نہیں ہے شاید۔''

''میری ہو یا تمہاری کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اور تم کوئی دو ہیں۔؟''

اور ماھم کی بات پوری ہونے سے پہلے ایمان کو آج کی تاریخ یاد آ گئی۔
ارے! تو یہ سارا اہتمام ماھم نے اس کی سالگرہ کیلئے کیا تھا۔ اتنا خلوص' اتنی محبت۔
ایمان کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لباب بھر اٹھیں۔

''مجھے تو بالکل یاد نہیں تھا۔'' ایمان جہاں حیران و ششدر تھی وہیں ماھم کی
اتنی ڈھیروں ڈھیر محبت' پیار اور خلوص پا کر سرشاریوں میں بھی مبتلا ہو گئی تھی۔

''اور یہ تمہارا گفٹ۔'' کندھے پر لٹکے شولڈر بیگ میں سے اس نے اک
چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ''یہ میری محبت۔''

وہ اک ڈائمنڈ کی نوز پن تھی۔ ''تمہاری منی سی' خوبصورت سی ناک کیلئے۔ جو
تمہارے پورے چہرے میں مجھے سب سے زیادہ پیاری لگتی ہے۔''

بڑے پیار سے اس نے ایمان کی ناک کو دبایا پھر وہ ہیرے کی لونگ اس
میں ڈال دی۔ ایمان کا پورا چہرہ جگمگا اٹھا۔ جیسا ہیرا ناک میں چمکا تھا ویسے ہی ہیرے
دونوں خوبصورت آنکھوں میں بھی جگمگ جگمگ کرا ٹھے۔

ماھم جیسی لاابالی سی طبیعت والی لڑکی سے اسے اتنی گہری محبتوں کی توقع نہیں
تھی۔ حیرت واستعجاب میں ڈوب گئی۔

''اور اب باقی جو کچھ منگوانا ہے اس کا آرڈر تم خود دو گی۔ مجھے بہت بھوک
لگ رہی ہے۔''

بیرے کو بلانے کیلئے ماھم نے ہال میں دور تک اک نگاہ دوڑائی تو اچانک ہی داخلی دروازے سے اندر آتے ہوئے اجلال حیدر پر جا ٹکی۔

''ایمان! وہ دیکھو اجلال حیدر۔'' ایک دم ہی اتنی جذباتی ہوگئی کہ وہیں سے بازو بلند کر کے لہراتے ہوئے اسے پکارنے لگی۔ ''اجلال۔ اجلال حیدر۔''

''کیا کر رہی ہو۔؟'' ایمان نے گھبرا کر اردگرد میزوں کی طرف دیکھا۔ کہ لوگ اس کی اس بچگانہ حرکت کو کس انداز میں برداشت کر رہے تھے مگر صد شکر' کوئی ان کی طرف اس وقت متوجہ نہ تھا۔ یوں بھی وقت ایسا تھا کہ رش نہیں تھا۔ اکا دکا میزوں پر کچھ لوگ تھے۔ باقی خالی ہی تھیں ابھی۔

ایمان کے ٹوکنے پر بھی ماھم منع نہیں ہوئی۔ اپنا عمل جاری رکھا۔ ''ادھر۔ اجلال حیدر! ادھر۔'' اجلال حیدر اس کا لہراتا بازو دیکھ چکا تھا۔ اور اب ماھم اسے اپنی میز تک پہنچنے کیلئے ڈائریکشن دے رہی تھی۔ پھر ماھم نے معلوم نہیں دیکھا تھا یا نہیں' ایمان نے البتہ دیکھ لیا تھا کہ اجلال کے پیچھے پیچھے وہ بھی چلا آ رہا تھا۔

''آ جاؤ۔ آ جاؤ۔'' جیسے برسوں کی شناسائی تھی۔ ماھم کچھ اسی طرح کھل کر انہیں ویلکم کر رہی تھی۔

''واؤ۔ یہ کیا سلسلہ ہے۔؟'' میز پر جلتی موم بتیوں کے درمیان کیک دیکھتے ہی اجلال بہت خوشگوار لہجے میں بولا۔

''ایمان کی سالگرہ ہے۔ یہ میری بڑی چہیتی ہے۔ اکلوتی بھی ہے۔ سب کچھ ہے میری۔'' ماھم نے تفصیل سے اس کا تعارف کرایا۔ یوں جیسے وہ تو اس کی تھی ہی اپنی اجلال حیدر بھی اپنا ہی تھا۔ اس کو اس کے متعلق بتانا تبھی بہت اہم تھا۔

''سالگرہ ہے۔؟ اسی لئے آج اس دن سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی ہیں۔'' اجلال حیدر نے بہت بے تکلفی اور اعلیٰ ظرفی سے ایمان کو کامپلیمنٹ دیا۔ ''ہیپی برتھ ڈے۔'' اجلال حیدر کے بعد اس کے ساتھی کی گھمبیر' سنجیدہ اور بھاری سی آواز ایمان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''شکریہ۔'' اجلال حیدر کا اور دوسرے کا اس نے اکٹھے ہی شکریہ ادا کیا۔ پھر بے اختیار نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔



ایمان نے شکریے کا لفظ تو وضعداری میں بول دیا تھا لیکن نگاہوں کے ٹکراؤ نے اسے مبہوت سا کر دیا۔ اس کی آنکھوں کی اسی اداسی نے' جس نے اس دن اسے اٹریکٹ کیا تھا' آج بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔

کتنے ہی لمحات وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ دل چاہا اس کی آنکھوں کی اس بے چین کر دینے والی اداسی کو کسی نہ کسی طرح مٹا کر اس کی جگہ خوشی و مسرت کے قافلے اتار دے۔ وہ اس کا کچھ نہیں تھا۔ نہ اپنا' نہ پرایا' اک نامانوس سا اجنبی۔ بس صرف اتنا ناطہ تھا اس سے کہ دو تین بار اس دن اس کی نظروں سے اس کی نظر ٹکرائی تھی اور آج۔ یہ دوسری ملاقات تھی اس سے۔ کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بس وہی نظروں کا تصادم تھا۔ ایمان کے دل کی دنیا الٹ پلٹ سی ہوئی جا رہی تھی۔ محبت کے جذبوں سے نہیں۔ کہ وہ تو بچپن سے ہی ہمایوں کے نام کے پابند کر دیئے گئے تھے۔ اور اب تو خود اس کا اپنا بھی اس پر کوئی حق نہیں تھا۔ نہ کسی پر نچھاور کرنے کا' نہ کسی کو دان کرنے کا' نہ کسی کے نام کرنے کا۔

''اے اجنبی! کاش میں تمہاری آنکھوں میں بسی اس اداسی کو شیئر کر سکتی۔''

''تم کن خیالوں میں کھوئی ہو۔؟'' ماھم ایمان سے صلاح مشورہ کیے بغیر ہی بڑے خلوص و اپنایت سے انہیں اس کی سالگرہ پر مدعو کرنے کے بعد میز تھپتھپا تھپتھپا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

''ہوں۔'' ایمان نے چونک کر ماھم کی طرف اور پھر ان دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔

''ہماری طرف کیا دیکھ رہی ہو یہ مینو دیکھو۔ ہم تینوں اس وقت تمہارے مہمان ہیں۔'' وہ بیرے کو بلا کر مینو کارڈ بھی حاصل کر چکی تھی۔

''ماھم بی بی! ہو سکتا ہے یہ ہمیں اپنی برتھ ڈے سیلیبریشن میں شریک نہ کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کیوں زبردستی کر رہی ہیں۔؟'' اداس آنکھوں والے کی آواز میں بھی عجیب سی اداسی گھلی ملی اسے محسوس ہوئی۔

''نہیں نہیں۔'' گڑبڑاتے ہوئے یکدم ہی اس نے مینو کارڈ تھام لیا۔ پھر کھول کر چہرے کے سامنے پھیلایا۔

''سیلیبریشن میں شریک کرنا تو معمولی سی بات ہے۔ میں تو تمہاری آنکھوں کی ان اداسیوں کو بھی شیئر کرنے کو تیار ہوں۔''

''مینیو کارڈ ہاتھوں میں لیتے ہی سو گئیں کیا۔؟'' ماھم نے پھر میز تھپتھپائی۔

ایمان نے چونک کر کارڈ پرے ہٹایا۔ ''تم خود ہی بتا دو۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا۔'' اس نے کارڈ ماھم کے سامنے میز پر ڈالا ہی تھا کہ اس پر اس نے اپنا ہاتھ دھر دیا ''نہیں۔ مزید کچھ نہیں۔'' ہاتھ کارڈ پر تھا اور آنکھیں اس کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔

''آپ کی خوشی میں ہم شریک ضرور ہوں گے پر صرف اک سادہ چائے کی پیالی کے ساتھ۔''

ایمان نے دیکھا۔ اب ان آنکھوں کی اداسیوں میں مسکراہٹیں گھل مل گئی تھیں۔ اور وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اگر ان آنکھوں کی اداسیوں میں کشش تھی تو ان کی مسکراہٹیں اس سے بھی زیادہ پرکشش تھیں۔ ایمان جیسے نگاہیں لوٹانا بھول گئی۔ ''ہاں بھئی عابی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ صرف چائے کی ایک پیالی۔ وہ بھی آپ کے اصرار پر۔'' اجلال حیدر کی نظریں کیک پر جمی تھیں اور وہ بات ماھم سے کر رہا تھا۔

''عابی۔ عابی۔'' ایمان نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اس کا نام لیا۔ جس سے ابھی ابھی اجلال حیدر نے اسے روشناس کرایا تھا۔ یہ کیسا نام تھا۔؟ کچھ نامکمل سا۔ ادھورا سا۔ پر خود اس کا اپنا وجود تو اس قدر مکمل اور اتنا پھیلاؤ لئے تھا کہ ایمان کو ادھر' ادھر' ہر سمت وہ ہی وہ دکھائی دے رہا تھا۔

''بائی داوے۔'' اجلال حیدر اپنی مسکراہٹوں کے ساتھ پھر بولا۔ ''ہم تو سادہ چائے کی پیالی سے ٹرخ جائیں گے۔ کیا یہ کیک آپ نے صرف دکھاوے کیلئے رکھا ہوا ہے۔؟ خود بھی نہیں کھائیں گی کیا۔؟''

''ارے!'' ماھم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ''چلو ایمان! پہلے کیک تو کاٹو۔''

پھر ایمان نے کیک کاٹا۔ اجلال حیدر اور ماھم نے تالیاں بجا کر اسے ہیپی برتھ ڈے کہا۔ آخر میں' جب اجلال حیدر اور ماھم کی تالیوں اور ہیپی برتھ ڈے گیت کی آواز تھمی تو یکا یک عابی کی پرسوز آواز ابھری۔

ہلکی سی لے اور سر میں' اک دعائیہ نظم دھیمے دھیمے لہجے میں اس نے سنا



ڈالی۔ چند اشعار ہی تو تھے۔ لگا پوری کائنات کو اس کی مدھم آواز کے سحر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تینوں ہی مسحور ہوئے بیٹھے تھے۔ فضا جیسے تھم سی گئی تھی۔

''واؤ۔'' نظم ختم ہونے پر ماھم نے اپنے انداز میں داد دی۔ ''کمال کر دیا۔''

''بہت اعلیٰ بھئی بہت اعلیٰ۔'' اجلال حیدر نے تعریف کے ساتھ ساتھ ایک معصوم سا شکوہ بھی کر ڈالا۔ ''لیکن یار عابی! اتنے سالوں سے تمہاری اور میری دوستی ہے پھر بھلا تم نے آج تک اپنی یہ خوبی مجھ سے چھپائے کیوں رکھی۔؟'' اس سے شکوہ کرنے کے بعد وہ ایمان سے مخاطب ہو گیا۔ ''یقین کریں گی یہ میری تقریباً پچاس ساٹھ سالگرہوں میں شرکت کر چکا ہوں۔ مگر میرے لئے اس نے اس خوبصورت انداز میں کبھی کچھ نہیں کہا۔''

''آپ ساٹھ سال کے ہیں۔؟'' ماھم ان کی گفتگو میں سے یہی نتیجہ اخذ کر سکتی تھی۔ سب کی ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ اجلال حیدر کو مذاق کا موقع ملنا چاہیے تھا۔ ہنسے ہی گیا۔ ''وہ مذاق تھا مس ماھم۔'' عابی نے اسے سمجھایا تو اپنی غلطی یا حماقت پر ماھم بھی ہنسنے لگی۔ کبھی کبھی وہ نجانے اتنی بیوقوفی کی بات کیوں کر جاتی تھی۔؟ خود بھی حیران تھی۔

''اور یہ نظم۔'' پھر عابی ایمان کی طرف تھوڑا سا جھک کر بولا۔ ''آپ کی نذر تھی۔ آپ کی سالگرہ کا تحفہ۔!!''

''یہ تحفہ' یہ نذر' میرے لئے۔؟'' ایمان بے یقین نظروں سے اسے تکتی چلی گئی۔ ''اتنا قیمتی؟ اتنا انمول؟'' شکریے کے طور پر اس کا سر جھک گیا۔ یکا یک ہی وہ ایسے مقام پر آن کھڑی ہوئی تھی جہاں الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ایسے جذبوں میں گھر گئی کہ جنہیں انسان کوئی نام نہیں دے سکتا۔

## 4

حویلی کے اس ہال نما بڑے کمرے میں جہاں ان کی نشست تھی اس کے

عین سامنے والی دیوار پر تین تصویریں آویزاں تھیں۔

درمیان والی خود ان کی اپنی تھی۔ دائیں طرف ان کے بڑے بیٹے کی تھی۔

اور بائیں طرف چھوٹے کی۔

بس یہی دو ان کے چشم و چراغ تھے۔

فوجی وردی میں زید کتنا اسمارٹ اور خوبرو لگ رہا تھا۔ وہ بس زیادہ وقت اسی کو دیکھا کرتے۔ چھوٹے کو دیکھنے کا وقت ہی نہ ملتا۔

اب بھی ان کی نظریں اسی فوجی وردی والے پر جمی تھیں۔ آنسو بہہ بہہ کر رخساروں کو تر کر رہے تھے مگر انہیں کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ ''بابا جان! کل دو بجے تک انشاء اللہ میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' فون پر زید نے خود ان سے بات کی تھی۔ ''پورے دس دن کی چھٹی لی ہے۔ عابی کو بھی بلا لیں۔ بہت عرصہ ہو گیا ہم سب اکٹھے نہیں ہوئے۔ ہیلو! بابا جان سن رہے ہیں آپ۔؟''

''ہاں ہاں بولو۔ لائن پر ہوں۔''

''فرحت اور مدحت بھی ساتھ ہوں گی۔'' خوشی کے مارے زید کی آواز لرز رہی تھی۔

''مدحت تو آپ کے اور اپنے چاچو کے ساتھ اتنے دن گزارنے پر پھولی نہیں سما رہی۔ وہ تو مجھے کہہ رہی ہے' پاپا! دو مہینے کی چھٹیاں ہیں۔ آپ مجھے حویلی میں ہی چھوڑ آئیں۔ میں دادا اور چاچو کے لئے کھانا بنایا کروں گی۔ اب دادی نہیں رہیں تو چاچو کو اور دادا کو کھانا کون کھلاتا ہو گا' دیکھ لیں بابا جان! آپ کی پوتی کو آپ کا کتنا خیال ہے۔''

رحمان علی خاں کے کانوں میں اب بھی زید رحمان کی آواز گونج رہی تھی۔

''اسے کہنا دادا کی جان! اب سے کل دو بجے تک ہم اک اک پل گن کر اس کا انتظار کریں گے۔''

''عابی کو ضرور بالضرور فون کر دیں۔ بہت تاکید ہے بابا جان! بلکہ میرا دل چاہ رہا ہے میں وہاں پہنچوں تو سب سے پہلے مجھے وہی نظر آئے۔ حویلی کے بڑے گیٹ پر میرا انتظار کرتا ہوا۔''



''ابھی کر دیتا ہوں۔ تمہاری کال سے فوراً بعد۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ فرحت اور مدحت سلام کہہ رہی ہیں۔ اللہ حافظ۔'' سوچوں ہی سوچوں میں یہ ساری گفتگو انہیں ازبر ہو چکی تھی۔

''کیسا پیار تھا دونوں بھائیوں میں۔ اور بابا کی جان! آپ نے ہمارا پیار تو آزمایا ہی نہیں۔ ویرانوں میں جاں دے دی۔ ہمارے سامنے ہوتے تو جان قربان کر دیتے آپ پر۔ ہمارے دل میں آپ کی محبت شہنشاہ بابر سے کم تو نہ تھی۔ جو وہ ہمایوں پر سے قربان ہو گیا تھا۔ تو ایسے جذبے ہمارے اندر بھی وافر موجود تھے۔ ان سے کھیلتے تو سہی۔ ان کی گرمی' ان کی حدت کو کٹھالی میں تو ڈالتے۔''

اور عابی بارہ بجے ہی حویلی کے گیٹ پر موجود تھا۔ بھائی کی محبت میں پور پور ڈوبا ہوا' پل پل بعد بابا جان سے پوچھ رہا تھا۔

''دو بجے کا ہی بھائی جان نے کہا تھا نا۔ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔''

دو گھنٹے اس نے سچ مچ گیٹ پر ہی کھڑے گزار دیئے تھے۔ ''انہوں نے یہی کہا تھا' کہ وہ یہاں پہنچیں تو انہیں سب سے پہلے میں ہی نظر آؤں۔ تو بابا جان! ان کی خواہش تھی سر آنکھوں پر اور میری بھی خواہش یہی ہے کہ میں بھی سب سے پہلے' گھر کے دوسرے ہر فرد سے پہلے' ان سے ملوں۔ اور نہ صرف ان سے بلکہ میری آنکھیں تو اپنی مدحو کو دیکھنے کیلئے بھی بڑی بے تاب ہیں۔''

عابی کو آٹھ سالہ مدحت سے بہت پیار تھا۔ وہ آ جاتی تو حویلی میں چاچو بھتیجی ہی ہر طرف ہوتے۔ وہ عابی کے ساتھ ہی اٹھتی' بیٹھتی' کھیلتی' کھاتی' پیتی۔ اک لمحہ کو اس سے جدا نہ ہوتی۔ عابی کی موجودگی میں اسے ماں باپ کا پتہ ہی نہ ہوتا کہ وہ بھی یہاں کہیں ادھر ادھر حویلی میں ہی تھے۔

بھائی اور مدحو کے خیالوں میں گم عابی کھڑا تھا کہ ہارن کی آواز پر چونک پڑا۔ ''بھائی آ گئے۔ بھائی آ گئے۔ بابا جان کو اطلاع کرو۔''

دو تین ملازموں کو اندر اطلاع کرنے کیلئے بھگایا۔ خود بڑی گاڑی پجارو کی طرف بھاگا۔ پیچھے کوئی دوسری بھی تھی۔ دھیان ہی نہیں دیا۔ دوسری گاڑی کونسی تھی اور کیوں تھی؟

''یہ ایمبولینس ہمارے دروازے پر کیوں کھڑی ہے۔؟'' بابا جان نے آ
ہی دور سے دیکھا تو ملازموں سے پوچھنے لگے۔

اور پھر جب آگے بڑھے۔ پتہ چلا تو اگلا قدم اٹھانے کی ان میں سکت
نہ رہی۔ پورے دو بجے زید رحمان حویلی کے گیٹ پر موجود تو تھا لیکن اپنے قدم
کے ساتھ وہ باپ کے سامنے نہیں آ سکا تھا۔ اوپر والے کا حکم یہی تھا۔

دو بندوں نے ایمبولینس سے اس کا جسد خاکی نکال کر چارپائی پہ ڈال
تھا۔ مدحت اپنے چاچو کی گود میں' اس کے کندھے کے ساتھ سر ٹکائے نیم بیہوش
تھی۔ اور فرحت گاڑی میں سے نکل کر بابا جان سے لپٹی کھڑی تھی۔

''بابا جان! صحیح وقت پر ہم پہنچ گئے ہیں نا۔ دیکھ لیں زید ہمیشہ وعدے
وقت کے پابند رہے ہیں۔ کل ایکسرسائیز سے جب اس حالت میں گھر پہنچے ت
میں نے افسران بالا سے ان کے وعدے کی پابندی کی درخواست کی تھی۔ آپ کو
کی وعدے اور وقت کی پابندی کی عادت بڑی پسند تھی نا۔''

''بھائی ہم سے روٹھ گئے ہیں بابا جان!'' عابی زید رحمان کے چہرے
چادر ہٹاتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ ''بھائی میری طرف دیکھیں۔
دو گھنٹے سے یہاں کھڑا ہوں۔ آپ نے خواہش کی تھی کہ یہاں پہنچنے پر سب سے
میں ہی آپ کو نظر آؤں۔ بھائی آنکھیں کھولیں۔ میں آپ کے سامنے ہو
بھائی! میں نے کیا قصور کیا ہے جو آپ مجھ سے روٹھ گئے ہیں چلیں مجھ سے اگر
غلطی سرزد ہو گئی ہے تو بابا جان ہی سے بات کر لیں۔ ان کا تو آپ بہت احترا
کرتے تھے۔''

رحمان علی خان زید کے چہرے پر نظریں جمائے سرہانے کھڑے تھے
فون پہ جو کل ان کی زید سے بات ہوئی تھی۔ اس وقت تو وہ بہت خوش تھا۔ بات
بات قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر نجانے یکایک روٹھنے والی کونسی بات ہو گئی تھی کہ منہ موڑ کر
وادیوں میں جا بسا جہاں ان میں سے کسی کی پہنچ نہیں تھی۔

پھر لاکھ دھاڑیں ماریں۔ اللہ کے واسطے دیئے۔ اس دائمی نیند سو جا
والے کے پاؤں پکڑ پکڑ کر رحمان علی خاں نے منتیں التجائیں کیں' اسے منانا چاہا۔ مگ



روٹھا ہوا کسی بھی طرح مانا ہی نہیں۔

سات سال گزر گئے۔ ان کا اک اک پل اس کی یاد میں کس کرب اور بے
قراری میں گزرا وہ کسی کو بھی بتا نہیں سکتے تھے۔ کہ جن کے ساتھ اپنا یہ دکھ شیئر کرتے
وہ خود اک عظیم صدمے میں مبتلا تھے۔ عابی' فرحت' مدحت۔ اس گھر کا ہر فرد ہنسنا
مسکرانا بھول گیا تھا۔ گھر میں سب موجود بھی ہوتے پھر بھی ہر سو سناٹے پھیلے رہتے۔

''دادا جان! چائے۔'' چودہ سالہ مدحت نے چائے کی پیالی اور بسکٹوں کی
پلیٹ لا کر ان کے پاس تپائی پہ رکھ دی۔

رحمان علی خاں پوتی کی آواز سن کر چونکے۔ ماضی کے دریچوں کو بند کیا۔
اندر ہی اندر اپنے آنسو اتارے' ہونٹوں پر اک مسکراہٹ سجائی اور اس کی طرف متوجہ
ہو گئے۔ خود وہ ان کے قدموں کے پاس فلور کشن پر بیٹھ گئی تھی۔ ''دیکھا ہے آج کتنی
سردی ہے۔؟''

''سردی کہاں دادا کی جان۔'' انہوں نے اک محبت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔
''ہم جب تمہیں دیکھ لیتے ہیں تو گرمی' سردی' خزاں' غرض ہر موسم کا احساس مٹ جاتا
ہے۔ پھر ہمیں اپنے اردگرد بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔''

''دادا جان۔!'' اس نے اپنا خوبصورت بالوں والا سر دادا کے گھٹنوں پر ٹکا
دیا۔ اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

''اپنی ماما کو بھی چائے دی۔؟'' وہ فرحت کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے
لگے تھے۔ ''آپ کے حکم کے مطابق انہیں سب سے پہلے۔ اور......''

وہ مزید کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ فرحت ہاتھ میں پیالی تھامے اندر داخل ہوئی۔
''وہ اس ویک اینڈ پر پھر نہیں آ رہا۔'' لہجے میں کچھ عجیب سا دکھ تھا۔ ان کے پاس ہی
دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں کہہ رہی تھی نا بابا جان! میں تو برباد ہوئی' سو ہوئی۔ مگر آپ اس کی
زندگی کو تو تاراج نہ کریں۔''

''تم ایسا کیوں سوچتی ہو۔ کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔'' اندر سے دل جانتا تھا کہ
فرحت ٹھیک کہہ رہی تھی۔ بس صرف اس کی دلداری کیلئے وہ یہ جملہ بول گئے تھے۔

"ہر ویک اینڈ پر کام۔ ہر ویک اینڈ پر کام۔" مدحت نے دادا کے گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر شکوہ بھرے انداز میں کہا۔ "آخر کاموں کا کتنا بڑا ڈھیر ان کے پاس ہے جو کئی ہفتوں سے کر رہے ہیں مگر وہ ختم ہی ہونے میں نہیں آ رہا۔"

رحمان علی خاں کی نظریں پھر سامنے لگی تصویروں کی سمت اٹھ گئیں اور اب ان کی نگاہ کا مرکز چھوٹے بیٹے کی تصویر تھی۔

"عابی! یہ شاید تم ہم سے انتقام لے رہے ہو۔ مگر بچے! ہم خاندان اور قبیلے کی ریت رواج سے ہٹ کر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہم بے بس تھے۔ بے اختیار تھے۔"

وہ ایک دم ہی انتہا سے زیادہ ڈسٹرب ہو گئے۔

"یہ خاندانی رسم و رواج کی زنجیریں کچھ اتنی مضبوط تھیں کہ ہم توڑ ہی نہیں سکے۔"

"دادا جان! اگر عابی کسی وجہ سے آ نہیں سکتے تو ہم تو ان کے پاس جا سکتے ہیں نا۔؟"

"جا تو سکتے ہیں۔ مگر۔؟" اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ کسی سوچ میں کھو گئے۔ "تو پھر ہم چلتے ہیں۔" مدحت کا انداز ضد کرنے والا تھا۔ "ہیں دادا جان۔؟"

مدحت کو کوئی جواب دیئے بنا' انہوں نے فرحت کی طرف گردن پھیری۔

"میں سوچ رہی ہوں مدحت میٹرک کر لے تو تم دونوں کو اس کے پاس ہی شفٹ کر دیا جائے۔"

فرحت نے بے کلی سے پہلو بدلتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ "سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ ایسا سوچ رہے ہیں۔؟"

"ہاں۔ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔"

"لیکن بابا جان! جو ذمہ داری کسی پر زبردستی ڈال دی جائے یا پھر جس پر ڈالی جائے وہ قبول ہی نہ کرے تو اسے......"

رحمان علی خاں نے ہاتھ بلند کر کے فرحت کی بات کاٹ دی۔ "مدحت ہر طرح اس کی ذمہ داری ہے۔ ہر ناطے سے۔ اس سے بھاگ سکتا ہے کیا۔؟" بات



کرتے کرتے وہ جلال میں آ گئے۔ "اگلے مہینے اس کا میٹرک کا رزلٹ آ رہا ہے۔ کیا اسے آگے تعلیم نہیں دلانی۔؟" وہ سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولتے چلے گئے۔ "اور ہم اپنی بیٹی کو کسی ہوسٹل میں کبھی نہیں رکھیں گے۔ اب تو عابی کو بھی وہیں نوکری مل گئی ہے۔ کب تک دوستوں کے گھروں میں پڑا رہے گا۔ ہم وہاں شہر میں اک گھر خرید لیں گے۔ تم تینوں وہیں رہنا۔"

"اور دادا جان! آپ۔؟ کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے۔؟"

"رہیں گے بیٹا! کیوں نہیں رہیں گے۔ ہم بھلا اپنی جاں کے بغیر رہ سکتے ہیں۔" وفور محبت سے ان کا گلا رندھ سا گیا۔ آنکھیں پھر پانیوں سے بھرنے لگی تھیں۔ نگاہ زید کی تصویر کی طرف اٹھ گئی۔

"اور ہم آپ کے بغیر بھی تو نہیں رہ سکتے۔" بے آواز سی آواز میں انہوں نے یہ جملہ زید رحمان کی نذر کر دیا۔

"ہم آپ کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔ اس حویلی کو بھی بے آباد تو نہیں کر دینا۔" وہ مدحت کو بڑے پیار' بڑی نرمی سے سمجھانے لگے۔ "یہ حویلی آپ کی دادی کو بڑی پسند تھی۔ اسی حویلی میں آپ کے پاپا پیدا ہوئے۔ اسی حویلی میں آپ کے عابی نے جنم لیا۔ اور اسی حویلی کے در و دیوار نے ان دونوں کو ہنستے کھیلتے' کھاتے پیتے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے دیکھا۔"

مدحت بڑے غور سے ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور وہ کھوئے کھوئے سے بولتے چلے جا رہے تھے۔

"اور پھر اسی حویلی کی فضاؤں میں' ہم نے اپنی اس بلبل کو کمرے کمرے میں چہکتے پھرتے دیکھا۔ اور پھر یہیں ہم نے آخری بار......"

اس کے بعد' مدحت نے دیکھا ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ اپنا جملہ مکمل کئے بنا زید رحمان کی تصویر کو تکنے لگے تھے۔ مدحت نے ان کے گھٹنے پر ٹکے ان کے تھر تھر کانپتے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں جکڑ لیا۔ "اور اب ہم اسی حویلی میں......"

وہ نجانے کیا کہنا چاہ رہی تھی کہ کھٹکے کی آواز پر بات ادھوری چھوڑ

دروازے کی جانب دیکھا۔ اک طویل چیخ اس کے ہونٹوں سے نکل گئی۔ اس کی نظریں
جہاں مرکوز ہو کر ساکت سی ہو گئی تھیں' اسی سمت فرحت اور بابا جان نے نگاہیں
اٹھائیں۔ وہاں دروازے میں بازو پھیلائے وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ دونوں ہی کو علم تھا
کہ یہ بازو کس لئے پھیلے تھے۔؟

''ارے عابی! میرے عابی آ گئے۔'' مدحت اپنی جگہ سے اٹھی اور بجلی کی سی
سرعت سے بھاگ کر اس کے بازوؤں میں سما گئی۔

''میں صرف تیرے لئے آیا ہوں۔'' انتہائی گرمجوشی سے اسے سینے سے لگا
لیا۔ پھر اس کا سر چوما۔ اس کی پیشانی چومی۔ بڑی بے اختیاری تھی اس کے پیار میں۔
بابا جان اور فرحت دونوں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ عابی کے پیار کے بعد
مدحو نے اپنے بازو اس کے گلے میں حمائل کر دیئے۔ پھر اس سے زیادہ جوش و خروش
سے وہ اس کے گال چوم رہی تھی۔

''بالکل کوئی پروگرام نہیں تھا۔ بلکہ اجلال سے کہہ کر میں نے فون بھی کرا دیا
تھا کہ اس ویک اینڈ پر نہیں آ سکوں گا۔ پھر اچانک مجھے لگا' میرا بیٹا مجھے پکار رہا ہے۔''

''تو عابی جی! اتنی دور سے بھی آپ میری آواز سن لیتے ہیں۔؟ چہرہ دیکھے
بغیر' دل کی آواز بھی۔؟''

''دیکھ لو۔'' اسے بازو کے گھیرے میں لئے اپنے پہلو کے ساتھ لپٹائے
لپٹائے وہ آگے بڑھا۔ ''سلام علیکم۔'' بابا جان اور فرحت کو مشترکہ سلام کرنے کے بعد
پرلے صوفے پر جا بیٹھا۔ رحمان علی خاں نے اس کے لیے جو بازو پھیلا رکھے تھے' وہ
انہیں یکسر ہی نظر انداز کر گیا۔

''آخر کب تک ناراض رہو گے ہم سے۔؟'' وہ ایک دم ہی بہت افسردہ ہو
گئے۔ نظریں پھر سامنے تصویروں پر جا ٹکیں۔ ان کی آنکھوں میں ہزاروں حسرتیں
تھیں۔ زندگی کے کچھ فیصلوں کی ناکامی اور ان سے جنم لینے والی بدنصیبی کا دکھ تھا۔ اد
بہت سارے ملال تھے۔ کتنی ہی دیر اندر شکست و ریخت کا عمل جاری رہا۔

''عابی! اس بار آپ کا حلیہ کچھ مختلف سا لگ رہا ہے۔؟'' مدحت اس سے
باتیں کیے جا رہی تھی۔ نہ اسے دادا کے اندر اترنے والی دکھوں کا علم تھا اور نہ ماں کے



جذبات کا کوئی خیال کہ وہ خزاں کے کن موسموں میں گھری ہوئی تھی۔ اسے تو بس عابی
کے آ جانے کی خوشی نے بے حال کیا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں تھیں اور آنکھوں
میں انوکھی سی چمک۔

''مختلف کن معنوں میں؟'' وہ بھی صرف اسی میں کھویا ہوا تھا۔

''بہت خوبصورت ہو گئے ہیں۔'' اس کی نظریں اپنے چاچو کے چہرے پر
سے نثار ہو رہی تھیں۔

''اچھا۔ حیرت ہے۔ مجھے کسی اور نے بتایا ہی نہیں۔'' شرارت سے آنکھیں
پھیلائیں اور اس کے جذبے لٹاتے بے حد پیارے چہرے پر مرکوز کر دیں۔''

''کوئی اور بتانے والا وہاں آپ کا کوئی تھا بھلا۔؟'' شکوہ بھرے لہجے میں
بولی۔ ''میرے سوا''۔

''یہ بھی سچ ہے۔ میرا تو سب کچھ یہاں تھا۔ پھر وہاں مجھے کون بتاتا۔؟''
عابی نے بازو کا گھیرا تنگ کر لیا۔ پھر بڑے پیار سے اس کی آنکھوں میں تکنے لگا۔
مدحت اس کے پیار میں ڈوبی ڈوبی قصبے بھر کی چیدہ چیدہ خبریں سنانے لگی۔

''عابی! میری پنچ کلیان بھینس کے ہاں اک بڑی پیاری سی بے بی گرل پیدا ہوئی
ہے۔''

اس خبر نے عابی کو بہت سارے قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ ''بے بی
گرل۔؟''

''سچی عابی! جھوٹ نہیں بول رہی۔ وہ اتنی پیاری ہے۔ اتنی پیاری کہ
بالکل......''

''میری مدحو جیسی۔؟'' وہ ہنستے ہوئے اسے چھیڑنے لگا۔

''اوں۔ ایسی نہیں۔ بالکل کسی شہزادی جیسی۔''

''مجھے تو نہ کوئی پری' نہ شہزادی۔ بس ساری دنیا میں سب سے زیادہ پیاری
اپنی مدحو لگتی ہے۔ تو پھر مدحو جیسی ہی ہوئی نا۔؟''

''جائیں میں نہیں بولتی۔'' اپنے عابی کے بال بگاڑ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''عابی جی! میں نے ٹی۔ وی میں سے اک نئی ڈش بنانا سیکھی ہے۔ اور اب

جا رہی ہوں وہی بنانے۔ صرف اپنے دادا جان کے لیے بناؤں گی۔ آپ کیلئے بالکل نہیں۔'' وہ شریر آنکھیں نچاتی' کھل کھل کر کے ہنستی کچن کی طرف بھاگ گئی۔ اتنے دیر کے عابی آئے ہوئے تھے ابھی تک کسی نے چائے ہی لا کر نہیں دی تھی۔ نوکروں نوکرانیوں کی کمی نہ تھی۔ پھر۔؟ زندگی میں پہلی بار یہ سوال ذہن میں ابھرا تھا۔

''فرحت بیٹے!'' رحمان علی خاں رخ موڑ کر فرحت سے مخاطب ہونے ہی لگے تھے کہ وہیں ٹھٹھک کر چپ سے رہ گئے۔ فرحت وہاں نہیں تھی۔ وہ نجانے کب وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہ تو بس چچا بھتیجی کی باتوں میں ہی کھوئے ہوئے تھے۔ کتنا پیار تھا ان دونوں میں۔ اتنا تو شاید انہوں نے اپنی سگی اولاد سے نہیں کیا تھا۔ ان کے اندر بسنے والے سارے دکھوں کو اک یہ احساس اس طرح مٹا ڈالتا تھا کہ وہ بہت پرسکون اور مطمئن ہو جاتے تھے۔

''عابی جان! میں تمہاری ناراضگی بھی سہہ لوں گا۔ کبھی اس پر گرفت نہیں کروں گا۔ بس تم اس بچی سے ایسے ہی محبت کرتے رہنا۔ ساری حیاتی۔''

جتنی خوشی انہیں بیٹے کے آنے کی ہوئی تھی' فرحت کو وہاں نہ پا کر اس سے کہیں زیادہ دکھ ان کے اندر اتر گئے تھے۔ اک کرب سے انہوں نے آنکھیں میچ کر سر صوفے کی بیک کے ساتھ ٹیک دیا۔ ''ہاں ہم قصور وار ہیں۔ ہم گناہگار ہیں۔ تم دونوں کے ہی۔!!''

بابا جان نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ عابی سمجھا وہ نیند کی جھونک میں تھے۔ ویسے تو وہ جاگ بھی رہے ہوتے تو اس نے کونسا ان کے پاس بیٹھ کر ان کے دکھ سکھ شیئر کرنا تھا۔ علیک سلیک یا خیر خیریت پوچھنے کے علاوہ' اک عرصہ ہوا اس نے ان سے کبھی بات چیت نہیں کی تھی۔ مدحو اس گھر میں نہ ہوتی تو وہ تو شاید اس گھر میں مہینوں سالوں بعد ہی قدم رکھتا یا شاید وہ بھی نہیں۔ حالانکہ یہ اس کا اپنا گھر تھا۔

بابا جان کی بند آنکھوں کو تکتے تکتے ہی وہ چپکے سے اٹھ کر کچن میں مدحت کے پاس چلا گیا۔ دبے دبے قدموں سے گیا تھا۔ پہلے اسے ''ہاؤ'' کر کے ڈرایا۔ اس کے ہاتھ میں پیالی تھی۔ وہ ڈرا کر گرائی۔ تڑوائی۔ پھر اس کے کان میں زور سے بولا۔

''کیا بن رہا ہے؟''



''ابھی بن تو نہیں رہا کچھ بھی' بلکہ بگڑ ہی رہا ہے۔ یہ ٹوٹی ہوئی پیالی دیکھ رہے ہیں۔؟ کتنے ڈھیر سارے اس کے ٹکڑے ہیں۔ یہ ایک کے نہیں ہیں۔ ابھی ابھی ایک عدد پیالی پہلے بھی مجھ سے ٹوٹ چکی ہے۔ اور اب ماما نے میرا سر توڑ دینا ہے۔''

''صرف دو پیالی کے بدلے میں۔؟ نہ بھئی میری مدحو کا سر بہت قیمتی ہے۔ دو پیالی تو اس کی قیمت کچھ بھی نہیں۔ بلکہ ہتک ہے اس کی۔ لہٰذا۔''

عابی نے اک تیسری پیالی بھی اٹھا کر ٹکڑوں کے اس ڈھیر پر پھینک دی۔

''میری مدحو کے سر کی کچھ تو قیمت بنے۔'' وہ چمکیلی چمکیلی آنکھیں اس کے پیارے سے چہرے پر گاڑ کر بولا۔ ''سر تو ٹوٹنا ہی ہے۔'' اسے دیکھتے ہی وہ شریر ہو جایا کرتا تھا۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ ٹکڑے سمیٹتے رہے اور ہنستے رہے۔

''ہائے چاچو! بڑا مزہ آئے گا۔ پوچھیں کیوں۔؟''

''بھتیجی! پوچھنے کی ضرورت ہے کیا۔؟ بول دو خود ہی۔ ہم نے یہ دو کان رکھے کس لیے ہوئے ہیں۔؟ صرف اپنی مدحو کو سننے کیلئے۔''

''دادا نے کہا ہے۔ میرا رزلٹ نکل آئے تو وہاں شہر میں ہی وہ ہمیں شفٹ کر دیں گے۔ آپ کے پاس۔ ہائے! کتنا مزہ آئے گا۔ پھر ہر وقت آپ میرے پاس ہوں گے۔''

پتہ نہیں اس خبر میں کچھ تھا یا پھر عابی کی اپنی غلطی تھی۔ ویسے وہ چونکا بہت زور سے تھا۔ تب پیالی کا اک ٹکڑا عین اس کی ہتھیلی میں کھٹ کر کے پیوست ہو گیا۔ دانتوں پر دانت جما کر اس نے وہ نوکیلا سا ٹکڑا نکال تو لیا پر۔

''آہ۔!'' عابی کے ہونٹوں سے آہ اور زخم سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔

''ارے! یہ زخم کیسے لگ گیا۔؟'' مدحو چیخ پڑی۔ اک بیقراری سے اپنے عابی کا ہاتھ تھام لیا۔

''باہر کے زخم بڑی جلدی نظر آ جاتے ہیں مگر اندر کے گھاؤ۔ کاش! وہ دیکھنے کی صلاحیت انسان میں ہوتی۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

مدحو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چیختی چلاتی' اسے کھینچتے ہوئے واش روم میں لا

گھسی۔ خون قطرہ قطرہ ٹپکے جا رہا تھا۔ مدحو نے ڈیٹول سے زخم دھویا اور پٹی باندھ دی۔

''ابھی ابھی مدحو تم نے بے خبری میں میرے اندر جو زخم لگایا ہے' اس میں سے نکلنے والے خون کے قطرے کون دھوئے گا اور کونسی ڈیٹول لگا کے۔؟''

پھر وہ اسے اس کے کمرے میں لے آئی۔ ''عابی! آپ تھوڑی دیر آرام کریں۔ میں آپ کیلئے چائے بناتی ہوں۔'' اسے زبردستی بیڈ پر لٹا دیا۔ ''میرے آنے تک یہاں سے ہلنا جلنا بالکل نہیں۔''

اسے تاکیدیں کرتے ہوئے وہ واپس کچن کی طرف بھاگی۔

''شہر میں وہ ہمیں شفٹ کر دیں گے۔ آپ کے پاس۔'' عابی کے دماغ میں مدحو کا بولا ہوا جملہ گونجے جا رہا تھا۔ ''بابا جان! آپ میرے لئے ہر وقت اپنے پاس نشتر کیوں رکھتے ہیں۔؟ جب بھی گھر آتا ہوں کوئی نہ کوئی زخم ہی لے کر جاتا ہوں۔'' وہ اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ کسی کل چین نہیں پا رہا تھا۔ ہاتھ کے زخم کا تو اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ بس مدحو کی آواز سماعتوں میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ''شہر میں وہ ہمیں شفٹ کر دیں گے۔ آپ کے پاس۔''

''مدحو! جان! میرا بس چلے تو تمہیں میں اپنے دل کے اندر بسا لوں۔ کبھی اک لمحہ کے لیے اپنے سے جدا نہ کروں۔ لیکن۔ دوسرے لوگ۔ دوسرے لوگ۔''

یکا یک ہی اندر اک ابال سا اٹھا۔ فکر' پریشانی' اضطراب' پورے وجود میں عجیب سی اذیت کی لہریں پھیل گئیں۔ چپکے سے اٹھا۔

''ایک کام یاد آ گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔'' اک چھوٹی سی چٹ میز پر رکھی۔ یہ بھی مدحت کیلئے تھی۔ ورنہ کسی اور کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔

اور وہ کمرے سے ہی نہیں' حویلی سے بھی نکل گیا۔



## 5

''اک نئی خبر سنی ہے تو نے۔؟'' شولڈر بیگ دھڑ سے نیچے پٹخنے کے بعد ماھم نے ایمان آفریدی کے قریب بیٹھتے ہوئے بات شروع کی۔

''ہر نئی یا پرانی خبر' مجھ تک تمہارے ذریعے ہی پہنچتی ہے۔'' ایمان اپنے ہمیشہ والے انداز میں مسکرائی۔ ''آج والی بھی سنا دو۔'' نگاہیں اسی طرح کتاب کے اوراق پر جمی تھیں۔

''نظریں تو میری طرف اٹھاؤ۔ یہ کیا۔؟ بات کرنے کا یہ کیسا نیا انداز نکالا ہے؟'' ماھم نے کتاب جھپٹ کر پرے دھری۔ ''میں یہ لاپرواہی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''کتاب کو تو یوں مت پھینکو۔ کہتے ہیں کتاب کی عزت نہیں کرو گے تو علم بھی حاصل نہیں ہو گا۔'' ایمان کی خوبصورت مسکراہٹ اس کی خوبصورتیوں میں اضافہ کر رہی تھی۔

''بہت حاصل کر لیا۔'' ماھم کا لہجہ طنزیہ تھا۔ وہ کب تعلیم کے حصول کیلئے اتنی کوشاں تھی۔؟ ایمان اسی پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے تکتی رہی۔ نگاہوں میں سوال لئے۔ اور ماھم اس کے کچھ بولے بغیر سمجھ گئی تھی کہ وہ اس نئی خبر کے متعلق استفسار کر رہی تھی۔

''اپنے سر ابرار علوی نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔ اور اب ان کی جگہ کوئی دوسرے سر آ رہے ہیں۔''

ایمان کے لئے واقعی یہ خبر نئی تھی۔ چونکی بھی۔ اندر اک سوچ بھی ابھری۔

''اوہ! یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ ابرار علوی تو کمال کے استاد تھے۔'' وہ بڑبڑائی ''کب سے۔؟'' ماھم سے پوچھا۔

''آج ہی سے بھئی۔ اگلا پیریڈ انہیں کا ہے۔''

''چلو۔ کوئی بھی آ جائے۔'' بظاہر لاپرواہی کا اظہار کیا۔ ''ہمیں کیا۔ پڑھنا ہی ہے نا۔''

ایمان کا یہ لاپرواہی بھرا انداز ماھم کو چونکا گیا۔ قدرے چڑ کر بولی۔ ''اور جناب

صاحبہ !ان کا نام سنا ہے۔؟ کوئی مولوی ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن۔ کہیں برقعہ ہی نہ پہنا دے۔ یا پھر کلاس روم میں پردہ لگوا دے۔ ایک طرف لڑکیاں دوسری طرف لڑکے۔''

ایمان نے اب غور کیا۔ ماہم خاصی پریشان تھی۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''تو پہنا دے برقعہ۔ ڈال دے پردے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔؟''

''ہاں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ناں۔ بچپن سے ہی اتنے ہینڈسم' مالدار اور لائق' فائق شخص کو پھانس رکھا ہے۔ مشکل تو مجھ ایسی لڑکیوں کیلئے ہے۔ صاف بات بھئی! میں تو یونیورسٹی میں داخلہ ہی اس لئے لیا تھا کہ کوئی اچھا رشتہ ہاتھ لگ جائے گا۔ اپنی پسند کے مطابق۔ اور اب یہ مولوی عبدالرحمٰن والی مصیبت آ گئی۔ پتہ نہیں کس کس انداز میں دین کو ہمارے اوپر مسلط کرے گا۔ ہوسکتا ہے ہمارا لڑکوں کے ساتھ بات کرنا بھی بند کر دیا جائے۔''

''ہوسکتا ہے ایسا کچھ بھی نہ ہو۔ تم ابھی سے پریشان کیوں ہوئی جا رہی ہو۔؟'' ایمان اسے تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

''عبدالرحمٰن ہے نام ان کا۔ اور آج تک میں نے جتنے عبدالرحمٰن دیکھے ہیں۔ سب یہ لمبی داڑھی والے اور صوم وصلوۃ کے پابند۔ نمازیں بھی پڑھائیں گے۔ روزے بھی رکھوائیں گے۔'' وہ بہت زیادہ فکر و پریشانی میں مبتلا تھی۔

''نماز روزے کی پابندی کرنا کوئی بری بات ہے۔؟ یہ سب تو ہم پر فرض ہیں۔ اور فرائض سے بھاگنا اللہ کے عذاب کو للکارنے والی بات ہوئی نا۔''

''تو گویا اللہ کا عذاب مولوی عبدالرحمٰن کی صورت میں ہم پر نازل ہونے والا ہے۔'' ایمان کا موقف جانے بغیر ماہم تنک کر بولی۔

اور ماہم کی بات سن کر ایمان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

یہ سب' جو کچھ ایمان کہہ رہی تھی' ماہم بچپن سے سنتی آئی تھی۔ اور ہمیشہ اسلامیات کے پیریڈ میں آدھ پون گھنٹہ اسی موضوع کے متعلق لیکچر بھی اسے ہضم کرنا پڑتا تھا۔ پھر گھر میں بھی دادی اٹھتے بیٹھتے ایسی ہی باتیں سنایا کرتی تھیں۔ وہ تو شکر تھا۔ کہ اس کی ماں بہت ماڈرن تھی اور مذہب کو اس نے کبھی خود پر اور اولاد پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ بلکہ وہ خود اور اس کی ماڈرن ازم ہی سب پر غالب رہتی تھی۔



''اس بحث میں تو بچو! میں کبھی بھی تمہیں جیتنے نہ دوں۔'' ایمان کی ہنسی نے ماہم کو جوش دلا دیا۔ وہ خم ٹھونک کر میدان کارزار میں اتر آئی۔ ''انہیں فرسودہ خیالات اور مذہبی پابندیوں نے تو ہمیں دنیائے ترقی میں اتنا پیچھے پھینک دیا ہے۔''

''مذہبی پابندیوں نے نہیں۔'' ایمان تڑخ اٹھی۔ وہ ماہم کے ساتھ کبھی بحث نہیں کیا کرتی تھی۔ واحد یہی مسئلہ ایسا تھا جو کبھی زیر بحث آ جاتا تو وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ ''بلکہ اسلام کے ارکان اور اصولوں کو ترک کر کے' دوسرے معنوں میں ان کی پابندی نہ کر کے ہم اس حال کو پہنچ گئے ہیں۔ ترقی کی دنیا میں سب سے پیچھے۔''

''تم' چادر اوڑھنے والی لڑکیاں اگر چار دیواری کے اندر ہی رہتیں تو زیادہ بہتر تھا۔ تم تو چاہتی ہو' ان چادروں میں سب کچھ لپیٹ کر' ان سے بہت کچھ ڈھانپ کر......''

''اونہوں۔'' ایمان نے اس کی بات کو قطع کرتے ہوئے اس کی تصحیح کی۔ ''سب کچھ نہیں۔ صرف عورت کی نسوانیت' عورت کی پاکیزگی۔ باقی ترقی کے میدان کھلے ہیں۔ جس طرف چاہیں دوڑ لگا سکتی ہیں۔ بس اک آہنی عزم شرط ہے۔''

''یہ چادر تمہیں دوڑ لگانے دے گی۔؟ پاؤں اس میں الجھیں گے اور اگلے ہی قدم دھڑام زمین پر۔'' ماہم نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

''میں تمہیں یہ دوڑ جیت کر دکھا دوں گی انشاء اللہ۔ اسی چادر میں' اسی مذہب کے تمام ارکان کی پابندی کرتے ہوئے۔'' ایمان کی آواز ایسی پرجوش اور چہرے پر عزم ویقین کی ایسی روشنی تھی کہ ماہم چپ سی ہوگئی۔ اگلی دلیل جو بولنے کے لیے سوچے بیٹھی تھی منہ ہی منہ میں رہ گئی۔ وہ بول ہی نہ سکی۔

اچھا ہوا گھڑی کی طرف نظر چلی گئی تھی۔ ''لو بھئی۔'' وہ جلدی سے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ہم چل کر اپنے مولوی عبدالرحمٰن سے ملاقات کریں۔''

''اور مجھے تو جیسے یہ پیریڈ اٹینڈ ہی نہیں کرنا۔'' ایمان نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

دونوں اکٹھی ہی کلاس روم میں داخل ہوئی تھیں۔ وہاں پہلے سے ہی تمام اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ مگر اپنی اپنی سیٹ پر نہیں۔ تین تین چار چار کے گروپس میں

بٹے ہوئے مختلف جگہوں پر کھڑے تھے اور آپس میں بڑے زور وشور سے باتوں میں مصروف تھے۔

یہ دونوں بھی لڑکیوں کے اک گروپ میں جا شامل ہوئیں۔ موضوع گفتگو مولوی عبدالرحمٰن تھے۔ ہر گروپ کا یہی مسئلہ تھا شاید۔

سر ابرار علوی جس انداز میں پڑھاتے تھے۔ ساری ہی کلاس ان سے بڑی مطمئن تھی۔ اور ایسے عالم میں' جبکہ پہلے سمسٹر کے امتحان سر پر تھے سر ابرار انہیں چھوڑ گئے تھے۔ یہ احساس کئے بغیر۔ لہذا ساری کلاس ہی خاصی پریشان تھی۔ اور وہ تو موجود نہیں تھے گلہ' شکوہ شکایت کس سے کرتے۔؟ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ سبھی نئے آنے والے کے ہی خلاف ہو گئے تھے۔

''یہ مولوی سا ہمیں انگلش کیا پڑھائے گا؟ اسے چاہیے جا کر عربی اور اسلامیات کی کلاسز کو پڑھائے۔''

''پتہ نہیں کس عقل کے اندھے نے ان کی تقرری انگلش ڈیپارٹمنٹ میں کر ڈالی ہے۔''

ہر کوئی ان کے نام ہی کو ہدف بنائے تھا۔ اور اپنے آپ ہی ہر کسی نے قیاس کر لیا تھا کہ وہ مولوی ٹائپ کا بندہ انگریزی تو کسی صورت ہی نہیں پڑھا سکتا تھا۔

''ان کرائے کے مولویوں نے ہمارے مذہب کا غلط سلط پرچار کر کے' اسلام کی ہر آسانی کو مشکل انداز میں پیش کر کر کے لوگوں کو بڑی حد تک مذہب سے خوفزدہ اور بیگانہ بنا چھوڑا ہے۔ اور مزید ان کی جرأت دیکھو۔ اب یونیورسٹی میں بھی ان کا عمل دخل شروع ہو گیا ہے۔ ہمارا رج کے خانہ خراب کریں گے۔''

لڑکیوں میں ماھم سب سے زیادہ پرجوش تھی' ماں کے ماڈرن ازم کی وجہ سے' جو مذہب سے بے بہرہ تھی' مولویوں ہی کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھی۔ اور ایمان آفریدی کو ہمیشہ کی طرح ماھم کا خواہ مخواہ ہی کسی بے قصور کو قصوروار ٹھہرا دینا' سراسر بے انصافی پر محمول لگ رہا تھا۔ بولے بنا رہ نہ سکی۔

''پہلے بیچارے سر عبدالرحمٰن سے مل تو لو۔ ان کا ایک آدھ لیکچر سن تو لو' پھر کوئی فیصلہ بھی سنا دینا۔''



''نہیں ایمان! ماھم ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن بھلا ایم۔ اے کی کلاس کو انگلش کیا پڑھائیں گے۔ یقیناً پرنسپل صاحب کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔'' آصفہ صدیق ماھم کی تائید میں بولی۔

''جس طرح ہمارے ملک کی وزارتوں میں ہوتا ہے۔ تعلیم کسی دوسرے شعبے کی ہوتی ہے۔ متعین دوسرے میں کر دیئے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ کوئی ایسا ہی سفارشی ہو گا۔'' نائلہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''سفارش بھی بہت بڑی۔ اتنی بڑی کہ انگلش کی سیٹ خالی تھی۔ مولوی عبدالرحمٰن کی عربی یا اسلامیات کیلئے درخواست آئی۔ اٹھا انہیں کی تقرری کر دی۔ کسی بڑے بندے کو ممنوں کرنا ہو گا ناں۔'' آزاد ملک کے باشندے' آزادانہ اپنی اپنی رائے کا اظہار کئے جا رہے تھے۔ کیا لڑکے کیا لڑکیاں۔

''ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔'' آخر کار عاتکہ علی کا خیال ساری کلاس میں گردش کر گیا اور سبھی اس پر متفق بھی ہو گئے۔ ''ہاں ایسا ہی ہوا ہو گا۔ بڑی سفارش کام کر گئی۔''

''کام کیا کر گئی۔ ہمارا بیڑا غرق کر گئی۔''

''سر عبدالرحمٰن کی کلاس کا۔'' ضیاء خاں نے نعرہ بلند کیا۔

''بائیکاٹ کرو۔'' تقریباً آدھی کلاس نے جواب دے کر نعرہ مکمل کر دیا۔

''مولوی سے انگلش'' فی البدیہہ نعرے ایجاد کئے جا رہے تھے۔ ''نہیں پڑھیں گے۔''

''عبدالرحمٰن۔''

''عربی کے ڈیپارٹمنٹ میں جاؤ۔''

کچھ شرارت کر رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ تھے۔ نعرے بازی عروج پر تھی۔ جیسے کوئی فیکٹری لگی تھی۔ ڈھل ڈھل کر نعرے نکلے آ رہے تھے۔ بہت شور وغل مچا تھا۔ لڑکیاں ایک سائیڈ پر کھڑی ہنسے جا رہی تھیں۔ غرض سبھی سٹوڈنٹس سر مولوی عبدالرحمٰن کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔

نبیل مقصود تیزی سے کلاس روم میں داخل ہوا۔ ''شی۔ شی۔ سنو۔ خاموش ہو جاؤ۔''

بڑی مشکل سے اس کی پکار سب نے سنی۔ کلاس روم میں سکوت چھا گیا۔
''آج سر عبدالرحمٰن کلاس نہیں لے رہے۔''
''لو بھئی پہلے ہی روز چھٹی۔ لیکچر تیار نہیں ہوا ہو گا ناں۔''
''کسی ختم قرآن کی محفل سے بلاوا آ گیا ہو گا اور مولوی صاحب حلوے مانڈے کھانے چل دیئے ہوں گے۔''
جو کوئی کچھ نہ کچھ کہتا جا رہا تھا۔ لیکن سب بہت خوش تھے۔ دو منٹ میں کلاس روم خالی ہو گیا۔ بٹیرے کی طرح چھٹی ہاتھ لگ گئی تھی۔

## 6

ایمان آفریدی کے بے حد حسین چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ کچھ بکھری بکھری اور جھنجلائی ہوئی بھی تھی۔ اس کے برعکس ماھم کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔
''اس دن بھی تم نے مجھے ٹیسٹ کی تیاری نہیں کرنے دی۔ کتنے کم نمبر آئے تھے میرے۔ اور آج پھر تم مجھے کھینچ لائی ہو۔ یونیورسٹی میں میرا کوئی چاچا ماما نہیں بیٹھا ہوا کہ پرچے میں کچھ بھی نہ لکھوں گی' تب بھی وہ مجھے ڈھیر سارے مارکس سے نواز دیں گے۔''
وہ مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھی۔ آف موڈ مزید آف ہوا جا رہا تھا۔ ''پر میں بھی کیا کروں۔ میں اکیلی شاپنگ نہیں کر سکتی۔'' ماھم نے اس کی پرابلم نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی اور انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ خود غرضی پر آمادہ تھی۔ ''اور کل مومو کی سالگرہ ہے۔'' مزید انکشاف کیا۔
''تو کسی اور کو ساتھ لے لیا کرو۔ بس میں کہہ رہی ہوں پلیز! میرے حال پر کچھ رحم کرو۔ اپنے گھر اور گھر والوں کو چھوڑ کر یہاں ہوسٹل میں بیٹھی ہوں۔ پڑھ بھی نہ پائی' کچھ حاصل بھی نہ کر پائی تو کیا فائدہ ان جدائیوں کا' ان قربانیوں کا۔''
''تمہارے بغیر مجھے مزہ نہیں آتا ناں۔ کیا کروں۔؟'' اب ماھم کے چہرے



پر بیچارگی سی پھیل گئی تھی۔ اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار کر دیا۔ نجانے کیسے اور کیونکر وہ اس کی محبت میں اس قدر گرفتار ہو گئی تھی کہ اس کے کچھ اختیار میں ہی نہیں رہا تھا۔ ماھم ایمان کے تمتمائے ہوئے حسین چہرے کو غور سے تکتے تکتے اپنے دل کا حال بڑے رساں سے بیان کر گئی تو وہ بے شمار شرمندگیوں میں ڈوب گئی۔
ابھی دو تین ہفتے پہلے ہی کی تو بات تھی کتنے خلوص اور محبت سے ماھم نے اس کی سالگرہ منائی تھی۔ پھر اسے عابی کی وہ نظم یاد آ گئی۔ وہ کتنا پیارا تحفہ تھا اس کیلئے۔ ہر وقت اس کے کانوں میں وہ اشعار اور عابی کا مترنم لہجہ گونجتا رہتا تھا۔ اس کی زندگی کی تمام سالگرہوں میں سے وہ بہترین سالگرہ تھی۔ اور آج تک اسے ملنے والے تمام تحفوں میں سے بہترین تحفہ اس کیلئے وہ نظم تھی۔ اور یہ سب ماھم ہی کی وجہ سے تو تھا۔
یادوں کی اس خوشگوار سی بوچھاڑ نے ایمان کی اس جھنجلاہٹ' غصے اور الجھن کو یکایک دھو کر صاف شفاف کر دیا۔ آف موڈ بحال ہوا اور چہرے پر مسکراہٹیں چھم چھم ناچنے لگیں۔ ''اچھا ناں۔ رونے والی کیوں ہو گئی ہو۔ آ تو گئی ہوں تمہارے ساتھ اور آئندہ بھی ہمیشہ آتی ہی رہوں گی۔''
ایمان کو مسکراتے دیکھ کر ماھم نہال سی ہو گئی۔ ''شکریہ۔''
کتنی ڈھیر ساری دیر لگا کر ماھم نے مومو کیلئے اک بڑی خوبصورت سی گڑیا پسند کی۔ ایمان نے بیزاری کا اک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ موڈ کو خوشگوار ہی رکھا۔ پھر ماھم کو خیال آ گیا۔ ماما نے چلتے ہوئے اپنی بلڈ پریشر کی گولیاں لانے کو اسے کہا تھا۔
''وہ سامنے میڈیکل سٹور ہے۔ ماما کی بلڈ پریشر کی دوا۔''
''ہاں ہاں چلو۔ مجھے بھی سر درد کی گولیاں لینی ہیں۔'' عابی کے معاملے میں ایمان نے ماھم کو پوری پوری اپنی محسن مان لیا تھا۔ اور وہ احسان فراموش نہیں تھی۔
''سر میں بہت درد ہے۔''
''میری وجہ سے۔؟'' ماھم گلٹی فیل کر رہی تھی۔
''ہاں۔ تمہاری وجہ سے۔'' ایمان آفریدی شرارت سے مسکرائی۔ حالانکہ

ماھم اکثر اس کی ٹینشن بڑھانے کا نہیں بلکہ دور کرنے کا ہی سبب بنتی تھی۔ بہت سارے واقعات اسے یاد آ گئے۔ لیکن شرارت تو شرارت تھی۔

بڑے کھلے دل سے ماھم نے یہ الزام قبول کر لیا۔ ''چلو پھر آئس کریم کھلا دیتی ہوں۔ پھر تو سر درد بھاگ جائے گی نا۔''

ایمان ہنس پڑی۔ ''اچھا پہلے جو دوا خریدنی ہے وہ کام تو نبیڑو۔ اور پھر۔'' پھر یکا یک ایمان کو یاد آ گیا۔ بھائی کیلئے ''مسنگ یو'' کا کارڈ بھی خریدنا تھا۔ کتنا پیارا اس نے اسے کارڈ اور گفٹ بھیجا تھا۔

وہاں ریسٹورنٹ میں سالگرہ منانے کے بعد جب وہ ہوسٹل واپس آئی تھی تو بیڈ پر تین چار پیکٹس پڑے ہوئے تھے۔ ماھم بھی ساتھ تھی۔ چیخ مار کر ان کی طرف لپکی تھی۔ پھر ایمان کی اجازت کے بغیر ہی وہ پیکٹس کھولنے لگی۔

سب اس کی سالگرہ کے تحائف تھے۔ پھوپھو کی طرف سے بھی۔ ایمان اور ارسل کی طرف سے بھی۔ کچھ کارڈز بھی تھے۔

''ہمایوں کی طرف سے کچھ نہیں۔؟'' ماھم اک اک تحفہ اور کارڈ دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''اچھا ہے نا۔ مجھے یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے۔ بس ٹھیک ہے منگنی ہو گئی' ہو گئی۔ بڑوں نے کر دی۔ میں نے تسلیم کر لی۔ بس کیا یہ ضروری ہے' تحفے تحائف بھیج کر' خط وغیرہ لکھ کر' منگنی کو عشق و عاشقی کا روپ دیا جائے۔؟''

''اک میں نے تمہیں ہی دیکھا ہے' اتنے وجیہہ وشکیل اور لائق فائق منگیتر کے ہوتے ہوئے' جوانی کے دن اور راتیں اس قدر بے کیف گزار رہی ہو۔ ارے! اس کے خواب سجاؤ آنکھوں میں' اس سے فون پر لمبی لمبی کالیں کر کے من بہلاؤ' دل میں اس کی محبت کے پھول کھلاؤ' اپنے اردگرد دھنک رنگ بکھیرو' مستیوں میں ڈوبو۔''

''اچھا بس نا۔'' ایمان نے اسے ٹوک دیا۔ ''مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ ان فضولیات کا میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''اور وہ جو نظم سننے بیٹھ گئی تھیں۔ تین بار تم نے اس سے وہ نظم سنی تھی۔ تب وقت نہیں ضائع ہو رہا تھا۔؟''



''ہاں سچ ماھم! تم نے غور کیا۔ اس کی آنکھوں میں کیسی اداسی سی ہوتی ہے۔ ویسا ہی پرسوز سا ترنم اس کی آواز میں تھا۔''

''آنکھوں کی اداسی کا تو مجھے پتہ نہیں۔ وہاں تم ہی گھسی ہو گی۔ البتہ وہ نظم بڑی مزے کی تھی اور اس کا لب ولہجہ بھی بڑا دلکش تھا۔ وہ میں جانتی ہوں۔''

''ماھم! تم اپنی سالگرہ بھی اسی طرح مناتا۔ اس سے پھر وہی نظم سنیں گے۔''

''کیا پتہ میری سالگرہ پر اتنا ڈوب کر وہ سنا ہی نہ سکے۔ یہ تو جذبوں کی بات ہے۔ اور ہر کسی کے لئے ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے ہر کسی کے جذبات۔'' ماھم ایک آنکھ دبا کر شرارت سے مسکرائی۔

ایمان آفریدی بری طرح بلش ہو گئی۔ ''اب تم کمینگی پہ اتر آئی ہو۔ کم از کم میرے لئے تمہیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ میں انگیجڈ ہوں۔''

''تم ہو نا انگیجڈ۔ وہ تو نہیں ہے شاید۔ اور تم خوبصورت بھی ہو' اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر رہی ہو۔ دیکھنے سے' گفتگو سے' ناز و انداز سے' تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا ہے۔ پھر تمہارے لئے اس کے جذبات......''

''بس۔ بس۔ پلیز! مزید اک لفظ نہیں کہنا۔'' ایمان نے اپنا لرزتا' کپکپاتا ہاتھ ماھم کے ہونٹوں پہ رکھ دیا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ لالیاں اتر آئی تھیں۔

دونوں میڈیکل سٹور پہ کھڑی تھیں۔ دوائیں شوائیں لینا بھولی ہوئی تھیں۔ عابی کو ڈسکس کئے جا رہی تھیں۔ اس کے جذبات کے متعلق رائے زنی ہو رہی تھی۔

''یار! جلدی سے یہ دوائیاں پیک کر دو۔'' دونوں کی سماعتوں میں اکٹھا ہی یہ جملہ اترا۔ آواز بڑی مانوس تھی۔ ایمان نے تو دھیان نہیں دیا۔ وہ ماھم کی گفتگو میں کچھ ایسی الجھ گئی تھی کہ اردگرد کی آوازیں سن بھی رہی تھی پر کچھ سمجھنے سے قاصر بھی تھی۔

''یہ کس کی آواز ہے۔؟'' ماھم البتہ چونک کر بڑبڑا اٹھی۔ پھر جلدی سے مڑی۔ کاؤنٹر کے آخر سرے پر اجلال حیدر کھڑا تھا۔ ان دونوں کی طرف پشت تھی اور کاؤنٹر پہ بازو رکھے' انگلی سے ٹھک ٹھک بجا رہا تھا۔

''جلدی۔ جلدی۔'' اس کی آواز میں' اس کے لہجے میں' اس کی حرکات میں

اضطرابی سی کیفیت تھی۔

''اجلال حیدر۔'' ماھم اک بے تابی سے اسے پکار اٹھی۔ پھر تیزی سے قدم اٹھاتی اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

''اوہ! اسلام علیکم۔'' ماھم کو دیکھتے ہی اجلال کے چہرے پر سے اضطرابی کیفیت معدوم ہوئی اور ایک خوشگوار سی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''وعلیکم اسلام۔ کیا بات ہے۔؟ آپ کسی جلدی میں ہیں شاید۔''

''ہاں۔ ہاں۔ وہ اپنا عابی ہے نا۔ بہت بیمار ہے۔''

اتنی دیر میں ایمان بھی پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ غیر اختیاری طور پر ہی' اک نمایاں سی بے تابی کے ساتھ وہ پوچھنے لگی۔ ''کیا ہوا انہیں۔؟ کیا بیمار ہو گئے؟''

''بخار ہے بہت۔'' مختصر سا جواب دیتے ہوئے اجلال پھر سیلز مین سے مخاطب ہو گیا۔ ''جلدی کرو بھائی! مریض کی دوا کا وقت ہو چکا ہے۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت ہے دوا وقت پر دی جائے۔''

''بخار کیوں ہو گیا آخر۔؟'' ایمان نے بڑے تردد سے پوچھا۔ چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔

''ایمان سے اسے میں نے بخار نہیں چڑھایا'' اس کا متفکر چہرہ عجیب ویران سی لک دے رہا تھا۔ اجلال حیدر پریشانی کے عالم میں بھی شرارت سے باز نہیں آیا تو ماھم بے اختیار ہنس پڑی۔

تب ایمان کو ہوش آ گیا۔ جلدی سے خود کو سنبھالا۔ چہرے کے تاثرات بحال کئے اور ماھم سے مخاطب ہو گئی۔ ''مجھے بھی سر درد کی دوا لینا تھی۔'' پھر ماھم کی پسلی میں کہنی سے ٹھوکا دیا۔ ''تمہیں بھی تو ماما کی بلڈ پریشر کی دوا......''

''ہاں ہاں۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ تم ہٹو ادھر میں لیتی ہوں۔'' پھر وہ بھی دوکاندار کی طرف متوجہ ہو گئی تو ایمان کاؤنٹر چھوڑ کر پرلی طرف چلی گئی۔

اجلال حیدر دوائیوں کی خریداری کے بعد کاؤنٹر سے پرے ہٹ کر ایمان کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ ''عابی ویک اینڈ پہ اپنے گھر گیا ہوا تھا وہیں اس کے ہاتھ کی ہتھیلی میں ٹوٹی ہوئی پیالی کی کرچیاں چبھ گئیں۔ اس نے زخم کی پرواہ ہی نہیں کی۔ وہ



سیپٹک ہو گیا۔ بس پھر بخار تو آنا ہی تھا۔ زخم کب لاپرواہی کو معاف کرتا ہے۔''

اجلال کے تفصیل بتاتے بتاتے ماھم بھی دوائیاں لے کر ان دونوں کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا ماھم نے بھی سنا۔ ''چچ چچ۔ ہائے بیچارا ہمارا شاعر' ہمارا مغنی۔'' وہ بہت اپنایت اور خلوص سے بولی۔ ''ہم ابھی ابھی انہیں ہی یاد کر رہی تھیں۔ اس دن کتنی اچھی' کتنی پیاری نظم سنائی تھی۔'' ایمان خاموش کھڑی تھی۔ ماھم نے جیسے اسے خراج تحسین پیش کیا۔

''میں اس کے پاس ہی جا رہا ہوں۔ چلیں گی آپ بھی۔ قریب ہی ہمارا فلیٹ ہے۔''

ایمان اور ماھم ایک دوسرے کی طرف مشورہ کرنے والے انداز میں تکنے لگیں۔ ''کہتے ہیں کسی کی عیادت کرنے سے بڑا ثواب ہوتا ہے۔'' اجلال حیدر کا شاید اپنا جی چاہ رہا تھا انہیں شرف مہمانی بخشنے کو۔

''میں ان ثوابوں وغیرہ کو تو نہیں مانتی۔ البتہ بحیثیت انسان کے بیماری سیماری میں پوچھنا تو ضرور چاہیے۔ اور ان سے تو ویسے بھی اچھی خاصی میل ملاقات ہے۔ ایمان! چلیں۔؟''

جس طرح ماھم نے اپنی رائے کا کھلم کھلا اظہار کر دیا تھا اس طرح صاف صاف ایمان کچھ نہیں کہہ سکی۔ بس سر جھکا کر رہ گئی۔ حالانکہ وہ ماھم سے بھی کچھ زیادہ ہی اس کے لیے دل میں سافٹ کارنر رکھتی تھی۔

ایمان نے کوئی جواب نہیں دیا تو ماھم نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ ''چلتے ہیں جی۔ اپنے پیارے سے بیمار کا حال چال پوچھ آئیں۔ اس دن میری دوست کی سالگرہ اتنی پررونق بنا دی تھی۔ میں اس کی احسان مند ہوں۔''

اور دل ہی دل میں ایمان آفریدی اس کی احسان مند ہو گئی کہ اس نے اس کی پسند کا فیصلہ کر دیا تھا۔ تینوں اکٹھے ہی دکان سے باہر نکلے۔ اجلال حیدر نے اپنی بائیک سٹارٹ کی اور ماھم نے گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔

اجلال حیدر ان دونوں کے ساتھ عابی کے کمرے میں داخل ہوا۔ بہت خوش خوش جیسے کوئی انوکھا سا کارنامہ سرانجام دے کر آیا تھا۔ مگر۔ یہ خوشی اس کے نصیب

میں نہ تھی۔ عابی اک گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر نے اسے جگانے سے منع
دیا تھا۔

ماھم کا تو علم نہیں' اس نے کیا محسوس کیا تھا۔ لیکن ایمان بڑی افسردہ سی ہو
تھی۔ کتنی ہی دیر دونوں اس کے بیڈ کے پاس کھڑی اسے تکتی رہیں۔ جس ہاتھ میں
بندھی ہوئی تھی وہ اس نے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ بخار
شاید۔ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ جتنی بار وہ اس سے ملی تھیں' انہوں
دیکھا تھا کہ وہ بال بڑے سنوار کر رکھتا تھا۔ مگر اس وقت پیشانی پر بکھرے ہوئے
جو کہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔

''میرا خیال ہے انہیں اس دن ہماری نظر لگ گئی۔ انہوں نے نظم بڑ
خوبصورت ترنم کے ساتھ سنائی تھی۔'' ماھم نے اسے یوں پڑے دیکھ کر افسردہ
لہجے میں کہا۔ ''نہیں نہیں۔ نظر کیوں لگ گئی۔ نظر تو بدخواہ کی لگا کرتی ہے۔ اور آ
یقیناً ان کی بدخواہ نہیں بلکہ بہی خواہ ہوں گی۔'' اجلال حیدر نے ان دونوں کی تشو
افسردگی اور اس کے لیے فکرمندی محسوس کرتے ہوئے جیسے انکا دل رکھنے کی کوشش ک
یوں بھی مہمان تھیں وہ دونوں۔ اور خصوصاً ماھم سے تو اس کی اچھی خا
دوستی اسی دن ہو گئی تھی۔ اور۔ اور۔ نہ صرف دوستی ہی' اجلال حیدر کو یہ جھگڑالو
تکلف اور مخلص سی لڑکی پہلے دن سے دل کے بہت قریب محسوس ہونے لگی تھی۔
اسے رنجیدہ' افسردہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔

''چلیں دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ اک چائے کی پیالی پ
گفتگو وغیرہ کرتے ہیں۔'' آہستہ آہستہ دھیمی دھیمی آواز اور لب و لہجے میں وہ
سے ہی مخاطب تھا۔ اندر کہیں یہ بھی خیال تھا۔ عابی ڈسٹرب نہ ہو جائے۔ پچھلی را
بھی اس نے بڑی تکلیف میں کاٹی تھی۔

''چلیں۔'' ماھم راضی ہو گئی تھی لیکن ایمان کا دل بے ایمانی پر آمادہ
ابھی وہاں سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ اس بیمار پر بڑا ترس آ رہا تھا۔
پہلے اس کی آنکھوں کی اداسی نے ایمان کو اٹریکٹ کیا تھا آج اس کی
بسی اور بے چارگی نے اس کے اندر حزن و ملال سا بھر دیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا وہ



رک جائے۔ پھر اس کی تیمارداری کرے۔ اس کی خدمت کرے۔ وہ اس کا کچھ نہیں
تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے اس کی سالگرہ میں وہ ''نظم'' بطور تحفہ دی تھی۔ اور اب وہ اس
تحفے کا ریٹرن اسے دینا چاہتی تھی۔ اس کی تیمارداری اور خدمت کر کے۔

وہ اپنی ہستی' اپنے وجود میں عجیب سی کشش رکھتا تھا۔ اور ایمان کھڑی ایک
ٹک اسے تکے جا رہی تھی۔

''چلو نا۔'' آج ماھم کو بھی اسے کہنی کا ٹھوکا دینے کا موقع مل گیا تھا۔

''اوہ چلو۔ میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔'' گڑبڑا کر سٹپٹا کر وہ ہولے ہولے
بڑبڑاتی ہوئی اس کے ساتھ قدم اٹھاتی اجلال حیدر کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں
جا پہنچی۔ مگر اب۔ یہاں بیٹھنے کا مقصد ہی کیا تھا۔ جس کے لیے وہ آئی تھیں وہ مقصد تو
پورا ہی نہیں ہوا تھا۔ مایوسی ایمان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

''ماہم! میرا خیال ہے اب چلیں۔ چائے پھر کبھی سہی۔ میرے سر کا درد۔''

''ہاں ہاں۔'' ماھم چونکی۔ اسے بھی احساس ہو گیا تھا۔ کچھ اس کے درد کا۔
کچھ کافی دیر ہو گئی تھی گھر سے نکلے ہوئے۔ ماما پریشان ہوں گی۔

''بائے بائے اجلال! پھر آئیں گی۔''

''کب۔؟'' اجلال حیدر کے کب میں اک نمایاں بے قراری تھی۔ ماھم
نے تو محسوس نہیں کیا البتہ ایمان مسکرا دی۔ اجلال حیدر نے اس کی معنی خیز مسکراہٹ
دیکھ لی تھی۔ جلدی سے صفائی پیش کرنے لگا۔

''میرا مطلب تھا عابی......''

''ہاں ہاں انہیں کے لیے۔ ان کی بیماری کے دوران ہی آئیں گی۔'' اس
کی بات سمجھے بغیر ماھم معمول کی بے تکلفی کے ساتھ اک پرامید سا وعدہ کرتے ہوئے
ایمان کا بازو تھام کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

## 7

ہمایوں خان کی دو ہی تو خواہشات تھیں۔ ایک زندگی بھر کیلئے ایمان آفریدی کی

سنگت' بطور بیوی کے۔ اور دوسری کچھ وقت' زندگی کے چند سالوں کیلئے امریکہ کی رہائش۔

زندگی ایک بار ہی ملتی ہے۔ اور وہ اسے پوری طرح انجوائے کرنا چاہتا تھا۔

اور اس کے خیال میں' بلکہ اسے یقین تھا کہ یہ انجوائے منٹ صرف اور صرف امریکہ ہی میں رہنے سے ملے گی اور اس کی گھریلو زندگی کی خوشیاں صرف ایمان آفریدی کے دم سے ہی حاصل ہو سکتی تھیں۔

ایمان آفریدی بچپن سے ہی اس کے ساتھ وابستہ کر دی گئی تھی۔ اس کی طرف سے تو وہ مطمئن تھا۔ کہ ان کے خاندان میں بچپن کی منگنی کو اک قسم کا شادی ہی کا درجہ دیا جاتا تھا۔ لڑکی اپنے منگیتر کی اس طرح پابند ہوتی تھی کہ وہ مر تو سکتی تھی اگر منگیتر سے شادی نہ کرنا چاہے تو لیکن منگنی توڑ دینے کا تصور کبھی نہیں کر سکتی تھی۔

رہا امریکہ میں رہائش پذیر ہونے کا سوال تو اس کیلئے وہ رات دن تگ و دو میں مصروف تھا۔ اس نے اپنا کمپیوٹر کورس مکمل کر لیا تھا۔

''کب آؤ گے۔؟ اپنی واپسی کی تاریخ سے فوراً مطلع کرو۔'' پاپا اور ماما کو کمپیوٹر کورس پاس کرنے کی اس نے اطلاع دے دی تھی۔ اور اب ان کے خطوط فیکس اور ای میل برابر پہنچ رہے تھے۔

کیا پتہ پاپا کب اس کو خرچ بھیجنا بند کر دیں۔ اس خیال سے اس نے اک شوروم میں ملازمت بھی کر لی تھی۔ اور گھر میں اپنی ملازمت کے متعلق بالکل نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے تو طوفان کھڑا کر دینا تھا۔ ایک اکلوتی اولاد' وہ بھی ان سے اتنی دور' ہزاروں میل کے فاصلے پر جا بسے۔ خصوصاً اس کی ماما کو تو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا۔

ہمایوں خان بہت پریشان تھا آجکل۔ ''اب بتاؤ نا تم۔ میں کیا کروں۔؟'' توفیق کے سامنے اس نے سب کچھ کھول کر بیان کر دیا تھا۔ اپنا مدعا' اپنی خواہشات اور اپنی تمنائیں سب کچھ ہی بڑی تفصیل سے اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔

''بہت مشکل مسئلہ ہے۔ بہرحال حل تو کرنا ہے۔'' توفیق کتنی ہی دیر سوچوں میں کھویا رہا۔

''ویسے ایک بات کا مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے۔'' ہمایوں یکا یک مسرور سے انداز میں بولا۔ ''ایک چکر پاکستان کا لگا آؤں۔ پندرہ بیس دنوں کیلئے۔ ماما پاپا



بھی خوش ہو جائیں گے اور باقی ساری فیملی بھی مطمئن۔'' اپنی اس سوچ پر اک فخر سا محسوس کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''ساری زندگی جس کا ساتھ چاہتا ہوں اسے بھی تو اطمینان حاصل ہونا چاہیے کہ یہ بندہ جہاں بھی رہے' بس اسی کا رہے گا۔''

''محبت ہو گئی ہے اس سے۔؟'' توفیق نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

''محبت ہو گئی ہوتی تو یہ سارے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ واپس نہ چلا گیا ہوتا۔؟'' ہمایوں نے اسے اچھی طرح سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ بہت خوبیوں کی مالک ہے۔ بہت حسین ہے۔ ہمارے خاندان کی نمبرون لڑکی ہے۔ اس لئے میں اپنے بچوں کی ماں اسے ہی بناؤں گا۔ دوستیاں یہاں امریکہ کی لڑکیوں سے ہی لگاؤں گا اور میری شریک حیات بس وہی ہو گی۔ صرف وہ۔ زندگی کو پوری طرح انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔''

''بڑے لالچی ہو۔''

''لالچ کہہ لو یا عقلمندی کہہ لو۔''

''ایک بات بتا دوں۔ تم پاکستان چلے گئے تو پھر امریکہ نہیں آ سکو گے۔''

''کیا مطلب۔؟'' ہمایوں چونکا۔ ساری سرشاری رخصت ہو گئی۔

''اس وقت تم تعلیم کے ویزے پر آئے ہوئے ہو' دوبارہ کیسے آؤ گے۔؟ تمہارے پاس گرین کارڈ نہیں ہے۔''

''اوہ۔!'' اس کے چہرے پر مایوسی کا تاریک سا سایہ لہرا گیا۔ ''میں نے تو سوچا تھا والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ انہیں مل لوں گا تو وہ خوش ہو جائیں گے اور پھر مجھے مزید یہاں ایک دو سال رہنے کی اجازت بھی دے دیں گے۔ خوشی خوشی۔'' وہ بڑی افسردگی سے توفیق کو تک رہا تھا۔ ''اور میں نے تو یہاں تک سوچ رکھا تھا کہ شادی کے بعد بھی رہوں گا پاکستان میں ہی' البتہ زندگی انجوائے کرنے کیلئے ہر دوسرے تیسرے سال چار چھ مہینے کا چکر یہاں کا لگا لیا کروں گا۔''

''اتنی انجوائے منٹ۔؟ اتنے لمبے پلان صرف ایک زندگی کیلئے۔؟؟'' توفیق نے دو تین قہقہے لگائے۔ ''اگر اتنی زیادہ انجوائے منٹ چاہتے تھے تو اس کیلئے خدا سے تین چار زندگیاں مانگ لانا تھیں۔''

''یار! تم تو مذاق اڑانے لگے۔ اچھے دوست ہو۔؟'' ہمایوں کے وجیہہ چہرے کو یاس کے بدنما رنگوں نے دھندلا سا دیا تھا۔ ''خود تو دوسرے سال پاکستان پہنچے ہوتے ہو۔ پھر تمہاری واپسی بھی ہو جاتی ہے۔''

''میرے پاس گرین کارڈ ہے۔ پچھلے پندرہ سالوں سے یہاں ہوں۔''

''یعنی مجھے بھی اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے گرین کارڈ حاصل کرنا ہوگا۔ اور گرین کارڈ حاصل کرنے کیلئے دس پندرہ سال یہاں گزارنا ہوں گے۔؟''

توفیق اس کی پریشانی سے خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔ ''ہاں۔ کچھ حاصل کرنے کیلئے کچھ پے ضرور کرنا پڑتا ہے اور تم تو میری جان پوری زندگی کی انجوائے منٹ کیلئے پلان بنائے بیٹھے ہو۔''

ہمایوں چپ کا چپ رہ گیا۔ اس نے خاص طور پر توفیق کو فون کر کے بلایا تھا کہ وہ اس کا مسئلہ ضرور بالضرور حل کر دے گا۔ دونوں تنہائی میں بیٹھ کر سوچیں گے۔ توفیق سے اس نے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اکثر پاکستان سے آئے ہوئے ناپختہ ذہن رکھنے والوں اور ناتجربہ کاروں کو وہ اپنے تجربے کی بنا پر کوئی نہ کوئی مفید مشورہ دے ڈالتا تھا۔

مگر اتنے بحث مباحثے کے بعد وہ اسے کوئی حل نہ بتا سکا تو مایوسی اور پریشانی نے ہمایوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تب ایسے موڈ میں وہ ضرور کچھ نہ کچھ پیا کرتا تھا۔ تھکے تھکے انداز میں اٹھا۔ توفیق اس کا مہمان بھی تھا۔ اس کی بھی تواضع کرنا تھی۔ دو ڈرنکس بنا کر لے آیا۔ اپارٹمنٹ میں وہ ہر قسم کی تواضع کا سامان ہمیشہ موجود رکھتا تھا۔

''یہ کیا۔؟'' توفیق نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''یہ کونسا وقت ہے پینے کا۔؟''

''یار! مجھے اس وقت اس کی بہت ضرورت ہے۔'' ہمایوں کے لہجے سے ہی ڈسٹربنس عیاں تھی۔

''تو پھر تم لو نا۔ میں نہیں لوں گا اس وقت۔ البتہ کافی چلے گی۔ اگر اجازت ہو تو میں اپنے لئے کافی کا اک مگ بنا لوں۔؟''

''میں خود بنا کر دیتا ہوں۔'' امریکہ میں رہ کر بھی ہمایوں کی عادات میں



پاکستانیوں کا سا انداز نمایاں تھا۔ وہ مہمان نواز بہت تھا۔ اسی ناطے فوراً اٹھا اور جا کر توفیق کیلئے کافی بنا لایا۔

''اس مسئلے کا اک حل ہے تو ہمایوں خان! لیکن وہ تمہیں قبول نہیں ہوگا۔'' کافی کے دو تین طویل سے گھونٹ بھرنے کے بعد توفیق گویا ہوا۔

''وہ کیا۔؟'' ہمایوں نے جلدی سے پوچھا۔ ''ہو سکتا ہے ٹھیک ہی ہو۔''

''تم یہاں کسی امریکن لڑکی سے شادی کر لو۔''

ہمایوں اس کی پیش کردہ تجویز پر کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ یوں بھی اپنی پسند کا مشروب لینے سے ہوش و حواس پر اک سرور سا طاری ہو گیا تھا۔ ''شادی تو میں صرف ایمان آفریدی سے کروں گا۔ واہ! کیا مخلوق بنائی ہے اللہ نے۔'' اس کی آنکھوں میں اک چمک تھی اور ہونٹوں پر اک لازوال سی مسکراہٹ۔

''یہ امریکن شادی محض وقتی ہوگی۔ صرف گرین کارڈ کے حصول کی خاطر۔ سمجھو پیپر میرج۔ گرین کارڈ مل جائے گا تو پھر تم اپنی خواہشات کے مطابق اپنی زندگی گزار سکو گے۔ پھر بے شک اس شادی کو ختم کر دینا۔''

''لیکن میرے والدین' ایمان اور ایمان کی فیملی' مجھے کب اجازت دیں گے۔ اسی لئے تو میں نے اس راستے پر آج تک قدم نہیں رکھے۔ حالانکہ یہ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔''

''احمق ہو تم تو پھر۔ خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا۔'' توفیق اس کی حماقت پر خوب ہنسا۔ پھر اسے سمجھانے لگا۔ ''والدین اور دوسرے عزیزوں کو بتانے کی بھلا کوئی ضرورت ہے۔؟ کیوں بتاؤ گے وہاں کسی کو۔؟ اتنی دوستیاں یہاں تم نے لگا رکھی ہیں۔ مہینوں کے حساب تمہارے ساتھ' تمہارے اپارٹمنٹ میں' لڑکیاں رہتی رہی ہیں۔ وہ ایٹا' وہ لیزا' جین' ماریہ' کسی ایک کا بھی وہاں کسی کو پتہ ہے۔؟''

''نہیں۔''

''تو تم شادی بھی کر لو گے تو کسی کو کیا معلوم ہوگا وہاں' کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔؟''

''یہ تو صحیح ہے۔'' ہمایوں کھویا کھویا سا بولا۔

''اپنی زندگی کے لئے خوشیاں اور انجوائے منٹس مہیا کرنے کا حق تمہیں حاصل ہے۔''

''بالکل ہے۔'' ہمایوں کھل اٹھا۔

''تو اپنا حق وصول کرو۔ جس قیمت پر بھی مل جائے۔ میری جان! یہی تو اس ملک کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ہر قانون' ہر اصول اور ہر قاعدہ اسی بنیاد ترتیب دیا جاتا ہے کہ ہر کسی کو شخصی آزادی حاصل ہو۔ کرنے کی' بولنے کی' دیکھنے سننے کی۔ کہیں بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ نہ سماجی' نہ معاشرتی' نہ مذہبی اور نہ اخلاقی۔''

''تبھی تو ملک ترقی کرتے ہیں۔ نہ کہ ہمارے پاکستان کی طرح۔ آگے کے بجائے پیچھے چل رہا ہے۔ دن بدن ان مغربی ممالک سے دور ہوتا جا رہا ہے۔'' ہمایوں پوری طرح توفیق کے ساتھ اتفاق رائے رکھتا تھا۔

''تو بس پھر اپنی زندگی کو خوشگوار اور پرلطف بنانے کیلئے سیدھا راستہ اختیار کرو۔''

''گرین کارڈ حاصل کروں۔؟''

''بالکل۔ جتنی جلد ہو سکے۔ اکثر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔''

''اور تم نے کیا کیا تھا؟'' ہمایوں معصوم سی صورت لئے پوچھ رہا تھا۔

توفیق زور سے ہنسا۔ ''اپنا ہی تجربہ بیان کر رہا ہوں۔''

''لیکن تمہاری بیوی تو پاکستانی ہے۔''

''ہم پاکستانی لوگ اپنی آنے والی نسل کو مسلمان عورت کی آغوش میں پرورش پاتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور جو ایسا نہیں کرتے ان کی ساری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ نہ ان کی اولاد صحیح طرح مسلمان ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے معاشرے میں ٹھیک طرح مکس اپ ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک اضافی دکھ انہیں لگ جاتا ہے۔'' توفیق نے ایک لمبا لیکچر دے ڈالا۔ ''پھر ان کا بڑھاپا رل جاتا ہے۔ پھر وہ امریکہ جوگے رہتے ہیں اور نہ پاکستان جوگے۔''

ہمایوں بڑے غور سے توفیق کو سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ پوری سنجیدگی سے کچھ سوچ رہا تھا۔



# 8

ویسا ہی دن آج بھی تھا۔ اڑتی اڑتی خبر' طیور کی زبانی پہنچی تھی کہ نئے سر کلاس لینے والے تھے۔ اور اب سارے اسٹوڈنٹس پانچ منٹ پہلے ہی کلاس روم میں موجود تھے۔

اس دن کی طرح آج شور تو نہیں تھا۔ نہ علیحدہ علیحدہ گروپس بحث مباحثہ میں مصروف تھے۔ البتہ کھسر پھسر اور سرگوشیاں جاری و ساری تھیں۔ اپنی اپنی نشست سنبھالے ہر کوئی اپنے دائیں بائیں والوں سے مولوی عبدالرحمٰن ہی کے ٹاپک پر بات کر رہا تھا۔ فیمیل اسٹوڈنٹس بھی متواتر بول رہی تھیں۔

''خاموش۔ خاموش۔'' فضا میں' ماحول میں اک یہی لفظ یکا یک ہی سرسرا گیا تو فوراً کھسر پھسر اور سرگوشیاں تھم سی گئیں۔

کلاس روم کے دروازے پر پرنسپل صاحب کا چہرہ نمودار ہوا۔ ان کے پیچھے ایک صاحب اور تھے۔ کلین شیوڈ۔ چہرے پر خوبصورت ذہین آنکھیں۔ گھنی گھنی مونچھوں کے نیچے بھرے بھرے لب اک پیاری سی مسکراہٹ کو چھو رہے تھے۔ قد پرنسپل صاحب سے کچھ نکلتا ہوا تھا یا شاید وہاں موجود سارے ہی اسٹوڈنٹس سے اونچا تھا۔ تبھی ایک دم ہی وہ سب سے نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ کچھ چہرے میں ایسی کشش اور دلکشی تھی کہ اک انتہائی شاندار پرسنالٹی کے مالک دکھائی دے رہے تھے۔ ہر آنکھ نے انہیں دل ہی دل میں سراہا۔

''لو۔ مولوی آج پھر غائب ہو گیا۔'' فہد رحیم نے طارق وحید سے سرگوشی کی ''چلو پھر چھٹی۔''

''یہ آپ کے نئے سر ہیں۔ سر ابرار علوی کو ایمرجنسی میں ملک سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ اس لئے آئندہ سے یہی آپ کو انگلش پڑھائیں گے۔''

پرنسپل صاحب کی آواز کلاس روم میں گونجی تو سارے اسٹوڈنٹس کی نگاہیں نئے

سر کے تعارف کے حوالے سے ایک بار پھر ان پر جم سی گئیں۔ کوئی تنقیدی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی تعریفی نظر سے۔ اور کچھ شرارتی لڑکے تو فکر و پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔

''یار! یہ کہیں ''ہماری'' لڑکیوں پر ہی قبضہ نہ کر لے۔''

''چپ۔ چپ۔ اس ٹاپک پر بات' اس پیریڈ کے بعد ہوگی۔''

پرنسپل صاحب نے نئے سر کے تعارف میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔ لیکن کسی نے بھی دھیان سے نہیں سنا۔ سبھی نئے سر کی شخصیت کے سحر میں مسحور سے انہیں تکے جا رہے تھے۔ کہاں تو مولوی عبدالرحمٰن کا ڈر تھا کہ نجانے کیسے کیسے ان پر اسلام طاری کیا جائے گا۔ انگلش کی ڈگری لیتے لیتے عربی یا اسلامیات کی ڈگریاں لے کر گھر جا بیٹھیں گے پھر نہ کوئی جاب ملے گی نہ روٹی روزی کا کوئی اور بندوبست ہو سکے گا۔ بھوکا مرنا پڑے گا۔

اور لڑکیوں کو تو سب سے زیادہ خوف و پریشانی برقعوں کی تھی۔ رشتوں کی تھی۔ میک اپ اور ملبوسات کی تھی۔ پھر کوئی مکسڈ پارٹی بھی نہیں ہوگی' کوئی دوسرا فنکشن بھی نہیں ہوگا تب وہ اپنی جیولری اور ملبوسات کی نمائش کیسے کر سکیں گی۔ زندگی بڑی بے رنگ و بو ہو کر رہ جائے گی۔

مگر۔ ان نئے سر کو دیکھ کر تو سبھی اسٹوڈنٹس کو یک گونہ سا اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ ''شکر ہے۔'' ہر کسی کے اندر سے اک صدا اٹھی۔

البتہ ایمان بڑی بے چین اور بے کل تھی۔ ''ماھم۔!'' یہ کہنی کا تیسرا ٹھوکا تھا' جو اس نے ماھم کی پسلی میں جڑا تھا۔ ''یہ تو وہی ہے۔''

مگر ماھم پرلی طرف بیٹھی نائلہ سے گفتگو میں اتنی مصروف تھی کہ نہ اسے ایمان کی کہنی کی ضرب محسوس ہوئی اور نہ ہی اس کی سرگوشی وہ سن سکی۔ اسے ٹھوکا دینے کے بعد ایک بار پھر ایمان آفریدی اپنی پوری جاں سے سر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اس کے خدوخال کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کے قد کاٹھ کو دیکھ رہی تھی اور اس کے انداز کو جانچ رہی تھی۔

بہت حیرت انگیز اتفاق تھا۔ اگر ان کے ہاتھ پر بھی پٹی نہ بندھی ہوتی تو ایمان نے یہی سمجھ لینا تھا کہ یہ عابی کا کوئی جڑواں بھائی ہوگا۔ اور اب تو یقیناً یہ وہی



تھا۔ پکا پکا وہی۔ اس کی بات کی ماھم تصدیق نہ بھی کرے تب بھی اسے پورا یقین تھا۔ پر کیسا اتفاق تھا اور کیسا یقین۔ کیوں تھا وہ یہاں۔؟

سر نے رول کال لینا شروع کر دی تھی۔ اور وہ اس کے اک اک عضو کو بڑے غور سے دیکھے جا رہی تھی۔

وہی اداس آنکھیں۔ لبوں پر بے شک اک مدھم سی مسکراہٹ تھی لیکن انداز وہی تھا۔ رول کال لیتے ہوئے بھی لہجہ ویسا ہی ٹھہرا ہوا سا۔ دیکھتے دیکھتے اسے یوں لگا جیسے عابی اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اپنا خاموش خاموش سا انداز لئے۔ دھیمی دھیمی لے میں مترنم سی آواز اور لہجے کے ساتھ اتنی پیاری سی نظم اسے گفٹ کر رہا تھا۔

''ہائے عابی! آپ یہاں کیوں آ گئے۔؟'' وہ سوچ رہی تھی۔ اتنے سارے شریر لڑکوں اور لڑکیوں کو وہ بھلا کیا لیکچر دے پائے گا۔ جو بڑی خاموشی سے' انتہائی اداس آنکھوں کے ساتھ بس ارد گرد تکتا ہی رہتا تھا۔

اسے کس نے اس اتنی ٹف جاب پہ متعین کر دیا تھا؟ ایمان حیرتوں میں گم تھی۔ عابی پر آنے والا وقت اسے بڑا کٹھن اور تاریک سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تو اک دن بھی یہاں ٹک نہیں پائے گا۔ اس کی ناکامی یقینی تھی۔ کیونکہ ایمان کو معلوم تھا اس کی کلاس کے تمام لڑکے بڑے شریر تھے۔ اور۔ لڑکے تو لڑکے' لڑکیاں بھی کافی تیز طرار تھیں۔ ایمان کو ان کے ہاتھوں سے بھی عابی کا انجام اچھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رول کال لیتے ہوئے پھر وہی نرم ملائم سی آواز ایمان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''ایمان آفریدی۔!''

''یس سر۔!'' جواب میں جو آواز خود اس کے اپنے منہ سے نکلی وہ بڑی نامانوس سی تھی۔ وہ مزید گھبرا گئی۔ نظریں اٹھائیں۔ اس لمحے سر نے بھی نظر اٹھا کر اسے بغور دیکھا تھا۔ دونوں کی نظر سے نظر ملی۔ سر کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ نہ آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی ہی چمک لہرائی۔ بہت مضبوط اعصاب اور حواس کا مالک تھا وہ۔ یا پھر بہت زبردست قسم کا ایکٹر تھا۔ بہر حال کچھ بھی تھا ایمان دل ہی دل میں اسے داد ضرور دے اٹھی۔

اس کے بعد ماھم کے نام پر بھی ایسا ہی رسپانس دیا۔ ''ارے! یہ تو و ہے۔'' ماھم البتہ بری طرح چونک کر ایمان کی جانب مڑی۔ اتنی حیرت تھی کہ ''یہ سر'' بھی نہ کہہ سکی۔ ''خدا کی قسم ایمان! وہی ہے یہ۔''

''یہی تو میں تمہیں ٹھوکے دے دے کر بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''میں نے سمجھا تمہیں کہنیاں مارنے کی عادت ہے اور اب بغیر وجہ کے مارے جا رہی ہو۔ کمبخت نائلہ کا قصہ بھی تو اتنا مزیدار تھا کہ میں اسی میں گم رہی' نہ ا کو کمرے میں آتے دیکھا نہ تمہاری ہی آواز سنی۔''

ماھم نے پھر غور سے سر کو دیکھا۔ ''ہائے یہ بیچارا بھلا ہمیں کیا انگریزی پڑ پائے گا جبکہ یہ اردو تک کم بولتا ہے۔ اس کی بجائے اجلال حیدر ہوتا......''

''اونہوں! چپ کرو۔ وہ ادھر ہی تک رہا ہے۔'' ماھم کو پھر کہنی کا ٹھوکا پڑا وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

رول کال سے فارغ ہونے کے بعد سر نے سر اٹھا کر پوری کلاس کا جائ لیا۔ سبھی طلباء و طالبات آپس میں گفتگو کئے جا رہے تھے۔ بغیر استاد کی موجودگی احترام کئے۔ گو موضوع وہی تھے۔ لیکن تھی تو بدتہذیبی کی بات۔ چند لمحات اسی طر بڑی گہری گہری نظروں سے سب کو دیکھنے کے بعد سر نے بولنا شروع کر دیا۔

ایک جملہ' دوسرا اور پھر تیسرے چوتھے کے بعد ساری سرگوشیاں اور کھ پھسر خود بخود ہی بند ہوگئی۔ پورے کلاس روم میں سناٹا سا چھا گیا اور اب صرف انہیں کی آواز گونج رہی تھی۔ تمام کے تمام اسٹوڈنٹس بڑی توجہ اور خاموشی سے انہیں سنن لگے تھے۔

انگریزی کا پیریڈ تھا اس لئے وہ تعارفی جملے انگریزی میں ہی بول رہے تھے۔ تعلیم کی افادیت کے ساتھ ساتھ' استاد کا طالب علموں کے ساتھ کیسا مشفقانہ او مخلصانہ سلوک ہونا چاہیے اور طلباء کا اپنے استاد کے ساتھ کس قسم کا مؤدبانہ اور احترا ومحبت والا رویہ ہونا چاہیے۔ تبھی اک استاد صحیح تعلیم دے سکتا ہے اور تبھی ایک طالب علم کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

بڑی شستہ انگریزی تھی اور وہ بہت روانی سے بول رہے تھے۔ لہجہ بہت



خلوص و محبت بھرا تھا۔ آواز میں اک خاص دھیما پن اور بردباری تھی۔ سبھی سننے میں محو تھے۔ وہ سر ابرار علوی سے زیادہ دلکش انداز میں بول رہے تھے۔ سب طلباء و طالبات متاثر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

''یار! یہ ملا تو بڑا تیز نکلا۔'' ماھم اور ایمان کے عین پیچھے والی قطار سے کاشف تعریف آمیز لہجے میں بولا تھا۔

ایمان اور ماھم دونوں نے سنا اس کے بالکل آگے تھیں۔ ایمان تو چپ رہی البتہ ماھم زور سے ہنس پڑی اور گردن موڑ کر بولنے کو دیکھنے لگی۔ اس نے سر کو کس مضحکہ خیز انداز میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔

سر کی نظریں انہیں پر جمی تھیں۔ ماھم کو پھر کہنی سے ٹھوکا پڑا۔ ایمان اسے سر کی نگاہوں سے باخبر کر رہی تھی۔ کہنی کی تیکھی ضرب کھا کر وہ جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔ پر سر نے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔

''کیا کہہ رہا تھا وہ۔؟'' ایمان کو کھڑا ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے سر نے کاشف کے متعلق پوچھا۔ ''آپ بتائیں۔''

وہ بوکھلا کر کھڑی تو ہوگئی پر اک گہری سوچ میں گم تھی۔ ایک کلاس فیلو دوسرے کی چغلی کھائے یا اس کے خلاف بولے' یہ تو خلاف اخلاق' خلاف اصول تھا۔ وہ خاموش رہی۔ جبکہ اس نے سنا بھی تھا۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔؟'' سر کے چہرے پر جلال تھا اور آواز اور لب و لہجے میں رعب و دبدبہ۔!

چادر میں لپٹا ایمان کا سارا وجود کانپ گیا۔ چہرے پر سرخی پھیلی' گال تمتمانے لگے۔ چند لمحے اس کی یہ کیفیت رہی پھر اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں لیکن چہرے پر اک عجیب سی' انوکھی سی چمک تھی۔ سر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت مضبوط آواز میں بولی۔

''سر! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ان کی کہی ہوئی کوئی بات' اگر میں سن چکی ہوں' تو آپ کو بتا بھی دوں گی۔؟''

''کیا مطلب۔؟'' سر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھے جا رہے تھے۔

''ایک تو یہ کہ یہ میرے کلاس فیلو ہیں۔ دوسرے میں اپنی اسٹوڈنٹس کے ساتھ بے وفائی اور غداری جیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کبھی نہیں کروں گی'' انتہائی بے خوفی اور دلیری کے ساتھ بلاجھجک سر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گئی۔

''اور میرے ساتھ۔؟'' انہوں نے اپنی استاد والی حیثیت جتلائی۔

''سر! جب آپ کا کوئی معاملہ ہوگا تو آپ کے ساتھ بھی وفا کروں آپ میرے استاد ہیں۔محترم ومکرم۔!'' اس کی جرأت قابل دید تھی۔

سر اک سکتے کے سے عالم میں کھڑے اسے تکے جا رہے تھے۔

اک صنف نازک ہو کر اس نے اتنی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایمان آفر کے اس انداز' لب و لہجے اور دلیرانہ گفتگو سے کاشف کی مردانگی پر زبردست پڑی۔ کیسے وہ اکیلی کھڑی اتنی دلیری سے سب کی نظروں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ا جو مجرم تھا' چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کاشف شرمندگیوں میں ڈوب گیا۔وہ کیسا بے انسان تھا۔؟ کہاں اس عورت ذات کی بلندی اور کہاں اس کی پستی۔؟اس سوچ ساتھ کاشف اک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔نہیں۔ وہ بے ضمیر انسان نہیں تھا۔

''سر!میں آپ کو خود ہی بتا دیتا ہوں کہ میں نے کیا کہا تھا۔'' اس ایمان کی سی بے خوفی اور دلیری کے ساتھ سر کی آنکھوں میں دیکھا۔

''یار! یہ ملا تو بڑا تیز نکلا۔'' لیکن یقین کریں یہ میں نے آپ کو اور آپ انگریزی کی قابلیت کو دادی دی تھی۔سوری سر! انداز ذرا غلط ہو گیا۔''

کاشف کی کی گئی وضاحت' سر کے سر پر سے گزر گئی۔ وہ اس ساری گ کے پس منظر سے واقف نہیں تھے تبھی سوالیہ نگاہیں ساری کلاس میں گھمائیں۔شاید دوسرا انہیں سمجھا سکے۔

اور کوئی دوسرا نہیں کیا سمجھاتا فی الحال تو ہر کوئی ہی اپنے گریبان میں ڈال کر جھانکنے لگا تھا۔لڑکے بھی' لڑکیاں بھی۔ سبھی نے انہیں باتیں بنائی تھیں۔ نے انہیں سفارشی کہا تھا۔کسی نے انہیں نام کی مناسبت سے کرائے کا مولوی کہا کسی نے ان کی اس ڈیپارٹمنٹ میں تقرری ہی کو قانونی طور پر غلط گردانا تھا۔غرض



اس جرم میں ملوث تھے۔ پھر وہ دونوں ہی کیوں بھگتیں۔؟

''دراصل سر!'' اب ماھم کھڑی ہو گئی۔''ایک میرے پاپا کے ملنے والوں میں اور ایک میری فیملی میں دور کے رشتے دار ہیں۔ دونوں کے ہی نام عبدالرحمٰن ہیں۔اور دونوں کٹر قسم کے مذہبی ہیں۔ میں نے سمجھا اس نام کا ہر بندہ ایسا ہی ہو گا۔ تب ہم نے آپ کے نام کے ساتھ مولوی لگا دیا۔لیکن آپ تو......بس سر! مجھ سے بھی غلطی ہو گئی۔سوری۔!''

اس کے دیکھا دیکھی آصفہ اٹھی۔''میں نے کہا تھا۔ ایک مولوی بھلا ہمیں انگلش کیا پڑھائے گا۔اسے عربی یا اسلامیات کے ڈیپارٹمنٹ میں دھکیلو۔''

''جس طرح ہمارے ملک کی وزارتوں میں ہوتا ہے تعلیم کسی دوسرے شعبے کی ہوتی ہے اور متعین دوسرے میں کر دیئے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ کوئی سفارشی ہو گا۔'' تنویر شمائل نے بڑی ایمانداری کے ساتھ اپنا قصور مانا۔

''اور سر۔!'' پھر ایک کے بعد دوسرا اٹھ کر کھڑا ہوتا گیا اور اعتراف جرم کرتا گیا۔جس جس نے جو جو کچھ سر کے خلاف بولا تھا یا ان کی شان میں جو کوئی گستاخی کی تھی' پوری دیانتداری کے ساتھ ہر کوئی خود بخود ہی بتاتا' بولتا چلا گیا۔

''ہمارا رج کے بیڑا غرق کرے گا یہ مولوی۔''

''سب کو چادریں اوڑھا دے گا اور نمازیں اور روزے۔ پابندیاں ہی پابندیاں۔''

ایک قطرے کے بعد دوسرا' تیسرا' چوتھا گرتا چلا گیا اور پھر جیسے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔تقریباً ساری کلاس ہی کھڑی ہو گئی تھی۔ اپنا اپنا جرم' اپنا اپنا اعتراف لے کر۔

سر ہکا بکا کھڑے تھے۔سب کو سن رہے تھے لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر میں ماھم دوبارہ بولی۔''آپ سر! سب کو معاف کر دیں۔بس جو کچھ ہوا آپ کے نام کی وجہ سے ہوا۔ بھلا آپ نے اپنا نام عبدالرحمٰن کیوں رکھا تھا۔ بے شک عبدالغفور یا عبدالشکور رکھ لیتے۔ پھر کبھی غلط فہمی نہ پیدا ہوتی۔''

''لیکن میرا نام عبدالرحمٰن نہیں ہے۔'' نیا انکشاف ہوا۔ پوری کی پوری کلاس

چونک اٹھی۔ بڑی ندامت سے سب انہیں دیکھنے لگے۔ حماقت کی کوئی حد بھی تھی؟

''پھر سر! آپ کا کیا نام ہے۔'' وحید عارف نے جرأت میں اگلا قدم بڑھایا۔ ''آپ نے تو اپنا تعارف ہی نہیں کرایا۔''

''میرا تعارف آپ سب نے جو کرا دیا ہے۔'' سر بڑی خوش دلی سے بولے اپنے متعلق اتنا کچھ سننے کے باوجود ان کا موڈ بحال تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ او آنکھوں میں جگمگاہٹ بھی ہنوز قائم تھی۔

ساری کلاس ان کی گرویدہ ہوگئی۔ یہ سر تو سر نہیں بلکہ دوست نما ثابت ہوئے تھے۔ ابھی پہلا دن تھا۔ آگے چل کر شاید استاد کے ساتھ ساتھ اک مخلص دوست کی حیثیت اختیار کر جائیں۔ ہر کسی کے اندر کچھ ایسا ہی خیال اترا تھا۔ اور و سب کو پہلے سے زیادہ وجیہ اور شاندار دکھائی دینے لگے۔ وہ سبھی کا آئیڈیل بن گئے۔

''میرا نام عبد ہے۔'' اک اپنایت بھری مسکراہٹ کے ساتھ وہ وضاحت سے اپنا تعارف کرانے لگے۔ ''رحمان علی خاں میرے بابا جان کا نام ہے۔ یوں پو نام عبدرحمان ہے۔ عبدرحمان علی خاں میری تمام اسناد میں لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ اتنا بڑ نام لکھنا بولنا مجھے پسند نہیں۔ کہ میں اک بہت چھوٹا سا انسان ہوں۔ بہت معمولی سا سر کے الفاظ اور لہجے میں عاجزی نمایاں تھی۔ ''پھر نام کا تکبر۔ نو نو۔ اللہ کو غرور پسن نہیں۔ کسی بھی قسم کا۔ بس یہ سمجھئے میرا نام صرف عبد ہے۔''

اور بس وہی لمحہ تھا جب سر عبد پوری کلاس کے دلوں میں بڑے پیار س بڑے اعتماد سے براجمان ہو گئے۔ اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ تو ا سارے دلوں نے سر عبد کے دل کو بھی مٹھی میں لے لیا۔ جس کا اظہار وہ بڑی فراخد سے کر گئے۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ میری یہ کلاس سچی اور جرأت مند ہے۔ اور آپ مجھے استاد سے زیادہ اپنا دوست پائیں گے۔ آپ میں سے کسی کو کوئی بھی مسئلہ ہو یا ضرورت ہو بلا جھجک میرے پاس آجائیں۔ میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ انشاء اللہ۔!''

کلاس کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ ''آج تو تعارف کا دن تھا لہٰذا باقاعدہ پڑھائ اب کل سے ہو گی۔ انشاء اللہ'' سر اعلان کر کے اپنی چیزیں میز پر سے سمیٹتے ہو اور اک پیاری سی مسکراہٹ سب کو گفٹ کرتے ہوئے کلاس روم سے باہر نکل گئے۔



اسٹوڈنٹس بھی انہیں کی باتیں کرتے ہوئے آگے پیچھے نکلتے چلے گئے۔ آخر میں ماھم اور ایمان رہ گئی تھیں۔ باقی کلاس فیلوز کی طرح وہ بھی سر ہی کو ڈسکس کر رہی تھیں۔

''سر بہت خاموش اور سنجیدہ سی طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی جگہ اس جاب کیلئے اجلال حیدر بہت مناسب تھا۔'' ماھم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

مگر ایمان کا خیال تھا کہ قابلیت میں اجلال حیدر کہیں بھی ان کے مقابل کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ ''دیکھا تھا ان کا انگلش بولنے کا انداز اور لب و لہجہ۔ واہ! کیا الفاظ کا چناؤ تھا۔ اور کیسے کیسے محاورے اور تشبیہیں استعمال کر رہے تھے۔ اجلال حیدر تو کھلنڈرا اور شرارتی سا ہے۔ اس کی بول چال میں ایسی گہرائی نہیں ہے۔''

بلڈنگ کی داہنی سمت والی دیوار کا موڑ مڑ کر جب دونوں باتوں میں مصروف سامنے لان کی طرف چلیں تو نجانے کدھر سے کسی درخت کی آڑ سے یا دیوار کی اوٹ سے سر عبدرحمان نکل کر ایک دم ان کے بالمقابل آن کھڑے ہوئے۔ دونوں ہی چونک کر وہیں رک گئیں۔

''ہیلو۔!'' اب ان کے چہرے پر وہی پہلے والی شناسائی تحریر تھی۔

ماھم کو ایک دم ہی وہ بے تحاشا اچھے لگ گئے۔ گندمی سے مسکراتے ہوئے چہرے پر سنہرے فریم والا چشمہ بہت جچ رہا تھا۔ ''ارے عابی......''

''اونہوں۔'' ماھم کے بے تکلفی بھرے طرز تخاطب پر انہوں نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے ہوئے روک تھام لگا دی۔ ''یہ نام' یہ انداز یہاں نہیں۔ یہاں میں آپ کا صرف سر ہی ہوں۔'' بڑی اپنایت سے انتہائی مدھم لہجے میں انہوں نے ماھم کو جیسے سمجھانے کی کوشش کی۔ چہرے پر سجی مسکراہٹ کی وجہ سے بہت پرکشش لگ رہے تھے۔ ''ہاں البتہ اور ہر جگہ میں آپ کا عابی ہوں۔ کیونکہ آپ میرے دوستوں اور اپنوں کی لسٹ میں ہیں۔ بلکہ سب سے اوپر آپ دونوں ہی کا نام ہے۔''

''اجلال سے بھی اوپر۔؟'' ماھم کو اجلال یاد آ گیا۔ اسی کا تو یہ دوست تھا۔

''آپ تینوں کا ایک ہی مقام ہے۔'' یہ کہتے کہتے ان کی نظریں ایمان آفریدی کے چہرے پر جم سی گئیں۔ اور۔ نجانے ان نگاہوں میں کیا تھا وہ بوکھلا کر نظر چرا گئی۔ حالانکہ ابھی ابھی سوچا تھا۔ قریب کھڑے تھے۔ غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھے گئی۔ کیا

وہ اداسی ابھی بھی وہاں تھی؟

''آپ میری عیادت کے لئے آئی تھیں۔ میں وہی شکریہ ادا کرنے
تھا۔''

''شکریہ کیسا۔؟'' ماھم ہی پھر بولی۔ ''آپ نے ہمیں دوست کہا ہے تو
ایسے تکلفات کیوں۔؟''

''تو پھر کچھ اور نام دے لیتے ہیں اس ملاقات کو۔ کیوں ایمان آفرید
آپ بھی تو کچھ بولیں۔''

ایمان نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ وہی انداز۔ جیسے کلاس روم میں
کاشف کی باز پرس اس سے کی جا رہی تھی۔ ابھی ایمان نے کچھ کہا نہیں تھا۔ بس سو
ہی تھا مگر سر نے نجانے کیسے اس کی سوچ کی زبان سمجھ لی تھی۔

''ہماری محبتوں کا انداز کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے خود بخو
ہی پھر بولے۔ ''کلاس روم کے واقعہ کیلئے معذرت خواہ ہوں۔ ایک بات آپ کو پہ
ہی بتا دوں۔ کلاس میں مجھ سے جو کچھ سرزد ہوگا' وہ ہماری دوستی پر اثر انداز نہیں ہو گا
وہ استاد اور شاگرد کا علیحدہ اک تعلق ہے۔'' ارے! اب تو اداسی کی جگہ جیسے جگنو
چمک رہے تھے۔ ''ہائے اتنا خوفناک۔؟'' ماھم کی بات پر تینوں ہی ہنس پڑے۔ تعلق
اور خوفناک۔!!

سر بہت عجلت میں تھے۔ اور وہی تیزی کلام میں بھی تھی۔ سن کم رہے تھے
بول اور دیکھ زیادہ رہے تھے۔ ''اور ہاں اب آپ کب آ رہی ہیں میری عیادت کے
لئے۔ یقین کریں اب سوؤں گا نہیں۔ جاگ کر انتظار کروں گا۔ بے شک قیامت تک
کرنا پڑے۔'' نگاہیں ایمان کے چہرے پر جمائے بولے جا رہے تھے۔ اور وہ اس
نظروں کے حصار سے گھبرائی جا رہی تھی۔

''ارے ہاں اب کیسا ہے آپ کا ہاتھ۔؟'' ماھم ہی کو خیال آیا تو پوچھا۔

''دیکھ لیں پٹی ابھی تک بندھی ہے۔ عیادت کا بہانہ معقول ہے۔ میں انتظا
کروں گا۔ اور اس سے پہلے کہ آپ کے کلاس فیلوز مجھے یہاں دیکھ کر آپ کو کٹہر
میں کھڑا کر دیں۔ میں تو چلوں۔ بائے بائے۔''



ان کی ایک بھی نہیں سنی۔ اپنی ساری سنا کر وہ جس تیزی سے آئے تھے اسی
تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ انداز اور ادائیں تو خاصی دلوں کو موہ لینے والی تھیں۔
اور ماھم اور ایمان کھڑی ایک دوسری کو تکتی رہ گئیں۔ پھر دونوں اکٹھی ہی ہنس
پڑیں۔ یہ چند دنوں میں اتنی بڑی تبدیلی؟ کیوں۔؟ ایمان کے اندر اک سوچ ابھری۔

''ویسے بندہ کافی دلچسپ ہے۔'' ماھم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''اور پیارا بھی۔''

''پسند آ گیا۔؟'' ایمان نے شرارت سے پوچھا۔

''ہاں بہت۔'' ماھم ہمیشہ والی بے تکلفی سے بولی''اور توبہ توبہ! باتیں کتنی
کرتا ہے۔''

''اب تو یہ اس جاب کے قابل ہے نا۔؟''

''پکا پکا۔ اے! پر تو کیوں اس میں اتنی دلچسپی لے رہی ہے۔ خبردار! جو اس
کیلئے تمہاری نظر بدلی۔ اس معاملے میں میرا ووٹ ہمایوں کی طرف ہی رہے گا۔''

''میری فیملی کی طرف سے مجھے کب اجازت ہے اپنی آنکھوں میں کوئی
دوسرا خواب سجانے کی۔؟'' عجب حسرت تھی ایمان کے لہجے میں۔ ماھم دیکھتی کی
دیکھتی رہ گئی۔

## 9

''بس ایک دم ہی میرا دل اڑنے لگا۔ میں نے کہا چل ایمان آفریدی! چل
کر اپنے ارسل سے مل آ۔ یہ جو تو آج کل بجھی بجھی سی رہتی ہے تو تیری بیٹری چارج
ہو جائے گی۔''

وہ اس کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑی تھی اور پیار برساتی نظروں سے اس
کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔ اس سے بمشکل ایک ڈیڑھ سال ہی تو چھوٹا تھا۔
جب سے ہوش سنبھالا تھا اس کے اردگرد خود کو پایا تھا اور اپنے اردگرد بس اسے ہی
دیکھا تھا۔

پندرہ بیس دن گزر جاتے تو ہوسٹل کھانے کو دوڑنے لگتا۔ اداسیاں دل میں سناٹے اتارنا شروع کر دیتیں۔ ہائے یہ محبت! کسی کی بھی ہو۔ جب شدتیں اختیار کر لیتی ہے تو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ اور ایمان آفریدی ہر وقت ہی بھائی کی محبت میں گرفتار و سرشار رہتی۔

ارسل سے ملنے کے بعد وہ ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ان کے گلے لگتے لگتے تو ان کی آغوش میں ہی ڈھیر ہو گئی۔ ''ہائے اماں! میں بڑی اداس تھی۔'' ان کے ہاتھوں کو چوما۔ ان کے گالوں کو چوما۔ ان کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کتنی ہی دیر انہیں تکتی رہی۔

''کتنے دنوں کیلئے آئی ہو۔؟'' اماں نے بھی پوری کی پوری کو بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''صرف دو دنوں کیلئے۔ پرسوں چھٹی تھی کل کی لے لی۔''

''چھٹی لینا ہی تھی تو ایک کے بجائے دو تین لے لیتیں۔'' پاس سے ارسل نے شکوہ کیا۔ ''جب بھی آتی ہو' ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ اب تو عرصہ ہو گیا۔ اطمینان سے بیٹھ کر گپیں ہی نہیں لگائیں۔''

''ہمارے پوئٹری کے نئے سر آئے ہیں۔ اس لئے ابھی چھٹی نہیں لے سکتی تھی۔ اور یہ ایک بھی تو باقاعدہ نہیں لی۔ ماھم سے پراکسی بولنے کو کہہ آئی ہوں۔''

ماں کو اچھی طرح مل کر سیدھی ہوئی تو نظریں اردگرد گھومنے لگیں۔ ''چودھری جی کہاں ہیں۔؟'' اپنے باپ کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

''آ جاتے ہیں ابھی۔ تمہیں پتہ ہے تمہاری نانو آئی ہوئی ہیں۔''

''اچھا۔؟'' خوشی سے چہرہ گلنار سا ہو گیا۔ ''کب کی۔؟''

''کل ہی آئی ہیں۔''

''چلو اچھا ہوا۔'' جوتے اتار کر ادھر ادھر پھینکتے ہوئے بولی۔ ''نانو سے بھی ملے بیسیوں سال ہو گئے تھے۔''

''بیسیوں نہیں' سینکڑے۔'' ارسل کی آنکھوں میں شرارت ناچی۔ ''کبھی اپنی عمر کا حساب لگایا ہے۔''



''دیکھ لیں اماں! یہ پھر مجھے حضرت نوح کے وقت کی عورت سے تشبیہ دے رہا ہے۔''

''حضرت نوح کے وقت کی۔؟'' اماں کو اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی۔

''ہاں اماں! کئی کئی سینکڑے سال عمر تو انہیں کے دور میں ہوتی تھی۔ آپ کو چاہیے تھا اسے مجھ سے پہلے پیدا کر دیتیں۔ ہر وقت بڑی ہونے کا طعنہ دیتا رہتا ہے۔''

''ارے تو بڑا چھوٹا ہونا بھلا کسی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔'' اماں ارسل سے کچھ کہنے کے بجائے اسے ہی سمجھانے لگیں ہمیشہ کی طرح۔ ''اب یہ دو دن لڑائی جھگڑے میں ہی نہ گزار دینا۔''

ماں سے اسے بس ایک ہی گلہ تھا۔ ہمیشہ بیٹے کی ہی طرفداری کرتی تھیں۔ ویسے اندر سے مطمئن تھی۔ بابا ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتے تھے۔ یوں بیلنس قائم رہتا تھا۔

جوتوں کے بعد چادر اتار کر پرے پھینکی۔ ''توبہ! کتنی گرمی اور کتنی مٹی۔ اچھا اماں! میں ذرا شاور لے لوں۔ دیکھ رہی ہیں میری حالت اور میرا حلیہ۔ قبرستان کا بھوت لگ رہی ہوں نا۔؟''

''تمہیں آج معلوم ہوا ہے کہ تم کیا ہو۔؟''

''دیکھو ارسل! میں صرف دو دن کیلئے آئی ہوں۔ لڑائی جھگڑا کوئی نہیں کرنا۔ اچھا۔؟'' لب مسکرا رہے تھے۔ ماں کو کنکھیوں سے تکتے ہوئے واش روم کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئی۔ بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک پیکٹ نکال کر اس کی طرف لڑھکا دیا۔ ''یہ تمہارے لئے۔'' لڑائی جھگڑا ایک طرف لیکن محبتوں کا بھی سیلاب آیا رہتا تھا۔ ''کیا ہے اس میں۔؟'' نگاہوں میں مٹھاس لئے وہ اپنی ایمان سے پوچھنے لگا۔ ''کھول کر دیکھ لو۔'' ساتھ ہی ترچھی ترچھی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

''اماں کا گفٹ آ کر دوں گی۔''

''مجھے ان گفٹوں وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس تم جلدی جلدی آیا کرو۔ تمہارے بغیر ایک ایک دن کاٹنا میرے لئے کتنا مشکل ہوتا ہے یہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔''

"میں بھی جانتی ہوں اماں۔!" ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی۔

شاور لے کر نکلی تو اماں کے پاس نانو بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ارے نانو میری جانو۔!" نانو سے بھی بہت پیار تھا۔ اور نانو تو اس کے پیار میں گلے گلے تک ڈوبی ہوئی تھیں۔

بہت سارے پیار کرنے کے بعد اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کتنی ہی دیر دیکھتی رہیں۔ پھر پاس بیٹھی بیٹی کو خشمگین نظروں سے گھورا۔

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے صفیہ۔! ختم کرا اس کی پڑھائی۔ دیکھ تو بچی کا چہرہ۔ پھول جیسا تھا۔ اب کمہلا کر کیسا ذرا سا نکل آیا ہے۔"

"یہ کرامات نانو! پڑھائی کی نہیں ہیں۔ سفر ہی بڑا تھکا دینے والا تھا۔ حالانکہ صرف دو سوا دو گھنٹے کا تھا۔"

"بس کا ہوتا ہی تکلیف دہ ہے۔" ارسل کی نظروں میں پیار کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ "کیوں آئیں بس سے۔؟"

"فون کر دینا تھا نا۔ گاڑی بھیج دیتے۔" اماں بھی محبت سے چور لہجے میں بولیں۔ "پر اماں! سرپرائز بھی تو کبھی کبھار دینا ہوتا ہے نا۔ کتنا مزہ آیا تھا اچانک جب میں سامنے آ گئی۔ ہیں نا ارسل۔؟"

"آیا تو تھا۔ لیکن دو منٹ کے مزے کیلئے دو تین گھنٹے تم نے اتنی تکلیف میں گزارے۔" اس کی ساری تکلیف جیسے ارسل آفریدی کے اندر اتر آئی تھی۔

"دراصل اماں! آج میرا دل چاہا تھا کہ دیکھو غریبوں کی کس بھاؤ بکتی ہے۔"

"تو پھر دیکھ لیا۔؟ مزہ آ گیا۔؟" ارسل نے طعنہ دیا۔ جب سے بہن کا تھکن زدہ، اترا ہوا چہرہ دیکھا تھا، بہت تکلیف میں مبتلا تھا۔ یہ محبتیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔!

"ہر وقت غریب امیر کا مقابلہ کرتی رہتی ہو۔" اور اماں کو یہ موضوع ہمیشہ ناپسندیدہ لگا کرتا تھا۔ اللہ میاں نے جس انسان کو جیسا بنا دیا، جو کسی کے مقدر میں لکھ دیا۔ تو بس وہ بن گیا۔ وہ لکھا گیا۔ صبر شکر کر کے ہر کسی کو زندگی گزار لینی چاہیے۔ نہ کہ امیری غریبی کے مقابلے کر کر کے اور کڑھ کڑھ کر پوری حیاتی ہی بندہ برباد



کرے۔ اس ایمان کی طرح۔ اللہ کی سب نعمتیں پا کر بھی اس کے نصیب میں کڑھنا لکھا گیا تھا۔ دوسروں کی خاطر۔ پگلی۔!

"کیا دوبارہ کبھی بس سے آؤ گی۔؟"

"ابھی تو واپس جانا ہے۔ بس سے ہی جاؤں گی۔"

"میں مر گیا ہوں۔؟" جانتی تھی ارسل آفریدی غصہ کرے گا۔ سو اس نے کر لیا۔ لال لال آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور یہ غصہ اسی کیلئے اظہار محبت کا نذرانہ تھا۔ ایمان کی ذرا سی بھی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کیسے اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی صاف ستھری، پاکیزہ سی، چمکیلی سی، جگمگاتی سی بہن۔!!

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔" باقی محبت کا غصہ اماں کے لہجے سے عیاں ہو گیا۔

"کیوں بھئی کس کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟" چودھری واصل آفریدی کھنکارتے ہوئے، اک واضح سی مسکراہٹ کے ساتھ لاؤنج میں آن داخل ہوئے۔

ایمان چونک کر اک جھٹکے سے مڑی اور بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔ ارسل بیٹا ہو کر باپ سے اتنا بے تکلف نہیں تھا جتنا ایمان تھی۔ جس صوفے پر وہ بیٹھے اس کے سامنے عین نیچے قالین پر بیٹھتے ہوئے کہنیاں ان کے گھٹنوں پر ٹکا کر، چہرہ ہتھیلیاں جوڑ، ان پر سجا لیا۔

"ہاں تو بابا سائیں! آج کل آپ کی ریاست کے حالات کیسے ہیں۔؟ لگتا ہے کچھ اچھے نہیں۔" ساتھ ہی ماں کو بھی مخاطب کر لیا۔ "اماں جانی! یہ چوپنڈ دے چودھری ہوتے ہی نا، یہ بڑے سنگدل ہوتے ہیں۔"

"کیا کیا اس پنڈ دے چودھری نے۔؟" اماں نے ہنس کر بڑے پیار سے اسے دیکھا۔

جس پیار سے اماں نے اسے دیکھا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ پیار سے واصل آفریدی اسے تک رہے تھے۔ رحل میں سجے قرآن کی طرح، جڑے ہاتھوں کے نازک سے پیالے میں دھرے اس چہرے کو، جو دونوں جہانوں میں سب سے زیادہ انہیں

عزیز تھا۔ باوجود اس کے کہ ابھی ابھی اس نے ان پر سنگدلی کا الزام لگایا تھا۔ وہ
بھی محبتیں نثار کرتی نظریں اس پر جمائے بیٹھے سوچ رہے تھے۔

آج ہی صبح قرآن کی اک آیت کا ترجمہ پڑھا تھا۔ ''میں نے موسیٰ کی شک
میں ایسی کشش بھر دی۔'' یہ فرعون اور حضرت موسیٰ کے اس قصے کا بیان تھا جس میں
فرعون نے بنی اسرائیل قوم میں ہر پیدا ہونے والے بچے کو قتل کر دینے کا اعلان عا
کیا تھا۔ فرعون کوئی حکم کرے اور اس کی تعمیل نہ ہو۔؟ یہ کیسے ممکن تھا۔ اور اس ظا
بادشاہ کے اس ظلم کی دھڑا دھڑ تعمیل ہونے لگی۔ ملک کے ایسے ہی حالات میں حضرت
موسیٰ نے جنم لیا۔ ماں پریشان۔ اس نومولود کو ظالم حاکم کے ظلم سے کیسے بچائے۔
الہام کے ذریعے اللہ کا حکم ہوا۔ کسی باسکٹ میں ڈال کر دریائے نیل میں بہا دو۔ یوں
حضرت موسیٰ کا منا سا محمل نیل کی لہروں پر سوار فرعون کے محل میں جا پہنچا۔ فرعون کی
کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی بیوی نے بچے کو گود میں بھر لیا۔ اور اپنی اولاد بنا کر پالنے
کا قصد کیا۔ فرعون نے بیوی کی فرمائش پر بچے کو گود میں لے کر بغور اسے دیکھا۔ اسی
لمحے کیلئے یہ آیۃ تھی۔ ''موسیٰ کی شکل میں ایسی کشش بھر دی۔'' جس کا مطلب ہے کہ
فرعون کا دل بھی ان پر آ گیا۔ واصل آفریدی دل ہی دل میں وہ آیۃ پڑھتے جا رہے
تھے۔ اور ایمان آفریدی کے چہرے کو تکے جا رہے تھے۔ سچ ہے۔ اللہ سب کچھ کرنے
پر قادر ہے۔ کچھ ایسی ہی کشش انہیں اس سامنے تکتے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ اور وہ
جی ہی جی میں اس ذات باری تعالیٰ کیلئے متشکر ہوئے جا رہے تھے' جس نے انہیں یہ
نعمت عطا کی تھی۔ ''آپ ایسے کیوں دیکھتے جا رہے ہیں۔ میری بات کا جواب کیوں
نہیں دے رہے سنگدل حکمران۔؟''

''ارے۔ جانتی ہو کس سے مخاطب ہو۔؟ اپنے باپ سے۔'' پاس بیٹھی نانو
کو غصہ آ گیا۔ ''کبھی عقل کی بھی بات کر لیا کرو۔ جوں جوں زیادہ پڑھ رہی ہے بگڑتی
جا رہی ہے۔'' نانی اس کی تعلیم کو مورد الزام ٹھہرانے لگیں۔

''میں اس لئے کہتی ہوں صفیہ! اس کی پڑھائی ختم کرا دو۔''

وہ واصل آفریدی کی پھوپھی بھی تھیں۔ دونوں طرف سے رشتہ داری تھی۔
تبھی ہر بات کرنے کا حق اختیار رکھتی تھیں۔



''نہ پھوپھی! اسے تو بہت پڑھاؤں گا۔'' واصل بڑے پیار سے ایمان کے
سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ گویا انہیں اس کی طرف سے ملا سنگدلی کا الزام بھی قبول تھا۔

''دیکھ لیتے نا میری حالت کبھی۔'' اور وہ نانی کی بھی نہیں سن رہی تھی۔ باپ
جس پیار کو نظروں میں سموئے اسے دیکھ رہا تھا' اس کا بھی احساس نہ تھا۔ نہ تفاخر تھا۔
نہ تشکر تھا۔ نہ ایسی حالت' ایسی کیفیت میں معمول کی طرح ارسل کی طرف چڑانے والی
نگاہیں اٹھی تھیں۔ وہ تو اس وقت کسی اور ہی عالم میں تھی۔ بس اپنی ہی کہے جا رہی
تھی۔ ''یہ سر سے پاؤں تک مٹی میں اٹی تھی''

''تو کیوں بس سے آئی تھیں۔؟'' ارسل نے درمیان میں ٹوکا۔

''اچھا ہوا جو بس سے آ گئی۔ حکمرانوں کے ظلم و بربریت کا اندازہ ہو گیا۔''

''کیا ہوا جان پدر! کیا کونسا اتنا بڑا ظلم سرزد ہو گیا واصل آفریدی سے۔'' وہ
اسی سرشاری میں مبتلا تھے۔ کتنے سارے دنوں بعد یہ موہنی صورت دکھائی دی تھی۔
نظروں ہی نظروں میں فدا و قربان ہو رہے تھے۔ حالانکہ ان کے قبیلے برادری میں رسم
و رواج کو جذبوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ وہ لوگ بیٹی سے نہ محبت کرتے تھے اور نہ کبھی
پیار کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پھر بھی واصل آفریدی ایمان سے محبت کرنے پر مجبور
تھے۔ یہ اللہ کا حکم تھا۔ اور وہ بخوشی' برملا اپنی اس محبت کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔
اللہ کے حکم نے ان کے دل سے قبیلے برادری کا ڈر خوف بھی مٹا ڈالا تھا۔ فرعون دشمن
ہو کر محبت میں بندھ گیا تھا مگر وہ تو اک باپ تھے۔

اور قبیلے برادری کے رسم و رواج کی طرح جو بیٹا ان محبتوں کا اصل حقدار تھا
وہ اپنے حقوق کو اپنے سامنے غصب ہوتا دیکھتا رہتا۔ اف تک نہ کرتا کہ خود وہ بھی اسی
جرم میں ملوث تھا۔ اور فخر بھی تھا اسے اپنے اس جرم کا مجرم ہونے پر۔ ایمان آفریدی
جیسی بہن اللہ میاں نے کسی انعام کی طرح ارسل آفریدی کے گھر میں اتاری تھی۔
نگاہوں میں پیار بھرے وہ باپ بیٹی کو دیکھ اور سن رہا تھا۔

''آپ کے دادا کو یہ زمین انگریز سرکار نے کسی نیکی یا اچھائی کے بدلے
میں ایوارڈ کے طور پر دی تھی۔ پھر اس زمین پر بلوچستان سے آ کر میرے دادا نے یہ
اپنے نام کی بستی بسائی۔ عظمت آباد۔ جانتے ہیں نا۔؟''

واصل آفریدی اک گہرے تبسم کے ساتھ اس کی بات سن رہے تھے۔ ''ہا
جانتا ہوں اچھی طرح۔ محمد عظمت آفریدی۔ اک عظیم انسان تھے میرے دادا۔'' ا
کے لہجے سے عقیدت و محبت مترشح تھی۔

''بہت عظیم انسان تھے نا آپ کے دادا۔ پھر انہیں انعام میں ملی زمین بسائی اس بستی کا آپ نے یہ کیا حال کر رکھا ہے؟''

واصل آفریدی کے ساتھ ساتھ ارسل' اماں' نانو' سبھی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''انعام میں ملی چیز کی تو بندہ بڑی حفاظت کرتا ہے۔ کاغذ پر تحریر ہو تو ا
خوبصورت فریم میں جڑا کر رکھتا ہے۔ چیز کی صورت میں ہو تو کارنس پر شوپیس
طرح سجا کر رکھتا ہے اور پھر روزانہ اس کی جھاڑ پونچھ کر کے چمکاتا رہتا ہے۔ جبکہ
انعام بندے کو سوائے فخر و افتخار کے اور کچھ نہیں دیتا۔'' وہ چاروں پوری توجہ سے ا
کی طرف متوجہ تھے۔ اور اس زمین اور اس پر بسنے والے بندوں نے تو آپ کو آ
کی گزری ہوئی دو نسلوں کو بہت کچھ دیا ہے۔ یہ دنیا بھر کی آسائشیں۔ کھانے کی
بہترین غذا' پہننے کو اچھے سے اچھے کپڑے' بے شمار ڈھور ڈنگر' رہائش کیلئے خوبصور
ترین بنگلہ' سواری کیلئے موٹریں۔ اور آپ نے ان کے لئے کیا کیا۔؟''

''وہ روٹی نہیں کھاتے۔ وہ کپڑا نہیں پہنتے۔؟'' واصل آفریدی کے جوا
دینے سے پہلے ان کی پھوپھی بول پڑیں۔ ان کے ہاں کب کسی عورت کو بولنے کا کو
حق تھا۔ ان کے زمانے میں تو عورت گونگی بہری ہوتی تھی۔ کام کرتی اندر باہر چل
پھرتی رہتی' پتھر کے مجسمے کی مانند یا کسی مٹی کی مورت کی طرح۔!!

''آپ نانو! خاموش رہیں۔ میں چودھری واصل آفریدی سے بات کر رہ
ہوں۔'' نانی کو چپ کرا کے وہ پھر باپ کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ''ہم صرف روٹی
نہیں کھاتے۔ ہم صرف کپڑا بھی نہیں پہنتے۔ ہمارے گھومنے پھرنے کو ایک نہیں دو
موٹریں موجود ہیں۔ اور ان موٹروں کی آمد و رفت کیلئے کتنی اعلیٰ' پکی' چمکتی سڑک م
روڈ سے ہمارے بنگلے تک آتی ہے۔''

''نئے ماڈل کی گاڑیوں کے نئے ٹائروں کیلئے سڑک بھی تو ویسی ہی ہو



چاہیے۔ صاف ستھری' ہموار' پھسلنی' ورنہ ٹائر جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔'' اب ارسل
نے اس کی بات کاٹی۔ ''عورت ذات ہونا آخر۔ اتنا بھی معلوم نہیں۔''
ایسے چڑانے کیلئے ہنس کر اس کا تمسخر اڑایا۔

''پر اس عورت ذات کو یہ بھی بتا دو آنے والی نسل کے چودھری جی! کہ جن
کے بازوؤں کی کمائی ہوئی دولت سے ہم اپنے لئے یہ موٹریں کاریں مہیا کرتے ہیں
کیا وہ انسان ان کے ٹائروں سے بھی کم تر ہیں کہ۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے اپنے
وجود کی طرف سر سے پاؤں تک ہاتھ لہرا کر اشارہ کیا۔ ''یہ میری حالت دیکھ رہے تھے
نا تم ارسل! مین روڈ سے ان کے گھروں تک جانے والی گزرگاہ سے ہو کر میں آئی
تھی۔ اور اگر کہیں بارش ہو گئی ہوتی تو میں مٹی سے نہیں' سر سے پاؤں تک کیچڑ میں
لت پت ہوتی۔''

''سڑک کے لئے درخواست دی ہوئی ہے۔ کتنا ہی عرصہ ہو گیا ہے بن ہی
نہیں رہی۔ لگتا ہے ہماری حکومت کا خزانہ بالکل ہی خالی ہو گیا ہے۔''

''تو بابا سائیں! آپ کا خزانہ تو خالی نہیں ہوا۔ اس میں تو بلکہ ہر سال
اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ کتنا ہے بنک بیلنس آج کل آپ کا۔؟''

''اور پڑھاؤ صفیہ! اس کو۔ دیکھ رہی ہو کیسے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر بولے جا رہی ہے۔'' نانو نے پھر اس کی تعلیم کو کوسا۔

اور اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ ''اس بنک بیلنس میں سے آپ یہ
سڑک کیوں نہیں بنوا دیتے۔ آخر انہیں لوگوں کی کمائی ہوئی دولت سے آپ کا یہ
بنک بیلنس بنا ہے اور دن بدن اس کا گراف اونچا جا رہا ہے اور اسی طرح ہماری
آسائشوں کا گراف بھی بلندی کی طرف رواں دواں ہے۔ ان کے پیٹ اور ان کے
تن اگر ہماری جیسی آسودگی حاصل نہیں کر سکتے تو انہیں آنے جانے ہی کی سہولت آپ
دے دیں۔ بہت مشکل ہے اس سڑک پر دو قدم بھی چلنا۔ اور اب آئندہ سے میں بھی
تو اسی راستے سے آیا جایا کروں گی۔ بس کے ذریعے۔''

''واہ واہ۔ کیا تقریر کی ہے۔ کیا انداز بیان ہے۔ اللہ کرے زور زباں اور
زیادہ۔'' ارسل تالی پیٹنے لگا۔ ''مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا میری بہن اتنی لائق فائق ہو چکی

ہے کہ تقریری مقابلہ بھی جیت سکتی ہے۔ بابا جان! آج تو اس کو ضرور کوئی ٹرا چاہیے۔'' وہ مسلسل اس کا مذاق اڑائے جا رہا تھا۔

''دیکھئے بابا جان! اس کو منع کریں ورنہ۔''

''ورنہ کیا۔؟'' ارسل جیسے محاذ آرائی کیلئے تیار تھا۔

''نہ بھئی نہ۔ میری بیٹی کو بولنے دو۔'' وہ گود میں گھسے اس کے سر کے کو پیار سے سنوارتے ہوئے بڑبڑائے۔ ''کسی کو کیا معلوم۔ مجھے اس کی یہ مع تقریر کونسا پیغام دے گئی ہے۔ اور کونسا صراط مستقیم دکھا گئی ہے۔ یہ تو میرا انع ہے۔'' انہوں نے جھک کر اس کے سر کو بوسہ دیا۔

صفیہ اس ساری گفتگو کے دوران کچھ نہیں بولی تھیں۔ بس چپ چاپ سنتی رہی تھیں۔ آخر میں واصل آفریدی کی بڑبڑاہٹ سماعت سے ٹکرائی تو ساتھ والے صوفے پر تو تشریف فرما تھے وہ۔ ان کی طرف جھک کر ہولے۔ لگیں۔ ''ہمارے بڑے کہا کرتے تھے۔ بیٹی کو زیادہ سر پہ نہیں چڑھانا چاہیے اچھا نہیں ہوتا''

''اور بیٹے کو سر پہ چڑھانے سے انجام اچھا ہو جاتا ہے۔'' واصل ہنس کر انہیں خاندان کے ان سب لڑکوں کے نام بتانے لگے جو اکلوتے تھے او والدین نے بے شمار پیار دیا تھا' بے شمار لاڈ کئے تھے' ان گنت آسائشوں سے نواز دیا پھر یہ سب پا کر انہوں نے کیسے کیسے گل کھلائے تھے۔ اور کیسے کیسے چاند چڑھائے۔

ماں باپ کو بحث میں الجھے دیکھ کر ایمان اپنے کمرے میں جا گھسی۔ طرح صاف ستھرا تھا۔ اک طمانیت کا احساس لئے بیڈ پر دراز ہو گئی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ایمان بڑی دیر تک ارسل کے س لان میں واک کرتی رہی اور یونیورسٹی کے چھوٹے چھوٹے لطیفوں جیسے واقعا رہی۔ دونوں بہن بھائی کا وہ وقت بڑا خوشگوار گزرتا تھا جب دونوں ایک دوس ساتھ ہوتے تھے۔ اور واقعات کے ساتھ ساتھ ایمان نے سر عبدرحمان عبدالرحمٰن والا قصہ اسے سنایا تو وہ بے حد محظوظ ہوا۔

''یہ سب سے مزیدار لطیفہ ہے۔'' ارسل ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہا



خاصی مزیدار چیز لگتی ہے۔''

''سر عبدرحمان اس سے بھی زیادہ مزیدار چیز ہیں۔'' نجانے ایمان نے کس لہجے میں کہا تھا۔ ارسل چونک کر اسے تکنے لگا۔

''یار! ہمایوں خاں کا پتا نہ کاٹ دینا۔ پھوپھو نے بتایا تھا امریکہ میں رہ کر بھی وہ تمہاری محبت میں گلے گلے تک ڈوبا ہوا ہے۔''

''تم بہت خبیث ہو۔ کمینے ہو۔'' ایمان نے اسے تھپڑ مکے مارتے ہوئے اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ''جاؤ آئندہ سے تمہارے ساتھ واک ختم۔''

نانو اسی کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ دیکھا۔ وہ اور اماں بیڈ پر جڑی بیٹھیں نجانے کونسے دکھ سکھ کر رہی تھیں۔ وہ دونوں کے درمیان میں گھس کر لیٹ گئی۔ تکیے کیلئے ایک گھٹنا درکار تھا۔ نانو کا پوز پسند آیا۔ انہیں کی ران پر سر ٹکا لیا اور دونوں کی باتیں سننے لگی' بڑی دلچسپ ہوتی تھی ان ماں بیٹی کی گفتگو۔ خاندانی مسائل ڈسکس کرتے کرتے نانو کی دیورانی کی بھانجی فرتی کا قصہ چھڑ گیا۔

''فرتی بیچاری کی تو زندگی ایسی برباد ہوئی ہے کہ ایسی کسی دشمن کی بھی نہ ہو۔ عابد نے آج تک اس سے بات ہی نہیں کی۔ پہلے گھر سے بھاگا۔ نجانے شہر میں کہاں کہاں ٹھکانہ کیا۔ پھر ملک سے بھی نکل گیا۔ ولایت میں پتہ نہیں کتنے سال رہا۔ تین یا چار سال۔''

ایمان خالہ فرتی کو جانتی تھی گو ملی کم تھی لیکن اکثر ماں اور نانی اس کا ذکر کرتی رہتی تھیں۔

''وہاں کیا کرتا رہا؟'' اماں متاسف سی پوچھنے لگیں۔ وہ فرتی سے بڑی محبت رکھتی تھیں۔

''سنا ہے پڑھائی شڑھائی کرتا رہا۔ زیادہ پڑھائی بھی بندے کو خراب کرتی ہے۔'' نانو نے اپنی منطق بھی ساتھ بیان کر دی۔ پھر گھٹنوں پہ ٹکے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چور نظروں سے اسے دیکھا۔

صفیہ اس کے اس ایکشن سے کچھ جز بز ہوئیں۔ ''نہیں اماں! یہ ضروری بھی تو نہیں۔ تعلیم اچھی ہوتی ہے۔'' پر وہ ماں کو اس مسئلے پر کبھی بھی قائل نہیں کر سکی تھیں۔

"ہاں اچھی ہوتی ہے۔" لہجے میں طنز تھا "تبھی تو زیادہ تعلیم حاصل کر ا
اپنے گھریلو فرائض بھی بھول بیٹھا۔ ان کے خاندان میں کب کسی نے نوکری کی ہے۔
ہے گھر، حویلی، زمینیں، سب کچھ چھوڑ دیا ہے اس نے اور شہر میں نوکری کرنے لگا ہے۔
"ہائے۔" صفیہ افسوس کرتے ہوئے بولیں۔ "فرتی کو تو گھر بسنے کی ا
آس امید باقی نہ رہی ہو گی۔ بیچاری۔!"

فرتی خالہ کی بات نانو اور اماں کر رہی تھیں۔ ایمان نے پوری سننے کی کوشش کی لیکن نیند کچھ یوں امنڈ گھمنڈ کر آئی جیسے ساون کے بادل یکدم ہی بر سب کچھ ہی بھگو ڈالیں۔ اور وہ تن من سے پوری کی پوری بھیگ کر جیسے ڈھے گئی۔

## 10

کیسی اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ جیسے سارے آسمان کے ستارے میں اتر آئے تھے۔ زید رحمان بہت ہینڈسم اور اسمارٹ تھا لیکن عبد میں کچھ ا بات تھی۔ کوئی ایسی، جو اسے زید سے بھی نمایاں، زید سے بھی کچھ منفرد اور ممتاز کر تھی۔ اور وہ شاید آنکھوں کی یہی چمک تھی۔

زندگی سے بھرپور، خواہشات سے بھرپور آرزوئیں اور تمنائیں ان میں کرتیں۔ وہ دو آنکھیں نہیں تھیں جیسے دو قندیلیں تھیں۔ روشن قندیلیں۔!

رحمان علی خاں اس کی تصویر پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ تصویر سے بھی ان قندیلوں کی چمک پھوٹ پھوٹ کر باہر آ رہی تھی۔ ہر سو روشنیاں سی بکھ تھیں۔ وہ جب مخاطب سے بات کرنے لگتا تو ہونٹوں پر اک مسکراہٹ پھیل تھی۔ لیکن آنکھوں کی۔ ان دو قندیلوں کی چمک اور جگمگاہٹ، مسکراہٹ کھلنے بکھرنے سے پہلے ہی حملہ کر دیتی تھی۔ اس حملے سے مقابل والا بھی اپنا بچاؤ کر پاتا تھا کہ دوسرا بڑا حملہ خوبصورت ہونٹوں کی مسکراہٹ کر دیتی۔ بس۔ سامنے والا کرنے والا فوراً پسپا ہو جاتا۔ اپنا دفاع کر ہی نہ سکتا۔ چپکے سے اپنے سارے



ڈال دیتا۔

"جان بابا! شاید ہم بھی ہتھیار ڈال دیتے۔ ہم، جو پہلے ہی آپ کے مفتوح تھے۔ جنگ جاری تو رکھتے۔ ہم سے پوری طرح مقابلہ تو کرتے۔ اگر علم بغاوت بلند کیا ہی تھا تو انقلاب آنے کا انتظار تو کرتے۔ ہم سینے میں اک باپ کا دل بھی رکھتے تھے۔" رحمان علی خاں اپنی آنکھوں میں سارے جذبے سجائے انتہائی محبتوں سے اسے تک رہے تھے۔

دو دو، تین تین، چار چار ہفتے ہو جاتے تھے اسے دیکھے ہوئے۔ کس کرب اور اذیت میں وہ وقت گزرتا تھا۔ کچھ وہی جانتے تھے۔ اندر سے دل دھڑکتا رہتا۔ کہیں بھی کوئی آہٹ ہوتی، اس کی دید کی پیاسی نظریں دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ یہ یقین لے کر کہ ابھی ان ذہین چمکتی آنکھوں سے ان بوڑھی آنکھوں کا ملاپ ہو گا۔

پھر اس کی خوبصورت مسکراہٹ ان کے دل کی بستی کا محاصرہ کر کے انہیں پسپا کرے گی اور آخری ضرب کے طور پر خود پاس آ کر ان کے گلے میں طلائی بازوؤں کا ہار ڈال دے گا۔

کیسے سنہرے سنہرے اس کے بازو تھے۔ اور کیسا ان کا لمس تھا۔ گلے کے ساتھ مس ہوتے تو اندر تک ان کے سارے محسوسات ہی بدل جاتے۔ دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگتیں۔ سانس بے ترتیب ہو جاتے۔ کیسا حظ، کیسا لطف، کیسی لذت ہوتی تھی اس کے ملن میں۔ کیونکہ۔ کیونکہ۔ اس وقت وہ اکیلا نہیں ہوتا تھا۔ انہیں لگتا زید رحمان کی خوشبو اور سانسوں کی گرمی بھی ان سے لپٹ گئی تھی۔ تب جذبے دو آتشہ ہو جاتے اور وہ کتنی ہی دیر اسے سینے سے لگائے رکھتے اور لمبے لمبے سانس لے لے کر عبد اور زید دونوں کو اپنے میں سموتے رہتے۔

نگاہیں تصویر پر جمی تھیں اور وہ بڑے روح افزا اور دلخوش کن سے احساسات وجذبات میں جکڑے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عبد کی آنکھوں کی دونوں قندیلیں ماند سی پڑ گئیں۔ ان کی لو ایک دم مدھم ہوئی، ساتھ ہی نگاہوں کی چمک اور جگمگاہٹ غائب ہو گئی۔

"خدا کیلئے یہ ظلم نہ کریں۔ نہ کریں یہ ظلم۔" وہ گڑگڑا رہا تھا۔ ان سے

التجائیں کر رہا تھا۔

جس اداسی نے اس کی آنکھوں کی چمک چھینی تھی' اس کا دکھ رحمان علی خا
کے اندر تک اتر گیا۔ روزانہ ہی اترتا تھا۔ وقت کا اک اک لمحہ زخمی ہوتا تھا۔ خون ر
تھا۔ جانے کیا لذت ملتی تھی۔ وہ پھر بھی سوچوں' خیالوں اور یادوں کے ساتھ زخموں
کریدتے ہی رہتے تھے۔

"یہ ظلم نہیں ہے۔" وہ اس کے باپ تھے۔ اس کی اولاد نہیں تھے۔ لہٰ
اسے سمجھانا ان کا فرض تھا۔ مگر ان کی سننے سے پہلے ہی وہ بیتابی سے بول پڑا۔

"میرے خیال میں ظلم ہے۔" وہ بلکنے لگا۔ بے حد مضطرب تھا۔ تڑپ ا
بے قراری جوش بن گئی۔

"کسی کے ارمانوں تمناؤں کا خون کر دینا کیا ظلم نہیں ہے کسی کے حسی
خوابوں کو اس کی آنکھوں سے نوچ لینا' کیا ظلم نہیں ہے جو کسی کی پوری زندگی کو
صرف ایک بار انسان کو ملتی ہے' برباد کر دینا' کیا ظلم نہیں ہے۔ کسی کی حیات کو رو
ومنور کرنے والی اک اک کرن کو بجھا کر' اسے ہمیشہ کیلئے' تاریکیوں میں دھکیل دینا'
ظلم نہیں ہے۔؟" اس کی آنکھوں سے متضاد قسم کے جذبے جھلک رہے تھے۔

پہلے لب و لہجے میں التجا تھی۔ پھر جیسے بغاوت سی اتر آئی۔ اور اب وہ با
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہا تھا۔ بجھی موٹی قندیلوں سے نجانے کیا کھو
رہا تھا۔ "ہمارے ہاں کی یہی رسم ہے۔ اور رسم و رواج کو ظلم نہیں کہا جاتا۔" رحمان ع
خاں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ "انسان فرائض کی طرح بڑوں کے' پرکھوں کے
وضع کیے ہوئے رسم و رواج کو پورا کرنے کا پابند ہوتا ہے اور جب کوئی فرض نبھا
جائے تو وہ کئی نیکیوں کے برابر گنا جاتا ہے۔ تم بھی نیکو کاروں میں اپنا نام......"

مارے اضطراب کے جنونی سا ہو رہا تھا۔ باپ کی بات بھی پوری نہیں سنی
درمیان میں سے کاٹ کر بولنے لگ پڑا۔ "ہاہ نیکی۔ اور میں نیکو کار؟ اس سے بڑ
کوئی اور بدعت ہمارے معاشرے میں نہیں ہو گی جسے آپ نیکی کا نام دے رہے
ہیں۔"

اس نے ان رسم و رواج کو برائی کہا' جو رحمان علی خاں کے باپ دادا کر



آئے تھے۔ اور اب ان کے قبیلے کیلئے تقریباً یہ قانون کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔
انہیں غصہ آ گیا۔ وہ برادری قبیلے کے اس باغی کو آنکھیں لال کر کے گھورنے لگے۔
"کیا سلوک کروں اس کے ساتھ۔" اندر اک سوچ تھی۔ "اپنے ہی بڑوں کے بنائے
ہوئے قانون کی بے حرمتی کرنے والے اپنے فرزند کو کیسے سمجھاؤں۔؟"

"اور میں جو رسموں اور رواجوں کو مانتا ہی نہیں تو ان کا حصہ کیوں بنوں۔
میں آج سے رسم و رواج کی ان زنجیروں کو توڑنے کا اعلان کرتا ہوں۔"

باپ پنچایت کا اک سرگرم رکن تھا اور وہ گھر بھر کا لاڈلا۔ اسی زعم میں سر
اٹھائے بالمقابل کھڑا تھا۔ مگر انہیں اپنی حیثیت اور مقام کا خیال زیادہ تھا۔

"تم اس رسم کو توڑنے والے کون ہوتے ہو۔ یہ قائم رہے گی۔"

"رسم ہی ہے نا۔ قرآن میں لکھا اللہ کا فرمان تو نہیں۔ کیوں توڑ رہے ہیں
اکلوتے بیٹے کو اس رسم کے مقابلے میں۔ زندگی چھین رہے ہیں اس کی۔"

"یہ ہمارے قبیلے کا قانون ہے۔ بیٹوں کو توڑ دیا جاتا تھا' قانون نہیں ٹوٹا
کرتے۔" باپ کے لہجے میں سنگینی تھی۔ وہ کانپ گیا۔

"ماں ہوتی تو ماں کی ممتا کا سہارا لیتا۔ وہ یقیناً ممتا کا بھرم رکھتی۔ میری
خاطر آپ کے قدموں میں گر جاتی۔ اور یہ میرے ہاتھ سمجھئے وہی ہاتھ ہیں۔" نیچے بیٹھ
کر باپ کے پاؤں کو تھام لیا۔ "ان سے آپ کو بھی محبت تھی۔ انہیں کا واسطہ دیتا
ہوں۔"

"قانون کسی محبت یا ممتا کی سفارش قبول نہیں کرتا۔"

"تو پھر میں بغاوت کا علم بلند کرتا ہوں۔"

قبیلے میں رحمان علی خاں کا نام بڑا اونچا تھا۔ پنچایت اور جرگے میں سب
سے پہلا مقام ان کا تھا۔ جب تک ان کی انگلی نہ اٹھتی' ان کا سر نہ ہلتا' ان کی زبان نہ
بولتی' کوئی بھی فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جس قانون کے خلاف وہ بغاوت کی آواز بلند کر
رہا تھا' رحمان علی خاں اس کے محافظ تھے۔ پستول نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

بیٹا تو وہ بھی اسی باپ کا تھا اور معاملہ بھی زندگی بھر کا تھا۔ "سسک سسک کر
گزارنا کہاں کی بہادری ہے۔" اک جھٹکے سے گریبان چاک کر کے سینہ ان کے

سامنے کھول دیا۔

''ساری کی ساری گولیاں اتار دیں میں اپنا خون آپ کو معاف کرتا ہوں۔'' بڑی دلیری سے جسم و جاں پیش کر دیا۔

''تمہارا کیوں کروں گا۔ میرا اگر حکم نہیں مانا تو خود کو شوٹ کروں گا۔ کہ یہ ذلت میری ہے۔ نہیں برداشت کر سکوں گا۔ پھر میں نہیں ہوں گا تو جو مرضی کرتے رہنا۔''

اور بس یہی ہتھیار تھا جو ان کے کام آ گیا۔ کس قدر بے بسی تھی اس کے چہرے پر۔ اور ان ہمیشہ جگمگاتی رہنے والی آنکھوں میں ایک دم کیسی اداسی آن بسی تھی۔ رحمان علی خاں کو اب اس تصویر میں وہ آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان جگر جگر کرتی آنکھوں کی جگہ۔ جن میں اداسی' دکھ اور کرب تھا۔

''دادا جان! دادا جان۔'' مدحت بھاگی چلی آ رہی تھی۔

''میرے عابی کا فون آیا ہے۔'' وہ اس قدر جذباتی ہو رہی تھی کہ تھم ہی نہ سکی۔ تقریباً ان کی گود میں ڈھے سی گئی۔ ''انہوں نے یہ' یہاں۔'' اپنی پیشانی پر ہاتھ دھر کر بتانے لگی۔ لمبی لمبی سانسیں لے کر۔ چہرہ خوشی کے مارے تمتما رہا تھا۔ ''یہاں' انہوں نے میری پپی لی ہے۔ اور ساتھ کہہ رہے تھے صرف میری خاطر انہوں نے فون کیا ہے۔ ہائے کتنے اچھے اور پیارے میرے عابی ہیں۔ آپ جلدی سے یہاں سے میری پپی لیں۔ میں عابی کا تصور کر لوں گی۔''

وہ بہت معصوم تھی۔ اپنے عابی کیلئے بے حد جذباتی ہو جایا کرتی تھی۔ اور جب جذبوں کی یلغار میں ہوتی تو کچھ دکھائی سوجھائی بھی نہ دیتا۔ دادا کے رخساروں پہ پھیلے آنسو نظر ہی نہیں آئے۔

اس کی ڈیمانڈ رحمان علی خاں کے دل پر جہاں ایک اور زخم لگا گئی وہاں اک گہرا سکون بھی اتار گئی۔ اس کے پاس ان کے لئے اگر کچھ نہیں تھا' نہ محبت' نہ پیشانی پر محبت کی مہر' نہ نظروں کا پیار۔ پر وہ مدحت کے تو سارے جذبے پورے کر رہا تھا۔ جن کے سہاروں کی اس بچی کو بے تحاشا ضرورت تھی۔

انہوں نے [illegible]



پھول ایسا تر و تازہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ وہاں انہیں زید رحمان دکھائی دینے لگا۔ وہی آنکھیں' وہی رنگ روپ۔ دونوں ہی بھائیوں کی اس میں شبیہ تھی۔ وہ ٹکٹکی لگائے دیکھتے چلے گئے۔

ایک کو موت نے جدا کر دیا دوسرے کو رسم و رواج نے چھین لیا۔ اور وہ خالی دامن خالی ہاتھ رہ گئے۔

اب ان کے پاس کونسا اثاثہ تھا جینے کیلئے۔ بس یہ سامنے لگی دو تصویریں۔ گونگی' بہری۔ جو نہ بول سکتی تھیں اور نہ انہیں سن سکتی تھیں۔ اور نہ ان کے گلے لگ کر زندگی کی حرارت بخش سکتی تھیں۔ جس کو وہ ترس رہے تھے۔

''دادا۔ دادا جان۔''

رحمان علی خاں مسلسل اس کے چہرے کو گھور رہے تھے اور سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں گم تھے۔ مدحت کی پکار پر جب وہ بولے نہیں تو وہ گھبرا کر اٹھ بھاگی۔

''ماما۔ ماما۔ جلدی سے آ کر دیکھیں دادا جان کو کیا ہوا ہے۔؟''

فرحت تیز تیز قدموں سے چل کر ان کے پاس آ گئی۔ مدحت بھی ساتھ ہی تھی۔ اب دادا جان نے صوفے کی بیک پر سر ٹکایا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ایک ہاتھ سینے پہ دھرا ہوا تھا اور دوسرا گود میں تھا۔

''تم نے کوئی بات کر دی ہو گی۔ ہزار بار تمہیں منع کیا ہے دادا کے سامنے فضول باتوں سے احتراز کیا کرو۔''

فرحت گھبراہٹ میں مدحت کو ہی ڈانٹنے لگیں۔ ''چلو جاؤ جلدی سے دادا کی وہ زبان کے نیچے رکھنے والی گولیوں کی شیشی اٹھا لاؤ۔''

مدحت ادھر بھاگی۔ وہ خود ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ''کمبخت یہ دل کا روگ بھی برا ہوتا ہے۔ لگ جائے تو نہ زیادہ غم برداشت کرنے دیتا ہے اور نہ زیادہ خوشی کے لمحات کو انجوائے کرنے دیتا ہے۔ اب پتہ نہیں کس سوچ نے انہیں....''

فرحت کی اپنی سوچ ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ مدحو گولیوں کی شیشی لے کر آن حاضر ہوئی۔ جلدی جلدی ان کی زبان کے نیچے گولی رکھوائی۔

''کتنی بار آپ سے کہا ہے یہ شیشی پاس رکھا کریں۔'' ساتھ ہی ان کی

نظروں کے زاویے کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائیں۔ ''یہ تصویریں تو آج ہی یہاں سے اترواتی ہوں۔''

''ساتھ مجھے زندہ رکھنے کیلئے یہ گولیاں فوراً مہیا کرتی ہو اور ساتھ ہی زندگی چھیننے کی بات بھی کرتی ہو۔ کیسی بیٹی ہو۔؟'' گولی کا اثر ہوا۔ کچھ طبیعت بحال ہوئی۔ تو سب سے پہلے فرحت سے یہی بات کی۔ فرحت مسکرا پڑی۔

''اولاد ایسی ہی ہوتی ہے بابا جان! والدین کو زندہ بھی دیکھنا چاہتی ہے اور کبھی اپنے اعمال و افعال سے زندگی چھین بھی لیتی ہے۔ بڑی بے درد ہوتی ہے۔''

''نہیں نہیں۔ بے درد نہ کہو۔ ظالم میں خود ہی ہوں۔''

''وہ تو آپ ہیں۔'' فرحت ان کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ کر ان کا بازو دباتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھیں۔

''تم بھی ہمیں ہی ظالم کہہ رہی ہو۔'' گلہ آمیز نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

''تو کیسے نہ کہوں۔ آپ بھی تو ہم زندہ انسانوں سے زیادہ ان تصویروں سے محبت کرتے ہیں۔ جو آپ کیلئے صرف دکھ درد کی سوچیں ہی مہیا کرتی ہیں۔ آپ کا روگ ہی بڑھاتی رہتی ہیں مگر آپ کے روگ کی دوا کبھی نہیں بنیں۔''

''بنتی ہیں۔ بنتی ہیں۔ سچ جانو تو مجھے زندگی کی طرف بھی یہی لاتی ہیں۔''

اب ان کی طبیعت پوری طرح بحال ہو گئی تھی۔ وہ مسکرانے لگے تھے۔

''عابی کی تصویر کبھی غور سے دیکھی ہے؟ کتنی زندگی، کتنی روشنی ہے اس کی آنکھوں میں۔''

''ہے نہیں۔ تھی۔ پہلے ہوا کرتی تھی۔'' فرحت نے ان کی تصحیح کی۔

''ہاں۔ ہوا کرتی تھی۔ اور میں چاہتا ہوں۔ اس کی آنکھوں کی یہ جگمگاہٹیں کسی طرح واپس لوٹ آئیں۔ یہ دیکھنے کیلئے میں زندہ ہوں۔ اور شاید زندہ رہوں گا۔''

''اور میرے لئے۔؟ میرے لئے زندگی کی کب خواہش کریں گے۔'' دونوں کو ہی پاس بیٹھی مدحت کی موجودگی کا خیال نہیں رہا تھا۔ ایک دم ہی چونکے تھے



اس کی بات سن کر۔

''ارے دادا کی جان!'' انہوں نے اپنے قدموں میں فلور کشن پر بیٹھی مدحت کو جھک کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ ''تو تو ہے ہی میری زندگی، میری جان، میری روح۔ ان کو بھی تو تیری ہی خاطر سوچتا ہوں۔ تیرے مستقبل کے لئے۔ تیری شادمانیوں کے لئے۔ تیری کامرانیوں کیلئے۔ ہمیں پتہ ہے۔''

وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لئے بڑی سنجیدگی سے کہتے چلے گئے۔

''تمہارا دل چاہتا ہے تمہارا عابی ہر وقت تمہارے پاس رہے۔ تبھی ہم بھی اس کی تمنا کرتے ہیں۔ تمہارا دل چاہتا ہے تمہارا عابی ہر وقت خوش رہے۔ تبھی ہم بھی اس کیلئے خوشیوں کی آرزو کرتے ہیں۔ دیکھا ہے سامنے اس کی تصویر میں۔ کیسی جگمگاتی۔ روشنیاں بکھیرتی اس کی آنکھیں ہیں۔ بس۔ انہیں روشنیوں اور جگمگاہٹوں کی ہم دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ لوٹ آئیں۔ سب تمہاری خاطر۔ سب تمہارے لئے دادا کی جان۔! دادا کی زندگی۔!!''

## 11

سر عبدالرحمان رول کال لے رہے تھے۔ ایمان آفریدی کے نام پر نظریں اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔ پھر انگلی سے اسے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔

''یہ پچھلے تین چار دنوں سے آپ کہاں تھیں۔؟ بغیر لیو کے۔ بغیر کسی درخواست کے۔''

''وہ۔ وہ سر!۔ میں۔ میں۔'' ایمان کو اس باز پرس کی قطعی توقع نہ تھی۔

''ماہم سے میں نے پراکسی بولنے کو کہا تو تھا۔'' گھبراہٹ میں پتہ ہی نہیں چلا کیا کہے جا رہی تھی۔ ''معلوم نہیں اس نے کیوں نہیں۔'' پھر خیال آیا۔ یہ لاقانونی کھلم کھلا تو ہوتی نہیں۔ چوری چھپے کی بات سر کے سامنے بول رہی تھی۔ یکا یک گڑبڑاتے ہوئے ہونٹ دانتوں میں دبا کر چپ ہو گئی۔ اپنی صفائی پوری طرح پیش ہی نہ کر

سکی۔ سارے اسٹوڈنٹس اس کی بات اور گھبراہٹ کے اس انداز پر محظوظ ہوتے ہو۔ زور سے ہنس دیئے۔ وہ مزید ندامتوں، شرمندگیوں میں ڈوب گئی۔

''آپ ذرا اس پیریڈ کے بعد برائے مہربانی آفس میں تشریف لائیے گا۔''

صاف ظاہر تھا سر عبد کا یہ مؤدبانہ انداز اک طنز لئے تھا۔ اسٹوڈنٹس پھر ہنس پڑے۔ اور ایمان آفریدی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر پانی لئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ سر باقی رول کال لینے لگے۔

''تمہیں میں نے پراکسی بولنے کو کہا تھا نا۔'' چپکے چپکے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی ماھم کو کہنی سے ٹھوکا دیا۔

''خدا کی قسم میں نے تینوں دن بولی تھی۔'' وہ بھی نظریں جھکائے مدھم لہجے میں اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے لگی۔

''سائیلنٹ۔ سائیلنٹ پلیز۔!'' سر عبد کی آواز پھر ابھری۔

دونوں گھبرا کر انہیں تکنے لگیں۔ ان کی آواز تو ان کے ساتھ بیٹھی۔ تیسری لڑکی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ اتنی آہستہ گفت وشنید کر رہی تھیں۔ سرگوشیوں کی مانند۔ پھر سر نے کس کیلئے یہ خاموش ہو جانے کا حکم صادر فرمایا تھا؟ دیکھا تو سر کی نگاہیں انہیں پر جمی تھیں۔ اور وہ ان دونوں کے ہونٹوں کی جنبش سے ہی نتیجہ اخذ کر بیٹھے تھے کہ وہ بول رہی تھیں۔ کچھ ان کی عقل وفہم بھی بڑی تیز تھی۔ ان کی وارننگ کے بعد یقیناً دونوں میں جھگڑا ہونا لازم تھا۔ اور وہ اسی اندازے کے ساتھ انہیں خاموش رہنے کی تلقین کر گئے تھے۔

ماھم کی اندرونی کیفیت کیا تھی؟ اس ساری بات نے کیا تاثر چھوڑا تھا؟ ایمان کو تو اندازہ نہیں تھا۔ البتہ خود اس پر جو گزر گئی تھی، وہ ناقابل بیان تھا، پوری کلاس کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہی تھی۔ اس نے جہاں جہاں تعلیم حاصل کی ادارے کے اصولوں اور قوانین کے خلاف کبھی کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔ یہ اس کا پچھلا ریکارڈ تھا صاف وشفاف۔ نہ کوئی غلطی، نہ کوئی سزا۔

اور آج بھی۔ یہ پراکسی بولنے والا معصوم سا جرم، جو اس سے سرزد ہو گیا تو ماھم ہی کی ترغیب دینے پر ہوا تھا۔

''اب ایک دن کی چھٹی کیلئے درخواست وغیرہ دیتی پھرو گی۔ تم جاؤ گھر۔ میں تمہاری پراکسی بول دوں گی۔''

وہ دوسری بات تھی اسے نانو کے اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے ایک دن مزید وہاں رہنا پڑ گیا تھا۔ ایک دن کی درخواست دے جاتی تو دوسرا دن بھی کور ہو جاتا۔ لیکن یہاں تو۔''اوہ خدایا! یہ کیا ہو گیا۔؟'' سارا پیریڈ وہ بیٹھی پریشان ہی ہوتی رہی۔ سر عبد نے کیا پڑھایا، کیا بتایا سمجھایا۔ وہ نہ سن سکی اور نہ کچھ سمجھ سکی۔ بس بار بار اڈے چلے آنے والے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پیتی رہی۔ دل چاہ رہا تھا ماھم کو دو چار چھ کہنی سے زور زور کے ٹھوکے مارے، اتنا زور سے کہ وہ درد سے بلبلا اٹھے۔ پھر ایمان اسے بتائے کہ کچھ اتنی ہی تکلیف میں اس نے اسے مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکی۔ وہ اس کی اچھی دوست تھی۔

ایمان جب بھی نگاہ اٹھاتی۔ سر عبد انہیں دونوں کو واچ کرتے ہوئے نظر آتے۔ شکر کیا جب لیکچر ختم ہوا۔ سارے اسٹوڈنٹس باہر نکل گئے۔ سب سے آخر میں وہی دونوں رہ گئی تھیں۔ ایمان روئے جا رہی تھی اور ماھم قسمیں کھا کھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے اس سارے معاملے میں کوئی بے ایمانی نہیں کی تھی۔ اور وہ کوئی بھی بددیانتی یا فراڈ اس کے ساتھ کر بھی کیسے سکتی تھی جبکہ وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔

''چلو شاباش! اٹھو اب۔'' آخر میں وہ اسے بچوں کی طرح پیار کرنے لگی۔ پھر ایمان کی حالت دیکھ کر اور کچھ نہیں سوجھا تو سر عبد کی شان میں خوب دل کھول کر بڑی شان سے بدتمیزیاں اور گستاخیاں کرنے لگی۔

''میسنا۔ گھنا۔ الو سا۔ اس دن اور پھر کل میں نے پراکسی بولی تو سر جھکائے اس طرح بیٹھا رہا کہ مجھے یہی تاثر ملا۔ سب ٹھیک ہے۔ تمہاری حاضری لگ گئی ہے۔ اس وقت نظر بھی نہیں اٹھائی۔ اور آج کیسے انگلی اٹھا کر کھڑے ہونے کا حکم صادر فرما دیا۔'' ساتھ ہی ڈری ڈری سی نگاہ اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھ لیا۔ کوئی آ تو نہیں رہا تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ تسلی ہو گئی تو پھر بولنے لگ پڑی۔

''اس سے بچ کر رہنا پڑے گا۔ بہت چالاک ہوشیار ہے۔ میں تو کہتی ہوں

اس چالاکو سے تو بہتر تھا کہ کوئی سچ مچ کے سر مولوی عبدالرحمٰن آ جاتے۔ اس نے تو ان مولوی صاحب سے بھی زیادہ ہماری آزادیاں سلب کر رکھی ہیں۔ ہم اس کے پیریڈ میں پراکسی بھی نہیں بول سکتے۔'' وہ بڑبڑاتی رہی اور ایمان کی چیزیں سمیٹتی رہی۔

''چلو اٹھو ناں۔ تم آفس میں نہ پہنچیں تو نجانے اور کیا مصیبت کھڑی کر دے۔ مجھے اپنا تو کوئی فکر نہیں۔ تم البتہ اک اچھی اسٹوڈنٹ ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی بے اصولی یا لاقانونیت منسلک نہیں ہونی چاہیے۔''

ماھم ایمان کے ساتھ ساتھ آفس تک آئی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ شدید قسم کے اضطراب میں مبتلا تھی۔ ماھم اسے تسلیاں دے رہی تھی۔

''تم بھی چلو۔'' وہ رقت بھری آواز میں بولی۔ ''کیا معلوم اب کوئی اور بھی فرد جرم عائد کر دیں۔'' آنسو بھر ٹپکنے لگے۔ ویسے ماھم کی طرح اس نے حد ادب کراس نہیں کی تھی۔ ''اس دن اچھے بھلے دوستوں کی طرح باتیں کر کے گئے تھے۔ پھر اس کے بعد بھی کلاس میں نارمل ہی رہے۔ کتنی عزت کرتی تھی ان کی۔ ان کے ہاتھ پہ بندھی ہوئی پٹی دیکھ دیکھ کر تڑپتی تھی۔ بے قرار ہوتی تھی۔ ہر وقت دل میں ان کا خیال سمایا رہتا تھا۔ کتنی بار تم سے کہا تھا کہ چلو ان کی عیادت کر آئیں۔ دوست بنے ہیں۔ دوستی نبھائیں۔ ہمارا بھی کوئی فرض ہے۔ وہ تو تمہیں ہی وقت نہ ملا تو جا نہ سکیں۔ اور آج۔ پتہ نہیں کہاں سے اتنی ساری دشمنی ہم دوستوں کے بیچ آ گئی۔''

آفس تک جاتے ہوئے ایمان آفریدی مسلسل بولے گئی۔ یہ پتہ ہی نہیں تھا کیا کیا کہے جا رہی تھی۔ ماھم اسے سن سن کر کبھی مسکرانے لگتی، کبھی دکھی ہو جاتی۔ اور اب وہ دونوں ان کے آفس کے بند دروازے کے باہر کھڑی تھیں۔

ایمان کے سارے وجود پر اک لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر ماھم کی منت کی۔ ''میرے ساتھ تم بھی چلو پلیز! میری دوست ہو ناں۔''

''کہا نا میں نہیں جاؤں گی۔ تم جانتی ہو میں بہت منہ پھٹ ہوں۔ کافی گستاخ اور بدتمیز بھی ہوں۔ نجانے تمہاری محبت میں کیا کہہ بیٹھوں۔ اور وہ تمہارے ہی لئے برا ہو جائے۔''

صاف جواب دیتے ہوئے ماھم نے دروازہ کھول کر آہستہ سے اسے اندر



دھکیل دیا۔ اندر قدم دھرتے ہی ایمان نے جھکے سر سے چوری چوری نظریں گھما کر وہاں کا جائزہ لیا۔ صد شکر کہ اس وقت آفس میں سر عبید کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ورنہ پتہ نہیں مزید کس کس کے سامنے عزت رلتی۔ اس بندے سے تو کچھ بعید نہ تھا۔

جب وہ سر جھکائے بیٹھے کچھ لکھنے میں مصروف رہے۔ اس کی آہٹ پر بھی نہیں چونکے نہ سر اٹھا کر دیکھا تو آخر ایمان گھبرا کر بول پڑی۔ ''مے آئی کم ان سر۔؟''

''آپ اندر تو آ چکی ہیں۔ اب اجازت کیسی۔؟'' اسی طرح جھکے جھکے سر کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''بیٹھئے۔''

اوہ! پھر غلطی ہو گئی۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کی ہر بات پر کیسے گرفت کرتے تھے۔ قول و فعل میں اتنا تضاد۔ زبان سے دوست کہتے تھے اور کلاس میں سلوک کیسا کرتے تھے۔ پہلے اس دن کاشف کے معاملے میں۔ پھر یہ پراکسی والا مسئلہ ہو گیا۔ ساری سختیاں پابندیاں اسی کیلئے تھیں۔ یہ کیسی ان کی دوستی تھی۔؟

وہ دل ہی دل میں شکایات کا دفتر کھولے بیٹھی تھی۔ اور سر نے فائل پرے رکھ کر رجسٹر کھول لیا تھا۔ ایمان نے چور آنکھوں سے دیکھا۔ شاید اس کی پچھلی حاضریوں کو بھی غیر حاضریاں بنانے لگے تھے۔

دوستوں کی فہرست میں سب سے اوپر نام اس کا تھا اور اب شاید دشمنی میں بھی ٹاپ پہ جانے کا ارادہ تھا۔ پر کیوں۔؟ یہ بڑا سا سوالیہ نشان نگاہوں کے سامنے آ کر ناچنے لگا۔ کیا پراکسی بولنا اتنا بڑا گناہ تھا۔ اور یہ گناہ آج تک اس کے سوا کسی اور نے کیا ہی نہیں تھا۔؟ سر کے ناطے سے وہ اس قدر سخت اور کٹھور تھے کہ کسی طور معاف ہی نہیں کر سکتے تھے۔ مجرموں کی طرح سرنگوں تھا اور سوچے ہی جا رہی تھی۔ ''کہاں تھیں اتنے دنوں سے۔؟'' اسی طرح جھکے سر سے کچھ لکھتے لکھتے بولے تھے۔ ''پراکسی بلوا دینے کا مطلب جانتی ہیں۔؟ سراسر کسی کو پھنسوانا۔''

وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ جو آنسو ماھم کی تسلیوں دلداریوں سے تھم گئے تھے۔ وہ پھر بہنے لگے۔

''کیا بگاڑا تھا میں نے آپ کا۔؟''

''جی۔ جی۔؟''

''کہیں کسی کو قتل کر دیتیں یا کسی ڈکیتی میں ملوث ہو جاتیں تو میں آپ کو کہاں سے حاضر .....''

بولتے بولتے انہوں نے سر اٹھایا۔ ایمان آفریدی حیرتوں میں ڈوبی، بھیگی آنکھوں سے بس انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ رخساروں پر اک تواتر سے آنسو بہ رہے تھے۔ عجیب ہی نظارہ تھا۔ ''ارے۔!'' ان کی آواز وہیں تھم گئی۔ جملہ نامکمل رہ گیا۔ اور وہ اسے دیکھتے ہی چلے گئے۔

وہ خاموش ہوئے تو ایمان کی ساری حسیات جاگیں۔ نظر سے نظر ملی۔ یہ یہ ان کی آنکھیں۔ اداسی کی بجائے وہ تو روشنیوں سے معمور تھیں۔ اور لبوں کے کونوں میں مسکراہٹیں دبکی بیٹھی تھیں۔

''ہائیں۔'' وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوگئی۔ ''یہ۔ یہ مذاق تھا۔؟''

وہ ہنس پڑے۔ مدھم سی لے میں۔ ''تو آپ کیا سمجھیں۔؟ سچ مچ آپ کو سزا دینے لگا ہوں۔؟''

''آپ سنجیدہ تو اسی طرح تھے۔'' ان کی نگاہوں کی تپش سے گھبرا کر ایمان نے نظر جھکا لی۔

''یار! دوست ہوں آپ کا۔ کیا مجھے مذاق شذاق کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔؟'' انتہائی بے تکلفی اور اپنایت سے پوچھ بیٹھے۔ ہونٹوں میں دبکا ہوا تبسم واضح ہو کر سارے چہرے پر بہار کا موسم پیش کر رہا تھا۔ جو پہلے اکثر خزاں زدہ رہتا تھا۔ بے شک مسکرائیں یا سنجیدہ ہوں۔ اور وہ اس روپ میں بھی اسے متاثر کر گئے۔ دل ہی دل میں انہیں سراہتی ہوئی پھر بیٹھ گئی۔

''مگر آپ نے تو کہا تھا کلاس میں استاد اور شاگرد والا ناطہ ہوگا۔'' وہ جلد جلد اپنے رخسار صاف کرنے لگی۔

''وہ دراصل اتنے دنوں بعد آپ کو دیکھا تھا۔ سارے اصول بھول گیا۔'' بظاہر خجل سا ہو کر بولے تھے۔ لیکن چہرے پر روشنیاں سی پھیل رہی تھیں۔

''آپ بھی تو کلاس کے علاوہ کہیں اور نظر ہی نہیں آتیں۔ یہ دیکھیں بندھی ہوئی۔ کب تک باندھے رکھوں۔ آپ عیادت کیلئے بھی نہیں آئیں۔ پھر اتنے دن غائب رہیں۔ بغیر کچھ بتائے۔ اچھی دوست ہیں۔ دوستوں کی محبت کو اس طرح نہیں آزمایا کرتے۔''

وہ بولے جا رہے تھے۔ یوں جیسے کوئی مریض ڈاکٹر کو دیکھ کر تفصیل سے اپنا حال بیان کرے۔ اور وہ ہکا بکا سامنے بیٹھی تھی۔ خوبصورت آنکھوں میں حیرانیاں اتری ہوئی تھیں۔ جو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ گالوں پر ابھی موتی لڑھک رہے تھے۔ اب گلاب کھل اٹھے تھے۔ یہ سب کچھ سننا اچھا بھی لگ رہا تھا۔

''یہ کس مقام پہ تم نے مجھے لا کھڑا کیا میرے دوست۔؟ تمہارے اور میرے درمیان جنس کا فرق ہے۔ میں کہیں کوئی اور مطلب نہ اخذ کر بیٹھوں۔'' دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر اپنے مچلتے فطری جذبوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی۔

''آئندہ کلاس سے کبھی اتنے دن غائب نہیں رہنا۔ ورنہ۔''

''ورنہ کیا۔؟'' ایمان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ اس کے بولے ہوئے جملے نجانے اسے کونسا اعتبار بخش گئے تھے کہ وہ آپ ہی آپ ان حیرتوں سے نکل آئی۔ ''پچھلی ساری حاضریوں کی غیر حاضریاں کر دیں گے۔؟'' اندر کی لڑائی بھی شاید جیت گئی تھی۔ ''کیا مطلب۔؟'' وہ سمجھے نہیں۔

''ابھی آپ کو رجسٹر پر کچھ مارک کرتے دیکھ کر میرے دل میں یہی خیال آیا تھا کہ آپ بطور سزا ایسا کرنے لگے ہیں۔''

عبد کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ''پسند آیا آپ کا خیال۔'' بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا۔

''کیا مطلب۔ کہ آپ مجھے یہ سزا بھی دے سکتے ہیں۔؟''

''ہاں۔ کیوں نہیں۔'' وہ شوخی پر آمادہ رہے۔ اس کی آنکھوں میں جب حیرت اتر آتی تھی تو وہ بہت منفرد لگنے لگتی تھی۔ ان کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ''بے حد بیوقوف ہیں آپ۔'' پھر چند لمحوں بعد اپنا سر جھٹکتے ہوئے بولے۔ لہجے میں عجیب سے جذبوں کی گھلاوٹ تھی۔ ''آپ نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' وہ بڑبڑائے۔

"جی کیا۔؟" وہ سن کر بھی انجان بن گئی۔ پر اندر کی حالت پھر دگرگوں ہونے لگی تھی۔ اس لیے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شولڈر بیگ میز پر سے اٹھا کندھے پر لٹکایا۔

"اگر آج میری عیادت کے لئے نہیں آئیں نا تو پھر کل کے پیریڈ میں کچھ ہو گا' اس کیلئے مجھے ذمہ دار مت ٹھہرانا۔" بڑے مان اور اعتماد سے بھری دھمکی تھی۔

دو قدم اٹھائے تھے ایمان ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس کی طرف دیکھا۔ بڑا دلکش سا تبسم چہرے پر بکھرا تھا اور آنکھیں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ عابی کی کہانی تو ادا ان آنکھوں سے شروع ہوئی تھی۔ مگر یہ کیا۔؟ وہ اس طرح بھی دل میں اترا جا رہا تھا۔ ہاں۔ وہ اب بھی اچھا لگ رہا تھا۔ ایمان کے قدم ڈول گئے۔ ہائے اس نامراد بے ایمان دل کا کیا کروں۔؟

تبھی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ مگر سامنے بیٹھا شخص خاصا ہوشیار اور سمجھدار تھا۔ ایک دم اس کے چہرے کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ اور اس پر سنجیدگی نے احاطہ کر لیا۔ "اب آپ جا سکتی ہیں۔ آئندہ خیال رکھئے گا۔ اور جو کچھ میں نے کہا اس پر عمل بھی کرنا ہو گا۔"

ساتھ ہی آواز اور لہجے میں سختی در آئی۔

"بہروپیا۔!" بے اختیار ایمان کے منہ سے نکلا۔ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بھی ہونٹ بھینچ بھینچ کر اپنی مسکراہٹ چھپائے جا رہے تھے۔

دروازہ کھلا' پھر بند ہو گیا۔ اندر کوئی نہیں آیا۔ "اچھا نام دیا ہے مجھے۔" وہ بولے۔ "سوری سر! بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔ ویسے ماھم......"

"اونہوں۔!" سر عبد نے اس کی بات وہیں قطع کر دی۔ "کوئی اپنی بات کریں' کوئی میری کریں۔ کسی تیسرے کا ذکر نہیں ہو گا۔"

"کیوں سر۔؟"

"ضرورت ہے کوئی۔؟ ہم کیا کافی نہیں ہیں۔؟"

عجیب سا لہجہ تھا۔ عجیب سا انداز تھا۔ کچھ جذبے آنکھوں میں چمک رہے



تھے۔ کچھ بے کہے ہونٹوں پر لرز رہے تھے۔

ایمان گھبرائی' سٹپٹائی' پھر رخ موڑ کر تیز تیز قدموں سے چل دی۔ "آج کا وعدہ یاد رکھنا۔"

عبدرحمان کی جذبات میں ڈوبی' بھیگی آواز سماعتوں سے ٹکرائی مگر کوئی بھی جواب دیئے بنا ایمان دروازہ کھول کر آفس سے نکلی چلی گئی۔

## 12

کہہ تو وہ صحیح رہا تھا۔

بہت ہی مناسب۔

کہ ہمایوں خاں کو کسی امریکن لڑکی سے شادی کر لینا چاہیے تھی۔

توفیق کا مشورہ اسے بہت پسند آیا تھا۔

بلکہ نہ صرف پسند یہ اس کی اک اہم ضرورت بھی تھی۔

اس کے لئے جلد از جلد گرین کارڈ حاصل کرنا اشد ضروری تھا۔

پچھلے پندرہ دنوں سے وہ ذہنی طور پر پوری شدتوں کے ساتھ اس کام کے لئے سرگرم عمل تھا۔ اس کی گرل فرینڈز کی تعداد کافی تھی۔ کچھ سے صرف ہیلو' ہائے' تھی کچھ کے ساتھ کافی کلوز تھا۔ قربتوں اور فاصلوں کا کھیل تو روز ہی ہوتا تھا۔

سبھی کے متعلق ہمایوں نے سوچ ڈالا۔

ایٹا سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کے ساتھ شادی کیسی رہے گی۔؟

خوبصورتی کے لحاظ سے تو وہ بہت اٹریکٹ کر رہی تھی۔

ہمایوں خاں خود بھی تو خاصا ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔ جوڑی اچھی بن سکتی تھی۔ لیکن اس کے باقی بوائے فرینڈز۔؟ جتنی زیادہ خوبصورت تھی اتنے ہی زیادہ اس کے بوائے فرینڈز تھے۔

پر یہ بھی اسے یقین تھا کہ اس کے سامنے جب وہ اپنا پروپوزل رکھے گا تو وہ

دوسرے سب فرینڈز پر اسے ترجیح دے گی۔ کیونکہ وہ کئی بار زبان سے اس کیلئے پسندیدگی کا اظہار کر چکی تھی۔ اس کی وجاہتوں اور ذہانتوں کی قائل بھی تھی اور معترف بھی تھی اپنے دوسرے فرینڈز کے مقابلے میں۔ جبکہ وہ سب اس کے ہم مذہب تھے اور ہم وطن بھی۔

مزید کچھ بھی سوچے بغیر ہمایوں ایٹا کو منتخب تو کر لیتا لیکن اس کا دل یہ سوچ سوچ کر پھڑپھڑائے جا رہا تھا کہ وہ خود اس کے ساتھ کیسے نبھاہ کر پائے گا شادی کے بعد وہ اپنے فرینڈز سے اسی طرح ملے گی تو وہ اپنی فطرت' اپنے مذہب اپنی پاکستانی معاشرت کے مطابق بھلا کیسے برداشت کرے گا۔

اور اپنا یہ مسئلہ اس نے پھر توفیق کے سامنے لا رکھا' پہلے تو وہ بڑی دیر ہنستا رہا۔ پھر اس کا تمسخر اڑانے لگا۔

''تم بالکل احمق ہو۔ گرین کارڈ کی خاطر کچھ مدت کیلئے شادی کرنے جا رہے ہو اور سوچ بچار ایسے کر رہے ہو جیسے عمر بھر کا بندھن باندھنے لگے ہو۔''

ہمایوں خاں نادم سا ہو گیا۔ ''ٹھیک کہہ رہے ہو تم' لیکن پھر بھی۔ جتنی بھی دیر شادی رہی وہ میری بیوی کی حیثیت سے ہی میرے ساتھ وابستہ رہے گی نا۔ تب بھی شاید میں ایسا سب کچھ سہار نہ سکوں۔''

''تو پھر کسی اور کے متعلق سوچ لو۔ خوبصورتی کے ساتھ تو ایسے ایسے مسائل پیدا ہوں گے ہی۔ کہ اس ملک کی معاشرت ہی ایسی ہے۔''

''ایٹا کے علاوہ سارہ ہے۔ لیکن نہیں یار! وہ بڑی احمق سی لڑکی ہے۔''

''میرا خیال ہے احمق اچھی رہے گی۔ چھوڑتے وقت آسانی ہو گی۔''

''لیکن جتنا وقت اکٹھا گزرے گا' وہ تو میں ہر لمحہ کوفت میں ہی مبتلا رہوں گا ناں۔ وہ حماقتیں کرتی رہے گی اور میں کڑھتا رہوں گا۔ کہ میرا واسطہ کس قسم کی بیوی کے ساتھ پڑ گیا۔ آخر سب دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے سامنے بھی تو عزت بے عزتی کا سوال ہو گا۔ یہاں تو سب اسے میری حقیقی بیوی ہی سمجھیں گے نا۔''

حقیقی بیوی کی اصطلاح سے توفیق خاصا محظوظ ہوا۔ بہت ہنسا۔ خوب قہقہے



''چلو اس کو بھی چھوڑو۔ کوئی اور۔؟'' توفیق دل سے چاہتا تھا کہ اس کا مسئلہ حل ہو جائے۔ ''ازابیلا ہے۔ تم اس سے مل چکے ہو پہلے۔ میرے ساتھ ہی۔''

''تمہارے ساتھ' تمہاری وساطت سے تو میں کئی لڑکیوں سے مل چکا ہوں۔'' توفیق مسکرایا تو ہمایوں پھر خجل سا ہو گیا۔

''یار! یوں مت دیکھو۔ بنیادی طور پر میں اک شریف انسان ہوں۔ بس ذرا یہاں کی طرز معاشرت نے کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے۔''

''تم جیسے شریف لڑکوں کے لئے ہی ایسے مسائل یہاں جنم لیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں۔'' توفیق نے شریف پر زور دیتے ہوئے اک آنکھ دبائی تو ہمایوں بے اختیار ہنس پڑا ''انسانی فطرت یہی ہے یارا۔''

''ہاں یہی ہے۔'' توفیق اس کے ساتھ متفق تھا پوری طرح۔

''تم کچھ فیصلہ کرو۔ پھر مجھے اک ضروری کام ہے۔''

''ازابیلا کی بات کر رہا تھا۔''

''اک ازابیلا کیا۔ مجھے یقین ہے تم پورے امریکہ کی تمام کنواری لڑکیوں کے متعلق سوچ ڈالو گے اور تم کسی ایک پر پھر بھی ٹک نہیں سکو گے''۔

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔'' ہمایوں کو توفیق کی اپنے متعلق رائے کچھ پسند نہیں آئی مگر اس نے ظاہر نہیں کیا۔ توفیق کے علاوہ یہاں اس ملک میں اس کا کوئی اور مشورہ کار بھی تو نہیں تھا۔ لہذا وہ اس کے ساتھ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''ازابیلا سیدھی سادی شکل وصورت کی ہے۔ لیکن ذہین بہت ہے۔ بڑی اچھی جاب پر فائز ہے اور خاصی ہینڈسم سیلری ہر ویک اس کے ہاتھ میں آتی ہے۔''

''تو اچھا ہے نا۔ نہ صرف اپنا بلکہ تمہارا خرچ بھی اٹھائے گی۔''

''خرچ کا تو مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' ہمایوں الجھ سا پڑا۔ کس مشکل میں پھنس گیا تھا۔ ''پھر آخر تمہارا مسئلہ ہے کیا۔ پچھلے دس پندرہ دنوں میں تم نے مجھے بیسیوں لڑکیوں سے متعارف کرایا ہے۔ کچھ سے زبانی زبانی۔ کچھ سے ملوایا بھی ہے۔''

''بھئی شادی کا معاملہ ہے۔ آخر کوئی ایویں سی پکڑ کر تو گھر میں نہیں بٹھا لینی۔''

''رہے نا آخر پاکستانی کے پاکستانی۔ دقیانوسی۔ فرسودہ خیالات کے ما
پاکستان میں ہی بیوی اس طرح تلاش کی جاتی ہے۔ اور وہ بھی ماں بہنیں کرتی ہ
کیونکہ گھر میں بٹھا لینی ہوتی ہے۔ یہاں ایسا معاملہ نہیں ہے۔'' آخر توفیق نے
سمجھایا۔ ''یہاں تو بس جو دل کو بھائی یا پھر حالات کے مطابق سوٹ کی۔ اسے پ
کر ڈالا۔ پھر اگر دونوں میں معاملہ ہو گیا تو چرچ چلے گئے۔ پھر جب تک ساتھ
سکے' چلے۔ ورنہ ڈائیوورس لے لو۔ کچھ قانونی تقاضے پورے کرو لینے دینے کے ا
اپنا راستہ پکڑو۔ قصہ ختم۔''

توفیق بھی آخر پاکستان کا باشندہ تھا۔ سارے رسم و رواج سے واقف
امریکہ بھی آئے اسے عرصہ دراز ہو گیا تھا۔ یہاں کی معاشرت کو بھی اچھی طرح
چکا تھا۔ ''یہاں نہ اس طرح لڑکی ڈھونڈی جاتی ہے اور نہ خاندانوں کی اور نہ لوگو
اور ان کی ذات پات کی چھان بین کی جاتی ہے۔ یہاں ہر معاملہ صرف لڑکے
میں طے ہوتا ہے۔''

''پتہ ہے اصل میں معاملہ کیا ہے میرے ساتھ۔'' ہمایوں خاں جھ
ہوتے ہوئے سر کو کھجلانے لگا۔ ''میں دل ہی دل میں ہر کسی کا مقابلہ ایمان آف
کے ساتھ کیئے جا رہا ہوں۔ شاید تبھی یہ ساری مین میخ نکال رہا ہوں۔''

''تو پھر ایسے کرو۔ اپنا سامان باندھو اور جاؤ پاکستان۔ کل ہی۔ پھر
آرام سے اپنی دین ایمان سے شادی کرو اور گھر بساؤ۔'' توفیق اٹھ کھڑا ہوا۔
چلتا ہوں۔ مجھے اپنے بھی بہت کام ہیں۔ فارغ نہیں ہوں کہ ایک ہی یہ معم
شادی کا مسئلہ کھینچ کر مہینوں لئے بیٹھا سوچتا رہوں۔''

''ارے! تم تو شاید ناراض ہو گئے۔'' ہمایوں نے اس کا بازو تھام لیا۔

''میں کیوں ناراض ہونے لگا۔ اور ضرورت بھی کیا ہے۔''

''اچھا یار! بس ناراضگی چھوڑو۔'' اسے واپس بٹھا لیا۔'' ایسا کر
سب کے نام کی پرچیاں بناتے ہیں۔ پھر قرعہ جس کے نام نکل آیا۔ اسی کے ساتھ

''قرعے سے شادی۔؟'' اس کی بے عقلی اور کم فہمی پر توفیق کی ہنسی
گئی۔ ''اور جس کے نام قرعہ نکلا' اگر اس نے منع کر دیا۔ تو پھر۔؟''



''پھر۔؟'' ہمایوں لاجواب سا ہو کر اسے تکنے لگا۔ ''پھر پتہ نہیں۔''

''دراصل تم میں قناعت نہیں ہے۔ تم ساری کی ساری لڑکیوں کو اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہو۔''

''نہیں نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' ہمایوں نے ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''پاکستان میں ایسے سب کام ماں اور بہنیں کیا کرتی ہیں۔ اس لئے ہم پاکستانی مردوں کی فطرت میں یہ لڑکیوں کے انتخاب اور چناؤ والے کام کا سلیقہ داخل ہی نہیں ہوا۔''

''پاکستانی مردوں کو سب سلیقے آ جاتے ہیں۔ اب میرا منہ نہ کھلواؤ۔ اپنے ساتھ اپارٹمنٹ میں رکھنے کیلئے لڑکی کا انتخاب فٹافٹ ہو جاتا ہے۔ اور یہ۔ بس سمجھو یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ چھ مہینے یا سال کی بات ہے۔ کونسی یہ ساری عمر کی شادی ہے اور اس کیلئے اتنی چھان پھٹک۔ لالچ کر رہے ہو۔''

اسی طرح ناراضگی' غصہ' صفائی اور پھر ہنسی مذاق میں دونوں نے تین چار اور لڑکیوں کو ڈسکس کیا۔ تب آخر میں قرعہ فال جینی کے نام نکلا۔

جینی باقاعدہ ہمایوں خاں کی فرینڈ بھی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی توفیق اور ہمایوں دونوں ہی کا خیال تھا کہ وہ شادی کیلئے بہترین رہے گی۔ اس لئے کہ اس کی عادات بہت حد تک پاکستانی لڑکیوں جیسی تھیں۔

اس کے مشاغل امریکن لڑکیوں جیسے بالکل نہ تھے۔ آفس سے آ کر وہ زیادہ تر اپنے اپارٹمنٹ میں رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کا سب سے پہلا شوق مطالعہ تھا اور پھر کوکنگ۔ اپارٹمنٹ سے نکلتی تو کسی نہ کسی لائبریری میں جا بیٹھتی اور وہاں سے نکلتی تو اپارٹمنٹ میں۔ آفس کے بعد بس یہی دو جگہیں تھیں اس کے لئے۔

وہ سیر و تفریح یا کہیں آنا جانا زیادہ پسند نہیں کرتی تھی تبھی اس کے زیادہ فرینڈز نہیں تھے۔ شکل و صورت کی اچھی خاصی تھی پھر بھی۔ بائیس تیئیس سال کی عمر ہو چکی تھی مگر ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ کیوں۔؟

یہی سوال ایک دن ہمایوں نے اس سے کر ڈالا تھا جس کا جواب اس نے ہنستے ہوئے بہت تفصیل سے دیا تھا۔

''میری نانی نے ایک بار مجھے نصیحت کی تھی کہ کبھی بھی صرف ایک یا دو

بوائے فرینڈ نہیں بنانا۔ بلکہ بہت سارے بنانا۔ اس لئے کہ تمہیں جب بھی شو
انتخاب کرنا پڑا تو آسانی رہے۔ چوائس جتنی زیادہ ہو گی' اتنا بہتر انتخاب ہو سکے گا۔

جینی نے بہت ہنس ہنس کر نانی کی بات اسے بتائی تھی۔ اور وہ ہنستی ہ
بہت اچھی لگتی تھی۔ کئی خوبصورت لڑکیوں سے زیادہ۔ اور اس وقت بھی ہمایوں کو ا
لگ رہی تھی۔ بلکہ اس کے دل میں اس کیلئے اک خاص جگہ بن گئی تھی۔

''اور میں بہت سارے فرینڈز کیسے بناتی۔ مجھے کبھی کتابوں کے مطالعہ
ہی فرصت نہیں ملی۔'' اس کی صاف گوئی قابل تعریف تھی۔ ''میرا خیال ہے اس شہ
ساری لائبریریوں کی جب ساری کتابیں میں پڑھ کر ختم کر ڈالوں گی تو پھر شاید
فرینڈز کی ضرورت پڑے۔''

''اور کتابیں ختم کرتے کرتے تو پھر تم سات آٹھ سو سال کی ہو جاؤ گ
اک بے حد بوڑھی عورت۔ پھر فرینڈز کو کیا کرنا ہے۔'' ہمایوں بڑی شرارت کے سا
بظاہر ہمدردی بھری نگاہ سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''توبہ توبہ۔ اتنی عمر۔'' اس نے ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے اور ہمایو
بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گیا۔

اس ساری بات کے ساتھ ہمایوں نے توفیق سے اس کا تعارف کرایا تھ
پھر توفیق اس سے ملا بھی تھا۔

''تم جیسے بندے کیلئے جینی سے بہتر اور کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ پور
امریکہ میں نہیں۔'' توفیق نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''بس اللہ کا نام لے کر اسے پرپوز کر ڈالو۔''

ہمایوں کو گرین کارڈ حاصل کرنے کی بڑی جلدی تھی۔ ادھر توفیق کی تائید
ادھر اس نے اسے پرپوز کر ڈالا۔ اگلے دن ہی۔ ذرا وقت ضائع نہیں کیا۔

جینی پہلے تو بہت حیران ہوئی۔ کیونکہ ہمایوں کبھی بھی اس کا فرینڈ نہیں رہا
بس کمپیوٹر کلاسز میں دونوں اکٹھے تھے۔ وہیں آتے جاتے ''ہیلو ہیلو'' ہو جایا کرتی تھی
اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ کبھی ایکدن بھی نہ دونوں نے اکٹھا بس کا سفر کیا
اور نہ ہی کسی ریستوران میں آمنے سامنے بیٹھ کر بھی اک چائے کی پیالی تک پی تھی



لہذا ایکدم ہی وہ ہمایوں کی آفر کا کوئی جواب نہ دے سکی۔

تب جینی نے ایک ہفتے کیلئے اپنے مطالعہ کے شوق کو چھٹی دے کر وہ سارا
وقت ہمایوں کے ساتھ گزارا۔ دونوں ہی کو ایک دوسرے کی عادات پہلے سے بھی زیادہ
اچھی لگ گئیں۔ اور جینی نے اس سے شادی کرنے کا اقرار کر لیا۔

ہمایوں بہت خوش تھا۔ شادی سے بھی اور جینی کے ساتھ کرنے والے فیصلے
سے بھی۔ شادی سے اس لئے کہ گرین کارڈ حاصل ہو جانا تھا۔ اور جینی سے اس لئے
کہ زیادہ اس کے قریب رہا تھا تو اندازہ ہوا تھا۔ وہ تو جیسے مشرق سے امپورٹ کی ہوئی
اک دوشیزہ تھی۔

بھولی بھالی اور شرمیلی شرمیلی سی۔ خدمت گزار سی۔ گھریلو سی۔ مغربی اور
مشرقی عادات کا عجیب سا امتزاج تھا۔ ہمایوں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ بے شک یہ
شادی ایک معینہ مدت کیلئے تھی۔ ہمیشہ کیلئے نہیں تھی۔ یہ پاکستان کی طرح' تا عمر کا
بندھن نہیں تھا۔ پھر بھی۔

ہمایوں پاکستانی شادی ہی کی طرح منا رہا تھا۔

پندرہ دن بعد یہ شادی ہونا طے پائی تھی۔ تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہمایوں
خاں نے اپنا بنک بیلنس چیک کیا۔ کافی رقم تھی۔ پاپا بڑی فراخ دلی سے اسے رقوم
بھیجا کرتے تھے۔ اور اب تو وہ بھی کمانے لگا تھا۔

''یار توفیق! وہ جو پاکستانی دلہنوں کا عروسی جوڑا ہوتا ہے کیا وہ یہاں سے مل
جائے گا۔؟'' انتہائی شرمیلے سے انداز اور لہجے میں اس نے پوچھا تو توفیق کو جہاں ہنسی
بھی بہت آئی وہاں اس پر پیار بھی آ گیا۔

''تم اگر چاہتے ہو تو اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔'' توفیق نے اس کی
پشت تھپتھپائی اس سارے عرصے میں اتنا دونوں کا میل ملاپ رہا تھا' لڑکیاں دکھانے
کے سلسلے میں' اور پھر جس طرح ہر معاملے میں ہمایوں خاں اس کی رائے' اس کے
مشورے پر عمل کر رہا تھا' اس سے وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے
اور بہت بے تکلف بھی۔

توفیق تو اس کے اس سارے پروگرام کو عملی جامہ پہناتے پہناتے یوں

محسوس کرنے لگ پڑا تھا جیسے وہ پاکستان میں تھا اور اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کی ساری ذمہ داری اس پر تھی۔ اور اسے بخوبی یہ ذمہ داری سرانجام دینا تھی۔ اسی طرح بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

اور ہمایوں خاں اس کی ہر بات مان رہا تھا اور اپنی منوا رہا تھا۔ پر اندر سے وہ خوف زدہ بھی بہت تھا۔

''یار! مجھے بہت ڈر ہے۔ کہیں پاکستان میں کسی کو معلوم نہ ہو جائے۔'' ہمایوں نے اندر سے اندیشے کا اظہار کیا۔

''نہیں۔ فکر نہ کرو۔ نہیں پتہ چلتا۔'' اس نے تسلی دی۔

''ایمان آفریدی کی فیملی کی طرف سے زیادہ فکر مند ہوں۔ وہ رشتہ توڑ دیں گے۔''

ہمایوں کا رشتہ ٹوٹ جانے والا فکر پھر توفیق کو گدگدا گیا۔ یہاں باقاعدہ شادی کر رہا تھا اور وہاں کا رشتہ ٹوٹنے کا فکر دامنگیر تھا۔ توفیق کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ واقعی ہمایوں اک معصوم انسان تھا۔

''بس تم ایک بات یاد رکھنا۔ شادی کے بعد بھی پاکستانی رشتہ داروں سے ویسے ہی تعلقات اور رابطہ رکھنا' جیسے اب تک رکھتے رہے ہو۔ بلکہ ہو سکے تو پہلے سے بھی کچھ زیادہ کر دینا۔ بس کسی قسم کی کمی نہ آنے دینا۔''

''کیا مطلب۔؟ میں سمجھا نہیں۔''

''مثلاً یہی کہ خطوط کے علاوہ اگر اپنی منگیتر کو کبھی کبھار کوئی تحفہ وغیرہ بھیجتے تھے' تو اب اس میں اضافہ کر دینا۔''

''میں نے تو پہلے کبھی نہ اسے خط لکھا ہے اور نہ کبھی کوئی تحفہ بھیجا ہے۔''

''سالگرہ پر بھی اسے کبھی وش نہیں کیا۔؟'' توفیق حیرت سے اسے تکنے لگا۔

''نہیں۔ ہمارے ہاں رواج ہی نہیں۔''

''تم امریکہ میں رہ رہے ہو۔ پاکستان کے رواج چھوڑو۔ یوں بھی نہ تمہارا کوئی خط جائے گا۔ نہ کبھی کوئی تحفہ اسے ملے گا تو اس کے دل میں تمہاری محبت کیسے پیدا ہو گی۔'' توفیق اسے پورے خلوص سے سمجھانے لگا۔ ''اب دور اور ہے میری جان!



تمہاری ایمان یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ وہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔ گفتگو ہوتی ہے۔ لین دین ہوتا ہے۔ اور تمہاری طرف سے کسی بھی طرح تعلق واسطے کا کبھی اظہار نہ ہو گا' نہ الفاظ سے' نہ کسی خوبصورت چیز سے' تو وہ کسی بھی لمحے کسی دوسرے سے متاثر ہو سکتی ہے۔ اس کے کسی سلوک سے' اس کی پرسنالٹی سے' اس کی ذہانت سے۔''

''یہ تو مجھے پہلے کسی نے بتایا ہی نہیں۔'' ہمایوں خاں بری طرح گھبرا گیا۔

''توفیق یار! میں شادی ایمان سے ہی کروں گا۔''

توفیق کے ہونٹوں سے ایک نہیں' کئی قہقہے ابل پڑے۔ ''اور یہ جینی سے کیا کر رہے ہو۔؟''

''یہ تو سب کچھ گرین کارڈ کے لئے ہے صرف۔'' ہمایوں خاں بڑے اطمینان سے بول پڑا۔

اور توفیق کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ ''یار! تم ہو بڑے مزے کے۔ گنڈ دے پورے۔''

''یہ کیا ہوتا ہے۔؟''

''یہ پنجابی کا اک محاورہ ہوتا ہے۔''

''اس کے معنی بتاؤ۔''

''وقت تمہیں بتائے گا۔ چلو اٹھو۔ کچھ شاپنگ کر لیں۔ کیونکہ میرا اگلا ہفتہ بہت بیزی ہے۔ اور شادی کے سارے انتظامات مجھے ہی کرنا ہوں گے۔ اکیلے کو۔''

## 13

ایمان سخت فکر و پریشانی میں مبتلا تھی۔ ''میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے آئی ہوں کوئی سیر و تفریح کے لئے تو نہیں۔''

''یہ بات تم مجھے تقریباً روزانہ ہی بتاتی ہو۔'' ماھم ہنس پڑی۔ ''لیکن ہو گا وہی جو میں چاہوں گی۔'' اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس کی کچھ نہیں سنے گی اور جو

جی میں آئے گا' وہی کرے گی۔

''خواہ مخواہ ہی ساری بات بتائی۔'' ایمان بڑبڑانے لگی۔ ''تم بھی مصیبت ہو اور۔ ستم بالائے ستم سرعبد بھی جان کا عذاب۔''

''دوستی کا ناطہ جوڑا ہے۔ اب ایک دوسرے کے سارے عذاب وثواب تو بھگتنا پڑیں گے۔''

ماھم بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں تھی جبکہ ایمان آفریدی خاصی الجھی ہوئی تھی۔ بہت دنوں سے صحیح طرح پڑھائی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ جتنا وہ آج کل پڑھ رہی تھی بھلا کیا ماسٹرز کی ڈگری لینے کیلئے اتنا بہت تھا؟ اور ماھم کے خیال میں تو بہت تھا مگر ایمان مطمئن نہ تھی۔ روز ہی تو ماھم کو کوئی نہ کوئی نیا خیال سوجھا ہوتا تھا۔ کبھی زیورات کے فیشن کا' کبھی ملبوسات کے فیشن کا' کبھی ایمان کی سالگرہ آ جاتی' کبھی اس کی بہن کی شادی۔ مایوں' مہندی' برات' ولیمہ۔ اف توبہ! وہ کن خرابوں میں پھنس گئی تھی۔

اور اب۔ اب یہ سرعبد کی ضد۔ کیا کرے۔؟ کیا کرے۔؟

''تو پھر دفع کرو ہمیں اور ہماری دوستی کو۔''

اور وہ ماھم کے اس مشورے کو بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اس جیسی مخلص دوست کو چھوڑ دے گی تو۔؟ نہیں نہیں اس کے بغیر تو بالکل ہی اس کا گزارہ نہیں تھا۔ اور سرعبد۔ یہ اس کے استاد تھے۔ ان کو بھی ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے ساتھ دوستی کے علاوہ استاد والا بھی تعلق قائم ہو گیا تھا اور تیسرا۔ دل دل بھی۔ نہیں نہیں۔ یہ وہ کیا سوچنے لگ پڑی تھی۔

اس نے چونک کر اپنے خیالات کو جھٹکا۔ ''تو پھر۔ تم کیا چاہتی ہو۔؟''

''یہی کہ اس کے ہاتھ کی پٹی تو کھلوائیں۔'' ماھم نے اسے خیال کا اظہار کیا۔ ''چلیں گے بھئی۔ ضرور چلیں گے۔ الٹے دماغ کا بندہ ہے۔ کہیں بھری کلاس میں کوئی اور شرمندگی نہ اٹھانا پڑ جائے تمہیں۔ اس کے شر سے بھی تو تمہیں بچانا ہے۔''

ماھم مسلسل زیرلب مسکرا رہی تھی۔ ''کیوں۔؟ نہیں۔؟''

بات اس کی بھی درست تھی۔ دو تین بار تجربہ تو ہو چکا تھا۔ کیسے بھری کلاس میں انگلی اٹھا کر اسے کھڑا ہونے کا اشارہ کر دیتا تھا۔ جب استاد بنتا تھا تو دوستی کا بھی



بھرم نہیں رکھتا تھا۔

''چلو ہو گیا نا فیصلہ۔ چلتے ہیں۔'' ہمیشہ کی طرح ماھم نے آخری حکم لگا دیا۔

''ویسے اک بات بتا دوں۔ مجھے سرعبد کے انداز کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ اس سے بچ کر رہنا۔'' ماھم یکا یک سنجیدہ ہو گئی۔ ''ادھر تمہارا ہمایوں خاں تمہاری جدائی میں پتا نہیں کس کس طرح ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہا ہو گا۔ اور ادھر یہ۔ اور اس کی شرانگیزیاں۔'' ماھم نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''کہیں تمہارے دل کو اس امریکہ والے سے باغی ہی نہ کر دے۔''

''نہیں نہیں۔'' ایمان لرزی۔ ''ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'' باتیں کرتے ہوئے دونوں کمرے میں آن داخل ہوئی تھیں۔ ماھم تو آتے ہی اس کے بیڈ پر دراز ہو گئی۔

''بہت تھک گئی ہوں آج۔''

''کیوں۔ کیا ہل چلاتی رہی ہو۔؟''

''رہیں نا آخر پینڈو کی پینڈو۔ ہل چلانا ہی کام نہیں ہوتا۔ ہم شہروں میں رہنے والی لڑکیوں کیلئے اور بھی بہت کام ہوتے ہیں۔''

''تمہارے کام جانتی ہوں۔'' ایمان مسکرائی۔ ''شاپنگ کیلئے جانا تو کبھی آئس کریم کھانے کیلئے مارے مارے پھرنا۔ پھر برگروں کا' پزے کا' بروسٹ کا شوق کوئی چیز شہر کے اس کنارے کی اچھی ہے تو کوئی دوسرے کنارے کی۔ یونیورسٹی کے بعد زیادہ وقت تمہارا اس طرح گزرتا ہے۔ ساتھ ساتھ کپڑوں کے' زیورات کے روزانہ فیشن بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے مختلف دکانوں اور مارکیٹوں کے چکر لگانا۔''

ماھم زور سے ہنس پڑی۔ ''یار! ذہنی ٹینشن بہت تھکا دیتی ہے۔''

''تمہیں کونسی ذہنی ٹینشن ہے۔؟''

''یہی کہ۔ ہائے میرے جیسی چیز اس کے پاس سے نہ نکل آئے۔ فیشن تو پرانا ہو گیا نا پھر۔''

''تبھی پھر پڑھائی میں۔'' ایمان نے اپنی بات پر خود ہی سنسر لگا دیا۔

''سنو۔ اس بار امتحان میں کوئی ایسا ویسا رزلٹ نہیں چلے گا۔ میری دوست

ہو۔ مجھے شرمندگی مت دلوانا۔"

اس کی تشویش پر ماھم کتنی ہی دیر ہنستی رہی۔" تم فکر نہ کرو۔ امتحان پڑھائی کروں نہ کروں۔ رزلٹ تمہیں اچھی ہی دوں گی۔" پھر یکایک اس نے بدل ڈالی۔ "چلو تم جلدی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اور میں ذرا وارڈن سے تمہارے اجازت نامہ لے آؤں۔"

ماھم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا پروگرام اسے جلد جلد بتانے لگی۔ "دونوں اکٹھی ہیں۔ مجھے بھی تو کچھ تیاری کرنا ہو گی۔ بھئی وہاں اجلال بھی تو ہو گا۔"

بات کرتے کرتے شرارت سے اس نے آنکھ دبائی تو ایمان چونک پھر بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے پوچھنے

"تمہیں اجلال حیدر پسند ہے۔؟"

"ہاں۔ بہت پسند ہے۔ دل کو بھی اچھا لگتا ہے۔" ماھم بہت صاف گو

"لیکن شادی وغیرہ والا معاملہ نہیں ہو سکے گا۔"

"تمہارے پاؤں میں تو میرے جیسی رسم و رواج کی کوئی زنجیر نہیں لپٹی ہوئی

"بظاہر نہیں۔ پر سمجھو تو ہے بھی۔" تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا۔

"ایسا بتانے والا کچھ نہیں۔ یہ جو ہم بہت امیر کبیر لوگ ہوتے ہیں نا شمار دولتیں آسائشیں رکھنے والے لوگ۔ ہمارے پاؤں کی زنجیر یہی آسائشیں دولتیں بن جاتی ہیں۔ ہم اپنا اسٹینڈرڈ کچھ ایسا وضع کر لیتے ہیں' اسٹیٹس کچھ اتنے لیول پر لے جاتے ہیں کہ پھر اس سے نیچے اترنے میں بے عزتی محسوس کرتے ہیں اور اپنی بے عزتی کوئی انسان بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تب ہم جیسے اسٹینڈرڈ اسٹیٹس رکھنے والے لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ ہم محبت کے بغیر زندگی گزار ہیں لیکن دولت کے بغیر نہیں۔"

"اس فلسفے کے ساتھ تمہاری اور اجلال کی شادی کا کیا تعلق۔؟"

"اسٹوپڈ ہو تم۔ اجلال کا سٹینڈرڈ آف لائف دیکھا ہے نا تم نے بھی۔ چھوڑو یہ بحث۔ پھر کبھی سہی۔ چلو تم تیار ہو جاؤ۔ میں وارڈن سے مل آؤں۔ کچھ آنٹی سے گپ بھی تو لڑانا ہو گی۔ ان کی تعریفیں کروں گی۔"



"کیا مجھے ساتھ لے جانے کیلئے تمہیں یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔؟"

"کوئی بھی انجوائے منٹ جب انسان حاصل کرتا ہے تو اس کی پے منٹ بھی کرنا پڑتی ہے۔ خوشامد وغیرہ کی جنس میں ہی سہی۔ گھر میں ایسی بندہ نہیں ہوں۔ پر تمہارے ساتھ کا لطف اٹھانے کیلئے خوشامد کا سکہ بطور پے منٹ چلا لیتی ہوں۔ مجھے تمہاری کمپنی بہت محبوب ہے۔ تم ساتھ ہو تو مجھے اچھا لگتا ہے' مزہ آتا ہے۔ لہذا اس کیلئے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ اور یہ خوشامد کا سکہ تو بہت چھوٹا سا ہے۔"

"بہت بری بات ہے۔"

"کوئی بری دوری نہیں۔ چلو تم جلدی سے تیار ہو جاؤ"۔ ماھم تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

پندرہ منٹ بعد ہی وہ واپس آ گئی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹیں کھلکھلا رہی تھیں۔ "خوب گپ لگی آنٹی کے ساتھ......" اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اس کے سراپا کو دیکھ کر چیخ سی پڑی۔ "یہ تم تیار ہوئی ہو۔؟ یہ۔ یہ۔" اس کا سفید سادہ لباس' میک اپ کے بغیر سادہ چہرہ' سادگی سے بنائی ہوئی لمبی چوٹی۔ یہ سب دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"مجھے کسی ڈیٹ پر نہیں جانا ہے۔" ایمان نے جواز پیش کیا۔

"مگر اس شخص نے ڈیٹ تو بنا ہی لی ہے۔ سمجھو کچھ۔ ایسے زور شور سے اپنی عیادت کا نیوتہ دیا ہے۔"

"ایک طرف تم مجھے اس سے بچنے کی نصیحتیں کرتی ہو۔ دوسری طرف مجھے گمراہی کی بھی ترغیب دیتی ہو۔ مت کرو مجھے گمراہ میری پیاری دوست! میں اپنے خاندانی رسم و رواج کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی۔"

ایمان آفریدی کی سنجیدہ صورت دیکھ کر ماھم کو اس سارے معاملے کی سنجیدگی کا احساس ہو گیا تھا۔ "چلو۔" لہجہ بہت مدھم تھا۔

راستے میں ایمان نے ہی اجلال حیدر والا موضوع چھیڑ دیا تھا۔

"تمہیں بتایا نا مجھے وہ بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن ہمارے طبقے کی مجبوری۔ محبت کے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں ہم لوگ' دولت کے بغیر نہیں۔ اور اجلال بیچارا' میری

کون کون سی آسائش پوری کر سکے گا۔ سترہویں گریڈ کا بندہ۔'' ماھم بے حد سنجیدہ تھی۔
اور ایمان نے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ نمی سی بھی تھی۔ آواز
میں بھی وہ ہمیشہ والی کھنک نہیں تھی۔

''بجلی' گیس' پانی اورفون کے بل ہی ادا کرتے کرتے اس کی تنخواہ ختم ہو
جایا کرے گی۔ پھر سارا مہینہ وہ مجھے کھلائے گا کیا اور پہنائے گا کیا۔ اور۔ اور۔'' پھر
اک دم ہی ماھم کی آواز گھٹ سی گئی تھی۔

''اور اگر وہ بھی تمہارے ساتھ انوالو ہو گیا ہو تو۔؟ اس کے انداز سے تو ایسا
ہی معلوم ہوتا ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ صاف گو تھی۔ فوراً اعتراف کر گئی۔

''پھر۔؟'' ایمان نے دکھ سے اسے دیکھا۔

''اسے سمجھا دوں گی۔ اسی طرح جیسے اپنے آپ کو سمجھایا ہے۔''

''تم تو اپنے آپ کو نہیں سمجھا پائی ہو۔'' ایمان بے خیالی میں اس کے زخم
چھیڑ گئی۔

''نہ چھیڑ ملنگاں نوں۔'' اس کی بات جیسے اس نے سنی ہی نہ تھی۔ بلند آواز
میں گانے لگی۔ ''نہ چھیڑ ملنگاں نوں۔''

پھر یکایک گاڑی کو بریک لگے تو ایمان چونکی۔ ''ان کا گھر آ گیا۔؟''

''انکا نہیں۔ فی الحال میرا گھر آیا ہے۔'' ماھم کے بتانے پر دونوں ہنسنے لگیں
جتنی دیر ماھم تیار ہوتی رہی ایمان اس کی ماما سے گپیں لگاتی رہی۔ ماما باتیں
کرنے کی بہت شوقین تھیں۔ ان کا چسکہ پورا ہوتا رہا۔

ماھم تیار ہو کر آئی تو ایمان حیرت سے اسے گھورنے لگی۔ پھر راستے میں
اچھی طرح اس کی خبر لی۔ ''یہ اتنی سج دھج نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔؟''

''ضرورت تھی۔ پر تم نہیں سمجھ سکو گی۔ کہ تم کو اللہ نے بہت خوبصورت بنایا
ہے۔ تمہیں ان آلتو فالتو چیزوں کا سہارا لینے کی ضرورت ہی نہیں۔''

''تو تم نے کونسا وہاں رشتہ کر لینا ہے اگر وہ متاثر ہو کر تمہیں پرپوز بھی کر ڈالے۔''

اس میک اپ اور اس لباس میں ماھم واقعی بہت منفرد' بہت پیاری لگ رہی



تھی اور ایمان کو اجلال حیدر پر ترس آ رہا تھا۔

''کسی جواں اور خوبرو شخص کی نگاہوں کا مرکز بن جانا' سچ مچ اک بہت بڑی
لذت ہے۔ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے' میں اسے۔ شادی ہو نہ ہو۔ بلکہ یقیناً نہیں ہو
گی۔ پر یہ وقت تو انجوائے کر لوں۔ محبتوں چاہتوں بھری نظریں' دل کی اتھل پتھل
ہوتی دھڑکنیں' پیار اور وفا لٹاتی حرکتیں۔ واہ! کیا نشہ ہے ان جذبوں میں بھی۔''

''عجیب تمہاری منطق ہے۔''

''سرپھری ہوں۔ پاگل دیوانی ہوں۔'' ماھم بلند آواز میں گنگنانے لگی۔

''مجھے پیا ملن کو جانے دے ایمانیاں۔ مجھے پیا ملن کو جانے دے۔''

''بدتمیز۔!'' ایمان کے تین چار مکے کھانے کے بعد بھی ماھم گنگناتی رہی۔

اور پھر اسی وقت اس کی آواز تھمی جب ایک بارگی دونوں کی نظریں سامنے
اٹھیں۔

## 14

سر عبد انہیں گیٹ پر کھڑے دور سے ہی دکھائی دے گئے۔ ''یہ یہاں کیوں
کھڑے ہیں۔؟'' دونوں اکٹھی ہی بڑبڑائیں۔ بریک لگتے لگتے گاڑی ان کے بالکل
ل جا کھڑی ہوئی تھی۔

''یقیناً یہ تمہارے انتظار میں کھڑے ہیں۔ پلکیں بچھائے۔'' ماھم نے سرگوشی
ل اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ''اور انکی نظریں دیکھ رہی ہو۔ لیکن خبردار! تم مت دیکھنا۔
تو بہک ہی گئے ہیں۔ تم بھٹک مت جانا۔''

''میں انہیں صرف ایک مخلص دوست سمجھتی ہوں اور اب تو ٹیچر بھی
ماہارے'' ایمان آفریدی کی آواز میں لرزش تھی۔

''ہاں بس۔ یہی دو رشتے رکھنا۔ تیسرے کی طرف قدم بڑھایا تو......''

''مجھے پتہ ہے سنگسار کر دی جاؤں گی۔ پتھروں سے نہیں۔ باتوں سے

طعنوں سے اور نگاہوں سے بھی۔"

ایمان نے ان سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا لیکن وہ پھر بھی اس کے
کھڑے تھے۔ یہ کیسا یقین تھا۔؟ کیسا اعتماد۔؟

"عابی! پلیز میرے ساتھ کسی یقین کی ڈور نہ باندھنا۔ میں بہت سا
زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔"

گاڑی جب رکی تو دونوں کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر رنگ سے بکھر
تھے۔ ان کے سامنے ماھم والی سائیڈ تھی۔ بے اختیار ہی تیز تیز قدم اٹھاتے چکر کا
کر ایمان والی سمت آن کھڑے ہوئے۔ ماھم نے اسے بڑے زور سے اک ٹہو
ٹھوکا دیا۔ "دیکھا۔"

"ویلکم۔" وہ اپنی ہی امنگوں ترنگوں میں تھے۔ جھک کر گاڑی کا در
کھولنے لگے۔ نظروں میں ایمان آفریدی کا وجود تھا۔ لبوں پر مسکراہٹیں تھیں
"موسٹ ویلکم۔!"

"اسلام علیکم۔" دونوں لڑکیوں نے اکٹھے ہی سلام کیا۔

"آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔؟" پھر ماھم نے ہی زبان کھولی
بات کرنے کی خاطر۔ "اپنی مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کیلئے جناب۔!" جواب
دیتے اک بہت ہی خوبصورت سے تبسم نے ان کے روشن چہرے کا احاطہ
تھا۔ "چلیں نکلیں باہر۔ جلدی۔"

"جلدی کس بات کی ہے۔؟" ماھم نے ہنستے ہوئے بغور ان کی
دیکھا۔ ایمان بھی گاڑی سے نکل کھڑی انہیں تک رہی تھی۔

گہری نیلی جینز پر ہلکے آسمانی رنگ کی قمیص پہنے تھے۔ دونوں آستینیں
کر کے کہنیوں تک چڑھائی ہوئی تھیں۔ جینز بھی نیچے سے الٹ کر ٹخنوں سے او
کی ہوئی تھی۔ پاؤں میں چپل تھی۔ جیسے کوئی کام کرتے ہوئے آئے تھے۔ او
گھریلو سے انداز میں بھی بہت باوقار لگ رہے تھے۔

"یہ آپ نے اپنا حلیہ کیا بنایا ہوا ہے۔؟" ماھم گاڑی کی بیک کی طرف
گھوم کر سامنے آ کے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ نظروں میں تعریف تھی۔



"یہ۔" انہوں نے اوپر سے نیچے تک خود ہی اپنا جائزہ لیا۔ پھر ہنس پڑے۔

"کچن میں سے آیا ہوں۔"

"ہائیں۔" دونوں کی حیرت زدہ سی نگاہیں اکٹھی ہی ان کے پٹی والے
ہاتھ کی طرف اٹھیں۔

"پٹی کے اندر ہاتھ ٹھیک ہے۔" آنکھوں کی روشنیاں کچھ اور گہری ہوئیں
اور ہونٹوں کا تبسم مچلا۔ "عیادت کے لئے لوگ آ گئے ہیں۔ اب کھل جائے گی۔" پھر
بات کرتے ہوئے ساتھ ہی اندر چلنے کا اشارہ کیا اور خود ان کے آگے آگے چل
پڑے۔

ان کی رہائشی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور پر ہی تھی۔ صرف دو کمروں کا فلیٹ تھا۔
اس دن تو دونوں پریشانی میں تھیں مگر آج بے فکری سے اردگرد دیکھتے ہوئے ہر چیز کا
معائنہ کرتیں اندر پہنچیں۔ اور اب چھوٹے سے برآمدے میں سے گزر کر سر عبد کے
پیچھے پیچھے چلتی اسی کمرے میں کھڑی تھیں، جس میں اس دن وہ مریض بنے پڑے
استراحت فرما رہے تھے۔

داہنی دیوار کے ساتھ اسی روز کی طرح بیڈ لگا تھا۔ درمیان میں چھوٹی سنٹر
ٹیبل اور اگلی دیوار کے ساتھ دو چھوٹے صوفے تھے۔ "یہاں بیٹھو اور میں بس ابھی آ
رہا ہوں۔" انہیں بٹھا کر خود سر عبد اسی دروازے سے باہر نکل گئے۔

"یہ کیسی خوشبو سی پھیلی ہوئی ہے۔" ماھم نے لمبے لمبے سانس کھینچے۔

"کسی کھانے والی چیز کی ہے شاید۔ یا روسٹ یا فرائیڈ۔" ایمان نے قیافہ
لگایا۔

"ہاں ہماری اماں بیٹھی ہوئی ہے نا اندر، جو ہمارے لئے روسٹ وغیرہ بنائے
گی۔" ماھم نے ہونٹوں پر بڑی حسرت سے زبان پھیری۔ پھر یکایک چونکی۔ "ارے!
آج تو میں نے کھانا ہی نہیں کھایا۔"

"اور میں نے بھی کب کھایا ہے۔ یونیورسٹی سے اکٹھی ہی آ گئیں اور۔" اپنی
بات ادھوری چھوڑ کر ایمان اٹھی رائٹنگ ٹیبل کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہاں بڑے
قرینے سے بہت ساری کتابیں ریک میں لگی تھیں۔ کتابیں ہمیشہ اسے بہت اٹریکٹ

کرتی تھیں۔ ایک ایک اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''بتاؤ نا کھانے کا کیا کریں۔ مجھے تو ایک دم بھوک لگ گئی ہے۔''

''سمجھ لو آج روزے سے ہو۔ واپس چلیں گی تو......'' ایمان کو ہوسٹل کے کھانے کے کمرے کا خیال آ گیا۔ ''تین بجے تو میزیں صاف اور دروازے بند ہو جاتے ہیں۔'' گھبرا کر اپنی گھڑی دیکھی۔ اڑھائی تو بج بھی چکے تھے۔

''واپسی پہ مجھے بھی اپنے ساتھ گھر لے جانا۔ لگتا ہے میرا روزہ تمہارے گھر افطار ہو گا۔''

''ارے! آپ لوگ آج روزے سے ہیں۔؟'' وہ اک ٹرے اٹھائے داخل ہوئے تھے۔ ایمان کی بات سن لی تھی شاید۔ بہت افسوس بھرا لہجہ تھا۔ ''یہ برا ہوا۔ ساری محنت اکارت گئی۔''

ایمان کھڑی کتابیں دیکھ رہی تھی۔ سرعبد کی بات سن کر جلدی سے پلٹی۔ اپنی جگہ سے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ارے! یہ آپ۔ یہ۔''

وہ ٹرے سنٹر ٹیبل پر رکھ کر اس میں سے ڈونگے پلیٹیں وغیرہ نکالنے لگے۔

''یہ کیا۔؟ یہ اتنا کچھ۔؟''

''پہلے سوچا تھا اکٹھے کھانا کھائیں گے۔'' وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔

''پر آپ تو دونوں شاید روزے سے ہیں۔'' سرعبد کی مسکراہٹیں عجیب تھیں۔ عجیب تھیں اور انداز بھی عجیب تھے۔ روشنیوں سے معمور' شرارتوں سے چور۔ کوئی مارے خوشی کے دیوانہ ہوا جا رہا ہو۔ ان کا اک اک انگ رقص میں تھا۔ لبوں میں جو گنگناہٹیں تھیں وہ علیحدہ سر اور لے سے بجی تھیں۔ ''میں پہلی بار میری پیاری پیاری سی اسٹوڈنٹس میرے گھر آ رہی ہیں۔ اپنے ہاتھ کا کچھ انہیں کھلاؤں۔''

وہ دونوں ابھی تک حیرتوں میں ڈوبی کھڑی ایک دوسرے کو تک رہی کبھی سرعبد کو مصروف عمل دیکھنے لگتیں۔ سنٹر ٹیبل پر چیزوں کا' برتنوں کا میلہ سا تھا۔ ایک ڈونگے میں ہری مرچوں والا بھنا ہوا قیمہ تھا۔ ایک ڈش میں فرائڈ چکن پیسز تھے۔ دو پلیٹیں سلاد کی تھیں' جو بہت خوبصورت سجی تھیں۔ سبز بنانا کسٹرڈ



سرخ سی جیلی سے نقش و نگار بنے تھے۔ وہ سب سے زیادہ دلکش دکھائی دے رہے تھے۔

اتنی خوبصورتیاں' اتنے انتظامات' اتنی تواضع۔ یہ سب ان کے لیے تھا۔؟ بڑی اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ ماھم کے تو منہ میں پانی بھرنے لگا تھا۔ ''یہ سب کچھ آپ نے بنایا ہے۔؟'' وہ بے حد متاثر ہو گئی تھی۔

''جی جناب۔'' سرعبد سینے پہ ہاتھ رکھ کر جھکے۔ ''اپنی دوستوں کیلئے۔'' انداز میں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ محبتیں بھی تھیں۔

''آپ کو کوکنگ آتی ہے۔؟''

''چھ سال جلاوطنی کے کاٹے ہیں۔''

''جلاوطنی کے۔؟'' ایمان کی نگاہوں میں تحیر اتر آیا۔ ساتھ ہی کچھ نا سمجھی کی کیفیت تھی۔

''میرا مطلب ہے اپنے ملک سے باہر رہا۔ سیکھ گیا سب کچھ۔'' گڑبڑا کر جواب دیا۔ اور پھر فوراً موضوع بدلا۔ ''چلیں شروع کریں نا۔''

جلدی جلدی پلیٹوں میں دو دو لیگ پیس نکال کر ساتھ سلاد رکھتے ہوئے انہیں تھما دیں۔ ''اجلال نان لینے گیا ہوا ہے۔ آ جائے تو پھر قیمہ ان کے ساتھ کھائیں گے۔ شروع کرو نا لڑکیو! کیوں ٹھنڈا کر رہی ہو۔'' انتہائی بے تکلفی سے بولتے چلے جا رہے تھے۔

''ہمارے بغیر کوئی اک لقمہ نہیں لے سکتا۔'' اجلال باہر سے ہی بلند آواز میں بولتا آ رہا تھا۔ رومال میں لپٹے ہوئے گرم گرم نان میز پر رکھتے ہی اس نے قیمے والا ڈونگا اٹھا لیا۔ ''عابی کے ہاتھ کی بنی ہوئی یہ ڈش تو صرف میری ہوا کرتی ہے۔''

''کیوں جی۔'' ماھم نے ہاتھ سے وہ لیگ پیس کی پلیٹ رکھتے ہوئے اجلال سے قیمے والا ڈونگا چھین لیا۔ ''یہ تو میری من پسند ڈش ہے۔ ہری مرچوں والا قیمہ۔ واہ۔!''

''یعنی کہ آپ کی اور میری پسند ایک ہی ہے۔'' اجلال کی چمکتی بھڑکتی آنکھیں اس کی آنکھوں سے بھڑ گئیں۔ ''تو پھر تو......'' مگر پھر جلدی سے اردگرد تکتے ہوئے موضوع بدل گیا۔ ''یار عابی! آج تو ڈکیت پڑ گئے۔''

"نہیں۔ یہ ڈکیت نہیں ہیں۔ مالک ہیں۔" عبد کی نظریں ایمان آفریدی کے چہرے ہی کا طواف کر رہی تھیں۔ "یہ سب کچھ آج ان کی تواضع کیلئے ہی بنایا گیا ہے۔"

"تو پھر ان سے پوچھو نا۔ اکیلی ہی کھائیں گی۔؟ کیا اس میں سے فقیر حصہ نہیں نکالیں گی صدقہ دینا باعث برکت ہوتا ہے۔" اجلال حیدر کسی بھیک منگے کشکول کی طرح پلیٹ بڑھائے' ماھم سے تھوڑا سا قیمہ مانگنے لگا۔ "اے بی بی! ا مولٰی فقیر کی جھولی میں کچھ ڈال دے۔"

بالکل گداگروں جیسا انداز تھا۔ ایمان اور عبد اور ماھم ہنسی سے دوہرے ہونے لگے۔ یونہی شرارتوں اور ہنسی مذاق میں کھانا ختم ہوا۔

"واہ بھئی واہ! اتنی مزیدار دعوت میں نے آج تک نہیں کھائی۔" ماھم بڑ بے تکلفی سے انگلیاں چاٹ چاٹ کر تعریف کر رہی تھی۔ "یہ قیمہ اور ہوتا نا تو میں ا کھا لیتی۔ پر اس فقیر نامراد نے......"

"اونہوں۔ نامراد مت کہو۔" کچھ اس قدر بے ساختہ اور بے ارادہ اجلا بولا تھا کہ ایمان اور عبد حقیقتاً چونک کر اسے تکنے لگے۔

"اوہ۔ میرا مطلب ہے۔" اجلال گڑبڑایا۔ "کبھی بھی' کسی کیلئے بھی نا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ہیں نا عابی۔؟ تم کیسے استاد ہو۔ تم نے اپنی شاگرد کو آج تک یہ بھی نہیں سکھایا۔؟"

"سب کچھ سکھا دوں گا۔ سب کچھ۔ ابھی تو صرف بولنا بتا رہا ہوں۔ لوگ تو ماسٹرز کرنے تک پہنچ جاتے ہیں مگر انہیں بولنا نہیں آتا۔" یہ جملہ صاف ایما پر ہٹ کر رہا تھا۔ وہ چونک پڑی۔ اس وقت سے اب تک وہ بہت کم بولی تھی۔ "ماھم اب چلیں۔"

"شکر ہے آپ بولنا تو سیکھیں۔ مگر ساتھ یہ بھی سیکھ لیں کہ جب کہیں کھانے جاتے ہیں تو یوں نہیں کرتے کہ آخری نوالہ حلق سے اتارتے ہی اٹھ کر پڑیں۔"

اجلال کی بات پر ماھم اور عبد دونوں ہنس پڑے۔ البتہ ایمان کچھ خجل سی کر سر جھکا گئی۔ کھانا ختم ہو گیا تھا۔ عبد اٹھ کر میز پر سے خالی برتن سمیٹنے لگے۔ "



اللہ اب جانے بھی دیں۔" ایمان نے بڑھ کر ان کے ہاتھوں سے برتن چھین لئے۔

"آپ تو ہمیں شرمندگی کی انتہاؤں تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ میں سمیٹ لیتی ہوں۔"

"نہیں بھئی آپ مہمان ہیں۔"

"نہیں۔ ہم دوست ہیں۔ ہمیں تو مل کر سب کچھ کرنا چاہیے تھا۔"

ٹرے میں سارے برتن رکھ کر ایمان کچن کی طرف چل دی۔ بڑا صاف ستھرا چھوٹا سا کچن تھا۔ وہیں اک چھوٹا فرج بھی پڑا ہوا تھا۔ کسٹرڈ بچا رہ گیا تھا۔ اسے فرج میں رکھا۔ باقی برتن سینک میں رکھتے ہوئے خیال آیا۔ سر عبد کو ہی یہ شاید دھونا پڑیں گے۔ کیونکہ باتوں باتوں میں پتہ چلا تھا کہ ان دونوں کی گھر گرہستی کے معاملے میں اجلال بڑا سست اور کاہل واقع ہوا تھا۔ اس لئے زیادہ کام عابی کو ہی کرنا پڑتے تھے۔

اس سوچ کے ساتھ ہی ایمان نے چادر اتار کر کھونٹی پر لٹکائی اور جلد جلد برتن دھونے لگی۔ ایک ان کا ہاتھ بٹانا مقصود تھا اور دوسرے ٹیچر کا احترام۔ اس کے علاوہ۔ نجانے وہ کونسا جذبہ تھا' جو اسے عبد کیلئے کچھ کرنے کو اکسا رہا تھا۔ ہاتھ برتن دھونے میں مصروف تھے۔ اور دماغ ان کی سوچیں سوچنے میں مصروف۔

یہ سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ بے انتہا اچھا۔ اپنی ہی دھن میں مگن تھی۔ لبوں پر کچھ گنگناہٹیں آن اتریں۔ یہ اس کی ہمیشہ سے عادت تھی۔ جب کسی کام میں بہت مصروف ہوتی تو کچھ نہ کچھ گنگنانے لگتی۔

ایمان واپس کمرے میں نہیں پہنچی تو عبد اسے دیکھنے چلے آئے۔ کچھ دیر وہیں کھڑے اس کی مصروفیتوں کو دیکھتے رہے اور اس کی گنگناہٹوں کے ترنم میں کھوئے رہے۔ پھر اچانک خیال آیا۔ وہ مہمان ہو کر کام میں لگی تھی۔ تب جلدی سے کھنکارے۔ "تو آپ ادھر مصروف ہو گئیں۔" پاس آ کر دھلے ہوئے برتن کپڑے سے خشک کر کر کے ان کی جگہ پر رکھنے لگے۔ "ہمارے ہاں کے مرد یہ عورتوں والے کام نہیں کیا کرتے۔" ایمان نے نظر اٹھا کر انہیں نظر بھر کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"غلط کرتے ہیں۔ انصاف نہیں کرتے۔"

"نہیں۔ اس سے مرد کا احترام ملحوظ ہوتا ہے۔"

''یہ سب فرسودہ خیالات ہیں۔ ہندو ذہنیت رکھنے والا ہے ہمارا معا
ورنہ ہمارے رسول پاکؐ بہت کام اپنے ہاتھوں سے کیا کرتے تھے۔ ان سے ز
قابل احترام ہستی اور کون سی ہو گی۔؟''

''سر!......''

''یہ کیا سر سر لگا رکھی ہے۔'' عبد نے اسے ٹوک دیا تو ہونٹوں میں ادھو
بات لئے انہیں تکتی رہ گئی۔ ''میرا ایک نام عبد بھی ہے اور پیار و بے تکلفی والا نام عا
بھی ہے۔ اور ہم دوست ہیں آپس میں۔ پلیز! اس تکلف کو اب چھوڑ دو۔''

بڑی خوبصورت سی التجا تھی ان کے لہجے میں اور اور ساتھ ہی بڑے اندا
سے جھک جھک کر اور مسکرا مسکرا کر وہ اسے تک بھی رہے تھے۔ ایمان بلش سی ہوئی جا
رہی تھی۔ کچھ ان کے قرب سے' کچھ ان کی باتوں سے' کچھ کام میں ان کا ساتھ دے
اور بار بار نظر بھر بھر کر دیکھنے کی وارفتگی سے۔ عجیب ہی کیفیت ہوئی جا رہی تھی۔ بھ
بہت ساری سوچوں کی یلغار سے پریشان ہو کر انہیں مخاطب کیا۔ ''عابی۔''

''تھینک یو۔'' مزید بات سننے سے پہلے ہی شکریہ ادا کرنے لگے۔

''کس بات کا۔؟''

''پیار والے نام سے پکارا ہے۔''

''اوہ۔'' پیشانی پر پسینے کے قطرے سے نمودار ہو گئے۔ ''وہ۔ اجلال بھی
آپ کو اسی نام سے۔''

''ہاں۔ پیار والے نام سے۔ بہت محبت کرنے والا اور بے حد مخلص دوست
ہے میرا۔''

اس کی پوری بات سننے سے پہلے ہی تفصیل سے جواب دے کر پوچھے
لگے۔ ''ہاں تو تم کیا کہنے لگی تھیں۔''

''ابھی اندر کمرے میں آپ نے ایک لفظ بولا تھا۔ ''جلا وطنی کے زمانے
میں۔'' کیا مطلب تھا اس کا۔؟''

''میری باتیں اتنے غور اور توجہ سے سنتی ہو۔؟''

''وہ۔'' ان کے سوال پر پہلے کچھ سٹپٹائی پھر انہیں کا جملہ بول دیا۔ ''دوست



جو ہیں ہم۔''

عبدالرحمان مسکرا پڑے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ ''حاضر جواب بھی کافی ہو۔''
پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولے۔ ''ملک سے باہر جتنا عرصہ رہا ہوں اسے بھی جلاوطنی کا
دور کہتا ہوں۔ مجھے بیرون ملک جانا پسند نہیں تھا۔''

''تعلیم کے لئے بھی نہیں۔؟ ماشاء اللہ اتنے تو ذہین ہیں آپ۔ پھر بھی
نہیں۔؟''

وہ بہت متجسس نظروں سے ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''لوگ تو بہت خوشی خوشی بیرون ملک جاتے ہیں۔ اور پھر باہر گزارے
ہوئے وقت کو زندگی کا سنہری دور کہتے ہیں مگر آپ۔''

''بس۔ اپنی اپنی سوچ ہے۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ اپنا اپنا انداز ہے۔'' ایمان
کے تجسس بھرے سوالات سے وہ کچھ گڑبڑا گئے تھے۔ کچھ گھبرا گئے تھے۔

''میں آپ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔'' سارے برتن دھل گئے
تھے۔ ایمان سیدھی ہو کر ایک دم ہی ان کی آنکھوں میں بغور دیکھنے لگی تھی۔ ''آپ مجھ
سے کچھ چھپا رہے ہیں۔''

اس لمحے ایمان نے ان کی آنکھوں میں وہی اداسی تیرتی دیکھی تھی۔ آخر
کونسا دکھ تھا جو وہ ہنستے کھلکھلاتے ہوئے بھی ایک دم اس کی گرفت میں آ جاتے تھے
اور پھر انہیں اپنے پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ کم از کم باطنی سوچوں اور خیالوں پر۔ تب وہ
دوتی جذبے آنکھوں میں آن کر ٹھہر جاتے تھے۔ اور پھر آنکھوں کی ان جھیلوں میں
اداسی ننھی ننھی بادبانی کشتیوں کی طرح تیرنے لگتی تھی۔ جب اس عالم' اس کیفیت میں
ہوتے تھے تو نجانے کیوں ایمان کے اندر بہت سارے درد اتر جاتے تھے۔ پھر اس کا
دل چاہتا تھا وہ اس شخص کا' جو آنکھوں میں کوئی گہرا دکھ بھرا راز لئے پھر رہا تھا' اس کا
درد سمیٹ لے۔ اسے اس کرب سے نجات دلا دے۔ کسی بھی طرح۔ کچھ بھی کرے۔

اور اس وقت بھی ایمان اسی احساس' اسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ ایک ٹک
تکے جا رہی تھی ان کی آنکھوں میں۔ اور وہ نظریں چرا رہے تھے۔ ''چھپا رہے ہیں نا
کچھ مجھ سے۔؟'' وہ خاصی مضطرب تھی۔ اور بہت دوستانہ اور مشفقانہ اس کا لہجہ تھا۔

''تم سے کبھی کچھ نہیں چھپاؤں گا۔'' یکایک جیسے انہوں نے کوئی فیصلہ
تھا۔ ہولے سے ایمان کے کندھے کو تھپکا۔ ''تم میری سب سے زیادہ اچھی د
ہو۔ میں تمہارے ساتھ اپنا ہر دکھ شیئر کرنا پسند کروں گا۔''
کچھ ایسے جذب کے عالم میں وہ یہ سب کچھ کہہ گئے تھے کہ ایمان آ
مبہوت سی انہیں تکتی رہ گئی۔
''چائے چلے گی۔؟'' میزبان کی پرمحبت آواز نے اسے چونکا دیا۔ مسکر
ہوئے نظریں اٹھائیں ''میرا خیال ہے چائے کی بجائے اب ہم ہی نہ چ
کریں۔؟''

پھر اک دم اسے اپنے وجود کا خیال آ گیا۔ چادر کھونٹی پہ لٹکائے وہ اپ
کی سی بے تکلفی کے ساتھ عابی کے کچن میں کھڑی تھی جبکہ وہ خود بھی وہیں موجو
''ہائے اللہ۔!'' جلدی سے پلٹ کر چادر اوڑھنے لگی۔ شرم و حیا کے مارے چہر
سرخ ہو گیا تھا۔ بڑا حسین نظارہ تھا۔ گلابوں کے پودوں میں جیسے شعلے سے
رہے تھے۔

''سارا کام ہو گیا۔ میں اب چلتی ہوں۔''
''اتنی جلد۔'' اس کی واپسی کے ارادے نے عابی کو بے چین سا کر
وصال کے رنگ بھی عجیب تھے اور فرقت کی گھڑیاں بھی پر درد اور بہت کربناک۔
نے سوچا تھا اب تھوڑی دیر بیٹھ کر گپیں لگائیں گے۔'' لہجے میں ڈھیروں ڈھیر حس
تھیں۔ ''اور ساتھ چائے پئیں گے۔ رک جاؤ نا تھوڑی دیر اور۔''
ان کے چہرے پر کچھ ایسے التجا کے رنگ تھے کہ ایمان نظر انداز نہ کر
''ایک شرط پر۔''
''دس شرطیں منوا لو۔'' بیقراری نمایاں تھی۔
''نہیں۔ صرف ایک۔'' ایمان مسکرائی۔ ''چائے میں بناؤں گی۔ آپ
بہت کام کر لیا۔''
''منظور۔'' وہ ایک دم ہی بہت خوش ہو گئے۔ جلدی جلدی چائے کی چ
اس کے سامنے رکھنے لگے۔ ''یہ پتی کا ڈبہ۔ یہ دودھ۔ یہ کیتلی۔''



''میں ڈھونڈ لوں گی سب کچھ۔''
''کبھی فرصت ملے تو ہمیں بھی ڈھونڈ لینا۔''
''فرصت شرط ہے نا۔ اور اگر وہی نہ ملی تو۔؟'' ایمان کا لہجہ اپنی شوخی میں
ان کی سنجیدگی کو بہا لے گیا۔ ''ورنہ پھر آپ ہی ایسے انگلی کھڑی کر کے ساری کلاس کے
سامنے رسوا کر دیں گے۔ ایمان نالائق ہے۔ ایمان جاہل ہے۔ ایمان ہوم ورک نہیں
کرتی۔''
عبد اس کے سامنے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ کتنی ہی دیر
ہنستے رہے۔ ''ویسے آپ زیادتی کر جاتے ہیں میرے ساتھ۔''
''اور اگر یہ بھی محبت ہی کا اک انداز ہو۔؟''
''آپ اندر جا کر آرام سے بیٹھیں نا۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' ان
کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ایمان نے موضوع بدل دیا۔
''اور اگر میرا آرام کرنے کا طریقہ یہی ہو۔؟'' پھر وہی انداز وارفتگی۔
''ساتھ ساتھ باتیں کریں گے اور ساتھ ساتھ تمہیں چائے بناتے دیکھوں
گا۔ آج اس کچن میں بالکل فیملی والے گھر کا سا ماحول لگ رہا ہے۔ ہیں نا۔؟''
ایمان نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''آپ کی فیملی میں کون کون ہے۔؟''
اچانک ہی اس کے خوبصورت لبوں پر یہ سوال آ گیا تھا۔ بلا ارادہ ہی۔
اور ایمان کے اس سوال پر عبد بری طرح گڑبڑا گئے تھے۔ پھر ایک دم ہی
بات بدل ڈالی۔ ''اب کب آؤ گی۔؟ کل؟ پرسوں۔؟''
''اچھا نہیں لگتا روز روز چلے آنا۔ دوستی یونیورسٹی میں بھی نبھائی جا سکتی
ہے۔'' عابی کی گرمجوشی اور التفات اس کی دھڑکنیں تیز کیے دے رہے تھے۔ ان کی
وارفتگی بھرے انداز سرور بھی بخش رہے تھے اور آزار میں بھی مبتلا کیے دے رہے تھے۔
چولھے کی آنچ تیز کر کے ایمان نے جلد از جلد چائے والا پانی کھولانے کی کوشش
کی۔ اندر کے شعلے بھی بلند سے بلند تر ہوئے جا رہے تھے۔
''یا اللہ! یہ تو نے مجھے کس جلتی آگ میں ڈال دیا ہے۔'' سوچوں میں کھوئی
کھوئی نے جلد جلد چائے بنائی۔ ٹرے میں سارے برتن لگائے۔

عبد خاموش کھڑے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ یوں تیزی سے ہاتھ چلاتی اور بے حد پھرتی سے کام کرتی ہوئی ایمان آفریدی کے وجود میں کتنی کشش تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹوں شرماہٹوں اور گھبراہٹوں کا امتزاج اسے حسین ترین بنائے دے رہا تھا۔ اور وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ بھی نگاہ اٹھا کر اس خاموشی کے پُروقار اور وجاہت بھرے مجسمے کو دیکھ لیتی۔ نظر سے نظر مل جاتی تو وہ یکدم بلش ہوتے ہوئے نگاہ پھیر کر کچھ نہ کچھ کرنے لگ جاتی۔

''چلیں۔'' چائے تیار ہوگئی تھی اور وہ ٹرے اٹھائے کھڑی انہیں آگاہ کر رہی تھی' ایمان کی میٹھی اور مترنم آواز سے ہی ان کا انہماک ٹوٹا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

کمرے میں داخل ہوئے تو ماھم اور اجلال شاید کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر بول رہے تھے۔ ''عابی! آپ فیصلہ کریں۔'' انہیں دیکھتے ہی ماھم عبد سے مخاطب ہوگئی۔

''تم نہیں۔ میں بات کروں گا۔'' اجلال اسے ٹوک کر خود بولنے لگا۔

''نہیں۔ تم چپ کرو۔'' ماھم نے بھی اسی بے تکلفی سے اس کی بات قطع کر ڈالی۔ ''میں بتاتی ہوں۔'' وہ یونہی جھگڑ رہے تھے۔ نجانے بات کیا تھی۔؟ کوئی ایک بھی دوسرے کو بولنے نہیں دے رہا تھا۔

ایمان اپنی ہی سوچوں میں گم جلدی جلدی چائے پیالیوں میں انڈیل رہی تھی۔ وہ اب جلد از جلد یہاں سے رخصت ہونا چاہتی تھی۔ وارڈن کا بھی ڈر نہیں تھا۔ اپنا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ نہ کوئی ٹیسٹ تھا نہ کوئی اور مصروفیت۔ بس۔ اندر اک شور سا برپا تھا۔ بہت ساری مختلف قسم کی آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

''تمہیں یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم دلانے کو کیا اس دن کیلئے بھیجا تھا کہ ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤ۔ پارہ پارہ کر دو ہمیں۔'' یہ اماں اور بابا جان کی آواز تھی۔

''ایماں تو ہمارے ہمایوں کی بچپن کی منگ ہے۔ کیا اسے اس بات کا پتہ نہیں تھا۔؟'' پھوپھا پھوپھی گرج چمک رہے تھے۔ ''کیوں ہماری عزت کو رولا۔''

''میں تمہیں ہر قدم پر انفارم کرتی رہی ہوں نا۔'' ماھم بھی اسے گھور رہی



تھی۔ ''پھر بھلا تم نے اپنے دل کو ان راستوں پر چلنے سے منع کیوں نہیں کیا۔؟''

''ایمان آفریدی میری ہے۔ کوئی کچھ بھی کہے پر اس پر صرف میرا حق ہے۔ کہ یہ معاملہ ہم دونوں کے دلوں کا ہے۔'' سب سے بلند آواز عبدرحمان کی تھی۔ جو دوسری سب آوازوں پر حاوی تھی۔

آدھی پیالی پی تھی۔ باقی وہیں چھوڑ کر ایمان اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے بہت سارے کام ہیں ماھم! جلدی اٹھو۔ اب میں اک منٹ بھی اور یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔''

اور وہ اس کا جواب سنے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ ماھم ابھی نہیں آئی تھی وہ گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ جیسے طویل مسافتیں طے کر کے آئی تھی۔ آنکھیں بہت سارے پانیوں سے بھری تھیں۔ انہیں جھپک نہیں پا رہی تھی۔ کہیں موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ کر رخساروں پر بکھر جائیں۔ اور زمانہ اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھ لے۔!!

## 15

فرحت بہت مضطرب' بہت شکستہ دل تھی آج۔ یوں تو ہمیشہ سے ہی بہت سارے دکھ اور پریشانیاں اس ذات باری تعالیٰ نے اس کے نام لکھ دی تھیں مگر کبھی کبھی اندر سے دل کچھ زیادہ ہی گھبرانے لگتا تھا۔

مدحت اپنی سہیلی شمائلہ کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ بابا جان بھی گھر میں نہیں تھے۔ ورنہ ان کے پاس ہی بیٹھ کر ادھر ادھر کی' کچھ ماضی کی' کچھ حال کی باتوں میں دل کافی بہل جایا کرتا تھا۔

''آج شاید کچھ دیر ہو جائے۔ پنچایت ہے نا۔ زلیخا اور اکرم کے کیس کی۔ فیصلہ ہونا ہے۔ ہو سکتا ہے فیصلہ ہوتے ہی نکاح کا بھی بندوبست ہو جائے۔ تو پھر مجھے کچھ دیر رکنا پڑ جائے۔''

رحمان علی خاں تو معمول کے مطابق جانے سے پہلے اسے بتا گئے تھے کہ

انہیں اس وجہ سے واپسی میں دیر بھی ہو سکتی تھی لہذا وہ خواہ مخواہ پریشان نہ ہ
پھرے۔ وہ اپنا فرض نبھا گئے تھے مگر فرحت کا اپنا ہی دل قرار نہیں پکڑ رہا تھا۔

ویسا ہی مقدمہ۔ وہی صورت حال۔ اسی انداز کی سنگینی۔ جو خود اس
ساتھ ہوا تھا۔

ہاں یقیناً۔ یہ گھبراہٹیں' یہ اندر کی ویرانیاں اور سناٹے' اس لئے سوا ہو
رہے تھے۔ کبھی اس کمرے میں جاتی۔ کبھی اس میں جا بیٹھتی۔ لیکن کہیں بھی چین
سکون نہیں مل رہا تھا۔ پھر وہ بے خیالی میں بلا ارادہ ہی بابا جان کی نشست گاہ میں
آئی۔ اچانک ہی نگاہ سامنے عبدرحمان کی تصویر کی جانب اٹھ گئی تھی۔ اسے دیکھتے
دیکھتے آگے بڑھی اور ان کی مخصوص جگہ پر ٹک گئی۔

آہ! کیسی روشنیاں' کیسی جگمگاہٹیں ہوا کرتی تھیں اس کی آنکھوں میں۔
ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتی چلی گئی۔

عبدرحمان۔ جو اس کا چچا زاد بھی تھا۔ زید رحمان کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔
اس حویلی کی رونق بھی۔ اور شاید اس گھرانے کے ہر دل کی رونق۔!!

مگر۔ یہ اس کی آنکھوں کی جلتی قندیلیں' یہ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹیں
سب معدوم ہو گئیں۔ سب بجھ گئیں۔ سب چھن گئیں اس سے۔

"کس نے چھین لیں۔؟" اندر سے سوال ابھرا۔

"تم نے۔ فرحت! تم نے۔" اندر سے ہی جواب ملا۔

نہیں نہیں۔ وہ اس کی مجرم ضرور تھی لیکن قصوروار نہیں تھی۔ وہ تو خود ع
میں تھی۔ اس معاشرے کے' اس سماج کے' جس نے یہ سارے رسم و رواج بنا
تھے۔ عبدرحمان کی آنکھوں کے جلتے چراغوں نے اداسیوں کی چادر اوڑھ
اندھیرے اس کا مقدر تو نہیں بنے لیکن اس کے مستقبل کا ہر تابناک لمحہ ہمیشہ کیلئے
کر رہ گیا۔ اب کوئی بھی آس کی کرن' چمکتی' لو دیتی' اس کے پاس نہ تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے فرحت کو لگا اس دیوار پر صرف عبدرحمان کی تصویر ہی
تھی بلکہ پوری دیوار ہی اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں تک مختلف مناظر کی تصا
سے بھری پڑی تھی۔ وہ کبھی اس کو دیکھتی' کبھی اس کو' ہر تصویر ہی اس کی توجہ اپنی طر



کھینچنے کی کوشش میں تھی۔ اور وہ دیوانوں کی طرح نظریں گھما رہی تھی۔ اوپر۔ نیچے۔
دائیں۔ بائیں۔

"بھابھی! میں آپ کیلئے اپنی ساری زندگی وقف کر دوں گا۔" زید رحمان کی
سفید کفن میں لپٹی میت پڑی تھی۔ وہ اس کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ اور عابی اسے
تسلیاں دلاسے دے رہا تھا۔

کبھی اس کے بکھرے بالوں کو سنوارتا۔ کبھی اس کے ننگے سر پہ چادر
اوڑھاتا۔ "قسم کھاتا ہوں اس پاک ذات کی۔ میں اپنی زندگی میں آنے والی ہر خوشی
سے رخ موڑ لوں گا۔ تج دونگا سب کچھ۔ بس صرف آپ اور مدحو ہوں گی میرے
لئے۔ میری حیات کی ہر تمنا' ہر راحت آپ دونوں سے شروع ہو کر آپ دونوں پر ختم
ہو گی۔ یہ دیکھئے میں اپنے مرے ہوئے بھائی سے وعدہ کرتا ہوں۔ مدحو کو ہمیشہ اپنی
اولاد سمجھوں گا۔ آپ کو اپنی بہن' اپنی ماں سمجھوں گا۔ اک صرف بھائی آپ کی
آنکھوں سے اوجھل ہوں گے' وہ کمی میں کسی طرح پوری نہیں کر سکوں گا کہ یہ خدائی حکم
ہے۔ ہاں البتہ اس کے علاوہ دنیا کی ہر خوشی' ہر آسائش' ہر آسودگی میں آپ کے
قدموں میں ڈال دوں گا۔ جو بھی میری دسترس میں ہو گی۔ اور جو نہیں ہو گی اس کی
کوشش کروں گا۔ آپ کی خاطر۔"

فرحت سے اسے بہت پیار تھا۔ وہ اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کا
ننگا سر برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے بازوؤں میں لے لے کر تسلی دلاسے بھی دے
رہا تھا اور اپنی زندگی کی ہر خوشی ان دونوں پر قربان کر دینے کے وعدے بھی کر رہا تھا۔

پھر اس نے تمام عہد و پیمان نبھائے بھی۔ وہ دھن کا پکا انسان تھا۔ عزائم اور
ارادوں کا راسخ! تب اپنی حیات کا ہر لمحہ اس نے ان کے لیے وقف کر دیا۔

وہ ان کے لیے شاپنگ کرتا۔ وہ انہیں سیریں کراتا۔ ان کے ساتھ گھنٹوں
گپ شپ میں مصروف رہتا۔ ان ڈور تمام گیمز مدحت کے ساتھ فرحت کو بھی سکھاتا۔
کھلاتا۔ بی۔ اے کا امتحان دینا تھا' ان دونوں کی خاطر اس کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔

"ساری زندگی پڑی ہے پڑھنے کو۔ میری بھابھی اور میری مدحو کو اس وقت
میری ضرورت ہے۔ میں ان کی تنہائی بڑھا دوں اپنی پڑھائی میں کھو کر۔ یہ کیسے ہو سکتا

ہے۔ مجھے تو ان کے ہر دکھ کا درماں بننا ہے۔ انہیں خوشیاں دینی ہیں۔"

اور سچ مچ ایسا ہی ہوا۔ اس نے ان کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں ہنسی قہقہوں کی پھلجھڑیاں اتار دیں۔ یوں اس کی کوشش سے بہت جلد وہ دونوں بحال ہو گئی تھیں۔ حویلی میں قہقہے گونجنے لگے تھے۔

چھ مہینے گزر گئے۔ وقت نے اک اور کروٹ بدلی۔ ایسی کروٹ، جس کا انہیں اندازہ ہی نہیں تھا۔ سمجھ رہے تھے۔ ایسے ہی زندگی گزرتی چلی جائے گی۔ مطمئن اور پرسکون۔!!

"بھابھی! سنا آپ نے یہ بابا جان کیا کہہ رہے ہیں۔؟" اگلی تصویر کا منظر کتنا کریہہ، کتنا بھیانک تھا۔ عابی فرحت کا پلو تھامے، اسی سے اپنا دکھ بیان کر رہا تھا۔

"میرے اور آپ کے نکاح کی بات کر رہے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ آپ ہی انہیں سمجھائیں کچھ۔"

جب فرحت بیاہ کر حویلی میں آئی تھی تو اسی طرح نو دس سال کا عابی اس کا پلو تھامے اس کے ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا۔ اپنا ہر دکھ سکھ اسے بتاتا۔ یہاں تک کہ بابا جان یا اماں سے کوئی اختلاف ہو جاتا تو فریاد بھابھی کے حضور پیش کی جاتی۔ روتا تو بھابھی کا پلو تھام کر اور ہنستا تو بھابھی کے آنچل کی چھاؤں میں۔ اب بھی جب باپ سے ہار گیا تو بے بسی کے مارے فرحت کے قدموں میں جا بیٹھا۔

"بڑا بھائی بھی نہیں رہا۔ اب آپ ہی ہیں میری سب کچھ۔ پچھلے دس سالوں کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ ہر دکھ آپ سے شیئر کرتا ہوں۔" وہ بے حد معصومیت سے اسی کی بات اسی کے ساتھ کر رہا تھا۔ سوجا پھولا چہرہ لئے اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ "بابا جان کو کہیے اپنی ضد سے باز آجائیں۔ چھوڑ دیں یہ خیال۔ ورنہ میں یہ گھر چھوڑ دوں گا ہمیشہ کے لئے۔ پھر آنکھیں ترس جائیں گی سب کی مجھے دیکھنے کو۔"

وہ بولتا رہا، فرحت سنتی رہی۔ اسے یہ بھی نہ بتا سکی کہ وہ اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ان کی برادری قبیلے کا دستور تھا کہ ایک بھائی کی بیوہ کے ساتھ دوسرے کو نکاح کرنا ہی پڑتا تھا۔ بے شک چھوٹا ہو یا بڑا۔ شادی شدہ ہو یا



کنوارا۔ کہ ان میں گھر کی عزت کو باہر نہیں جانے دیتے تھے۔

ہائے! کس قدر مان سے اس نے اس سے بات کی تھی۔ فرحت کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ اسے کوئی ایک دو لفظ ہی تسلی کے کہے۔ اسے اپنی حمایت کا یقین دلائے۔ اس کی پریشانی دور کرے۔ مگر وہ گونگی بہری بنی بیٹھی رہی۔ رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ اس سے چھپا چھپا کر صاف کرتی رہی۔ کہ اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

دوسرے دن وہ پھر اس کے پاس بیٹھا تھا۔ "ماسی حنیفہ نے مجھے بلوایا تھا۔ پتہ ہے کیوں۔؟" بہت ہنس کر بتا رہا تھا۔ "شاید بابا جان نے انہیں مجھے سمجھانے کو کہا تھا۔"

فرحت چپ چاپ بیٹھی سن رہی تھی۔ اسی کیفیت میں، اسی پریشانی میں۔

"کیا ہوا اگر تمہاری اور فرحت کی عمر میں دس بارہ سال کا فرق ہے۔ جب حضور پاک کی شادی ہوئی تھی تو حضرت خدیجہ الکبریٰ بھی تو ان سے پورے پندرہ برس بڑی تھیں۔" یہ مجھے ماسی حنیفہ سمجھا رہی تھیں۔ ان کے خیال میں، میں آپ کی اور اپنی عمر کی وجہ سے انکار کر رہا ہوں۔"

اماں کی اکلوتی بہن ماسی حنیفہ نے رحمان علی خاں کو یقین دلایا تھا کہ وہ ضرور عابی کو رضامند کر لیں گی۔ ایک بار اسے ان کے پاس بھیجیں تو سہی۔

تصویر کے ہر فریم میں وہ فرحت کے ساتھ موجود تھا۔ اب ماسی حنیفہ کے خلاف شکایت لئے بیٹھا تھا۔ اسی طرح اس کا پلو تھامے خاصی بلند آواز میں اس کے ساتھ محو گفتگو تھا۔

"آپ ماسی کو سمجھائیں نا۔ عمر کی بات نہیں ہوتی۔ عمر کی بات ہوتی تو آپ میری دوست بھی نہ ہوتیں۔ اور اب ہماری کیسی دوستی ہے۔ جیسے ہم عمر ہوں۔ مگر یہ شادی بیاہ کا معاملہ تو مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ رسول پاک کی مرضی شامل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی، کسی کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ زبردستی کرنے کی اجازت نہیں دی۔"

اسے سارے شرع و سنت کے احکامات کا علم تھا۔

"حضرت خدیجہ الکبریٰ کے ساتھ جو رشتہ طے ہوا تھا تو رضامندی کی بنیاد پر ہوا تھا۔ مگر یہاں میری رضامندی نہیں ہے۔ آپ کی بھی نہیں ہے نا۔؟"

اور واقعی مرضی فرحت کی بھی نہیں تھی، وہ اپنی زندگی زید رحمان کی یاد میں اس

کی بیٹی کے ساتھ اور اپنے چچا رحمان علی خاں کے ساتھ اس حویلی میں رہ کر گزا
چاہتی تھی۔ مگر کسی نے اس سے اس کی مرضی پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔ ا
کے قبیلے میں کب عورت کو اتنی اہمیت دی جاتی تھی کہ وہ اپنے ہی کسی معاملے یا مسئلے
میں بول سکے۔ یا خود کوئی فیصلہ کر سکے۔ اس کو کوئی حق نہیں دیا جاتا تھا۔

''بھابی! کل تایا جان نے مجھے بلوایا تھا۔ آخر یہ سب ہمارے پیچھے کیو
پڑ گئے ہیں۔؟ پھر وہی بات' وہی مسئلہ' وہ بھی چھیڑ بیٹھے۔ کتنی اچھی ہماری زندگی گز
رہی ہے۔ خدا کیلئے کچھ کریں۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ آپ بابا جان سے با
کیوں نہیں کرتیں۔ میری تو وہ سنتے ہی نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کی سن
گے۔ اور مان بھی جائیں گے۔ ہمیشہ کی طرح۔ وہ آپ کی ہر بات مانا کرتے ہیں۔''

وہ اس کی منتیں التجائیں کرتا رہا تھا۔ بہت بے قرار تھا۔ بے حد مضطرب تھا
اس پر اسے بے تحاشا ترس آ رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ کہ اس
زبان پر مجبوری و بے بسی کے قفل پڑے تھے۔ اپنے ہاں کی عورت کا مقام وہ جا
پہچانتی تھی۔ لیکن اسے بتانے سے قاصر تھی۔

پھر وہ آخری بار تھی جب وہ اکیلے میں اس کے پاس آیا تھا۔ اس بار اس
فرحت کا پلو نہیں تھاما تھا۔ اس کے پاس بیٹھا بھی نہیں تھا۔ بس دور کھڑا بات کرتا رہا تھا
''کل آپ کا اور میرا نکاح ہونا قرار پایا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ
پھر اس نے پاگل دیوانوں کی طرح ایک قہقہہ لگایا۔ ''نکاح ایسے نہیں ہوا کرتا۔ مر
کے خلاف۔ مرضی کے بغیر۔ بس یوں سمجھئے یہ اک ناٹک' اک ڈرامہ ہی ہوگا۔ میں
ڈرامہ بھی کبھی نہ کھیلتا مگر کیا کروں۔ بابا جان کی زندگی سے بھی تو نہیں کھیل سکتا۔''

اب اس کی آواز میں لرزش تھی۔ آنسوؤں کی آمیزش تھی' لہجہ مرتعش تھا۔
''وہ کہتے ہیں اگر میں نے ان کا حکم نہ مانا تو وہ خود کو شوٹ کر لیں گے
میں ان کی ضدی طبیعت کو جانتا ہوں۔ یوں بھی وہ رسم و رواج کو کبھی نہیں توڑیں
خواہ ان کا بیٹا ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔''

پھر وہ کتنی ہی دیر رخ پھیرے چپ چاپ کھڑا رہا۔ فرحت نے اس
تاثرات جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ویسے جان بھی



تو کیا کرتی۔ اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ سوائے آنسو بہانے کے اور وہ بہا رہی
تھی۔ چپکے چپکے۔

''کل اس حویلی میں میرا آخری دن ہوگا۔'' کچھ توقف کے بعد اس نے
آخری ضرب لگائی۔ ''میں یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔'' یہاں میرا جو کچھ ہے' شرع و سنت
کے حساب سے جو کچھ میرا حق یہاں بنتا ہے' میں وہ سب مدحت کے نام کرتا ہوں۔
بقائم ہوش و حواس۔ آپ گواہ رہئے گا۔''

اگلی تصویر میں فرحت دیکھ رہی تھی۔ عبدالرحمان کے ساتھ اس کا نکاح ہو رہا
تھا۔ خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ اسے دلہن بنایا گیا تھا۔ تقریباً ساری بستی کے
لوگ آج حویلی میں کھانے پر مدعو تھے۔

نکاح ہو گیا۔ فائرنگ سے سارا ماحول گونج اٹھا۔ کھانا وغیرہ کھا کر سب
مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ اس وقت وہ کمرے میں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی
روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے یوں پیوست تھے جیسے نہ کبھی زندگی
میں بولا تھا اور نہ آئندہ کبھی بول سکے گا۔

سوئی ہوئی مدحت کے پاس بیٹھ کر وہ کتنی ہی دیر اس کے بالوں میں ہاتھ
پھیرتا رہا اور چہرے کو بڑے غور سے تکتا رہا۔ پھر جھکا اور انتہائی والہانہ انداز میں اس
کی پیشانی اور اس کے گالوں کو چومنے لگا۔ وہ کسمسائی تو اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

فرحت اس کی ساری کارکردگی دیکھ رہی تھی۔ اس نے فرحت کی طرف نظر بھی
نہیں اٹھائی۔ واپسی کے لئے قدم اٹھا لئے۔ دروازے تک پہنچ کر پھر مڑا۔ تیز تیز قدم چلتا
واپس آ کر پھر مدحت پر جھک گیا۔ وہ ایک بار پھر اسے پیار کر رہا تھا۔ فرحت نے دیکھا
اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ منظر فرحت سے دیکھا نہیں گیا۔ اس نے
آنکھیں میچ لیں۔ پھر قدموں کی چاپ پر اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ جا چکا تھا۔

فرحت کا خیال تھا۔ باپ' مدحت' گھر بار' حویلی' زمینیں' جائدادیں' آسائشیں'
چھوڑ کر کہاں جائے گا۔ یا اگر گیا بھی تو کب تک ان سب کے بغیر رہ سکے گا۔ وہ آ
جائے گا واپس۔ لوٹ آئے گا دو چار ماہ میں۔ مگر وہ ایسا گیا۔ چھ سال گزر گئے۔

اس تمام عرصے میں البتہ وہ اپنی مدحت کو نہیں بھولا۔ ہر ایک ڈیڑھ ماہ بعد

اسے کوئی خط یا کارڈ مدحت کے نام آ جاتا۔ پھر مدحت کی سالگرہ اور عید کے موقع
وہ تحفہ بھی ضرور بھیجتا۔ البتہ فرحت یا بابا جان کے لئے وہ کبھی بھی اک لفظ نہیں لکھ
تھا۔ ان سے اس کا مکمل بائیکاٹ تھا۔

یہ سب' جو کچھ ہو گیا فرحت نے تو کبھی بھی نہیں چاہا تھا۔ وہ اس کی تصویر
دیکھ رہی تھی اور اس کے آنسو بہہ بہہ کر رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

چھ سال بعد وہ آیا بھی تو صرف مدحت کیلئے جس کا اظہار اس کا ہر انداز
رہا تھا۔ اس نے شہر میں ہی رہائش اختیار کر لی تھی۔ ہفتے دو ہفتے بعد آ جاتا' بابا جا
اور اس کے لیے اک لفظ ''سلام علیکم'' کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا اس کے پاس۔ بل
مدحت کے ساتھ ہی اس کا ہر رشتہ ناطہ رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ گپیں لگاتا۔ اسے پیا
کرتا۔ اس کے لیے تحفے لے کر آتا۔ دو چار گھنٹے ٹھہرتا اور پھر رخصت ہو جاتا۔

اس کی آنکھوں کی جگمگاہٹیں جیسے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکی تھیں ا
اداسی نے وہاں مستقل ڈیرے ڈال لئے تھے۔

بابا جان ظاہر کچھ نہیں کرتے تھے مگر فرحت نے اکثر انہیں اس کی تصویر کے
ساتھ بے آواز' آواز میں باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ہونٹوں پر بظاہر زید رحمان کا نام ہو
تھا مگر فرحت جانتی تھی ان کا ہر لمحہ صرف اپنے عابی کی یاد میں اس کی تصویر دیکھ کر گز
تھا۔ ان کے رخساروں پر بہتے آنسو بھی اس نے دیکھے تھے۔ اسے یقین تھا وہ دکھ
عبد ہی کا تھا۔ زید کی جدائی تو اللہ کی رضا تھی' عبد سے جو فرقت کی گھڑیاں ملی تھیں
اسے سراسر اپنا قصور' اپنا جرم سمجھتے تھے۔

مگر اب صرف پچھتاوے باقی رہ گئے تھے۔ کر کوئی بھی کچھ نہیں سکتا تھا۔

## 16

ایمان آفریدی بہت پریشان' بہت مضطرب' بہت بے چین تھی۔

پچھلے تین دنوں سے اس کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ بات ہی ایسی ہو



تھی۔ روتی نہیں تو اور کیا کرتی۔ یہ کمبخت ماھم بھی پتہ نہیں کہاں جا کر مر گئی تھی۔ کچھ
اس سے اپنا دکھ شیئر کر لیتی تو شاید جی ہلکا ہو جاتا۔ اس کی پورے آٹھ دن کی چھٹی کی
درخواست آ گئی تھی ساتھ اس کیلئے اک دو جملوں کی چٹ تھی۔

''سوری۔ آٹھ دنوں کی جدائی ہے۔ ماما زبردستی کر رہی ہیں۔ تفصیل واپسی
پر بتاؤں گی۔ ویسے فی الحال بیروت کے لئے فلائی کر رہی ہوں۔ اس کے بعد کہاں
کہاں' یہ معلوم نہیں۔ خدا حافظ۔ ماھم۔''

''مجھے پتہ ہے۔ آٹھ نہیں تم پندرہ دن لگاؤ گی۔'' وہ پڑھ کر ایمان بڑبڑائی
تھی۔ مگر اس وقت اسے ذرا پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ ماھم کی طرف سے ایسی ایسی
حرکات سرزد ہوتی ہی رہتی تھیں۔

اس کی ماما ہی کو کہیں قرار نہیں تھا۔ کیا مجال جو چار چھ ماہ ہی مسلسل گھر میں
ٹک جاتیں۔ بے شمار دولتیں پاس تھیں۔ سال کے ایسے ایسے دو چار چکر تو ان کے لگ
ہی جایا کرتے تھے۔ جب دیکھو کبھی مشرق کی طرف تو کبھی مغرب کی سمت اڑانیں
بھرتی نظر آتیں۔ کہ کبھی شاپنگ کیلئے جانا ضروری ہو جاتا تو کبھی' ماھم کا بھائی زاروں
جو انگلینڈ کی کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا' اس کیلئے دل اچانک اداس ہو
اٹھتا۔ پھر کبھی اکلوتے بھائی کی یاد ستانے لگتی۔ ماھم کے ماموں جاپان میں رہائش پذیر
تھے' کبھی ان کے پاس یوں وہ چکراتی ہی پھرتیں ساری دنیا میں۔

''چلو اچھا ہے۔ میں اطمینان سے کچھ سٹڈی کر لوں گی۔'' اس وقت تو اس
نے یہی سوچا تھا اور خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔ یوں بھی آج کل اس کے اندر کے موسم
بڑے سہانے اور پر بہار تھے۔ بظاہر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ حالات میں کوئی ایسی نمایاں
سی تبدیلی بھی نہیں پیدا ہوئی تھی پھر بھی کچھ ایسا ہو گیا تھا۔ اندر کے موسم نے باہر بھی
اس کیلئے خوش رنگ گلستان سجا رکھے تھے۔ سب کچھ اچھا ہی اچھا لگتا تھا۔

''کیا بات ہے آج کل بہت خوش رہتی ہو۔ اکثر گنگناتی' مسکراتی پائی جاتی ہو۔''

''تم نے مجھے روتے کب دیکھا ہے۔ میں ہوں ہی بہت خوش اخلاق۔
ہمیشہ سے ہی۔'' ماھم کو تو ایمان نے جواب دے دیا تھا مگر پھر اندر ہی اندر وہ سوچ بنا
رہ نہیں سکی تھی۔ کیا واقعی اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی آ گئی تھی؟

اور ابھی وہ کچھ حتمی انداز میں نہ سوچ پائی تھی' نہ کچھ فیصلہ کر پائی تھی کہ
صحیح کہہ رہی تھی یا غلط۔ کہ اس کی زندگی میں یہ اتنا بڑا طوفان آ گیا۔

''خدا کیلئے ماھم! تم جلد واپس آ جاؤ۔ مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔''

نہ سٹڈیز میں اس کا دل لگ رہا تھا اور نہ کلاس روم کے اندر قدم رکھنے
چاہ رہا تھا۔ جبکہ وہ یہ دونوں کام بڑی خوشی اور لگن سے کیا کرتی تھی۔

سر عبد رول کال لیتے تو جی چاہتا۔ ''یس سر'' کی بجائے ''نو سر''
دے۔ یہ سچ ہی تو تھا۔ وہ حاضر کب تھی۔ نہ کلاس روم میں' نہ یونیورسٹی میں' نہ
کمرے میں۔ حتیٰ کہ اس دنیا میں ہی نہیں۔

''چلو۔ کم از کم آٹھ دن تو میں اطمینان سے کچھ پڑھ لوں گی۔'' ماھم
جانے کے بعد وہ پہلی شام تھی۔ کتابیں فائلیں سامنے رکھ کر ایمان بڑے اطمینان
تسلی سے سٹڈیز کیلئے بیٹھی تھی۔

''یہ جی آپ کو ملنے کوئی فاروقی صاحب آئے ہیں۔'' ہوسٹل کے ملاز
آ کر اطلاع دی۔ ساتھ ہی ایک وزیٹنگ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''ڈاکٹر ابصار فاروقی۔'' بلند آواز میں پڑھتے ہوئے ایمان اٹھ کھڑی ہو
وزیٹنگ روم میں جاتے جاتے وہ یہی سوچتی گئی تھی کہ اس نام کے شخص
قطعی نہیں جانتی تھی۔ بلکہ یہ نام ہی اس نے پوری زندگی میں پہلی بار سنا تھا۔

''میں ڈاکٹر ابصار فاروقی ہوں۔'' وزیٹنگ روم میں موجود اجنبی نے اپنا
کچھ اس انداز میں کرایا۔ ''ہمایوں خاں کا فرینڈ ہوں۔ کل ہی امریکہ سے آیا ہوں

پھر اس نے خوبصورت ریپر میں لپٹا ایک پیکٹ ایمان کی طرف بڑ

''انہوں نے یہ ایمان آفریدی کے لئے بھیجا ہے۔''

''جی۔؟ جی۔؟ ایمان آفریدی تو میں ہی ہوں۔ لیکن۔'' وہ عجیب سی
پنچ میں پڑ گئی تھی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھوپھو کی طرف سے تحائف
اس کیلئے آتے ہی رہتے تھے۔ مگر ہمایوں خاں کی طرف سے اس قسم کی جرأت کا
کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ پیکٹ اسے وصول کرنا چاہیے تھا یا نہیں۔؟ وہ سوچنے لگی تھی۔

''آپ حیران کیوں ہیں۔ ہمایوں خاں آپ کے منگیتر ہی ہیں نا۔؟'' ڈاک



فاروقی ایک شوخ سی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے قدرے بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔

''جی۔؟ جی۔؟ نہیں۔ ہاں۔'' منگیتر کے لفظ اور یا شاید تعلق نے' اسے بری
طرح گھبراہٹ میں ڈال دیا تھا۔

سچ کو سچ کہنا تو بعض اوقات مشکل ہوتا ہی ہے۔ مگر سچ کو تسلیم کرنا بعض
اوقات کس قدر تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے' یہ اسے آج ہی معلوم ہوا تھا۔

''مجھے جلدی ہے۔ یہ آپ اپنی امانت سنبھالیں۔'' ایمان کے چہرے پر
پھیلی سرخیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے وہ پیکٹ ایمان کو تھما دیا۔ ''ایک مہینے
بعد مجھے واپس جانا ہے۔ آپ نے کوئی پیغام یا گفٹ وغیرہ ہمایوں خاں کو بھیجنا ہو تو
اس فون نمبر پر مجھ سے رابطہ کر لیں۔ اللہ حافظ۔''

وہ واقعی جلدی میں تھا۔ ہنستے مسکراتے ہوئے جلدی جلدی بات کر کے نکلا
چلا گیا۔ پر جو ایٹم بم ایمان آفریدی کے لئے چھوڑ گیا تھا' وہ کمرے میں آ کر اسے
پتہ چلا کہ اس کے پھٹنے پر کیا کیا تباہ کاری پھیلی تھی۔

دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اس نے پیکٹ کھولا تو اس میں ایک سویٹر
تھا اور ایک پرفیوم۔ دونوں ہی چیزیں بہت اعلیٰ کوالٹی کی تھیں۔ بے حد قیمتی۔ لیکن
اصل تباہ کاری کا باعث وہ خط بنا تھا جو ہمایوں خاں نے اپنی منگیتر کے نام لکھا تھا۔ اس
میں اس نے اپنی بے شمار محبتوں' چاہتوں اور وفاؤں کا اظہار کرنے کے علاوہ اپنی بے
قراریوں کا بھی احوال بیان کیا ہوا تھا جو اس کے انتظار میں اسے لاحق تھیں۔ اس
تڑپ اور بے چینی کو بھی احاطہ تحریر میں لے آیا تھا جو اس کی جدائی میں وہ برداشت کر
رہا تھا۔

ایمان آفریدی وہ طویل وعریض خط پڑھ کر سکتے کے سے عالم میں بیٹھی رہ
گئی۔ اس میں ہلنے جلنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ تو اس نے شکر کیا کہ تنہا تھی اس وقت۔
پاس کوئی نہیں تھا۔ اس میں تو زبان ہلانے تک کی سکت نہ تھی۔

''یہ کیا ہو گیا۔؟ یہ کیوں ہو گیا۔؟'' صرف اک ذہن تھا جو مصروف عمل تھا۔
لامتناہی سوچیں تھیں۔ اور سوچوں کے خلاف برسرپیکار تھا' دل بھی' دماغ بھی۔ ''کیوں
ہمایوں خاں! یہ تم نے مجھے ایسا خط کیوں لکھا۔؟'' اسے بہت برا لگا تھا۔

حق تھا اس کا۔ بچپن کا منگیتر تھا۔

منگیتر تھا نا۔ پر یہ محبتوں بھرا خط۔ اس کی اجازت کس نے دی۔؟

اس رشتے نے' اس تعلق نے' جو منگیتر نام کے ساتھ استوار ہو گیا تھا۔

"نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ محبتیں تو میں کسی اور کو دے چکی۔ میں
نے تو اپنے دل کی چوکھٹ پر کسی اور کے نام کی تختی لگا دی ہے۔ تم اب کیوں دستک
دینے چلے آئے ہو۔ نہیں ہمایوں خاں! تم اب لوٹ جاؤ۔ مجھے خود اپنے آپ پر
نہیں رہا۔ عبدالرحمان کے سوا اب کوئی نام میری ساعتوں میں نہیں اتر سکتا۔ اب کو
وجود میری نظروں میں نہیں سما سکتا۔ عابی کے علاوہ۔ اور کوئی شبیہ میرے آئینہ دل
ایسا نقش نہیں چھوڑ سکتی جو اس اداس آنکھوں والے نے چھوڑ دیا۔"

خود اسے بھی پتہ نہیں چلا۔ یہ سب کیسے ہو گیا اور کیوں ہو گیا۔؟

دونوں گھٹنوں میں چہرہ دیئے اور بازو ٹانگوں کے گرد لپیٹے وہ بیٹھی رو
رہی تھی۔ کتنا روئی' کب تک روتی رہی۔ کوئی احساس نہیں تھا۔

رات کیسے گزری۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ وہ بستر پر لیٹی بھی نہیں
غرض نیند' بھوک' پیاس سب کچھ غائب تھا۔ تمام حسیات جیسے مفقود سی ہو چکی تھیں۔

فجر کی اذان کی آواز کانوں میں اتری تو اپنی جگہ سے ہلی۔ اٹھ کر واش روم
میں گئی۔ نماز پڑھی۔ کچھ دیر تلاوت کی۔ تھوڑا سا سکون ملا۔ پھر معمول کی طرح
یونیورسٹی چلی گئی۔ کلاسیں بھی اٹینڈ کیں۔ پر معلوم کچھ نہیں ہوا۔ کس سر نے کیا لیکچر
دیا۔ اس نے کیا سنا۔ کیا سمجھا۔ دماغ کچھ بھی اور قبول ہی نہیں کر رہا تھا۔ بس صرف
ایک ہی خیال وہاں جامد ہو چکا تھا۔

زمانے کو کیا جواب دے گی۔؟ اس سوال کا کوئی جواب اس کے پاس نہ
تھا۔ دوپہر کو جلد ہی واپس کمرے میں آ گئی۔ اندر سے لاک کیا اور بیٹھ گئی۔ اور وہی
شغل پھر جاری ہو گیا۔ آنسو اور سوچیں۔ سوچیں اور آنسو۔!!

اگلی رات بھی اسی طرح گزر گئی۔ کھانا پھر نہیں کھایا۔ بسکٹوں کے دو
پیکٹ اور نمکو کی تھیلی پڑی تھی۔ ماھم معلوم نہیں کہاں سے اٹھا لائی تھی۔ کچھ بتا رہی
مگر وہ سن نہیں سکی تھی۔ وہی اس وقت اس کی بھوک ہڑتال کا توڑ بن گئے۔ تین بسکٹ



کھائے۔ نمکو ہتھیلی پر ڈال ڈال کر ایک ایک دانہ ٹھونگتی رہی۔ پانی کا گلاس پاس رکھا
تھا۔ ایک ایک گھونٹ وہ لیتی رہی۔ اچھا شغل ہاتھ آیا تھا۔ وقفے میں آنسو بھی بہا
لیتی۔ یوں دوسری رات گزر گئی۔

اور ماھم کے آنے میں ابھی بہت دن تھے۔ تیسرے دن کا آغاز اسے ہی
کوستے ہوئے کیا۔ یہ کوئی وقت تھا اس کا ورلڈ ٹور پر جانے کا۔ جبکہ اس کی عزیز ترین
دوست اتنے سخت طوفان میں گھری تھی۔ اس کی زندگی میں اتنے بڑے بڑے
انقلابات آ گئے تھے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود' اس کے بار بار سمجھانے کے
باوجود' وہ عبدالرحمان سے محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اپنے اتنے ہینڈسم' لائق فائق' منگیتر کو
چھوڑ کر عبدالرحمان کو دل دے بیٹھی تھی۔

اس سے بڑا بھلا کوئی اور انقلاب ہو سکتا تھا؟ اور اس سے زیادہ ظالم کوئی
اور انکشاف ہو سکتا تھا؟

نہیں۔ یقیناً نہیں۔ وہ کھلے دل سے اعتراف کر رہی تھی۔

اور۔ وہ خوش نہیں تھی۔ وہ بے شمار پریشانیوں میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اسے
ہزاروں لاکھوں تفکرات نے آن گھیرا تھا۔

دل کو سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ کہ یہ سب مناسب نہیں تھا۔ اس کی جو
تقدیر ازل سے لکھی گئی تھی۔ اسے اس پر کاربند رہنا تھا۔ اس کے گھر والے' برادری
خاندان والے' کبھی بھی اس کے دل کے اس کارنامے کو قبول نہیں کریں گے۔ بہت
گڑبڑ ہو جائے گی۔ بہت برا ہو جائے گا۔ مگر دل تھا کہ مان ہی نہیں رہا تھا۔ کسی ضدی
بچے کی طرح مچلا جا رہا تھا۔

بیٹھی بیٹھی اک دم اٹھی۔ اب ہمایوں خاں پر غصہ آ گیا تھا۔ ٹھہرے ہوئے
پرسکون ساگر میں اس نے پتھر پھینک دیا تھا۔ کیوں لکھا تھا اس نے یہ خط۔؟ کیوں۔؟
اس وقت کیوں۔؟ جو ہونا تھا آپ ہی آپ ہو جاتا۔ اس نے کیوں ٹھہرے ہوئے
پانیوں میں تلاطم بپا کر دیا تھا۔ کیا حق تھا اسے ایسا کرنے کا۔؟

سویٹر بہت خوبصورت تھا۔ پرفیوم اس کی پسند کا تھا۔ مگر کاش! یہ چیزیں
ہمایوں خاں کی طرف سے نہ آئی ہوتیں۔ اب تو جب بھی ان کی طرف نگاہ اٹھ جاتی

تھی تو رونا ہی آتا تھا۔ گھن آتی تھی ان سے۔ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکنے لگی تھی کہ کسی
غیبی قوت نے جیسے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

تب اس نے الماری میں کپڑوں کے پیچھے انہیں چھپا دیا۔ نہ دکھائی دیں
گے نہ اس کا صبر وقرار لوٹیں گے، نہ اس کی سوچیں مشتعل ہوں گی۔ نہ بار بار ہمایوں
خاں پر غصہ آئے گا۔ نہ ہر ہر لحہ مرے گی، جئے گی۔ پھر مرے گی، پھر جئے گی۔

چیزیں چھپانے کے بعد خط اٹھایا۔ اسے پرزہ پرزہ کیا۔ اس میں اس کا
امریکہ کا ایڈریس بھی تھا۔ اور ہمایوں نے اسے بہت تاکید کی تھی کہ جواب ضرور
دے۔ وہ انتظار کرے گا۔ کہ اس کے لکھے ہوئے چند الفاظ بھی اس کی بیقراریوں کیلئے
تسکین کا باعث بن جائیں گے۔

جب سوئیٹر اور پرفیوم نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ خط تلف کر دیا گیا۔ تب
وہ کچھ سکون پذیر ہوئی۔ لیکن آنسو اب بھی نہیں تھم رہے تھے۔ اور پھر اگلا دن بھی
شروع ہو گیا۔

سر عبد کا پیریڈ اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اگلے دو پیریڈ فری تھے۔ چپ چاپ
کر لائبریری میں بیٹھ گئی تھی۔ بہت سکون تھا یہاں۔ پہلے تو ماہم سے چھپ کر پڑھنے
کیلئے یہاں آ بیٹھتی تھی۔ اس کونے والی میز پر۔ آج شاید اپنے آپ سے بھی چھپنے کی
کوشش میں تھی۔ کیونکہ اندر کی حالت ویسی ہی تھی۔

سامنے کتاب کھلی پڑی تھی۔ مگر اک لفظ بھی نہ دکھائی دے رہا تھا نہ سوجھائی
دے رہا تھا۔ کمبخت الفاظ بھی اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگ پڑے تھے کہ یکایک
ہی کھلی کتاب پر سنہرے سنہرے رووں والا اک مردانہ ہاتھ آن ٹکا۔ کچھ یوں کہ
دونوں طرف کے اوراق اس پھیلے ہوئے ہاتھ میں چھپ سے گئے۔

ایمان نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ ''ارے۔!'' وہ چونکی اور پھر جلدی سے
اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سامنے ہونٹوں پر اک خوبصورت سا تبسم سجائے، عبد
کھڑے اپنی وجاہتیں بکھیر رہے تھے۔

''تین دنوں سے تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے آج پکڑ پایا ہوں۔''
وہ اس کے ہوائیاں اڑے چہرے کو بغور تکتے ہوئے بولے۔ ''مجھے لگ رہا تھا تم



پریشان ہو۔''

کرسی کھینچ کر خود بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایمان کچھ جھجکی،
کچھ ہچکچائی پھر بیٹھ گئی۔ کاٹن کے زرد سوٹ جیسا اس کا رنگ بھی زرد سا ہو رہا تھا۔ لیکن
چہرے کی خوبصورتی ویسی ہی پر کشش تھی۔ ''پرسوں سے نوٹ کر رہا ہوں۔ تم شاید روتی
بھی رہی ہو۔ آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ کیوں؟''

''وہ۔ اوہ۔ ہاں۔ نہیں۔'' آنکھوں کے سامنے ہمایوں کے بھیجے ہوئے تحفے
اور اس کا محبتوں بھرا خط تھرکنے لگا۔ وہ گڑبڑا سی گئی۔ آنسو پھر آنکھوں میں جمع ہونے
لگے۔ عابی نے بڑے خلوص سے پوچھا تھا۔ لہجہ بھی بہت الفت بھرا تھا اور آنکھوں
سے بھی بہت سارے جذبے عیاں ہو رہے تھے۔

جھوٹ بولے یا سچ کہے۔؟ وہ دبدھا میں پڑ گئی۔ کچھ بھی طے نہیں کر پا رہی
تھی۔ کچھ اپنے دل نے دھڑک دھڑک کر علیحدہ واویلا مچا رکھا تھا۔ کتاب پر رکھے اس
کے دونوں ہاتھ بری طرح لرز کانپ رہے تھے۔

عبد کچھ دیر بڑے غور سے اسے تکتے رہے۔ اس کی کیفیات کو محسوس کرتے
رہے پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے دونوں لرزتے ہاتھوں پر دھر دیا اور بے حد نرم اور ملائم
لہجے میں بولے۔ ''اپنی پریشانی مجھ سے شیئر کر لو۔ اچھا مشورہ دوں گا۔ بہت مخلص
دوست ہوں۔ اور بہت پیار.....'' اپنی باقی بات ہونٹوں میں ہی بڑبڑا کر دبا گئے۔

''کہاں۔؟'' ایمان نے گھبرا کر ارد گرد دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ
اعتراف کر رہی تھی کہ کوئی پریشانی اسے لاحق ضرور تھی۔

''گھر چلتے ہیں۔ ویسے آج اجلال چپل کباب بنا رہا ہے۔ اچھے بناتا
ہے۔'' اتنے ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہے تھے کہ وہ ایک دم بہت ریلیکس ہو گئی۔

پچھلے دو تین دنوں سے کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا تھا اور چپل کباب
پسند بھی بہت تھے۔ ''ماہم نہیں ہے۔'' بہانہ بنایا لیکن نیم رضامندی صاف جھلک رہی
تھی۔ ''یہ کوئی ایکسکیوز نہیں۔''

''سچی۔ میں اس کے بغیر کبھی ہوسٹل سے باہر نہیں گئی۔''

''میرے ساتھ چلو۔ شام سے پہلے واپس بھی چھوڑ جاؤں گا۔''

"وہ۔ میرا ایک پیریڈ باقی ہے۔" پھر بہانہ بنایا۔ جو کہ سچا تھا۔ مگر پورا کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

"میرا چھوڑا ہے نا۔ یہ بھی چھوڑ دو۔ نوٹس فراہم کر دوں گا۔ چلو اٹھو۔"

"لیکن جائیں گے کیسے۔؟"

"بائیک پر۔" وہ اسی بیساختگی سے بولے۔ پر آنکھوں میں شوخی تھی۔

"میں؟ آپ کے ساتھ۔؟ بائیک پر۔؟" وہ آنکھیں پھیلائے انہیں تکنے لگی۔

"کیوں۔؟ بہت ناقابل اعتبار بندہ ہوں۔" ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرائے جا رہے تھے۔ "اوہ۔ نہیں۔ یہ بات نہیں۔" اس نے فوراً اپنا لہجہ اور اپنا انداز نارمل کیا۔ اندر سے فوراً دل کی گواہی پیش ہوئی۔ "آپ سے زیادہ قابل اعتبار کون ہو گا۔"

"پھر اعتراض کیا ہے آخر؟"

"وہ۔ وہ۔" وہ پھر ہکلانے لگی۔ یہ مناسب نہیں تھا۔ دل کہہ رہا تھا۔

مسکراتے ہوئے عبدرحمان اٹھ پڑے۔ "وارڈن سے اجازت لے کر ہوسٹل کے گیٹ پر آ جانا۔ ٹھیک ایک بجے۔"

"سر۔ سر۔" وہ پکارتی رہ گئی۔ عبد تیز تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔

"مجھ سے پریشانی شیئر کرنے کو کہہ رہے تھے اور خود جو اتنی بڑھا گئے' اس کا خیال ہی نہیں۔ اب بھلا بائیک پر ان کے ساتھ کیسے بیٹھوں گی۔؟"

بڑبڑاتے ہوئے اپنی چیزیں سمیٹیں اور ہوسٹل کو چل دی۔ تیار ہوئی' وارڈن سے اجازت لی اور عین ایک بجنے میں پانچ منٹ تھے جب وہ ہوسٹل کے گیٹ پر پہنچ گئی تھی۔ ویسے اسے یہ سب پسند نہیں تھا۔ پر عابی نے دوسری بات سنی ہی نہیں تھی۔ کیسے مجبور ہو گئی تھی۔

"بائیک پر تو کبھی نہیں بیٹھوں گی۔" وہ اندر ہی اندر پروگرام بنا رہی تھی۔ "کوئی رکشا یا ٹیکسی لے لوں گی۔" ابھی سوچ پوری طرح مکمل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ایک ٹیکسی عین اس کے سامنے' بالکل قریب آن رکی۔ پھر عبد اس میں سے نکل کر اسے



اشارے سے بلانے لگے۔

"لیکن آپ نے تو بائیک......"

"پھر رکو۔ بائیک لے آتا ہوں۔" ہنستے ہوئے واپس ٹیکسی میں بیٹھنے لگے تو ایمان کو اندازہ ہوا۔ محض شرارت کر رہے تھے۔ بہت اچھے بھی لگے۔ بہت غصہ بھی آیا ان پر۔ کچھ ترس اپنے آپ پر آیا۔

حالات نے اسے زندگی کے کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ ایسی غلط لڑکی نہ تھی۔ یوں ہوسٹل سے چپکے چپکے نکل کر کسی غیر کو ملنے جاتی۔ لیکن نہیں۔ سر عبدرحمان غیر تو نہیں تھے۔ وہ تو ہمیشہ سے اپنے تھے۔ بس سارا معاملہ ہمایوں نے خراب کیا تھا۔ اسے ایسا خط لکھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کہ اب ایمان کو کوئی ہمدرد تلاش کرنا پڑ گیا تھا۔ جو اس کی پریشانی شیئر کرے۔ عبد یقیناً ایسے تھے۔ اس کی پریشانی بانٹ سکتے تھے۔ ان کا لہجہ' ان کا انداز' کس قدر مشفقانہ تھا۔

ٹیکسی رکی تو وہ اپنے خیالات کے سمندر سے باہر نکلی۔ اس دن کی طرح آج اجلال گیٹ پہ کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ "چپل کباب تیار ہیں بھائی صاحب! بہن صاحبہ!" اجلال نے دونوں کو دیکھتے ہی ہانک لگائی۔ "بہت گرما گرم۔ مصالحے دار۔ چٹپٹے۔" ساتھ ہی بڑھ کر ایمان آفریدی کی سمت والا گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"خوش آمدید۔ خوش آمدید۔" پھر گاڑی کے اندر سر گھسیڑتے ہوئے عابی سے جھگڑنے لگا۔ "قیمہ اتنا کم کیوں لائے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے یہ چڑیا جتنی لڑکی چوگا بھی چڑیا جتنا ہی لے گی۔ نہیں۔ ایسی دھان پان نظر آنے والی لڑکیاں اندر سے بہت پیٹو ہوتی ہیں۔ اس دن ماھم کو قیمے والے ڈونگے کا صفایا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کیسے دونوں ہاتھوں سے لپڑ لپڑ کھا رہی تھی۔"

ایمان کو اجلال کی بات پر ہنسی آ گئی۔ ساری پریشانی بھول بھال وہ ہنستی چلی گئی۔ عبد بھی مسکرا رہے تھے۔ "یار! باہر تو نکلنے دو۔"

"لیکن اب قیمے کا کیا کریں۔" وہ پرے ہٹ کر نکلنے کا راستہ دیتے ہوئے بڑبڑایا۔ "یا تو یہ لڑکی ہمیں وعدہ کرے نا کہ بس دو کبابوں سے زیادہ نہیں کھائے گی۔ ورنہ پھر۔"

"ورنہ پھر کیا ہو گا۔؟" عابی والٹ میں سے نوٹ نکال کر ٹیکسی وا
دیتے ہوئے پلٹے اور تیکھے سے لہجے میں اجلال سے پوچھنے لگے۔ "پورا ایک کلو قیمہ
تھا۔ سچ بتاؤ کیا کیا ہے تم نے قیمے کو۔؟"

ٹیکسی والا کرایہ لے کر چلا گیا تھا۔ وہ دونوں وہیں کھڑے تھے۔ "میں
قیمے کو کیا کرنا تھا۔" اجلال نظریں جھکا کر سر کھجلاتے ہوئے بولا۔ "بس صرف چھ سا
کبابوں کا نمک ہی چکھا ہے۔"

اور جب اندر جا کر عبد نے کبابوں والی پلیٹ دیکھی تو سر ہی پیٹ لیا۔"
دیکھو ایمان! پورے ایک کلو قیمے کے کباب۔" وہ پلیٹ لا کر اسے دکھانے لگے۔

پلیٹ میں صرف چار کباب پڑے ہوئے تھے' وہ بھی سائز میں ب
چھوٹے چھوٹے۔ چپلی کباب تو لگتے ہی نہیں تھے۔

"اور آج مجھے بھوک بھی بہت لگی ہوئی ہے۔" بے تکلفانہ ماحول تھا۔ ایم
پر بھی اثر ہو گیا۔ وہ اپنی بھوک کا رونا رونے لگی۔ "تین دن سے میں نے اچھی ط
کھانا نہیں کھایا۔"

"بتانا اب۔ بچی کیا کرے گی۔؟" عبد کو تو ایک دم ہی غصہ آ گیا۔ یو
بے قابو سے ہو گئے کہ جیسے ابھی اجلال کو کچھ اٹھا کر دے ماریں گے۔ جوان کا ع
ترین دوست تھا۔ چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں بھی لال لال ڈورے ا
آئے تھے۔

"اچھا اچھا۔ تم بیٹھو تو سہی۔" اجلال ان کے غصے کو دیکھ کر بڑے نرم۔
میں بولا۔ "میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔" عبد کو صوفے پر بٹھا کر اجلال خود کچن میں
گیا۔ "کافی تھے اتنے بھی۔" ایمان اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔ اس سے اچھا تھ
نہ ہی آئی ہوتی۔ رائٹنگ ٹیبل کے پاس کھڑی ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے عبدرحمان
دیکھ رہی تھی۔ اور تسلیاں دے رہی تھی۔ "پورے ہو جائیں گے۔"

دونوں دوستوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ سب اس کی وجہ سے۔ اور یہ عبدرحما
توبہ توبہ۔ اس قدر غصے والے تھے۔ وہ حیرت زدہ سی کھڑی تھی۔

"خاک پورے ہو جائیں گے۔" عبد نے سنٹر ٹیبل پر سے پھر کبابوں و



پلیٹ اٹھا لی۔ اور ان کبابوں کو دوبارہ سہ بارہ گننے لگے۔

"اس طرح بڑھ تو نہیں جائیں گے۔ اتنے ہی رہیں گے۔" اجلال کمرے
میں آتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "بے شک چار بار اور گن لو۔"

عبد اور ایمان دونوں نے ہی سر اٹھا کر اجلال کی سمت دیکھا۔ "ہائیں یہ
کیا۔؟" اس کے ہاتھ میں وہی اس دن والا بڑا ٹرے تھا۔ اس میں باقاعدہ لنچ سجا ہوا
تھا۔ تین بڑی بڑی پلیٹوں میں چار چار چپلی کباب تھے۔ چپس اور سلاد سے انہیں
بڑے خوبصورت انداز میں سجایا ہوا تھا۔ ساتھ گرم گرم نان تھے۔ ساتھ ٹماٹو کیچپ کی
بڑی بوتل تھی اور ساتھ کولڈ ڈرنکس۔

سنٹر ٹیبل پر ٹرے رکھ کر وہ سیدھا ہوا تو عابی نے اس کا گریبان تھام لیا۔

"یہ کیا ڈرامہ تھا۔؟"

"تمہارا اک امتحان لینا تھا' وہ لے لیا۔" اجلال نے اک انوکھے سے انداز
میں تبسم فرمایا۔

"بکواس۔" عبد نے مسکراتے ہوئے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

"ہائے! آپ کو اتنا غصہ آ جاتا ہے عابی! میں تو ایسا نہیں سمجھی تھی۔"

"تم اب بھی نہیں سمجھی ہو۔ یہ غصہ نہیں تھا۔ بیچاری بچی کی محبت تھی۔ جو
سر چڑھ کر بول رہی تھی۔"

"بکواس کر رہا ہے۔" عابی سر جھکائے تیزی سے کباب اور چپس کھانے
میں مصروف تھے۔ اسی طرح جھکے جھکے سر سے شرمیلے سے انداز میں بڑبڑائے۔ "اس
کی عادت ہی ایسی ہے۔ اکثر مجھے ایسے ہی تنگ کرتا رہتا ہے۔"

ساتھ ساتھ لنچ ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ گپ شپ۔ اجلال نے اپنے اسی شریر
نداز میں عابی کے بہت سارے لطیفے سنا ڈالے۔ پھر ایمان چائے بنا لائی۔ تینوں نے
بیٹھ کر اسی طرح گپیں لگاتے ہوئے چائے پی۔

"کل شام تھوڑا سا وقت دیں گی۔؟" اچانک ہی عبد نے پوچھ لیا۔

"ہائے بیچارا کیسے تھوڑا سا مانگ رہا ہے۔ دے دو بھئی دے دو۔ ڈھیر سارا
ے دو۔"

وہ اجلال حیدر ہی کیا جو پل بھر کے لئے بھی خاموش رہ جائے۔ مگر ا
گپ باز طبیعت سے یہ ضرور ہوا کہ پچھلے تین دنوں کا کفارہ ادا ہو گیا۔ جتنی ایمان
پریشانی اٹھائی تھی۔ جتنا روئی تھی۔ اتنا ہی وہ یہ دو تین گھنٹے ہنستی رہی۔ ''میری اک
ہے۔ اس کیلئے تحائف خریدنا تھے۔ کیا مدد کرو گی کچھ۔؟''

''کیوں نہیں۔'' ایمان سے پہلے اجلال بول پڑا۔ ''اس سے اچھا موقع
کونسا ملے گا۔ اور بچو! ساتھ سیر بھی کرآنا اور ساتھ آئس کریم بھی.....'' باقی بات
کے مکوں گھونسوں نے مکمل کر دی۔

پھر جب وہ ایمان کو واپس ہوسٹل ڈراپ کر رہے تھے تو بہت سنجیدگی
اسے سمجھا رہے تھے۔

''کوئی بھی پریشانی ہو' آنسوؤں سے حل نہیں ہوا کرتی۔ تم نے
خوبصورت آنکھوں کا حشر دیکھا ہے۔؟ اب اصل بات کل ہو گی۔''

## 17

وہ اک بے حد خوبصورت اپارٹمنٹ تھا اور بہت ہی پیارے انداز میں سجا
تھا۔ جینی اندر باہر پھر پھر کر ہمایوں خاں کو دکھا رہی تھی۔

''یہ دیکھو' یہ کھڑکی اور اس میں سے دکھائی دیتا' وہ دور خوبصورت پہاڑ
منظر' اور اس طرف دیکھو گرتی آبشار۔ ہائے! کس قدر پیارے نظارے ہیں۔''

جینی بطور خاص اسے یہ پارٹمنٹ دکھانے لائی تھی۔ ''یہاں پہلے میری اک
دوست رہا کرتی تھی۔ میں اسے ملنے آیا کرتی تھی۔ یوں سمجھو اس سے ملنے سے زیا
مجھے اس کھڑکی میں سے یہ پہاڑی منظر اور گرتی آبشار کے نظارے دیکھنے کا شوق تھا۔

ہمایوں خاں بڑی دلچسپی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''یوں میں جب بھی یہاں آتی تھی' میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھ
کہ میں اپنی شادی شدہ زندگی اپنے بہت اچھی عادات والے شوہر کے ساتھ ا



اپارٹمنٹ میں گزاروں۔'' پھر اس نے اپنی سفید سفید سی اور نازک نازک سی باہیں
ہمایوں خاں کے گلے میں ڈال دیں۔ ''ہاہ! کس قدر خوبصورت اور مزیدار وہ ساعتیں
ہوں گی جب ہم دونوں یہاں بیٹھ کر گرم گرم کافی پئیں گے اور یا پھر وہ گھڑیاں کتنی
پرسکون ہوں گی' جب میں اک جھولتی کرسی پر' یہاں اس کھڑکی میں بیٹھ کر کوئی اچھی سی
کتاب پڑھوں گی۔''

یہ اس کی پہلی پہلی فرمائش تھی۔ اور جس انداز میں' اس کے گلے میں باہیں
ڈال کر اس نے کی تھی' ہمایوں خاں اپنے دل کے سارے قرار کھو بیٹھا۔

شادی میں صرف دس دن باقی تھے۔ اور وہ دونوں شادی کے بعد رہائش
کیلئے کسی اچھے اپارٹمنٹ کی تلاش میں تھے۔ جب جینی نے ہمایوں خاں کو یہ اپارٹمنٹ
دکھایا تھا۔

''گو میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ یہ جینی کی دیرینہ خواہش
اور پہلی فرمائش ہے۔ لہذا وہ تو پوری کرنا ہو گی۔'' ہمایوں خاں توفیق سے اپنی پرابلم
بیان کر رہا تھا۔ ''اور اب مجھے یہ اپارٹمنٹ خریدنا ہے۔ رقم کا حساب کتاب لگایا ہے مگر
کچھ کم پڑ رہی ہے۔''

''عجیب انسان ہو تم بھی۔ ساتھ ہی کہتے ہو کہ اس پوزیشن میں نہیں ہو۔ رقم
بھی پوری پاس نہیں لیکن اس کی خواہش' اس کی فرمائش پوری بھی کرنا چاہتے ہو۔''

''ہاں تو کیا ہے۔ تم میری مدد نہیں کرو گے۔؟''

''پہلے تمہارے لئے میں نے کیا نہیں کیا۔؟''

''مجھے سب اعتراف ہے جان جگر۔! سب کچھ کیا ہے۔ اسی لئے تو ہر مسئلہ
تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔''

''تو پھر بولو۔ اب مجھ سے کیا چاہتے ہو۔؟''

''صرف تیس ہزار ڈالر کا سوال ہے۔ کہیں سے انتظام کر دو۔''

''تیس ہزار ڈالر۔'' توفیق چونک اٹھا۔

''میں پاپا سے اکٹھے منگوا نہیں سکتا۔ اور ویسے بھی منگوانے میں وقت لگے
گا۔ جو میرے پاس نہیں ہے۔'' ہمایوں بڑے خوبصورت انداز میں مسکر رہا تھا۔ ''میرا

باپ اک کروڑ پتی انسان ہے اور میں اس کی اکلوتی اولاد۔ وہ میری ہر خواہش پوری
کرتا ہے۔"

"تو فی الحال جینی سے ایکسکیوز کر دو۔ باپ کی طرف سے ایڈ آنے تک۔"

"نہیں۔ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرا دل چاہتا ہے اس کی ہر خواہش
پوری کروں۔ جتنی دیر وہ میرے پاس رہتی ہے۔" پھر وہ قدرے دلگیر ہو کر کہنے لگا۔

"کچھ زیادہ وقت تو ہے نہیں میرے پاس۔"

"اتنا افسردہ کیوں ہو رہے ہو۔ اسے ہمیشہ ہی رکھ لینا اپنے پاس۔" تو
چڑ کر بولا تھا۔ "پتہ نہیں تم کیسے انسان ہو۔ اور زندگی سے کیا کیا چاہتے ہو۔؟"

توفیق کتنی ہی دیر بڑبڑاتا رہا تھا۔ بہت کچھ کہہ ڈالا تھا اس نے بہت
سمجھاتا بھی رہا تھا۔ اور ہمایوں خاں چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا تھا۔

"تو گویا تمہاری طرف سے انکار ہے۔" آخر میں ہمایوں بولا تو وہی ا
مطلب کی۔ اس پر توفیق کی کسی بھی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"جینی کیلئے تو مجھے یہ اپارٹمنٹ خریدنا ہی ہے۔ وہ بھی شادی سے پ
پہلے۔"

"میں تمہیں آج تک سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

"اک تمہیں نہیں، سبھی یہی کہتے ہیں۔" ہمایوں خاں بڑے فخر سے کہہ
تھا۔ "مگر میں پوری طرح زندگی انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں مجھے
ڈس ہارٹ نہیں کر سکتیں۔ میں انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

"مجھے ڈر ہے کہیں ایک دن تم۔" توفیق نے مزید کچھ نہیں کہا۔ یہ ہینڈسم
ہمایوں خاں اسے اچھا لگتا تھا۔ پر اس کے اتنا تیز بھاگنے سے وہ اکثر پریشان بھی
جاتا تھا۔ انجوائے منٹس کی خواہشات کرتے کرتے ٹھوکر کھا کر گر ہی نہ جائے۔

اب یہ بھلا کوئی تک تھا۔ جینی کو اتنی بڑی قیمت کا اپارٹمنٹ شادی میں گفٹ
کرنے کا۔ جبکہ اس کے اپنے حساب سے یہ شادی نہیں تھی محض اک ڈیلنگ تھی۔ او
اس میں یہ اپارٹمنٹ والی شق کہیں نہیں تھی۔

بہر حال توفیق ہمایوں خاں کے خیالات و عزائم کے ساتھ متفق تھا یا نہیں،



اک الگ مسئلہ تھا۔ اس سے بالکل علیحدہ۔ مگر اپنے دل اور اصول کے مطابق اس نے
ہمایوں کی مدد ہر صورت میں کرنا تھی۔ وہ ایسا ہی تھا۔ پاکستان سے آنے والے ہر اس
فرد کی مدد کرنا وہ اپنا فرض سمجھا کرتا تھا، جسے کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔

اور ہمایوں خاں کیلئے تو وہ خاص طور پر اپنے دل میں اک علیحدہ سا گداز
رکھتا تھا۔ "چلو اٹھو پھر۔ میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں۔؟"

"میں چیک بک ساتھ تو نہیں لئے پھرتا۔؟"

"وہ مارا۔ جیو یار! رہتی دنیا تک۔"

اپارٹمنٹ کی خریداری ہو گئی۔ جینی اور ہمایوں خاں اس دن بہت خوش تھے۔
اور انہیں خوش دیکھ کر توفیق بھی بے حد ریلیکس ہو گیا تھا۔ شادی میں صرف دو دن باقی
تھے جب پاکستان سے ہمایوں خاں کو اطلاع موصول ہوئی۔

توفیق کے دفتر میں ہی ای میل پر ہمایوں خاں کو پیغام ملا تھا۔ "ماں بہت
بیمار ہے فوراً پاکستان آ جاؤ۔" اور اب وہ دونوں حیرتوں میں گم، فکر و پریشانی میں ڈوبے
آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

صرف دو دنوں بعد ہمایوں خاں کی جینی فر کے ساتھ شادی تھی۔ تمام
تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ یوں وہ اس وقت بھلا کیسے پاکستان جا سکتا تھا۔ ہمایوں کا
پریشانی کے مارے برا حال تھا۔

والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی بھی ساری امیدیں، تمام خواہشات تمنائیں
اسی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اسے پورا احساس تھا۔

"خدا کیلئے کچھ بتاؤ۔ کیا کروں اب۔؟"

آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے۔ سر ہاتھوں میں تھامے بے بس سا بیٹھا
تھا۔ ماں سے بہت پیار تھا۔ اس کی محبتیں، قربانیاں، جاں نثاریاں یاد آ رہی تھیں۔ "اگر
ماما کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو۔؟"

"خیر کے کلمات منہ سے نکالو۔" توفیق اسے ڈھارس بندھا رہا تھا۔ "ٹھیک
ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ۔"

''وہاں پاکستان میں تو کبھی کبھی مرض کی صحیح تشخیص بھی نہیں ہو پاتی
مریض چل بستا ہے۔''

''ہاں۔ انہیں ڈاکٹروں کے ہاتھوں' جو یہاں آ جاتے ہیں تو
کارکردگی بہترین ہوتی ہے۔ ان کی تشخیص صحیح ہوتی ہے۔ ہر مریض ان کے
سے شفایاب ہو کر ہسپتال سے نکلتا ہے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔؟''

توفیق اس کی پریشانی' اس کے صدمے کا دکھ کم کرنے کی خاطر باتیں
رہا تھا۔ پھر اس کا خیال بٹانے کے لئے ہی اپنے اک دور کے کزن کا قصہ سنانے لگا

''ایکسیڈنٹ سے اس کی ٹانگ کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ پورا
ہسپتال میں پڑا رہا۔ چھ آپریشن ہوئے مگر نہ ہڈی جڑی نہ ٹانگ ٹھیک ہوئی۔ آخر
والوں نے کچھ اپنی زندگی کی جمع پونجی اکٹھی کی' کچھ ادھر ادھر سے قرضے لئے اور
یہاں علاج کے لئے لے آئے۔'' وہ اک باصلاحیت داستان گو تھا۔ ''یقین کرو
تین مہینے کے اندر اندر وہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔''

''بالکل۔؟'' ہمایوں سوچوں میں ڈوبا ابھرا۔ ماں کے ٹھیک ہو جانے کی
آس بندھی۔ بہت بہل گیا وہ سارا قصہ سن کر۔

''ہاں بالکل۔'' توفیق اسی ہمدردانہ سے لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ چلو زبانی
سہاروں سے ہی' ہمایوں کا خیال تو ادھر سے ہٹا تھا۔ بھیگی آنکھیں تو خشک
تھیں۔ ''ہڈی بھی جڑ گئی۔ چلنے بھی لگ پڑا۔ ٹانگ بالکل سیدھی۔ اٹھنے بیٹھنے میں
کوئی ٹیڑھ نہیں۔ وہی ٹانگ' جس کے متعلق پاکستانی ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ
پڑے گی۔''

''تو ماما کو یہاں بلوالوں۔؟'' ہمایوں نے بڑی تشویش سے پوچھا۔

''ماما کو۔؟ یہاں۔؟'' توفیق چلا سا پڑا۔ ''پاگل ہوئے ہو۔؟ ان حالات
میں۔؟'' ماتھا پیٹ کر رہ گیا۔ ''بلوالو۔ شاباش کل ہی بلوالو۔'' پھر طنز سے
پچکارنے لگا۔ ''تمہاری شادی میں شریک ہو جائیں گی۔ میں تو کہتا ہوں اک ماما
نہیں سارے کنبے کو بلوالو' رونق رہے گی۔''

''اوہ سوری یار! مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔''



''ہمایوں خاں! تم کیا چیز ہو۔؟'' دانت کچکچائے۔

''وہ دراصل ماما کی پریشانی میں ذہن سے بہت کچھ نکل گیا۔''

''تمہارا ذہن بھی عجیب ہے۔ کچھ داخل بھی بڑی جلدی ہو جاتا ہے اور
خارج بھی۔''

توفیق بڑبڑایا۔ اندر ہی اندر خاصا پریشان تھا۔ ویسے مسئلہ ہمایوں خاں کا
تھا۔ سوچا جائے تو اس کی پریشانی حیران کن بھی تھی۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس
نے حل اسی سے پوچھنا تھا۔ تبھی وہ پہلے ہی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ ''تم ماما کو یہاں
بلوانے تو لگ پڑے ہو اور یہ معلوم ہی نہیں کیا کہ ماما کو ہوا کیا ہے۔ کونسا مرض ہے جو
انہیں اچانک لاحق ہو گیا ہے۔ اور۔ اور کیا واقعی وہ یہاں آ جائیں گی تو ان کا علاج
بہتر ہو جائے گا۔ اور وہ کس حالت میں ہیں آ بھی سکیں گی یا نہیں۔ پہلے یہ ساری
معلومات تو فراہم کرو۔''

''یہ صحیح ہے۔ پریشانی میں یہ خیال ہی نہیں آیا۔'' ہمایوں اس کے ساتھ متفق
ہوا۔ ''ابھی پچھلے ہفتے ہی تو میری ماما کے ساتھ بات ہوئی تھی۔ بھلی چنگی تھیں۔ پھر میں
نے انہیں بتایا تھا کہ ایمان کو میں نے تحائف بھیجے ہیں۔ بہت خوش ہوئی تھیں۔ پھر
میرے ساتھ شادی کی باتیں کرتی رہی تھیں۔''

''کونسی شادی کی۔؟ جینی کے ساتھ والی۔؟''

''جینی کے ساتھ والی وہ کیسے کر سکتی ہیں۔'' ہمایوں جھنجھلا پڑا۔ اس کے
مذاق کو سمجھا ہی نہیں۔

پھر اسی جھنجھلاہٹ میں اٹھ کر گھر فون کرنے لگ پڑا۔ تبھی معلوم ہوا کہ اس
کی ماما کو کچھ دن پہلے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ بہت زبردست بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔
لیکن خدا نے مہربانی کر دی۔ دو دن انتہائی نگہداشت میں رہیں اور اب پہلے سے بہتر
تھیں۔ اتنا کہ زندگی کی امید بندھ گئی تھی۔

مگر اب وہ زندگی سے بے اعتبار بھی ہو گئی تھیں۔ لہٰذا اپنے اکلوتے بیٹے
سے ملنا چاہتی تھیں۔ جتنی جلد ہو سکے۔

''میں کل تمہاری ماما سے تمہاری بات کراؤں گا۔ تمہاری آواز سنیں گی تو یقیناً

انہیں خوشی بھی ہو گی اور تسلی بھی ملے گی۔ اور پھر جلد صحت یابی بھی۔"

پھر باپ نے اسے بتایا کہ کس طرح ان کے ہسپتال جانے سے گھبرا گیا تھا۔ انہیں تو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں اور کیا نہیں۔ وہ تو اس کے مامی آ گئے اور سب کچھ انہوں نے ہی سنبھالا۔ مامی نے گھر اور ماموں ہسپتال تو پریشانی کے مارے کچھ کرنے' سوچنے' سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔

اگلے دن پھر ماما سے بھی ہمایوں خاں کی بات ہوئی۔ ان سے تو بات ہو سکی تھی۔ ڈاکٹر نے زیادہ بولنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ کہ زیادہ گفتگ سے ایسا نہ ہو کوئی جذباتی لمحہ آ جائے اور وہ پھر کسی تکلیف میں مبتلا ہو جا کے معاملات کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

البتہ ماں کی خواہش باپ نے اپنے الفاظ اور زبان سے اس کے گ کر دی تھی۔ "وہ تمہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لئے تم فوراً تیاری کرو۔ ایک ہفتے کے اندر اندر۔"

"مگر بابا جان! یہ ممکن نہیں۔ خدا ماما کو عمر خضر عطا کرے۔ میری دعا کے ساتھ ہیں۔ میرا دل ان کے لئے پریشان ہے مگر میں اتنی جلد واپس نہیں آ

"کیوں۔؟ کیوں آخر۔؟ اتنی بڑی بات ہو جانے کے باوجود۔"

"وہ۔ وہ دراصل میں نے یہاں ایک اور کورس جوائن کر لیا ہے۔"

"ایک اور کورس۔" سامنے بیٹھا توفیق ہنسنے لگا۔ اور ہمایوں گھور دیکھتے ہوئے بہانہ سازیوں میں مصروف ہو گیا۔ ایک دن تو رہ گیا تھا جینی او شادی میں۔ صرف ایک دن۔

ماں کی زندگی کی طرف سے تسلی ہوئی تو جینی اور شادی یاد آنے

"اگر یہ کورس مکمل ہو گیا تو آپ کا بیٹا پاکستان کا لائق فائق ترین شخص ہو گا۔"

"لائق فائق ترین۔" توفیق نے ہنس کر پھر مضحکہ اڑایا۔

اور اب ہمایوں خاں نے اس کی طرف والے کان پر ہاتھ رکھ کر ا اور اپنی بات مکمل کرنے لگ پڑا۔

"اور بابا جان! میں اس کورس کے لیے فیس بھی ادا کر چکا ہوں۔



سے قرضہ لے کر۔ بہت نقصان ہو جائے گا۔ پچاس ہزار ڈالر۔"

رقم بڑھا کر ہی بتائی۔ جینی کے ساتھ ہنی مون کیلئے بھی تو جانا تھا۔ اور یہ موقع بڑا اچھا تھا۔ اس وقت وہ ایسی پریشانی کے عالم میں تھے کہ اس کی ہر ڈیمانڈ فوراً پوری کرنے کو تیار ہو جاتے۔ بغیر کچھ پوچھے گچھے۔

"بھجوا دوں گا وہ رقم۔ دوست کا قرضہ اتار دینا۔ لیکن بیٹا! تمہاری ماما کی خواہش ہے کہ اپنی زندگی میں تمہارا سہرا دیکھ لیں۔ بے شک صرف ایک ہفتے کیلئے ہی آ جاؤ۔"

"ایک ہفتے کیلئے۔ سہرا۔ یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے۔؟" ہمایوں خاں کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ بری طرح سٹپٹایا تھا۔

"میں نہیں کر رہا۔ تمہاری ماں کی خواہش ہے۔"

"لیکن بابا جان! میں نے بتایا نا۔ فیس ادا کر چکا ہوں۔ کورس شروع ہونے والا ہے۔ ویسے بھی ابھی یہاں کی تعلیم کب مکمل ہوئی ہے۔ ڈیڑھ سال پڑا ہے ماسٹرز کی تکمیل میں۔" وہ فون پر ہی باپ کے ساتھ الجھ پڑا۔ "ہمارے ہاں کی خواتین کی خواہشات اور ارمان بھی عجیب ہوتے ہیں۔ بیٹے کا سہرا دیکھیں گی۔ اور خود بستر پر پڑی ہیں۔ آپ نے انہیں سمجھایا نہیں۔ پہلے پوری طرح صحت یاب ہو جائیں پھر سہرے بھی دیکھے جائیں گے۔ ہمارے ہاں کی تو شادیاں بھی......"

"شادی کی بات کون کر رہا ہے۔ فی الحال وہ نکاح کرنا چاہتی ہیں۔ وہ تو چند گھنٹوں کا فنکشن ہو گا۔ بستر پر پڑے پڑے بھی انجوائے کر لیں گی۔ اور جب خوشی ملے گی تو صحت یابی بھی انشاء اللہ جلد ہو جائے گی۔"

"اوہ! نئی مصیبت۔ اچھے ہیں نا امریکہ والے۔ بس ایک دن میں ہی شادی نمٹ جاتی ہے۔ اور پاکستانی شادی۔ کئی حصوں میں بٹی ہوتی ہے۔ مایوں' مہندی' برات' ولیمہ۔ پورے آٹھ دن لگ جاتے ہیں مکمل ہونے میں اور بعض اوقات تو مہینے سال بھی لگ جاتے ہیں۔ نکاح ہو جاتا ہے اور رخصتی چھ ماہ بعد' سال بعد' دو سالوں بعد ہو گی۔ یہ کیسے رسم و رواج ہیں۔ کن عذابوں میں جکڑے ہوئے ہیں ہم لوگ۔"

سوچتے سوچتے' ڈوبتے ڈوبتے آخری سہارا [illegible] ہاتھ آیا۔ "ماموں مامی سے بھی پوچھا۔؟ ایمان کے والدین ہیں۔ ان کے بھی کوئی مسائل ہوں گے۔ ان

کی بھی کوئی خواہشات، کوئی ارمان ہوں گے۔ آپ انہیں کیوں اس افراتفری میں
"تمہاری ماں کی خوشی ان کے لیے بھی اہم اور مقدم ہے۔ تمہیں نہیں پتہ
دونوں بہن بھائی میں کتنی محبت، کتنی انڈرسٹینڈنگ ہے۔ تمہارے ماموں نے ہسپتال
دہلیز اس دن سے نہیں چھوڑی اور تمہاری مامی نے ساری گھر گرہستی سنبھالی ہوئی
وہ تمہاری ماما کی خوشی کیلئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ان سے بات ہو چکی ہے۔"

"پر بابا! میں کسی طرح بھی اس وقت یہاں سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر نکاح فون پر ہو جائے گا۔ کونسا اس وقت رخصتی
ہے۔ مسئلہ تو تمہاری ماما کی خوشی پوری کرنے کا ہے نا۔"

"اوہ خدایا۔!" فون بند کر کے ہمایوں خاں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام
توفیق سامنے بیٹھا اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کی حالت جو
زندگی کا اک اک پل انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ اور اسی تگ و دو میں وہ کن مشکلا
کا شکار ہو گیا تھا۔

"لالچ بری بلا ہے۔" وہ ہولے سے بڑبڑایا۔

"لالچ کی کیا بات ہے۔" ہمایوں نے سر اٹھایا۔ "اب تم ایسی ایسی باتیں
کے میری حوصلہ شکنی تو نہ کرو۔ کیسے میرے دوست ہو۔ مجھے ڈس ہارٹ کر رہے ہو۔
وہ رونے والا ہو رہا تھا۔

"دوست کی وفا کو طعنہ نہ دو۔" توفیق نے اس کے قریب آ کر اس کا شا
تھپتھپایا۔ "اور پریشان بھی مت ہو۔ کرتے ہیں کچھ۔"

وہ اسے تسلی دینے لگا۔ توفیق کو بھی پورا پورا احساس تھا کہ وہ اس وقت انتہا
پریشانی میں مبتلا تھا۔

"تم پرسوں جینی کو تو نمٹاؤ۔"

"کیا مطلب۔؟" پریشانی میں الفاظ کے معنی بھی جیسے بدل گئے تھے۔ اس
کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ "شادی ملتوی کر دوں۔؟"

"نمٹاؤ کا مطلب ہے اس کے ساتھ تو شادی بناؤ۔ دوسرا معاملہ پھر سوچیں
گے۔" ہمایوں کے چہرے پر مسکراہٹوں کے قافلے اتر آئے۔



# 18

عبدالرحمان کے ساتھ شاپنگ کے لئے جاتے ہوئے ایمان آفریدی کو کچھ
عجیب سا بھی لگ رہا تھا اور بہت اچھا بھی محسوس ہو رہا تھا۔

وہ خود یونیورسٹی بائیک پہ آیا جایا کرتے تھے۔ پھر اس دن اسے اپنے گھر
لے جانے کے لیے ٹیکسی لے آئے تھے اور آج سفید سوزوکی میں تھے۔ جسے خود ہی
ڈرائیور کر رہے تھے۔ عین اس کے سامنے گاڑی کو کھڑی کرتے ہوئے باہر نکلے تو
ایمان بے خیالی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کیلئے پیچھے والا دروازہ کھولنے لگی۔

"سر ہوں تمہارا بھئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ایک دم ہی مجھے ڈرائیور تو نہ بنا
دو۔" بڑی دھیمی دھیمی سی مسکراہٹوں کے ساتھ قدرے شوخ سا ہو کر انہوں نے یہ جملہ
بولا تھا۔ تب ایمان گھبرا کر جلدی سے آگے والی سیٹ پر چادر سنبھالتے ہوئے بیٹھ گئی
تھی۔ پیازی کاٹن کے سوٹ میں چہرہ بھی پیازی پیازی سا ہو رہا تھا اور جب
عبدالرحمان نے اس شوخی بھرے انداز میں اس طرح کی بات کی تو بلش ہو کر گلابوں کو
شرمانے لگی۔

"کل یہ گاڑی کہاں تھی۔؟" ان کی نگاہوں سے بچنے کی خاطر پوچھ ڈالا۔

"اپنے مالک کے پاس۔"

"کیا مطلب۔؟" ایمان کی سمجھ میں ان کی بات نہیں آئی تھی۔

"میرے ایک اسٹوڈنٹ کی ہے۔ ورنہ میں ایک غریب سا بندہ ہوں۔
گاڑی افورڈ نہیں کر سکتا۔" انہوں نے خود ہی حقیقت حال سے پردہ اٹھا دیا۔

"دو ٹیوشنز ہیں میرے پاس۔" لہجے میں عاجزی تھی۔ اپنی حیثیت بیان کرنے
والی "یعنی کہ ایک لیکچرر شپ دو ٹیوشنز۔" ایمان نے ان کی کم حیثیتی تسلیم نہیں کی۔

"اتنا کما لیتے ہیں۔ پھر بھلا یہ افورڈ کرنے والی کیا بات ہوئی۔ کہیں کنجوسی کو
افورڈ نہ کرنے کی آڑ تو نہیں دے رہے۔؟"

عبد ہنسے لگے۔ اس کے کنجوسی والے طعنے کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''آپ نے میری بات کو ہنسی میں اڑا دیا ہے۔''

''کیا کریں گے گاڑی رکھ کر۔ بائیک سے ہی کام چل جاتا ہے۔''

''اور آپ کی فیملی۔؟'' ایمان کا لہجہ متجسس تھا۔ ''کیا انہیں ضرورت
ہوتی۔''

وہ پھر ہنس پڑے۔ ''میری فیملی اجلال ہے۔ اس کے پاس بھی بائیک ہے۔
کیا دو بائیکیں ملا کر ایک گاڑی نہ بن گئی۔؟''

ان کی بات سن کر ایمان کو ہنسی تو آئی مگر ضبط کر کے روٹھے سے لہجے
بولی۔ ''آپ ہمیشہ مجھے ٹال جاتے ہیں۔'' پھر بڑبڑائی۔ ''ساتھ دوست بھی
ہیں۔ یہ کہاں کی شرافت ہے۔؟''

''کچھ شبہ ہے میری شرافت پر۔؟'' ذرا سی نظریں گھما کر اسے دیکھا
ہونٹوں پہ بڑا شریر سا تبسم تھا۔

''میں فیملی کی بات کر رہی تھی۔''

''فیملی کوئی ہے ہی نہیں۔'' پھر اک چور نظر اس پر ڈالی۔ ''فی الحال۔''

''فی الحال'' کو نظر انداز کر کے ایمان جلدی سے بولی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا
فیملی کے بغیر بھی بھلا کوئی انسان ہوا ہے۔؟''

''میں جو ہوں تمہارے سامنے۔''

''اور یہ جو شاپنگ کے لئے جا رہے ہیں۔ کس کے لئے۔'' بات کر
کرتے ایک دم نگاہ باہر جا ٹکی۔ مزید اک لفظ نہیں بولا گیا۔

گاڑی تو کسی بے آباد علاقے میں رواں دواں تھی۔ اور۔ اور۔ اس سمت
کوئی شاپنگ سنٹر' کوئی مارکیٹ وغیرہ بھی نہیں تھی۔ ایمان پر یکا یک گھبراہٹ طاری
گئی۔

''عابی! یہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔؟''

اس کے سوال کا کوئی جواب دیئے بغیر عبد گاڑی چلاتے رہے۔ نگا
سامنے دور سڑک پر جمی تھیں۔



''آپ نے بتایا نہیں۔؟'' پریشانی حد سے بڑھنے لگی تھی۔ لہجہ کپکپا رہا تھا۔
اور جناب عبد رحمان پر شرارت کا موڈ طاری تھا۔ اس کی پریشانی بھری
کپکپاہٹ کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اس طرح لاپرواہ' بے نیاز بنے بیٹھے
گاڑی چلاتے رہے۔

''عابی! گاڑی روکیے۔'' آخر اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی۔ سٹیرنگ پر
دھرے عبد کے ہاتھ پر اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ رکھا اور چلانے لگ پڑی۔

''خدا کیلئے گاڑی روک لیجئے۔ میں واپس جاؤں گی۔'' بڑا ہذیانی سا انداز تھا۔

عبد نے گھبرا کر اس کی طرف گردن موڑی۔ ''کیا ہوا۔؟''

''میں نے کہا نا گاڑی واپس موڑ لیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہی
انداز تھا۔ وہی لہجہ۔ وحشتوں بھرا۔ گھبراہٹوں بھرا۔

''ریلیکس ایمان! ریلیکس۔'' انہوں نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی۔ ''آخر
ہوا کیا۔؟''

''بس مجھے واپس ہوسٹل پہنچا دیں۔''

اسے بغور دیکھا۔ وہ تو زار و قطار رو رہی تھی۔ ''مگر کیوں۔؟''

''آپ نے تو اپنی بھتیجی کے لئے شاپنگ کرنا تھی۔ پھر مجھے یہاں کہاں لے
آئے۔؟ کیوں لے آئے۔؟''

اس نے عبد کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ چونکے۔ اس کی پانیوں سے لبریز
ان خوبصورت آنکھوں میں بے اعتباری کی جھلک تھی۔ گاڑی وہیں سڑک کے کنارے
روک کر انہوں نے اس کی طرف رخ موڑا۔

''تمہیں مجھ پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہے۔؟ میں ایسا ناقابل اعتبار انسان
ہوں تمہاری نگاہ میں؟'' وہ تاسف سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ ''مگر میں تو سمجھا تھا
تمہاری نگاہوں میں میرا مقام بہت بلند ہے۔''

''بلند ہی تھا۔ تبھی چلی آئی۔ ورنہ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔''

''پھر اب یہ واپسی کی رٹ۔ رونا دھونا۔ چیخنا چلانا۔ یہ سب کیا ہے۔؟''

وہ اب بھی روئے چلی جا رہی تھی۔ ''یہ سنسان ویران سڑک اور سامنے دور

تک جاتے سناٹے۔ کوئی اور گاڑی بھی نہیں گزر رہی۔"

"تو اعتبار ختم ہو گیا۔ اتنے سے ہی۔؟" سامنے ڈیش بورڈ پر ٹیشوز کا ڈ
تھا۔ اس میں سے اک جھٹکے کے ساتھ اکٹھے تین چار ٹشو نکال کر ایمان کی گود میں پھینکے

"لو چہرہ صاف کرو۔ پھر بات کرتے ہیں۔" بے حد غصیلے لہجے میں بو

"حد ہو گئی ہے تمہاری بھی۔ چھ سال باہر کی دنیا میں رہا ہوں۔ جو رنگوں روشنیو
کہلاتی ہے۔ جہاں حیا و حجاب باقی نہیں رہتے۔ میرے اردگرد جوانیاں بھی
رہیں۔ عریاں و فحش لباس پہنے خواتین دعوت نظارہ بھی دیتی رہیں۔ ساتھ پڑھا'
اٹھا' بیٹھا بھی' مگر نہ کبھی آنکھ میلی ہوئی نہ کبھی ذہن آلودہ۔ اور یہ آج تم نے مجھے
ہی نظروں میں رسوا کر دیا۔"

بولتے بولتے عبد کی آواز حلق میں ہی گھٹنے لگی۔ آنکھوں میں ہزار
شکوے تھے اور ہونٹوں پر کپکپاہٹ۔

"نہیں نہیں۔ وہ۔ میں اکیلی اس شہر میں۔ ہوسٹل میں۔ والدین دور ہیں'
گئی تھی۔" ان کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ ایمان ندامتوں میں ڈوب گ

"روزانہ اخبارات میں ایسی ویسی خبریں نظروں سے گزرتی رہتی ہیں میں اپنا ہی ا
کھو بیٹھی۔"

یہ اس سے کیا ہو گیا۔؟ نادانستگی میں ہی وہ اس جیسے نفیس اور بے ضرر انسا
کو ہرٹ کر بیٹھی۔ "سوری عابی! رئیلی ویری سوری۔"

نادم سی ہوتی ہوئی عبد سے معافیاں مانگنے لگی۔

"دراصل عابی! میری نانو ہر وقت اماں کو یہ کہہ کر خوفزدہ کرتی رہتی ہ
کہ بڑے شہروں میں کالے بھیڑیئے بستے ہیں اور انہوں نے اپنی بیٹی کو اکیلے یہا
بھیج دیا ہے تب میں بھی۔ میں بھی چند لمحوں کیلئے۔"

"تو وہ کالا بھیڑیا تمہیں میں ہی نظر آیا ہوں۔ اغوا کر لوں گا تمہیں۔"
غرائے "پھر پتہ نہیں کہاں سے کہاں پہنچا دوں گا تمہیں۔" دکھ اور کرب میں ڈوبی نگ
سے ایمان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں' جو تمہیں اپنی دوست سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔
وقت تمہارے خیال میں رہتا ہوں۔ کوئی دوسرا تمہاری طرف نظر بد سے دیکھے تو اس کی
آنکھیں نکالنے کو تیار ہو جاتا ہوں۔ اور میرے اتنے سچے کھرے جذبوں کو تم نے یوں
بے یقین اور بے اعتبار کر دیا۔"

انہوں نے سٹیرنگ پر پیشانی ٹکا لی۔ پھر کتنی ہی دیر اسی طرح پیشانی ٹکائے
بیٹھے رہے اور ایمان شرمندگیوں میں ڈوبی ان کی چوڑی پشت کو تکتی رہی۔ "عابی! پلیز
عابی! میری بات تو سنیں۔" پھر جب ندامت حد سے بڑھی تو ان کے کندھے پر ہاتھ
رکھ کر ایمان انہیں مخاطب کرنے لگی۔ مگر انہوں نے اس کی سنی ہی نہیں۔ سر اٹھایا ہی
نہیں۔ اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

کچھ دیر ساکت و صامت رہنے کے بعد اسی طرح بیٹھے بیٹھے رقت بھری
آواز میں پھر بڑبڑانے لگے۔ "تم پریشان تھیں۔ تمہیں پریشانی اور تفکرات میں گھرا
دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا۔ اک پل چین نہیں آ رہا تھا۔ ساری رات نہیں سو سکا۔
تمہارا ہر دکھ' ہر فکر شیئر کرنا چاہتا تھا۔ پھر تمہاری خاطر' تمہیں تسلی دینے کیلئے' تمہارا دل
بہلانے کیلئے یہ پروگرام میں نے بنایا تھا۔ شاپنگ تو صرف ایک بہانہ تھا۔ جس طرح
تمہاری موجودگی مجھے سکون دیتی ہے' میں نے سوچا شاید کچھ وقت میں تمہارے پاس
رہوں' تو تمہارے لئے بھی میرا وجود باعث سکون بن جائے' تبھی یہ لمبا راستہ' لمبی
ڈرائیو اختیار کی تھی۔ شہر کی گہما گہمی' ٹریفک کا شور' آتی جاتی گاڑیوں کے ہارن کی
آوازوں سے ہٹ کر یہ سڑک......"

"سوری عابی! معاف کر دیں پلیز! بتایا نا۔ نانو ہر وقت کہتی رہتی ہیں۔ ورنہ
میں تو۔ میں تو آپ سے بہت۔ بہت۔ ہاں میرا مطلب ہے آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔
بہت محترم اور بہت معتبر جانتی ہوں آپ کو۔ آپ کا وجود' آپ کی موجودگی واقعی
میرے لئے باعث سکون' باعث مسرت ہوتے ہیں۔ یوں آج بھی مجھے آپ کے
ساتھ شاپنگ کیلئے جانے کی بہت خوشی تھی۔ گو اندر ہی اندر ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں کوئی
جاننے والا یا کلاس فیلو نہ دیکھ لے ہمیں' کہیں کسی دکان یا سنٹر میں نہ مل جائے کوئی۔
پھر بھی۔ ان خدشات اور اندیشوں کے باوجود آپ کے ساتھ چل پڑی۔"

تب اسی لمحے عابی نے سر اٹھایا۔ گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں

سے آنکھیں ملیں۔ وہ جو کچھ زبان سے کہہ رہی تھی، آنکھیں اس کی تصدیق کر رہی تھیں۔ اک روشنی، اک رونق سی ان کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔ ان کی آنکھوں میں جو اداسی اتر رہی تھی، یکدم معدوم ہوگئی۔ پوری کہکشاں جیسے ان دو آنکھوں میں سمائی تھی۔

''اک شرط پہ معافی ملے گی۔ آئندہ کچھ بھی ہو جائے کچھ بھی۔ کوئی بڑی سے بڑی بات لیکن میرا اعتبار، میرا یقین اک لمحے کیلئے تمہارے دل سے علیحدہ نہیں ہو گا۔ وعدہ کرو۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' ایمان نے اک لمحہ سوچا۔ فوراً عبد کے سٹیرنگ والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا۔

''تو پھر اجازت ہے؟ آگے چلیں۔؟'' خوشی سے بے اختیار ہوتے ہوئے عبد گنگنائے۔ ''ابھی اور آگے جانا ہے۔؟'' ایمان نے پوچھا۔

''ہاں۔ ہمارا راستہ بہت طویل ہے۔ تھک گئی ہو۔؟''

''آپ ساتھ ہیں تو تھکن کیوں۔؟''

''گڈ۔ ویری گڈ۔'' انہوں نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ ''بس دو تین کلو میٹر اور۔''

اور پھر پتہ ہی نہیں چلا ایمان کو۔ ایسے جیسے پلک جھپکتے میں، وہ مسافت طے ہوگئی تھی۔ سیدھے جاتے جاتے دائیں ہاتھ گاڑی موڑ کر انہوں نے روک دی۔ وہ اک پارک سا تھا۔ دور تک درخت اور رنگ برنگے پھولوں کے خوبصورت قطعات تھے۔ اردگرد کوئی آبادی نہیں تھی۔ بس دور اک چھوٹی سی عمارت نظر آ رہی تھی۔ شاید اسی سے ملحق تھی لیکن وہاں کوئی متنفس موجود نہ تھا۔

ایمان کو گاڑی سے باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی نکلے۔ بڑی خنک سی ہوا چل رہی تھی۔ پھولوں کی خوشبو ہر چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔ ''میں اکثر یہاں آ جایا کرتا ہوں۔ یہ پھول، یہ ہوائیں، یہ معطر معطر فضائیں، میری تنہائی کی ساتھی ہیں۔''

اک خوبصورت سے، معصوم سے تبسم کے ساتھ ایمان سے بات کرتے کرتے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر کچھ چیزیں نکالنے لگے۔ ''یہ چادر پکڑو۔ یہ



کشن۔ اٹھاؤ نا۔''

''مگر یہ کیا۔؟'' حیران ہوتے ہوئے ایمان نے حکم کی پابندی کی۔ اٹھا لیا سب کچھ۔

''بس چپ چاپ چلتی آؤ۔ دیکھتی جاؤ۔'' خود اک باسکٹ اٹھا لی۔ دوسرے ہاتھ میں تھرماس۔ اور آگے آگے چل پڑے۔

ان کی تقلید میں ایمان نے قدم بڑھائے۔ اس سارے ساز و سامان کے ساتھ جو انہوں نے اس پر لاد دیا تھا۔ عجیب سا بندہ تھا۔ عجیب سی اس کی حرکات تھیں۔ مگر سب اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خود بھی۔ اس کی عجیب و غریب حرکات بھی۔

چند قدموں کے فاصلے پر، پھولوں کے قطعات سے علیحدہ سا ہٹ کر اک کنج سا بنا ہوا تھا۔ ہرے بھرے ہوا سے لہراتے پودوں کے درمیان۔ وہاں چادر بچھائی۔ کشن رکھے۔ ایک طرف باسکٹ اور تھرماس دھر دیا۔ پھر خود بڑے آرام سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ ''آؤ نا۔ تم کیوں کھڑی ہو۔؟ یہاں سامنے بیٹھو۔''

''آخر یہ سب ہے کیا۔؟'' حیرتوں میں ڈوبی، وہ بھی اک کنارے پر ٹک گئی۔

''پکنک۔'' بڑی معصومیت سے مسکرا کر جواب دیا۔ ساتھ ہی باسکٹ سامنے کھینچ کر اس سے چیزیں نکال نکال کر باہر رکھنے لگے۔ کولڈ ڈرنک کے دو ٹن تھے۔ دو چھوٹے باکس سینڈوچز کے تھے۔

''اور یہ سب۔؟'' ایمان نے ان چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

''پکنک کا سامان۔'' اسی سادگی اور بھولپن سے فرمایا گیا۔

''یعنی کہ صرف ہم دونوں پکنک منائیں گے۔؟''

''یس۔ صرف ہم دونوں۔'' وفور مسرت سے چہرہ چمکیں مار رہا تھا۔ ہمیشہ سے کہیں زیادہ وجیہہ لگ رہے تھے۔ ان خوبصورت نظاروں ہی کا اک حصہ۔

''ہائے! اتنی خوبصورت جگہ۔'' وہ سچ مچ متاثر ہو گئی۔ کاش! ماھم بھی ہوتی۔'' نو۔ نو۔ تھری از کراؤڈ۔'' وہ زیرلب مسکرائے۔ ''تبھی تو اجلال کو ساتھ نہیں لیا۔ صرف ٹو از کمپنی پر اکتفا کر لیا ہے۔'' پھر ایک دم سے ہی جھک کر ایمان کی آنکھوں

میں تکنے لگے۔ ”سچ بتانا کسی تیسرے کی ضرورت ہے۔؟“

وہ گڑبڑا کر بول اٹھی۔ ”اور اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ ہم نے اکیلے ا
پکنک منالی ہے۔“

”اکیلے اکیلے نہیں۔ دو اکیلوں نے مل کر۔“

عابی کی شوخ بیانی پر ایمان بے اختیار ہنس پڑی۔

”گناہ کی بات کوئی نہیں کی ہم نے۔ پھر کسی کا ڈر کیوں۔؟ جب دل م
خدا کا خوف ہو تو بندوں کا ڈر نکال دینا چاہیے۔“

ایمان جواب میں کچھ نہیں بولی تو عبد ہی بغور اسے تکتے ہوئے کہنے لگے۔

”تمہیں یہاں اس لئے لایا ہوں کہ مجھے تم سے کہنا تھا۔ تنہائی ہے۔ خاموش
ہے۔ ماحول سازگار ہے۔ کوئی ڈسٹربنس نہیں۔ اب تم اپنی پریشانی مجھ سے شیئر کر سک
ہو۔“

”اوہ! صرف اتنی سی بات کیلئے اتنا بڑا اہتمام۔“

”میری بہت پیاری دوست ہو۔ لہٰذا نہ یہ تمہاری پریشانی اتنی سی بات۔
اور نہ یہ سب اتنا بڑا اہتمام ہے۔!“

عبد کے بے پایاں خلوص نے ایمان پر رقت سی طاری کر دی۔ ”آپ کی
نے، آپ کی شفقتوں نے عابی! مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“ وہ بے اختیار رونے لگ پڑی

”آپ میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا کریں۔ میں اس کی مستحق نہیں ہوں

”تم کس کی مستحق ہو یہ مجھے معلوم ہے۔ اور جو سلوک کی بات کرتی ہو تو
میرا دل صرف تمہارے ساتھ ہی ایسا سلوک روا رکھنا چاہتا ہو تو۔؟“ عبد مسکرا ر
تھے۔ ”تو۔ تو۔“ آنکھوں کی بارش مزید تیز ہو گئی۔

”ارے بھئی بتاؤ نا۔ بات کیا ہے آخر۔؟“ عبد کا دل بری طرح
قراریوں کی گرفت میں آ گیا۔ وہ سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ انہیں چین کہاں۔؟

”کل اجلال کی وجہ سے پوچھ نہیں سکا تھا۔ مجھے لگتا ہے تم بہت زیادہ ا
میں ہو۔“

”ہاں عابی! میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ بہت الجھی ہوئی ہ
بہت مضطرب ہوں۔“

”تو میرے ساتھ شیئر کرو نا۔ میں کس مرض کی دوا ہوں۔“

”کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی کچھ نہیں۔“ الفاظ اس کے حلق میں اٹک رہے تھے۔ بتانا چاہ بھی رہی تھی۔ ان سے شیئر بھی کرنے کا من تھا۔ بے شک کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن عبد کی دی ہوئی تسلیاں یقیناً اس کی ڈھارس بندھا سکتی تھیں۔ دنیا میں صرف اک وہی ہستی تھی، وہ جس پر بھروسہ کر سکتی تھی، وہ جس کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی سے قرار پکڑ سکتی تھی۔ تب اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں عبد کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

”عابی! میں بڑی بدنصیب ہوں۔ ازل سے میری تقدیر میں بدنصیبی لکھی گئی ہے۔“ آنسو بہاتے ہوئے وہ آخر اپنی بدنصیبی بیان کرنے لگی۔ ”بچپن سے میری منگنی ہو چکی ہے۔ اور ہمارے خاندان میں یہ رواج ہے کہ جس لڑکی کی منگنی ہو جائے وہ مر تو سکتی ہے مگر اس کی منگنی نہیں ٹوٹ سکتی۔“

”اوہ۔!“ عابی گم سم سے ہو کر اسے تکنے لگے۔ زبان پر یکا یک قفل سے پڑ گئے۔ اک لفظ نہیں بول سکے۔

”اور پھر پتہ ہے عابی! وہ شخص اب مجھے تحائف بھی بھیجنے لگا ہے۔ محبتوں بھرے خطوط بھی لکھنے لگا ہے۔“

عبد نے بے قراری سے پہلو بدلا۔ آنکھوں میں دھندسی چھانے لگی تھی۔

”اور عابی! مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ عابی! میں بہت ڈسٹرب ہوں۔ میں اس شخص سے محبت نہیں کرتی۔ کوشش کروں بھی تو نہیں کر سکتی۔“

”کیسا ہے وہ خوش نصیب۔؟“ عبد کی آواز جیسے کسی کنویں سے آئی تھی۔

”وہ ہینڈسم بھی بہت ہے۔ وہ لائق بھی بہت ہے۔ اس وقت امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ باپ کروڑ پتی ہے۔ اور وہ اکلوتی اولاد۔ یوں سمجھئے بے شمار دولتوں کا مالک بھی ہے۔ پر عابی! دل کی بات ہے۔ میں اس کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔ ساری زندگی نہیں کر سکوں گی۔ میں کیا کروں عابی! پلیز مجھے بتائیے میں کیا کروں۔؟“

وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ عبدرحمان کا دل اندر سے کٹ رہا تھا۔ جیسے کوئی برچھیاں چلا رہا تھا۔ وہ اسے تسلیاں' دلاسے دینا چاہ رہے تھے۔ لیکن اس وقت الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ خود کو بے حد مفلس اور لاچار محسوس کر رہے تھے۔

ایسا ہی وقت کبھی ان پر بھی آیا تھا۔ کس قدر دکھ اور کرب میں مبتلا تھے۔ اک اک کی منتیں کر رہے تھے۔ مگر ان کی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ اب اسی طرح اور ویسی ہی اذیت میں ایمان آفریدی گرفتار تھی۔ ویسی ہی زنجیروں میں جکڑی جا رہی تھی۔

اور عبد کو اس پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ دکھ کی اسی کیفیت اور درد کے اسی عالم سے وہ بھی گزر رہی ہو گی۔ اس کے لئے کیا کریں۔ کس طرح اسے اس قید و بند سے نجات دلائیں۔ رسم و رواج کی ان زنجیروں کو توڑ ڈالیں۔ تاکہ وہ رہائی حاصل کر لے۔

پھر اندر سے سوال ہوا۔ ''کیا تم توڑ سکے ہو ان زنجیروں کو۔؟''

نہیں۔ لیکن اتنا تو ہوا۔ جو زندگی گزارنی انہیں قبول نہ تھی' اس سے منہ موڑ کر اپنا گھر بار' اپنا ملک ہی چھوڑ گئے۔ جلاوطنی قبول کر لی۔ اتنی دولت جائداد والے تھے۔ مگر فاقے کاٹے۔ اک اک لقمے کیلئے محنت مشقت کی۔ اپنا مستقبل روشن کرنے کیلئے تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان راستوں میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' وہ جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ انہوں نے کیا سب کچھ۔!

یوں وہ مرد تھے سب کچھ کر گزرے۔ مگر ایمان آفریدی۔ اک عورت ہونے کے ناطے' کیا یہ سب کچھ کر سکتی تھی۔؟

وہ کیا مشورہ دیں اسے۔؟ وہ کونسے تسلی بھرے الفاظ اسے پیش کریں جن سے وہ سکون پا جائے۔ یا اسے ان زنجیروں کے ٹوٹنے کی نوید مل جائے۔ مگر کوئی حل تھا بھی نہیں اس کے لئے۔ وہ بڑی بے بسی سے اسے تک رہے تھے۔

''آپ کچھ بول نہیں رہے عابی! میری پرابلم شیئر نہیں کر رہے۔ میں نے آپ کے ساتھ بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔'' وہ بے حد دل برداشتہ ہو کر بولی تھی۔

''پورا اتروں گا تمہاری ہر امید پر۔ انشاء اللہ۔'' وہ اتنا پریشان تھی' اتنا



رہی تھی آخر عبد کو اس کی تسلی دلداری کے لئے جھوٹ کا دامن تھامنا پڑا۔

وہ اپنے لئے کب کچھ کر سکے تھے۔ سوائے گھر چھوڑنے کے' ملک چھوڑنے کے۔ اور ایمان تو یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں خیال آیا۔ اب اس کیلئے بھی ساری عمر کی تباہی اور رونا تھا۔ ان کی اپنی زندگی کی طرح۔

فکروں میں گھلتی رہے گی' روتی رہے گی' پھر کوئی مہلک بیماری گلے لگا لے گی اور آخر میں مر جائے گی۔ کیونکہ وہ اک عورت تھی۔

پر یہ بھی دل کو قبول نہ تھا۔ ان کے جیتے جی اس کی زندگی کو کچھ ہو جائے۔ یہ بھی منظور نہ تھا۔ ان کی پہلی پہلی محبت تھی۔ ابھی ابھی دل کو اس بات کا شدتوں سے احساس ہوا تھا۔ کہ انہیں اس کے ساتھ بے پناہ محبت تھی۔ وہ اسے کسی ذرا سے دکھ درد میں بھی مبتلا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ غم و اندوہ میں گھلتے گھلتے اک مستقل روگ لگا لے اور پھر مٹی میں جا سوئے۔ یہ وہ کیسے گوارا کریں گے۔ وہ ہمیشہ کے لئے ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ کیسے برداشت کریں گے۔ نہیں نہیں۔ اس کی ایسی فرقتوں کی اذیتیں اٹھانے سے یہ بہتر تھا۔ جھوٹ کی بیساکھی کے سہارے لے لیں۔ زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا۔ جتنا زیادہ سے زیادہ بول سکے' بولیں گے۔ کیا ہوا اگر عاقبت خراب ہو جائے گی۔ اس کی زندگی کے کچھ روز تو سنور جائیں گے۔ ان کی جھوٹ موٹ کی آسیں اور امیدیں دلانے سے زندگی کے بہت سارے شب و روز خوشگوار تو ہو جائیں گے۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے ہولے تھپتھپایا۔ ''بس۔ بہت رو لیا۔ اب یقیناً سارا غبار نکل گیا ہو گا۔'' اور پھر ہنسے۔ ''مطلع بھی صاف ہو گیا ہو گا۔ پھر تو سورج نکل آنا چاہیے۔'' ٹشو اس کی طرف بڑھائے۔ ''یہ لو آنکھیں اور چہرہ صاف کرو۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس منگیتر والی مصیبت سے کیسے چھوٹ سکتی ہو۔''

''کیا سچ مچ۔؟''

''ہاں۔ بالکل۔'' دوسرے کو پوری طرح مطمئن کر دینے والا انداز تھا۔ ''تم نے پہلے کیوں نہیں مجھ سے ذکر کیا۔''

وہ جلد جلد ٹشو سے آنکھیں اور رخسار صاف کرنے لگی۔ ''وہ بس۔ ڈر تھا کہیں آپ۔ کہیں آپ۔'' اپنی ہی بات مکمل کرنے سے گھبرانے لگی۔ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

''ہاں بولو۔ بلا جھجک' جو دل میں ہے کہہ ڈالو۔ دوست ہوں تمہارا۔ تمہاری خاطر جہاد کرنے کو تیار ہوں۔ ان پرانے' فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ہر انداز میں آواز اٹھاؤں گا۔ تم دیکھنا تو سہی۔''

اس کے خوبصورت ہونٹوں پر اک دلکش سی مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔

''اتنا کچھ نہیں۔ بہت کچھ۔ سب کچھ۔'' ساتھ ہی ایک پیپسی کاٹن کھول کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''لو پیو۔ زیادہ رونے سے آنکھیں تو جو بدصورتی کا شکار ہوتی ہیں' وہ ہوتی ہی ہیں۔ ساتھ یہ جو حلق خشک ہوتا ہے نا۔ وہ بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ زیادہ اذیت ناک۔ پیو جلدی سے۔ سکون ملے گا۔''

''ارے! آپ کو تو ساری کیفیات کا علم ہے۔'' دو گھونٹ بھر کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آپ کبھی روئے ہیں۔؟''

''کئی بار۔'' رواروی میں بول گئے۔ پھر چونکے۔ سٹپٹائے۔ ''میرا مطلب ہے رویا نہیں تو پڑھا تو ہے نا کئی جگہوں پر کئی بار۔ سب معلوم ہے کیا کیا ہوتا ہے۔ ویسے مرد بھلا کب رویا کرتے ہیں۔ اور یوں بھی۔ میں کیوں روؤں گا۔ میری کوئی بچپن میں منگنی ہو چکی ہے۔ اور مجھے اپنی منگیتر سے محبت نہیں ہے۔''

پھر جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ ''اتنی ساری صفات رکھنے کے باوجود یہ منگیتر تمہیں پسند نہیں تو کیا کسی اور میں انوالو ہو۔؟''

ایمان آفریدی ایک دم گڑبڑا سی گئی۔ ابھی پیپسی کاٹن ہاتھ سے چھٹنے لگا تھا۔ گر جاتا۔ عبد رحمان کی سفید چادر خراب ہو جاتی۔ وہ کہتے۔ ''کیسی پھوہڑ لڑکی ہے۔ کھانا پینا بھی ڈھنگ سے نہیں جانتی۔'' یہ ظاہر کی سوچیں تھیں۔ ان کے سوال سے اندر جو کچھ ہو گیا تھا وہ ساری کیفیات بتا نہیں سکتی تھی۔ زلزلوں کا سا سماں تھا۔ وہ سامنے تھے۔ اک سکون بھی تھا۔

''آپ بھی تو لیں۔'' ان کے سوال کو نظر انداز کر کے جلدی جلدی دو



پیپسی کاٹن کھول کر ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ''ارے! مجھے تو بھوک بھی لگی ہے۔'' وہ سوال ان کے ذہن میں ہٹانے' مٹانے کی ہر کوشش بھرپور انداز میں کر رہی تھی۔ ''آپ کو بھی لگی ہو گی۔''

باسکٹ میں سے سینڈوچز والے باکس نکال لئے۔ وہ لائے تھے۔ مگر ان سے پوچھے بغیر ہی۔ ایک ان کے سامنے رکھا۔ ایک خود کھول کر کھانے لگی۔

''بہت مزیدار ہے۔ لیں نا آپ بھی۔'' اپنائیت بھری بے تکلفی عیاں تھی۔

اس کی حرکات دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے وہ بھی سینڈوچ کھانے اور ساتھ گھونٹ گھونٹ پیپسی پینے لگے۔

وہ تو روئے بھی نہیں تھے۔ پھر نجانے کیوں ان کا حلق اتنا خشک تھا۔ کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں ابنارمل تھیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے یہ فضائیں' یہ ہوائیں بڑی خوشگوار تھیں' بڑی جانفزا تھیں۔ دل کے ویرانے میں بہار آئی لگ رہی تھی۔

پر اب۔ پیپسی تو پی لی تھی۔ خشک گلے کو تر کرنے کی خاطر۔ البتہ سینڈوچ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بائیٹ لئے تھے۔ منہ کڑوا ہی ہو گیا تھا۔ اسی طرح واپس دھر دیا۔

''تھرماس میں کافی ہے۔ ہاٹ کافی۔ پوری طرح پکنک منانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔'' منہ کی کڑواہٹ سے کافی یاد آ گئی تھی۔ وہ کتنی کڑوی لگے گی۔ جو پہلے کی اس ذائقے کی صفت لئے تھی۔ شاید زندگی کی کڑواہٹوں میں کچھ کمی کا باعث بن جائے۔ چند لمحات کے لئے ہی سہی۔

کشن سر کے نیچے رکھ کر سوچوں میں کھوئے کھوئے لیٹ گئے۔ نگاہیں اس کے وجود پر جمی تھیں۔ کتنی دلکشیوں اور دلنوازیوں کا حاصل تھا اس کا سراپا اور کتنی کشش تھی اس کے ہنستے مسکراتے چہرے میں۔ وہ مسلسل اسے تکے جا رہے تھے۔ وہ آج تک اسے اپنا ہی سمجھتے رہے تھے مگر وہ تو کسی دوسرے کی ملکیت تھی۔ اندر دکھ کا آتش فشاں ابل رہا تھا۔ اس کے منگیتر کو سوچے جا رہے تھے۔

''میرے کہنے سے تم ایک کوشش کر کے تو دیکھو۔ ہو سکتا ہے کامیاب ہی ہو

جاؤ۔"

"کیسی کوشش۔؟ کس میں کامیاب ہو جاؤں۔؟" وہ نجانے کن سوچوں میں کھوئی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں تھیں۔

"اپنے منگیتر کے ساتھ محبت کرنے کی کوشش۔"

"کیا اس طرح محبت ہو جایا کرتی ہے۔؟" ایمان نے اچانک ہی الٹا ان سے سوال کر ڈالا۔ جیسے انہیں نادانی کا طعنہ دے رہی تھی۔ "آپ کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے" اور انہوں نے وہ نادانی کا طعن قبول کر لیا۔ "اس کا مجھے تجربہ نہیں۔" لیکن بحیثیت استاد اسے سمجھانا ان کا فرض بھی تو تھا۔ "پر تم کوشش بھی تو کرو۔"

"نہیں۔ میں ایسی کوشش کرنا ہی نہیں چاہتی۔" اس نے صاف جواب دے دیا۔ "لیکن آپ تو میری خاطر ان رسم و رواج کی زنجیریں توڑنے والے جہاد کی تیاری کرنے کا کہہ رہے تھے۔"

اس کے مسکراتے چہرے پر پھر اداسی کی پرچھائیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ وہ تو وعدہ ہے۔" اس کی دلداری کی۔ لیکن ا
سے جانتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بے بس تھے۔

نہ اپنے راستوں کا پتہ تھا انہیں کس طرف لے جا رہے تھے۔ اور نہ ا
منزلوں کا۔ وہ بھی جیسے گم ہو چکی تھیں۔ زندگی سے بھٹک جانے والے دو مسافر دونوں۔ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ ان سے مدد طلب کر رہی تھی۔

اور۔ اسے اور خود کو سوچتے سوچتے انہوں نے کہنی چہرے پر دھر لی۔

بے زمین لوگوں کو
بے قرار آنکھوں کو
بدنصیب قدموں کو
جس طرف بھی لے جائیں
راستوں کی مرضی ہے۔

عبدالرحمان بڑی پرسوز سی آواز میں گانے لگے۔ پہلے گنگناہٹیں ابھریں
اک خوبصورت سا ترنم فضاؤں میں پھیل گیا۔ ایمان آفریدی کھانا پینا بھول



طرف متوجہ ہو گئی۔

اجنبی کوئی لا کر
ہم سفر بنا ڈالیں
ساتھ چلنے والوں کی
راکھ بھی اڑا ڈالیں
یا مسافتیں ساری
راستوں کی مرضی ہے۔

"واہ! آپ کے وجود کی' آپ کے سلوک کی اور آپ کی آواز کی خوبصورتیاں چھوڑ کر میں بھلا کسی دوسرے کے ساتھ محبت کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں۔ عابی! آپ تو بڑے ہی بھولے ہیں۔"

روک لیں یا بڑھنے دیں
تھام لیں یا گرنے دیں
وصل کی لکیروں کو
توڑ دیں یا ملنے دیں
راستوں کی مرضی ہے۔

"آپ کبھی روئے ہیں عابی۔؟" وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان سے پوچھ رہی تھی۔ "تم نے کبھی کسی دل کو یوں ٹوٹتے' بکھرتے اور نوحہ کناں دیکھا ہے۔" سامنے بیٹھی اس خوبصورت سی لڑکی سے بہت کچھ کہنے کو ان کا دل مچل رہا ہے۔

ویسے آنسو تو پچھلے کئی سالوں سے ٹپک رہے تھے۔ مگر جو درد کے آنسو اس کی محبت دے گئی وہ تجربہ انوکھا ہی تھا۔ سرور بھی بخش رہا تھا۔ اذیت بھی دے رہا تھا۔

"خاموش کیوں ہو گئے ہیں عابی!" ایمان اک بیقراری سے انہیں جھنجھوڑنے لگی تھی۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ چہرے پر سے بازو ہٹایا تو وہ چونکی۔

"ارے! آپ کا تو سارا چہرہ بھیگا ہوا ہے۔" وہ بے اختیار سی ہو گئی۔ اپنے دوپٹے کے دامن سے ان کا چہرہ صاف کرنے لگی۔ "آنسو۔؟ کیوں۔؟"

"نہیں تو۔ شاید اشعار کا اثر ہے۔" یہ تو صرف چند آنسو تھے۔ کہیں
فشاں نہ پھٹ پڑے۔ عبدالرحمان جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
"چلیں اب۔ شام ہونے والی ہے۔" اندر سے صدا آئی۔ "شام تو
گئی۔ اب تو گہرا اندھیرا چھا گیا ہے۔ راستے تلاش کرنے میں مشکل پڑے گی۔"
"کیا پکنک ختم۔؟" اس کا موڈ بڑا خوشگوار تھا۔ عبد سامنے تھے۔
خوبصورت نظم سنائی تھی۔ پورے ماحول پر اک پراسراریت سی طاری تھی۔ سحرزدہ
رہی تھی ساری فضا۔ "اتنی جلد۔؟ ابھی تو کافی بھی۔"
"ارے ہاں۔ وہ تو مجھے یاد نہیں رہی تھی۔" وہ پھر بیٹھ گئے۔
"عابی! ایک نظم اور۔ پلیز۔!" اتنے پیارے انداز میں اس نے فرمائش کی
تھی کہ وہ رد نہ کر سکے۔
ایمان کا موڈ خوشگوار تھا۔ اس لئے وہ بھی ہر دکھ، ہر اذیت بھول کر
خوشی میں شامل ہو گئے۔
وہ سامنے بیٹھی تھی۔ بڑے ہی خوبصورت انداز میں۔ زلفیں اڑ اڑ کر، گھوم
کر اس کے حسین چہرے سے لپٹ رہی تھیں۔ حیا بھری گلابیاں اس کے
رخساروں کو عجیب سی رعنائیاں اور دلربائیاں بخش رہی تھیں۔
وہ اسے تکتے تکتے اک طربیہ گیت گانے لگے۔

## 19

"نہیں بابا جان! میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" فرحت نے دو ٹوک اپنا
سنا دیا۔ "میں یہیں رہوں گی آپ کے پاس۔"
"لیکن بیٹی! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔" رحمان علی خاں کی پیشانی پر
کی گہری لکیریں تھیں۔ "ہم اکیلی مدحت کو کیسے وہاں بھیج دیں۔"
"اکیلی کیوں۔ وہ ہو گا نا وہاں۔"



"مرد کھلی فضا کا پرندہ ہوتا ہے۔ اڑانیں بھرتا رہتا ہے ادھر ادھر۔ اس نے
کام دھندے کیلئے بھی نکلنا ہوتا ہے۔ یوں وہ گھر میں اکیلی رہ جایا کرے گی۔"
فرحت تو جذباتی ہو رہی تھی مگر وہ تجربے کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے سب
کچھ۔ "اتنی معصوم سی بچی۔ بڑا شہر۔ نہیں نہیں۔ یہ ہمیں کبھی گوارا نہیں ہو گا۔" اک
نمایاں سی بے کلی کے ساتھ انہوں نے پہلو بدلا۔
"حیراں جو ہو گی ساتھ۔ وہ......"
"اونہوں۔" اس کی پوری بات ہی نہیں سنی۔ "حیراں اپنے آپ سے بے خبر
رہتی ہے وہ بچی کی دیکھ بھال کیا کرے گی۔ بس تم تیاری کرو۔"
پھر قدرے حیرت سے اسے گھورا۔ "ماں ہو تم۔ کیسے اس معصوم کو اپنے سے
جدا کر دو گی۔ بیٹی کی ایسی عمر میں تو اک ماں اس کا سایہ بن جایا کرتی ہے۔"
"پر آپ کو بھی تو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ بیمار بیمار رہتے ہیں۔ نہیں بابا جان!
کوئی اور حل سوچیں۔" فرحت کا انداز قطعی تھا۔
"اور حل کیا ہو سکتا ہے۔؟" وہ سوچنے لگے۔
"میں تو کہتی ہوں اس کو ہوسٹل میں کرا دیں۔"
فرحت نے بڑے رسان سے ہوسٹل کا کہہ دیا تھا۔ جبکہ رحمان علی خاں کے
دل میں کچھ دوسرا ہی خیال تھا۔
مدحت کی تعلیم کی وجہ سے ہی دونوں اکٹھے، ایک گھر میں رہنا شروع کر دیں
تو شاید آباد ہو جائیں۔ وہ فرحت اور عبدالرحمان کے متعلق ہی ہر وقت سوچتے رہتے
تھے۔ انہیں کی خاطر یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ کسی کو کیا معلوم۔ اس گھر کی بربادیاں
دیکھ دیکھ کر وہ اندر سے کتنا برباد ہو چکے تھے۔ کیسی عالی شان عمارت تھی جو کھنڈر بن
چکی تھی۔
اک اور کوشش۔ اب نئی سعی۔
کل ہی تین دن شہر میں رہ کر لوٹے تھے۔ عابی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا
کہ اسی شہر میں باپ بھی موجود تھا۔ ویسے معلوم ہو بھی جاتا تو کیا کر لیتا۔ کلام کا تو روا
دار نہ تھا۔ سوچ تھی نا باپ کی۔ ساتھ پدرانہ شفقت۔ "ہم ہی قصور وار ہیں۔" دل فوراً

اس کی طرف سے صفائی پیش کر دیتا۔

''پورے تیس لاکھ میں سودا ہوا ہے۔'' شہر سے آتے ہی فرحت کو بتایا۔

''اتنا خوبصورت بنگلہ ہے کہ دیکھو گی تو جی خوش ہو جائے گا۔ ابھی بیعانے کی رقم ادا کی ہے۔ بقیہ اگلے مہینے' ادائیگی کا وقت مقرر ہوا ہے۔''

''آپ خواہ مخواہ ہی یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔'' فرحت بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

اور رحمان علی خاں کے دل کے اندر کہیں اک یہ خیال بھی جاگزیں تھا۔ جب عابی گھر سے گیا تھا۔ ابھی اس نے بی۔ اے بھی نہیں کیا تھا۔ سات سال پہلے کی بات تھی۔ دیکھا جائے تو یہ حویلی' زمینیں' جائدادیں' بنک بیلنس' گاڑیاں' بگھیاں' ڈھورڈنگر سب کچھ اسی کا تھا۔ مالک تھا ہر چیز کا اور ہر آسائش کا ہر سہولت لینے کا جائز حقدار۔ مگر وہ سب چھوڑ چھاڑ گیا تھا۔

پھر یہ سات سال نجانے اس نے کیسے گزارے تھے۔ رحمان علی خاں سے کبھی کچھ نہیں لیا تھا۔ نہ روٹی کپڑے کے خرچ کے نام پر' نہ تعلیم کے نام پر' نہ زندگی کی کسی آسائش یا آسودگی کے نام پر اور نہ ہی کسی خواہش یا تمنا کے نام پر۔

جیسا اس نے زبان سے کہا تھا۔ وہ عمل سے بھی کر دکھایا' مرد آہن تھا۔ بااصول تھا۔ باکردار تھا۔

''پر بابا کی جان! ہمارے سینے میں بھی تو اک باپ کا دل ہے۔ ہم چاہتے ہیں تمہارا حق کسی نہ کسی طرح تمہیں ضرور ملے۔ مدحت کے بہانے ہی سہی۔''

اٹھتے بیٹھتے نگاہ اس کی تصویر پر ہی رہتی۔ اس کی آنکھوں کے جلتے دیئے انہیں ان گھور اندھیاروں میں راستہ دکھاتے رہتے۔

''ہمارا شفقت پدری سے معمور دل کڑھتا رہتا ہے بچے۔ نجانے آپ کھاتے کیا ہوں گے' نجانے آپ کی رہائش کیسی ہو گی۔ اور آپ پہنتے کیسا ہوں گے۔ یقیناً اس کوالٹی کا نہیں جیسا زندگی کے اوائل انیس سال پہنا تھا' کھایا پیا تھا' برتا تھا۔ انتہائی قیمتی۔ اتنا شاندار۔ بے انتہا خوبصورت۔ شہزادوں' نواب زادوں کی طرح اس کی زندگی گزرا کرتی تھی۔



اور اب۔ وہ آ جاتا تھا تو رحمان علی خاں کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہی نہیں ہٹتی تھیں۔ وہ کیسے دیکھتے کہ اس نے لباس کس قسم کا پہن رکھا تھا۔ اپنی حیثیت کے مطابق یا کم تر۔

''چاچو! یہ تیسری باری ہے۔ جب بھی آپ آتے ہیں یہی شرٹ اور یہی پتلون آپ نے پہنی ہوتی ہے۔ دیکھیں نا اس کا رنگ کیسا خراب ہو گیا ہوا ہے۔''

رحمان علی خاں نے مدحو کی بات پر ہی چونک کر عبد کے چہرے سے نظر ہٹائی تھی اور اس کے پہنے ہوئے لباس کو غور سے دیکھا تھا۔

''ارے بچے! ہم ملنگ لوگ ہیں۔'' عابی نے ہنسی ٹھٹھے میں اس کی بات اڑا دی تھی۔ ''ہم ان کپڑوں شپڑوں پر دھیان نہیں دیا کرتے۔ ویسے۔ نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔''

وہ ہنس ہنس کر اک انتہائی پرانے زمانے کا مثالی شعر گانے لگا جو بڑی بوڑھیاں اپنی بہوؤں بیٹیوں کو کفایت شعاری برتنے کیلئے سنایا کرتی تھیں۔

''چاچو کی جان! آپ اپنے عابی کا چہرہ دیکھو۔ یہاں وجاہت ہے نا۔ اپنے عابی کا قد جسم دیکھو۔ اللہ نے کیسا متناسب بنایا ہے۔ آپ کی دادی ماں تو ہر وقت آپ کے عابی کو دیکھ دیکھ کر ماشاء اللہ ماشاء اللہ کرتی رہتی تھیں۔''

''میں بھی تو کرتی رہتی ہوں۔'' اس نے عابی کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کا رخسار چوم لیا تھا۔ ''میرے عابی جیسا ہینڈسم بندہ اس سارے قصبے میں کوئی اور نہیں ہے۔''

''پھر میرا بچہ کپڑوں کی بات کیوں کرتا ہے ملنگوں کے ساتھ۔؟''

دونوں کتنی ہی دیر ہنستے رہے تھے اور رحمان علی خان کا دل اندر ہی اندر کیسے کٹ کٹ گیا تھا۔ یقیناً اس کے مالی حالات دگرگوں تھے۔

''بابا جان! اس بار عابی آئے تو یہ پیکٹ اسے دے دیں۔'' کچھ پتلونوں' قمیضوں اور سوٹوں کا کپڑا تھا جو فرحت نے لا کر ان کے پاس رکھ دیا تھا۔ شاید اس نے چچا بھتیجی کی بات سن لی تھی اور رحمان علی خاں کے دل کی آواز بھی۔

''ہم سے تو وہ نہیں لے گا۔ مدحت سے کہیں گے۔ وہ کسی بہانے اسے

گفٹ کر دے۔"

مگر وہ بھی عبدرحمان تھا۔ ضد کا پکا اور انا اور خودداری کے خمیر میں گندھا ہوا۔ دل کا بادشاہ مزاج کی فقیری پر ہی قائم رہا۔

"عابی! یہ آپ کے لئے۔ بڑی نیک تمناؤں اور دل کے ارمانوں کے ساتھ آپ کو گفٹ کر رہی ہوں۔ اور محبتوں کا تو شمار ہی نہیں ہے۔ سالگرہ سے پہلے پہلے آپ یہ سلا لیں۔ اس بار یہاں، حویلی میں، میرے پاس، آپ سیلبریٹ کریں گے۔"

عابی نے بہت شکریوں کے ساتھ وہ پیکٹ لے کر رکھ لیا۔ مگر جانے کب۔ جاتے جاتے اپنے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ جہاں سات سال پہلے کے اس کے انیس سالہ زندگی کے تمام اثاثے، تمام چھوٹی موٹی یادگاریں پڑی تھیں۔ کتابیں، فائلیں، قلم، کارڈ، خطوط، شیونگ کا سامان، جوتے، کپڑے، غرض بڑی الماری بھری پڑی تھی۔ صرف تین کپڑوں سے تو اس حویلی سے نکلا تھا۔ پھر اس کی ساری چیزیں گھر والوں نے بطور امانت سنبھال چھوڑی تھیں۔

"نجانے کب آ جائے۔ خود ہی استعمال کرے گا۔"

مگر وہ سات سالوں بعد آ کر بھی جیسے نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں خود کو کہاں چھوڑ آیا تھا۔ سوائے مدحو کے باقی گھر والوں میں سے کسی کے بھی ساتھ اس کا ناطہ نہیں رہا تھا۔ اسی طرح ان ساری چیزوں کے ساتھ اس نے اپنے تعلقات منقطع کر لئے تھے۔ کسی ایک چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

اور رحمان علی خاں خون کے آنسو روتے رہے تھے۔

"عابی! شہر میں آپ کا گھر کیا اس حویلی سے بھی بڑا ہے۔" ایک بار مدحت نے بڑے تجسس سے پوچھا تھا۔ گھر کا کوئی اور فرد تو اس سے بات کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ سب اس کے مجرم تھے۔ سب قصوروار تھے۔

فرحت اس کی دوست نما بھابھی تھی۔ وہ کیوں خاموش رہی۔ بابا جان اس کے والد تھے انہوں نے رسم و رواج کو اولاد پر ترجیح دی۔ سونے جیسا دل توڑ دیا بیٹے کا۔ ساری زندگی کے، اس کے ارمانوں کا خون کر ڈالا۔ سب نے مل کر وہ سب سے



روٹھ گیا تھا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" کتنی دیر انتظار کے بعد مدحت نے دوبارہ پوچھا تھا۔ رحمان علی خاں جانتے تھے۔ وہ ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بتایئے نا۔ آپ کا گھر وہاں شہر میں کیسا ہے۔؟"

شہر کا امیج مدحت کے ذہن میں بڑا ارفع و اعلیٰ تھا ٹی۔ وی کی بدولت۔ یہ بڑی بڑی بلڈنگیں، چوڑی چوڑی سڑکیں، وسیع و عریض پارک، تفریح گاہیں، بازار رکیٹیں، شاپنگ سنٹر، گاڑیاں، بسیں۔ اس کے خیال میں یہی تھا کہ یہ سب کچھ چاچو ی کی زندگی کا حصہ تھا جیسے۔ ہر بڑی بلڈنگ، ہر خوبصورت بنگلہ، ہر چمکیلی گاڑی سب ی کا تھا۔ تبھی تو وہ وہاں رہتا تھا۔ اور یہاں رہنا پسند نہیں کرتا تھا کہ یہاں وہ سب چھ نہ تھا۔

مدحت کے دہرائے سوال پر اس نے اک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں وہاں کسی بہت بڑے، اس حویلی سے بھی بڑے ر میں رہتا ہوں۔ ارے عابی کی جان! دل بڑا ہونا چاہیے بندوں کا۔ ان فراخ لیوں، کوٹھیوں کا کیا کرنا۔ لاتعداد کمرے، برآمدے۔ میں ادھر ہوں۔ میرا بچہ ادھر لے آخری کمرے میں ہے۔ آواز دوں۔ تم تک پہنچے ہی نہیں۔ ہو گئے نا دور دور لے ہی فاصلے۔" بڑی چالاکی ہوشیاری سے اس نے مدحو کی بات کا جواب دیا تھا۔

امول سا۔ "یوں ہم چھوٹی جگہ پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایک دو کمرے ہوں۔ ے ہوئے۔ ساتھ ساتھ۔ قریب قریب۔ دل کے قریب۔ آواز کے قریب۔ ل کے قریب۔ نظروں کے سامنے۔"

"پر میں تو وہاں ہوتی نہیں عابی! پھر کس کے قریب۔؟"

اس کی بات پر وہ گڑبڑا گیا تھا۔ بچی کے معصوم سے سوال نے اس کی ساری ا ہوشیاری ختم کر ڈالی تھی۔

"ارے! تم نے اپنی شمائلہ کی کوئی بات نہیں سنائی۔ کیسی ہے وہ۔؟"

"ہائے عابی! پرسوں کیا ہوا۔" وہ بڑے پرجوش انداز میں شمائلہ کا کوئی قصہ گی۔ یوں عبد اسے ٹالنے میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر رحمان علی خاں سمجھ گئے

تھے کہ شہر میں اس کی رہائش کیسی ہو گی۔ کم حیثیت والے لوگوں کی آبادی میں
سے ایک دو کمرے ہوں گے جہاں وہ رہتا ہو گا۔ ان کا خیال تھا۔

تبھی وہ اس پر مصر تھے کہ مدحت کا داخلہ کالج میں ہو تو وہ ہوسٹل
بجائے عابی کی نگرانی میں کسی اچھے سے علاقے میں' اچھے سے گھر میں رہے۔ ج
زندگی کی ساری آسائشیں موجود ہوں۔ ساری آسودگیاں اسے میسر آئیں۔ کہ
کے ساتھ ساتھ ان کا عبدالرحمان بھی زندگی کی کچھ آسانیاں' کچھ سہولتیں پالے۔ ا
حق تھا آخر۔

بنگلے کا بیعانہ کرنے کے بعد وہ اک شوروم میں بھی گئے تھے۔ شہر کا
سے بڑا وہ گاڑیوں کا شوروم تھا۔ وہاں انہوں نے اس کیلئے سفید نئے ماڈل کی ا
خوبصورت گاڑی بھی دیکھ لی تھی۔ کہ عابی کو سفید رنگ پسند تھا۔

پھر کتنی ہی دیر کھڑے اس کی چمکیلی سطح پر ہاتھ پھیرتے رہے تھے اور اس
ڈرائیونگ سیٹ پر اپنے عبدالرحمان کو بیٹھا دیکھتے رہے تھے۔ بڑی خوبصورت مسکرا
اس کے وجاہتوں بھرے چہرے پر تھیں اور آسودگی رحمان علی خاں کے اندر تک
رہی تھی۔

''پھر بابا جان! آپ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔'' فرحت ان کے پاس
ہوئے بولی تھی۔ ''میں تو کہتی ہوں۔ مدحت کو ہوسٹل میں کرا دیں۔ میں آپ کو ا
نہیں چھوڑ سکتی۔'' وہ اپنی ہی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

''نہیں نہیں۔ کہا نا۔ ہم مدحت کو ہوسٹل بھیجنے کے قطعی خلاف ہیں۔
بہت معصوم ہے۔'' زبان پر مدحت کا نام تھا۔ دل میں عابی بیٹھا تھا۔ ساری
ان کی سوچوں میں تھیں۔

''نہ وہ صحیح ہے۔ نہ یہ ٹھیک۔ آپ بھی تو پتہ نہیں پھر کیا چاہتے ہیں۔؟''
قدرے الجھ پڑی۔ اور اصل میں جو وہ چاہتے تھے' وہ فرحت نہیں چاہتی تھی۔

''بیٹا جی! آپ ہمارے دل کو نہیں جانتیں۔'' وہ بظاہر خاموش تھے۔ مگر ا
ہی اندر اس کے ساتھ ہم کلام بھی تھے۔ ''اس کے تین خانے ہیں۔ ایک میں آپ
رہی ہیں۔ ایک میں مدحت ہے اور تیسرے میں وہ۔ جو ہمارے گھر میں' ہماری نگا



کے سامنے نہیں پر کیسے بتا سمجھا پائیں کہ صرف اک خانے میں ہی نہیں' وہ تو شاید
پورے کے پورے دل میں موجود ہے۔ آپ کی بھی بھلائی ہمیں سوچنی ہے' مدحت کی
بھی اور اس کو تو نظر انداز کر ہی نہیں سکتے۔ بظاہر جس سے بے پرواہ اور لاتعلق نظر
آتے ہیں۔ ہائے! ہم کیا کریں۔؟''

انہوں نے اپنی بھیگی بھیگی آنکھیں عبدالرحمان کی تصویر پر جما دیں۔ وہاں اس
کی جگنوؤں جیسی چمکتی آنکھیں انہیں راستوں کا نشان دے رہی تھیں۔

''اور جو ہم وہاں سودا کر آئے ہیں۔ بنگلے کا۔ گاڑی کا۔''

''گاڑی کا بھی۔؟'' فرحت نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

''تو ہمارا بچہ کیا پیدل کالج جائے گا۔؟'' اپنی عقل و فراست کی دھاک
بٹھائی۔ ''ہم سب دیکھ بھال آئے ہیں۔ بنگلے سے کالج تک کا فاصلہ۔ پیدل نہیں جایا
جا سکتا۔ اور پھر۔ کیا تم ماں بیٹی کبھی شاپنگ اور کبھی سیر و تفریح کے لئے نہیں کہیں آیا
جایا کرو گی۔؟ بڑے شہر کی رہائش کے لئے سواری بھی بہت ضروری ہوتی ہے۔''
انہوں نے سارے انتظامات گویا مکمل کر لئے تھے۔

اور اس وقت فرحت کو ان کے سارے پلان کی سمجھ آ گئی۔

جہاں تک فرحت اور عبدالرحمان کو اکٹھے اور شاد و آباد دیکھنے کی رحمان علی خاں
کی خواہشات اور تمناؤں کا تعلق تھا تو وہ تو فرحت ان کے ساتھ متفق نہیں تھی۔

البتہ اپنے عبدالرحمان کے لئے اگر وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے' خوبصورت بنگلہ'
نئے ماڈل کی گاڑی اور زندگی کی دوسری سہولیات کی فراہمی' تو یہ تو فرحت بھی چاہتی
تھی۔ اسے سب کچھ ضرور ملے۔ کسی بھی انداز میں۔ کہ وہ مالک تھا' حقدار تھا' جائز
وارث تھا۔ شرع شریعت کی رو سے اور قرآن و سنت کے احکامات کے مطابق۔ اور
سات سال وہ محروم رہا تھا۔

''ٹھیک ہے بابا جان! میں مدحت کے ساتھ وہاں شہر میں رہوں گی۔''
حقدار کو اس کا حق پہنچانا تھا۔ فرحت مان گئی۔

# 20

لائبریری میں اپنے اسی مخصوص گوشے میں ایمان تنہا بیٹھی تھی۔ نظریں کتاب پر جمی تھیں۔ لیکن ذہن میں سوچیں دوسری ہی تھیں۔

ماھم ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ”دفع رہے وہیں۔ مرکھپ جائے کہیں۔ مجھے بھی کوئی پرواہ نہیں۔ میری بلا سے۔“ دو تین بار سر کو جھٹکا بھی۔ لیکن پھر بھی اس کا خیال بار بار آئے جا رہا تھا۔

وہ اسے بہت مس کر رہی تھی۔ بہت ساری باتیں جمع ہو گئی تھیں اسے سنانے والی۔ اک وہی تو اسکی محرم راز تھی۔

اس دن اجلال حیدر کے ہاتھوں کے بنے ہوئے چپلی کباب کھائے تھے۔ ساتھ کتنے سارے اس نے لطیفے بھی سنائے تھے۔ وہ دو تین گھنٹوں کی محفل کس قدر پرلطف رہی تھی۔ ہنس ہنس کر اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ سب اس کے گوش گزار کرنا تھا ایمان نے۔

پھر عابی کے ساتھ جو پکنک منائی تھی۔ اس کی بہت ساری باتیں تھیں۔ اتنی اچھی اس نے نظم سنائی تھی۔ واہ! کیا لحن داؤدی اللہ نے عابی کو دے رکھا تھا۔ وہ نظم تو سالگرہ والی سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت اور پرسوز تھی۔ کتنی ہی دیر خیال ہی خیال میں، وہ اس کے ترنم اور آواز کے لوچ میں گم رہی تھی۔

پکنک کے بعد عابی کو اپنی بھتیجی کے لئے شاپنگ کرنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ جیسے پھر کوئی ایسا دن آنے کی امید ہی نہیں تھی۔ اس لئے اسی دن سب کچھ کر لینا تھا اس نے۔ ”وقت کا کوئی پتہ ہوتا ہے۔ مٹھی میں ریت کی طرح ہوتا ہے۔ پھسلتا چلا جاتا ہے تو پھر ہاتھ نہیں آیا کرتا۔“ عابی نے دیر ہو جانے کی بھی پرواہ نہ کی۔ نہ یہ کہ کوئی ان دونوں کو اکٹھے دیکھ لے گا تو باتیں بنیں گی۔ شاپنگ سنٹر کے سامنے جا گاڑی کھڑی کی۔ ایمان کو منع کرنے کے باوجود بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

پھر دونوں نے مل کر، گھوم پھر کر بہت ساری چیزیں بھتیجی کے لئے دیکھیں۔ ان میں سے جن جن پر ایمان نے انگلی دھری وہی وہ خریدتے چلے گئے، بہت ساری



خریداری کر ڈالی۔ سوٹ، دوپٹے، چوڑیاں، کلپ، پھر کچھ چیزیں اپنی پسند کی علیحدہ پیک کرائیں۔

”یہ کس کیلئے۔؟“ ایمان کے پوچھنے پر مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ بڑا پراسرار سا انداز تھا۔ ایمان نے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

ہوسٹل پہنچ کر اترنے لگی تو وہ پیکٹ اسے تھما دیا۔

”نہیں نہیں عابی! یہ مناسب نہیں۔“ اس نے پرزور احتجاج کیا۔

”ہمارے ہاں کا رواج ہے۔ مہمان آئے تو اسے خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے۔“ اک پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ شاپنگ کرانے کے حق میں دلیلیں اور توجیہات پیش کر رہے تھے۔

”اس کے علاوہ تمہارے ساتھ میرے رشتے بھی تو کئی بن گئے ہیں۔ جبکہ ناطہ صرف ایک ہوتے ہوئے، اس کی اتنی ساری شاپنگ کرنی ہے۔ تو تمہارے لئے خیال نہ کرتا۔“

”کئی رشتے۔؟ وہ کون کون سے۔؟“ ایمان حیرت زدہ سی ہو گئی تھی۔

”ایک تو تم میری دوست ہو۔ دوسرا ناطہ سٹوڈنٹ کا ہے۔ تیسرا تعلق.....“ مسکرا کر کسی سوچ میں کھو گئے تھے۔ ”ہاں۔ تیسرا کون سا۔؟ محبت کا۔“ یہ کہتے کہتے زبان ذرا سی لڑکھڑائی تھی۔ خود ایمان بھی ہول سی گئی تھی یہ وہ کہہ رہے تھے۔؟

پھر وہ آپ ہی تصحیح کرنے لگے۔ ”کیا دوست اور اسٹوڈنٹ ہونے سے یہ تعلق قائم نہیں ہو جاتا۔؟“

”ہاں۔ ہاں۔“ ایمان بھی ریلیکس ہو گئی تھی۔ وہ بھی مطمئن۔

”بہت بہت شکریہ عابی۔! اس سارے خوبصورت دن کا۔ جو آپ کے ساتھ گزارا۔ اک یادگار دن ہو گا میرے لئے۔ اور اس تحفے کا بھی۔“

واپس کمرے میں آئی تو جلدی جلدی پیکٹ کھولا۔ اس میں ایک ریڈی میڈ سوٹ تھا۔ اس کے ہم رنگ چوڑیاں تھیں۔ اک بہت ہی خوبصورت کلپ تھا۔

پکنک مناتے ہوئے جب عبد ”راستوں کی مرضی“ سنا رہے تھے تو ایمان

کے بال ہوا سے اڑ کر بار بار اس کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔

"ایک تو آج میرا کلپ بھی ٹوٹ گیا ہے۔" وہ بالوں کو پر
ہوئے جھنجلا کر بولی تھی۔ "ماھم پتہ نہیں کب آئے گی۔"

"تو عابی! آپ اتنے غور سے میری ہر بات سنتے ہیں۔" اندر ہی اند
فخر سے بھر گیا تھا۔

پھر اس نے اسی وقت بالوں میں کلپ لگا لیا۔ چوڑیاں دیکھیں تو
پیاری گولڈن سی ریشمی ریشمی سی تھیں۔ اسی وقت ہاتھ میں ڈال لیں۔ اپنے آپ
اپنا بازو خوبصورت لگنے لگا۔ بے اختیاری میں پتہ ہی نہیں چلا کیا کر رہی تھی۔ چو
والی کلائی کو چوم لیا۔ سامنے سوٹ کے ساتھ گولڈن سا دوپٹہ نظر آیا وہ اٹھا کر سر
لیا۔ پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

عابی کے دیئے ہوئے تحائف نے اسے کتنا سجا سنوار دیا تھا۔ وہ دیکھ
دیکھتی رہ گئی۔ ان چیزوں سے بہت اچھی اچھی' بہت زیادہ خوبصورت اور بہ
چیزیں اس کے پاس تھیں۔ مگر ان میں' جو عابی کا خلوص اور محبتیں شامل تھیں' انہو
انہیں بہت قیمتی' بہت نایاب' اس کی نگاہ میں کر دیا تھا۔ وہ بڑی دیر آئینے میں
دیکھتی رہی۔ ایسی خوبصورت' ایسی انوکھی تو وہ کبھی بھی نہ تھی۔ ہزاروں لاکھوں با
دیکھا تھا۔ "عابی! یہ آپ نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔"

انہیں سوچوں میں کھوئی بیٹھی تھی۔ پوئٹری کی کتاب سامنے کھلی پڑی تھی
اک مردانہ ہاتھ کھلی کتاب پر آن ٹکا۔

"خیالوں میں تو تھے۔ حقیقت کیوں بن گئے۔ بدنام ہو جاؤں گی۔
سوچ کے ساتھ سر اٹھایا۔

"ارے!" اک حیرت بھری چیخ ماری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم کب
ارسل!" وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ بہت دنوں بعد اسے دیکھا تھا۔ شدت
میں آنسو نکل پڑے۔ پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کتنی ہی دیر اسے تکتی رہی۔

"اماں' بابا سائیں اور نانو' سب ٹھیک تو ہیں نا۔؟"

"وہ تو سب ٹھیک ہیں پر تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں سارے



ذیچ ہو گیا۔ گھنٹے بھر سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ کس کس سے تمہیں نہیں پوچھا۔"
لائبریری میں تھے اس لئے تقریباً سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے بات کر رہے
تھے۔ "دوسرے اسٹوڈنٹس ڈسٹرب ہوں گے آؤ کینٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" جلدی
جلدی اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے ارسل آفریدی کا بازو پکڑا اور کھینچتی ہوئی لے چلی۔

بھائی سے ملنے کی خوشی میں دیوانی سی ہو رہی تھی۔ کولڈ ڈرنکس بھی منگوا لئے۔
چائے کا بھی آرڈر دے دیا۔

"ہماری کینٹین کے سینڈوچز بہت مشہور ہیں۔ بے حد مزے کے ہوتے
ہیں۔" وہ بھی اس کے سامنے دھر دیئے۔

"لیکن میں یہاں یہ سب کھانے کیلئے نہیں آیا۔"

"مجھ سے ملنے آئے ہو ناں۔" اس کی بات سنی ہی نہیں اپنی بولے جا رہی
تھی۔ "تو ابھی ملے کہاں ہو۔؟" اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لئے۔
نظریں بھائی کے چہرے پر ہی جمی تھیں۔ نثار ہوئی جا رہی تھیں۔ پہلے سے پیارا بھی تو
بہت ہو گیا تھا۔ اونچا لمبا جواں خوبرو۔ دل چاہ رہا تھا' ایک ایک کو دکھائے۔ "یہ میرا
ہے۔ میرا حقیقی بھائی۔"

"مل لوں گا تم سے بھی۔ فی الحال تو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"کیوں۔؟" وہ چونکی۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں۔؟"

"بس جہاں لے جاؤں۔" وہ کچھ مختلف انداز میں مسکرایا تھا۔

"بتاؤ نا۔؟" وہ سٹپٹا کر پوچھ رہی تھی۔ یوں پراسرار سا کیوں ہو رہا تھا۔
"کہاں لے جا رہے ہو مجھے۔؟"

"بس۔" کچھ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ پھر سینڈوچ کھانے میں مصروف
ہو گیا اور وہ بے چینیوں میں گھر گئی۔ بھلا بتا کیوں نہیں دے رہا تھا۔؟

"جانے کے لئے تیار ہونا ہو گا۔ اور تیاری کے لئے ہوسٹل جانا پڑے
گا۔؟" پوچھنے کا انداز بڑا عجیب سا تھا۔

''ہاں تو'' مزید حیرتیں' مزید گھبراہٹیں۔ ایمان کے دل کی دھڑکن
ہونے لگی۔''بات کیا ہے ارسل۔؟ ایسے کیوں پوچھ رہے ہو۔؟''

''وہ دراصل جلدی ہے نا۔''

''کس بات کی جلدی۔؟''

''پھوپھو بیمار ہیں۔ وہاں پہنچنا ہے۔''

''پھوپھو بیمار ہیں؟ تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟'' ایمان نے دل تھام
لیا۔''کیا ہوا پھوپھو کو۔؟''

''ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ پر اب پہلے سے بہتر ہیں۔'' پھر وہ تفصیل
بتانے لگا۔''اماں اور بابا سائیں وہیں ہیں۔ تب سے ہی' جب سے انہیں اٹیک ہوا
ہے۔ آٹھ دن ہو گئے ہیں۔''

ایمان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھوپھو سے بہت پیار تھا۔ لالا
جان اور ارسل کے بعد اک وہی ایسی ہستی تھی۔ جو اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھیں

''اور اب انہوں نے تمہیں دیکھنے کیلئے بلوایا ہے۔'' پھر ہولے
سے لہجے میں بولا۔''امریکہ سے ہمایوں بھائی کو بھی بلوایا تھا۔''

''تو......؟'' دل ڈول سا گیا۔ پھر ڈوبنے لگا۔

''وہ نہیں آ سکتے۔ کوئی دوسرا کورس جوائن کر لیا ہے۔ اس لئے اب۔''

''اب کیا۔؟'' یہ ارسل کہنا کیا چاہ رہا تھا۔ ایمان کے دل کو جیسے
میں لے کر کوئی مسل رہا تھا۔

''اب تمہارا نکاح ٹیلیفون پر ہونا قرار پا گیا ہے۔''

''نکاح۔؟ ٹیلیفون پر۔؟'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ متحیر سی
بڑبڑائی۔

''ہاں نکاح۔ تمہارا نکاح۔ فون پر۔''

''مگر کیوں۔؟'' وہ ابھی تک ناسمجھی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

ارسل مسکرا پڑا۔''ایسی خوشی کی خبر ہے کہ دماغ ٹھکانے ہی نہیں رہا ہے

''کونسی خبر۔؟''



''تمہارے نکاح کی۔ سب کو اطلاع کر دی گئی ہے۔''

''کس کے ساتھ۔؟'' بات کچھ سمجھ میں آئی تو گھبرا کر پوچھا۔ نگاہوں میں
عبدرحمان کی شبیہ تھی۔ سوچ میں اس کا وجاہتوں بھرا وجود اور آنکھوں کے جلتے دیئے تھے۔

''ہمایوں خاں کے ساتھ۔ جو تمہارا بچپن کا منگیتر ہے۔'' ارسل کے منہ سے
قہقہہ ابل پڑا۔''پاگل ہو گئی ہو۔ بھلا کسی اور کے ساتھ ہو سکتا ہے۔؟''

''نکاح۔ ٹیلیفون پر۔ ہمایوں خاں کے ساتھ۔'' پھر لرزتی آواز میں' مرتعش
لہجے میں' اک اک لفظ توڑ توڑ کر' علیحدہ علیحدہ کر کے بولنے کے بعد فہم کی حد تک پہنچی
تو یکا یک ساکت سی ہو گئی۔

ارسل کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ عجیب سا ہی ردعمل ہوا تھا'
جس کی توقع اسے نہیں تھی۔

''اور اگر۔ میں نہ چاہوں تو۔؟'' ایمان کا لہجہ ارسل کو چونکا گیا۔

''تو پھر بھی یہ ہو جائے گا۔'' وہ اس کے چہرے پر پھیلتی زردیوں کو تکنے لگا۔

''ارسل۔'' ایمان' بھائی کا ہاتھ تھامتے ہوئے آگے جھک کر سرگوشی کے سے
لہجے میں بولی۔''اور اگر میں انکار کر دوں۔؟''

''کوئی سنے گا ہی نہیں۔ تمہاری آواز پر کوئی کان ہی نہیں دھرے گا۔'' اس کی
بات کا جواب دیتے ہوئے ارسل نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے یخ ہو رہے
تھے۔''کیونکہ یہ تمہارا مقدر بن چکا ہے۔ ہمارے ہاں کے رسم و رواج تقدیر کی طرح
انسان پر مسلط ہو جاتے ہیں۔''

ایمان کے لہجے کی سنجیدگی اور ہاتھوں کی ٹھنڈک جیسے اس کے پورے وجود
میں سرایت کر رہی تھی۔ ارسل نے اس کے ہاتھوں کی بے جان سی گرفت سے اپنا ہاتھ
نکال لیا۔

''چلو اٹھو۔ دیر ہو رہی ہے۔'' وہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''دیر نہیں اندھیر ہو گئی ہے۔'' میز پر کہنیاں دھر کر اس نے دونوں لرزتے
ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ ارسل متوحش نظروں سے اسے تکنے لگا۔

کیا اس کی بہن اپنے بچپن کے منگیتر کے ساتھ شادی پر راضی نہیں۔؟ اک

سوچ سی ذہن کی سطح پر لہرائی۔

وہ گم سم سی بیٹھی تھی۔ اس کے کہنے پر اٹھی بھی نہیں تھی۔ اس کے ساکت وجو میں ہلکی سی جنبش تک نہ ہوئی تھی۔ وجہ۔؟ سوچ کے دھارے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔

''ایمان۔!'' وہ واپس بیٹھ گیا۔ پھر اس کے ہاتھوں میں تھامے سر کو سہلانے لگا۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟''

''ہوں۔؟'' ایمان نے سر اٹھایا۔ ''ہاں۔ پر پتہ نہیں کیوں۔؟ ارسل! لگ ر ہے میرے سارے وجود سے جیسے جان نکلی جا رہی ہے۔''

''نکاح کا سن کر۔؟'' شک پر یقین غالب آ رہا تھا۔ مگر وہ چاہتا نہیں تھا۔

''ہاں۔'' وہ سچ بول گئی۔ دونوں بہن بھائی کا آپس میں ایسا ہی ناطہ تھا۔

''پر یہ تو نصیب تھا تمہارا۔ اور اس وقت نے آنا ہی تھا۔ اور تم بھی جا تھیں۔ پھر۔؟'' بھائی تھا آخر۔ بہن کی حالت دیکھ کر ہول سا گیا۔

نجانے کیوں وہ اس اطلاع سے اتنا پریشان ہو گئی تھی۔ سوچیں بے کل ک دے رہی تھیں۔ اندر اضطراب پھیل رہا تھا۔

وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی۔ کوئی جواب دے بھی نہ سکی۔

''یار! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' وہ اس کی دلداری کرنے لگا۔ ''وہ بہ اچھا انسان ہے۔ لائق فائق بھی ہے۔ ہینڈسم بھی ہے۔'' اندر وحشتیں تھیں۔ لبوں مسکراہٹیں۔ ''تمہیں اور کیا چاہیے۔ خوش قسمت ہو تم تو۔''

''ہاں۔ بہت خوش قسمت۔'' اپنے آپ پر طنز کرتے ہوئے ایمان نے اک گہرے دکھ سے بھائی کو دیکھا۔ ''ایسی۔ کہ جس کی کوئی مثال نہیں۔'' خود سے ہم کلام تھی۔

''تم یہ سینڈوچ تو ختم کرو۔ اور ہاں میں ذرا چھٹی کے لئے درخواست د آؤں۔'' آنکھوں میں سمندر اتر رہے تھے۔ ارسل سے نظریں چراتے ہوئے ا آپ کو سنبھالنے لگی۔ ''سر پر اکسی بھی نہیں بولنے دیتے۔ اور درخواست نہ دی ہو صاف سیدھی غیر حاضری مارک کر دیتے ہیں۔ بہت سخت ہیں۔ چنگیز خاں پورے پورے۔''

خیال میں مہربان و مشفق عادات والے سر عبدالرحمان تھے۔ ''بغیر بتا



غائب ہو گئی تو پریشان ہوں گے۔ ماہم بھی نہیں ہے۔''

وہ جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں دھند پھیل رہی تھی۔ نظر ہی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ٹٹول ٹٹول کر شولڈر بیگ اٹھایا۔ کندھے پر لٹکایا۔

''بس ابھی آتی ہوں۔ پلیز تم یہ چائے......'' آواز بھرائی ہوئی نکلی تھی۔ وہیں ہونٹ بھینچ لئے۔ بات مکمل ہی نہیں کی۔ رخ پھیر کر تیزی سے چل دی۔

اسے جاتے ہوئے دیکھتے دیکھتے' ارسل نے چائے کی پیالی اٹھائی۔

## 21

گود میں دھرے اتنے سارے تحائف کو دیکھ دیکھ کر مدحت گھبراہٹوں سے بے حال اور چاچو کی محبتوں سے نہال ہوتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھی۔

''اتنا کچھ لے آئے آپ۔ اور عابی! اتنی پیاری چیزیں۔'' عابی کی نظریں اسے کے گلابیاں بکھیرتے چہرے پر سے نثار ہوئی جا رہی تھیں۔

''یہ سوٹ۔ یہ لہریئے دار دوپٹہ۔ یہ چوڑیاں۔ کلپ۔ ہیئر بینڈ۔ ہائے! سب کچھ کتنا خوبصورت ہے۔ اور کتنی اعلیٰ چوائس ہے آپ کی۔''

وہ اک اک چیز کو اٹھاتی' چومتی' رکھ دیتی۔ پھر دوسری کوئی اٹھاتی' چومتی' نگاہوں میں ڈھیروں ڈھیر پیار بھر کر اپنے پیارے پیارے عابی کو تکتی۔

''آپ کو مجھ سے اتنا پیار ہے۔؟''

''ابھی تو میری جان! تم نے میرا پیار دیکھا ہی نہیں۔ ہر قربانی دے سکتا ہوں۔ تمہارے لئے۔ اپنی پوری زندگی کی بھی۔''

''تمہیں کیا پتہ۔ دے بھی چکا ہوں۔'' اندر کی آواز اس کے جذبوں کی امین تھی۔ ''سب کچھ قربان کر دیا۔ صرف مدحو! تمہاری خاطر بچے۔ کہ تم میرے بھائی زید رحمان کی امانت ہو میرے پاس۔''

کچھ آنسو ایسے ہوتے ہیں جو کبھی کسی دوسرے کو دکھائی نہیں دیتے۔ دل پر

ٹپکتے رہتے ہیں۔ آنکھوں میں‘ ادھر ادھر کونوں کھدروں میں دبکے رہتے اثاثہ تھا اس کے پاس‘ جو زید رحمان کی محبتوں نے اسے سونپا تھا اور وہ سب سے چھپائے رکھتا ہر وقت۔

”سات سالوں سے محبت اور امانت کے اس رشتے میں بندھا ہوں۔ اس حویلی سے فرار اختیار کرلیا تھا‘ وہاں وقتی طور پر بابا جان کی بات مان لینے کے کچھ عرصہ گزرنے پر‘ فرحت کو طلاق بھجوا کر پاؤں میں پڑی یہ رسم و رواج کی زنجیر بھی کاٹ ڈالتا۔ کوئی کیا کر لیتا میرا۔ کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا میرا۔؟“

خیالات کی پرواز کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ منزل کھو کر‘ اس کے ڈھونڈ رہا تھا۔

”لیکن نہیں مدحو! تمہارا عابی اپنے بھائی کی میت پر کیئے ہوئے وعدے کبھی نہیں بھول سکتا۔ نہیں بھولے گا۔ تمہاری خاطر۔ وہ مرد ہی کیا جو اپنا وعدہ نبھائے۔ دیکھ لینا۔ ساری عمر نبھاؤں گا انشاء اللہ۔“

سوچ کے دھارے بہتے چلے جا رہے تھے اور اسے اپنے ساتھ بہائے جا رہے تھے۔ وہ سکول سے آیا تھا۔ دھڑام سے بھابھی کے کمرے کا دروازہ کھول اندر داخل ہوا تھا۔ ”تمہاری بھابھی ہسپتال سے اک جیتی جاگتی گڑیا لے کر آئی ہیں

اماں کا جملہ کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس لئے کمرے میں داخل ہوتے نظریں ادھر ادھر گھمانے لگا۔ ”کہاں ہے وہ۔؟“

اسی لمحے زید رحمان باتھ روم سے نکلے تھے۔ ”کون کہاں ہے۔ مسکراہٹوں سے بھرا سوال کیا۔

”وہ۔ وہ گڑیا۔ اماں نے بتایا ہے۔“ وہ گڑیا دیکھے بنا ہی بہت جذباتی ہو تھا۔ زید رحمان نے بڑھ کر فرحت کے پہلو میں سے کپڑوں کا اک پیکٹ سا اٹھایا۔

عبد نے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور زید رحمان نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں بڑے آرام سے وہ پیکٹ دھر دیا۔

”یہ تمہاری ہے۔“

”کیا۔؟“ اک لمبی چیخ کے ساتھ اس نے پیکٹ میں سے نمودار ہو



والے اس انتہائی ننھے منے گلابی گلابی سے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ دنیا کی خوبصورت ترین یہ گڑیا۔ اس کی تھی۔ اس کی اپنی۔ بھائی نے کہا تھا۔

”سچ مچ۔؟“ پھر ایک نظر بھابھی کو دیکھا۔ وہ بے یقین نظر تھی۔

”ہاں۔“ فرحت نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کی بے یقینی کو یقین ملا تو بے اختیار ہوتے ہوئے اس نے اس جگنوؤں جیسی چمکتی آنکھوں والی گڑیا کا نرم نرم گال چوم کر سینے کے ساتھ اسے لپٹا لیا۔

اس کے بعد مدحو کو ہمیشہ وہ اپنی ہی گڑیا سمجھتا رہا اور پھر۔ زید رحمان کے جانے کے بعد تو۔ ہاں۔ وہ اسی کی ذمہ داری تھی۔ اس نے بڑی چاہتوں اور محبتوں کے ساتھ اس کو قبول کر لیا تھا۔ بابا جان اور فرحت کے ساتھ جو اختلافات تھے وہ مدحت اور اس کے تعلقات‘ رشتے اور اٹوٹ بندھن پر اثر انداز نہیں ہوئے تھے۔ اس کی محبت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا تھا۔

اس کے لائے ہوئے تحائف کو ہمیشہ ہی بہت پذیرائی ملتی تھی۔ مگر اس بار تو مدحت کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ اس کے لال گلابی چہرے اور روشنیاں بکھیرتی خوبصورت آنکھوں کو ایک ٹک تکے جا رہا تھا۔

اور۔ پرے بابا جان کے پاس بیٹھی فرحت کی نگاہیں ان چیزوں پر مرکوز ضرور تھیں لیکن دماغ دوسری سوچوں میں مصروف تھا۔ عابی پہلے بھی اس کے لیے بہت کچھ لایا کرتا تھا مگر اس بار چیزوں کا انتخاب بہت مختلف تھا۔ سوٹ‘ دوپٹہ‘ چوڑیاں‘ کلپ‘ ہیر بینڈ۔ سب خالص زنانہ قسم کی چیزیں تھیں‘ جیسے کسی خاتون نے ہی خریداری کی تھی۔

عابی کے ساتھ کون ہوگا جس نے یہ شاپنگ کی تھی۔؟

”اجلال۔؟“

”نہیں۔ کوئی نسوانی دماغ۔“

”عابی کی کوئی اسٹوڈنٹ۔؟“

”ہاں۔ ایسا ہوسکتا ہے۔“

پچھلی دو تین باریوں سے عابی کے چہرے کے رنگ مختلف تھے۔ فرحت نے محسوس کیا تھا۔ لیکن اپنا وہم سمجھ کر اس نے دماغ کو جھٹک دیا تھا۔ مگر آج یہ سب

چیزیں دیکھ کر اس کا خیال پختہ ہو رہا تھا۔

''عابی! آپ کے لئے چائے لاؤں۔؟'' ترنگ میں آ کر مدحو پوچھ رہی تھی۔ ''ٹھیک۔ چلے گی۔ آج مدحو کا عابی بہت خوش ہے۔''

''کیوں۔؟''

''مدحو جو خوش ہے۔ واہ کیسے پیارے پیارے رنگ میری گڑیا کے چہرے پر پھیل رہے ہیں۔'' عابی نے پہلو کے ساتھ جڑی بیٹھی مدحت کو بازو کے حصار میں لے کر اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

''میرا خیال ہے میں کچن میں تمہارے ساتھ چلوں۔ ساتھ باتیں کریں گے۔ ساتھ چائے بنائیں گے۔ ارے ہاں۔!'' پھر جیسے کوئی بھولی بات اچانک یاد آئی۔ ''تمہارے داخلے کا کیا بنا۔؟'' پیار لٹاتی نظروں سے' جھک کر اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔ ''اب تو میرا بچہ کالج میں جائے گا۔ ہوسٹل میں رہے گا۔ نئی نئی دوستیاں بنیں گی۔'' اس کی بہت ساری سہیلیاں بنانے کی عادت پر ڈائریکٹ نشانہ لگایا۔ اسے چھیڑنے' ستانے کی خاطر۔

''ہوسٹل میں نہیں عابی! دادا مجھے ہوسٹل میں رکھنے کو تیار نہیں ہیں۔ بالکل بھی نہیں۔'' مدحت پرجوش انداز میں بتانے لگی۔ ''دادا نے تو ہمارے لئے اک بڑے خوبصورت بنگلے کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں۔؟ اور میرے کالج جانے آنے کیلئے گاڑی بھی......''

''کیا۔؟'' عابی کے چہرے پر پھیلے خوشیوں کے رنگ مدھم پڑنے لگے۔

مگر مدحت کو کوئی احساس نہیں تھا۔ اس نے عابی کے ماند ماند چہرے کو دیکھا ہی نہیں۔ بجھی بجھی آنکھوں میں جھانکا ہی نہیں۔ بس بولے چلی گئی۔ اسی روانی میں۔

''ہاں عابی! پوچھ لیں بابا جان سے۔ اگلے ہفتے ہم سب شہر شفٹ ہو جائیں گے۔ پھر وہاں تو آپ میرے پاس ہی رہیں گے نا۔ ہر وقت۔'' کھلا چہرہ مزید کھل گیا تھا۔ ''پھر گاڑی میں مجھے کالج بھی خود لے کر جایا کریں گے۔''

عابی گم سم بیٹھا تھا۔ مدحت سارا پروگرام اس کے گوش گزار کرنے لگی۔ اس کی اطلاعات سے کون سے آزار عابی کے اندر اتر رہے تھے' وہ کن پریشانیوں میں مبتلا



ہوا جا رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

''کالج سے واپس بھی آپ ہی لایا کریں گے۔ دادا کہتے ہیں۔ ڈرائیور نہیں رکھنا۔ زمانہ خراب ہے اور مدحت بڑی معصوم۔ ہم کسی غیر پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔''

دادا کا فرمان اس نے دادا کی آواز اور لب و لہجے میں بتانے کی پوری کوشش کی۔ رحمان علی خاں سامنے صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے' آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ وہ جس انداز میں بات کر رہی تھی' سب سماعتوں میں اتر رہا تھا۔ بڑی ٹھیک ٹھاک ان کی نقل اتار رہی تھی۔ ان کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل اٹھی۔

شہر میں شفٹ ہونے کی اطلاع پر عابی جس طرح گم سم سا ہو گیا تھا۔ فرحت نے نوٹ کیا تھا۔ پھر چور آنکھوں سے اس کے وجیہہ چہرے پر سے مفقود ہوتی روشنی اور پھیلتے دھندلکے بھی دیکھے تھے۔ عجیب سے ویرانے اس کے اندر اترے تھے۔

لیکن پھر بھی۔ مدحت نے اتنی معصومیت سے جب دادا کی نقل اتاری تو رحمان علی خاں کی طرح اس کے چہرے پر بھی بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ خود عابی' جو اس خبر سے بڑے ہولناک سے سناٹوں میں آ گیا تھا' وہ بھی بے ساختہ قہقہہ لگا اٹھا تھا اور وہ تو بلکہ اتنا زیادہ محظوظ ہوا تھا کہ اس نے اسے اپنے ساتھ ہی لپٹا لیا تھا۔

''اگر اس ہونی نے ہو کر ہی رہنا ہے تو پھر مجھے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔'' یکا یک ہی ذہن میں اک سوچ ابھری۔ تب فوراً حاضر دماغی کو حاضر کیا۔

''ہوں تو زمانہ خراب ہے اور میری مدحو معصوم۔'' شرارت سے اسے دیکھا۔

''عابی! یہ میں نہیں کہہ رہی۔ دادا نے کہا تھا۔ سچی۔ پوچھ لیں بے شک ان سے۔''

اور رحمان علی خاں جو بیٹھے سب سن رہے تھے' اپنے سارے حواس خمسہ کے ساتھ منتظر ہو بیٹھے کہ شاید ان کا عبدرحمان مدحو کے کہنے پر ہی ان سے کلام کر لے۔

یہ دوریاں کچھ تو قربتوں میں بدلیں۔ مدحت کے معاملے کو ڈسکس کر کے۔ اس کے لمس نہ ملے۔ اس کی نظر سے مل کر اندر روشن و منور نہ ہو۔ کانوں میں ہی بالواسطہ اس کی آواز کا رس تو ٹپکے۔ وہ ایک بار بابا جان تو بولے۔

جس طرح اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ بے شک وہ منع ہی کر دے۔ بر براہ راست ان سے کوئی تو تعلق قائم ہو۔ مخالفت کا ہی۔ جھگڑے کا ہی۔

مگر وہ یکا یک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا مدحو! مجھے اک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔''

''لیکن عابی! چائے۔؟'' جلدی جلدی ساری چیزیں وہیں صوفے پر رکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''وہ پھر سہی۔ شاید تمہارے شہر والے گھر میں۔''

مدحو کی تعلیم کا معاملہ تھا۔ عبدرحمان نے چپکے سے تمام ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کی زندگی کے اسی نشیب میں تو پانی گرتا تھا۔ وہ بظاہر مسکرا رہا تھا۔ مگر اندر الاؤ دھک رہے تھے۔

''ہوں۔ تو اب لوگ مجھ سے میرے جذبوں کی بھی قربانی طلب کرنے لگے ہیں۔ میں نے جو دل کا شہر آباد کیا ہے اس کا بھی محاصرہ کیا جا رہا ہے۔''

''کیوں بابا جان! ہم کب تک شفٹ ہو رہے ہیں۔'' مدحت دادا کے پاس جا کر ان سے پوچھ رہی تھی۔

اور عابی بغیر کچھ سنے' خدا حافظ کہتا' تیز تیز قدموں سے نکل بھی گیا جب وہ جواب دینے لگے تھے۔

## 22

''اماں! میری بات تو سنیں۔'' آنکھوں میں آنسو بھرے وہ ماں کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔

''بس۔ نہیں مجھے کچھ بھی سننا۔ آخر تمہیں ایسی بات سوچنے کی ہمت بھی کیسے ہوئی۔؟''

''یہ میرا حق ہے اماں۔!''



''تمہارا حق۔؟ ہمیں تم سے بہتر معلوم ہے کہ تمہارا حق کیا ہے اور فرض کیا ہے۔ اور ہمارے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا ہیں۔''

آنکھیں تو اس کی پہلے ہی رو رو کر متورم سی ہو رہی تھیں۔ جنہیں ماں نے شاید غصے میں غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ دیکھ لیتیں تو ہو سکتا تھا اس کے اندر کے دکھ کا انہیں کچھ ادراک ہو جاتا۔ وہ تو بس اس کا یہی جملہ سن کر سیخ پا ہو اٹھی تھیں۔

''اماں! ابھی میرا نکاح نہ کریں۔ مجھے اپنی تعلیم مکمل کر لینے دیں۔ میں اس طرح اپنی پڑھائی اچھی طرح نہیں کر سکوں گی۔''

وہ کون ہوتی تھی اس معاملے میں اتنا بھی کچھ کہنے والی۔ اک لفظ تک بھی۔ ان کے ہاں تو لڑکی ذات کو اپنے کسی ایسے معاملے میں ہاں یا نہ بولنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ یہ ایمان نے کس سے اجازتیں لے لیں؟ یہ ایمان نے کیسے جرأتیں پکڑ لیں۔؟؟

''اماں! میری پوری زندگی کا سوال ہے۔''

''یہ بھی جانتے ہیں ہم۔ تمہیں ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت ہے نا۔ کیونکہ آپ اپنی بیٹی کی بھلائی سوچنے کے بجائے اپنی برادری قبیلے کے بنائے رسم و رواج کی اندھا دھند تقلید میں......''

''بس بس۔'' ماں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''لیکچر تو مجھے تمہارا سننے کی فرصت نہیں ہے۔ سیدھا صاف بتا دو ہم تم پر ظلم کونسا ڈھا رہے ہیں۔ کیا کمی ہے ہمایوں خان میں۔ وہ بدصورت ہے۔ وہ اجڈ جاہل گنوار ہے۔ وہ مفلس و نادار ہے۔ وہ پچاس ساٹھ سال کا بوڑھا ہے۔ کونسا عیب ہے اس میں۔؟''

''ہائے ماں میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ یہ عیب و ہنر والی بات نہیں ہے۔ یہ خالص دل کا معاملہ ہے۔'' اس نے اک کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ کیا کرے۔؟ کس طرح اس متوقع حادثہ سے خود کو بچائے جو اس کے جذبات کی موت بنتا دکھائی دے رہا تھا اور کسی بھی قسم کی موت کے بعد بھلا انسان زندگی کے گلے مل سکتا ہے۔؟

''میں زندگی کیسے جیونگی۔ کیسے جیونگی اماں! پلیز میرا دکھ محسوس کریں۔'' دل میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

"آپ کو کیا پتہ اماں! وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔ چار سالوں سے وہ سب
آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اس کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں۔" اس نے ا
اور دلیل دی۔ ماں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے دوسری سوچ پیش کی۔

"اس ماحول کے متعلق ہمارے یہاں جس قسم کی کہانیاں مشہور ہیں۔ کیا علم
انہیں کہانیوں میں کا اک کردار ہو۔ تب میری زندگی کی بربادی کا کون ذمہ دار ہوگا۔؟"

ویسے پتہ تو خود اسے بھی کچھ نہیں تھا۔ بس ہوا میں ہی تیر چلانے کی کوشش
تھی۔ شاید اماں قائل ہو جائیں اور اس کے نکاح کے ارادے کو فی الحال ملتوی کر دیں

"تم جس زندگی کا سوال آج لے کر بیٹھی ہو' اس کا جواب ہمارے ہا
لڑکیاں نہیں مانگا کرتیں۔ اب وہ جیسا بھی ہے تمہارا مقدر ہے۔" صفیہ نے خفگی
اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بات ختم کر دی۔ "اور مقدر کی ذمہ داری کوئی نہیں لیا کرتا
دوپٹے کو گوٹہ لگا رہی تھیں۔ سوئی کی نوک چبھنے پر ہائے کر کے اسے علیحد
رکھا پھر بیٹی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ وہاں جو نظارہ انہیں نظر آیا وہ ان کی ما
کو زیر و زبر کر دینے کیلئے کافی تھا۔

آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ گلابوں کو شرمانے والے رخساروں
زردیاں سی اتری ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔

وہ کس الجھن میں تھی۔؟ وہ کس دکھ میں مبتلا تھی۔؟ صفیہ نے پوچھنا چاہا
مگر دانستہ ہونٹ سی لئے۔ کیا کریں گی جان کر۔ ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

کاش! وہ اس کے لیے کچھ کر سکتیں۔ ماں کی ممتا تڑپی مچلی۔

"وہ جو چاہتی ہے اس کی مانگ پوری کر دو۔" دل اتھل پتھل ہوا جا رہا تھا۔

مگر۔ نہ کچھ بس میں تھا۔ نہ دسترس میں۔ نہ اختیار میں۔!!

ان کی اپنی ساری زندگی بے اختیاریوں میں اور بے بسی میں گزر گئی تھی۔
ان کے ہاں عورت کی یہی حیثیت اور یہی مقام تھا۔ ان کے کنبے برادری میں عورت
کچھ کہا نہیں کرتی تھی صرف سنا کرتی تھی اور بجا لایا کرتی تھی۔

کتنی ہی دیر بیٹی کے چہرے کو غور سے دیکھتے رہنے کے بعد انہوں نے نظر
پھیر لی۔ اس کے لیے جو دل میں گداز اترا تھا' ممتا نے جو رحم کی اپیلیں کی تھیں' سب



مسترد کر دیں۔ اندر ہی اندر کلیجہ پتھر کیا۔ اس کی صورت دیکھ کر جو نرمی پیدا ہوئی تھی
اسے زبردستی سختی میں ڈھالا۔

"سن لو ایمان! کان کھول کر سنو۔ تمہاری پھوپھی کی یہ خوشی ہے اور تمہارے
باپ نے ہر حال میں پوری کرنی ہے۔"

اور ایمان کے ٹوٹنے والے دل کی صدائیں نہ اماں کے کانوں میں اتریں
اور نہ اس کی کرچیوں نے انہیں کوئی زخم دیا۔ اس کا یہی خیال تھا۔ دلوں کے بھید تو
صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

"اولاد کے ہر دکھ سکھ کی ساتھی اک ماں ہوتی ہے۔" ایمان رقت بھری
آواز میں بڑبڑائی۔ "آپ کیسی ماں ہیں جو میرے اندر کے دکھ کو سمجھ ہی نہیں پا
رہیں۔"

"اب وقت نہیں ہے۔ اب تو طے ہو چکا سب کچھ۔" وہ اسی بے دردی سے
گویا ہوئیں۔ زبان پر ہی بے رحمی تھی ورنہ دل اس کی ہمدردیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

"مجھ سے پوچھے بغیر ہی طے ہو چکا ہے۔؟" ایمان نے اپنے وجود' اپنی تعلیم
کی حیثیت جتائی۔ اتنے لاڈ سے پالا تھا۔ اتنی محبتوں سے پرورش کی تھی۔ اتنی تعلیم
دلائی تھی۔

"ہمارے ہاں لڑکیوں سے نہیں پوچھا جاتا۔"

"کیوں لڑکیاں انسان نہیں ہوتیں۔ جذبات و احساسات نہیں رکھتیں۔ دل
دماغ نہیں انہیں اللہ نے دیا۔؟ جب اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے تو پھر لڑکوں اور
لڑکیوں میں یہ فرق کیسا۔؟"

"یہ جا کر اپنے باپ سے پوچھو۔ مجھ سے بحث نہیں کرو۔" صفیہ نے جھنجھلا کر'
اٹھ کر پھر دوپٹہ اٹھا لیا۔ کام ختم کرنا تھا۔ بے شک دل کے اندر ویرانی ہی ویرانی تھی۔

"تمہیں تعلیم نے اتنی تو جرأت دے دی ہوئی ہے۔ باپ سے ہر بات کر
سکتی ہو۔"

"کیسی جرأت ہمت۔" آنسو پھر فراوانی سے بہنے لگے۔ "باپ سے سڑک
بنوانے کی بات تو کر سکتی ہوں۔ جو سنا ہے' بن بھی چکی ہے۔ مگر ہم لڑکیوں کا یہ المیہ

ہے کہ اپنی زندگی کے ٹیڑھے راستوں کو سیدھا کرنے کی نشان دہی نہیں کر سکیں۔ آپ ماؤں نے ہی باپوں کے ڈراوے دے دے کر ہمیں بزدل بنا چھوڑا ہے۔ اپنے حق' اپنے جذبات و احساسات کیلئے زبان ہی نہیں کھولنے دیتیں۔ ماسٹرز کر رہی ہے بیٹی' اتنی باشعور ہو چکی ہے کہ اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ خود کر لے پھر بھی۔"

ایمان کی بڑبڑاہٹیں بڑھیں۔ صفیہ کا غصہ بڑھ گیا۔ پہلے اپنے آپ پر تھا۔ کہ ماں ہو کر اس کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ ایسی بے بس تھیں۔ اب اس پر آنے لگا۔ جب اسے یہ سب معلوم تھا تو ان کے ساتھ ٹاکرا کیوں لگائے بیٹھی تھی۔ یہ اس آزادی ہی کا اثر تھا جو تعلیم کے نام پر دے دی تھی۔ اسے شہر بھیج دیا تھا حاصل کرنے کے لیے۔ گھر سے نکلنے کی اجازت دے دی تھی۔ ہوسٹل میں رہنے لگی تھی۔ گھر کی چھت سے پرے' ماں کی نگاہوں سے دور۔

"اسی تعلیم نے تو بیڑا غرق کیا ہے۔ اندھیر خدا کا۔ بیس برس کا بندھا ہوا بندھن' آج اس میں برائیاں نظر آنے لگیں۔ اس پڑھائی کی وجہ سے ہی نا۔ بچپن کے رشتے میں اور جوانی کے کیئے گئے رشتے میں فرق نظر آنے لگا۔"

ویسے ہمایوں خاں کے رشتے کے متعلق تو خود انہیں یہ احساس تھا کہ ان کی بیٹی کا نصیب خاندان بھر کی سب لڑکیوں سے اچھا نکلا تھا۔ خاندان بھر میں سب سے زیادہ امیر اور دولت مند اس کے پھوپھا تھے۔ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہمایوں خاں کو سمجھا جاتا تھا جو امریکہ تک جا پہنچا تھا۔ اور جوانی خوبصورتی میں بھی وہی یکتا تھا' ہزاروں لاکھوں میں کھڑا کر دیا جائے تو نگاہ اس پر ٹھہرتی تھی۔

پھر اس نے نکاح کے لئے اتنا واویلا کیوں مچا رکھا تھا۔ جہاں ایک لفظ بولنے کی حاجت نہ تھی' آنکھیں میچ کر ہاں کر دینے والا یہ اتنا اعلیٰ رشتہ ہوا تھا' وہاں یہ ایمان اتنا کچھ کہے جا رہی تھی۔ دماغ خراب تھا اس کا۔

"باپ کے کان میں بھنک تک پڑ گئی تو دونوں کو گولی سے اڑا دے گا۔ اس بھول میں نہ رہنا کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔" صفیہ بھی جلال میں آ گئیں۔ حقائق پر سے پردے اٹھانے لگیں۔ "ہم لوگ برادری قبیلے کے رسم و رواج سے ہٹ کر کبھی کچھ نہیں سوچ سکتے۔ بچپن کی منگنی نکاح کے برابر ہوتی ہے۔ یہ تو تمہاری



پھوپھی کی خواہش ہے جو بظاہر پوری کی جا رہی ہے ورنہ سچ جانو تو اسی دن تمہارا نکاح ہو گیا تھا جب یہ بات طے ہوئی تھی۔ عمریں پکھ رہی ہوں۔"

"ہاں۔ بہت اچھا کرتے ہیں۔ جنم دیتے ہی زندگی چھین لیتے ہیں بیٹی کی۔" آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اک تواتر سے بہے چلے جا رہے تھے۔ اور ان کی روانی کے ساتھ ساتھ زبان بھی رواں تھی۔ دل کی دنیا میں ہلچل مچی تھی۔ اندر طوفان اٹھ رہے تھے۔ کیسے زبان تھمتی۔

"کس قسم کے لوگ ہیں آپ۔ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔ اپنا کچھ بھی نہیں۔ نہ کچھ کہنے کی آزادی نہ کرنے کی۔ نام کے مسلمان۔ نمازیں پڑھ چھوڑیں۔ ٹکریں مارنے کے انداز میں۔ شرع سنت کا کوئی پتہ نہیں۔ کیا کہتا ہے ہمارا اسلام۔ جو دین فطرت ہے۔ جذبوں پر پابندیاں لگا دیں۔ کیا پیغام دیتا ہے قرآن۔ وہ کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہیں یہ لکھا ہے کہ کسی کی زندگی کا فیصلہ۔"

"بس چپ کر جاؤ۔" صفیہ میں مزید اس کی آہ و بکا سننے کی ہمت نہ تھی۔ غصہ بھی آئے جا رہا تھا۔ دکھی بھی ہو رہی تھیں۔ اس کی دہائیاں' اس کی فریادیں سن سن کر لٹی لٹی جا رہی تھیں۔

ماں نے ڈانٹا تو۔ زبان تو تھم گئی۔ گھٹنوں میں چہرے گھسا لیا۔ دماغ اسی طرح مصروف عمل رہا۔ آنسو اسی طرح ٹپکتے رہے۔

سارا وجود آگ کی بھٹی بنا ہوا تھا۔ نہ صرف وہی جل جل کر بھسم ہو رہا تھا۔ جذبات واحساسات میں بھی جیسے الاؤ سے دہک رہے تھے۔

اس نے کہا تھا۔ تمہارے لئے کچھ کروں گا۔ بچپن کی منگنی کے خلاف احتجاج کریں گے۔ قومی سطح پر آواز اٹھائیں گے۔ ان چھوٹی چھوٹی جہالت کے دور کی رسموں کی بیخ کنی کر ڈالیں گے جو زندگیوں کا کینسر بن جاتی ہیں۔ جذبات کی موت اک انسان کی موت سے بڑا حادثہ ہے۔ اور روز روز کا مرنا' انسان کو کب کسی قابل چھوڑتا ہے۔ جیتے جی بندہ مر جاتا ہے۔

جیسے وہ مر گئی تھی اس وقت جب ارسل نے یہ خبر سنائی تھی۔ اور اسے ساتھ لایا تھا۔ پھر کیسے کیسے وہ سارا راستہ آنسو پیتی رہی تھی۔ آنے سے پہلے عابی سے

ملنے کی کوشش کی تھی۔

''ارسل! میں ذرا چھٹی کی درخواست تو دے آؤں۔''

اسی بہانے وہ بھاگی بھاگی سر عبد کے آفس پہنچی تھی۔ پتہ نہیں کتنے دن
جائیں۔ ماھم بھی نہیں تھی جو اس کی غیر حاضریوں کا کچھ کر لیتی۔

''سر ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔'' چپڑاسی نے اطلاع دی تو دل جیسے تھم سا
تھا۔ وہ انہیں ضرور ملنا چاہتی تھی۔ بڑی بے تاب ہو رہی تھی اک نظر دیکھنے کو۔

پھر باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا بھی۔ وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ دل
ویرانیاں اترنے لگیں۔ اداسیاں ابھی سے گھر کرنے لگیں۔

بھاگی بھاگی اک اک کمرے میں جھانکتی پھری۔ ''شاید کوئی کلاس لے رہے
ہوں۔'' مگر مایوسی ہی ملی ہر در سے۔ ہر متوقع جگہ سے۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دیے۔

''اٹھو جاؤ پھوپھو کے پاس۔ وہ تمہارے بغیر بہت اداس تھیں۔''

خیال کی بزم عابی کے ساتھ سجائے بیٹھی تھی جب ماں نے اس کی اداسی
کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پھوپھو کی اداسی کا پیغام دے دیا۔

ایمان نے گھٹنوں میں سے سر نکالا۔ اک آخری امید۔ سوچ کی آخری
سعی۔ ''اماں! میں یہ رشتہ توڑنے کیلئے تو نہیں کہہ رہی۔ میرا مطالبہ صرف اتنا ہے
مجھے تعلیم مکمل کر لینے دیں۔''

''کہا ناں۔ یہ صرف نکاح ہے۔ رخصتی شادی نہیں۔ تمہاری تعلیم میں کوئی
رخنہ نہیں پڑے گا۔''

صفیہ نے بات ختم کر دی۔

مگر بات تو تب بنتی جو وہ خود ختم کر دیتی۔ اس کا تو دل دھڑک پھڑک رہا
تھا۔ کسی کل نہ چین تھا نہ قرار۔ نہ سکون تھا نہ اطمینان۔

''اور جو ذہنی طور پر میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں گی۔''

وہ عبد رحمان کے متعلق ہی سوچے جا رہی تھی۔ جیسے اگر آج اس کی جان
اس نکاح والی آفت سے چھوٹ گئی تو عابی خضر راہ بن کر سامنے آ کھڑا ہو گا۔ اور
اپنے ساتھ ہونے والے اس ظلم اور اپنے جذبوں کی موت سے بچ نکلے گی۔ زندگی



پائندہ۔ اور اس کے دل کی بستی بھی اجڑنے سے بچ جائے گی۔

ماں کا حکم ملا تھا۔ مگر اسے پھوپھو کے پاس جانے کا بھی ہوش کہاں تھا۔ دل
کی بیقراریوں نے باپ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کیا کر
رہی تھی۔

''بابا جان! آپ میری ہر بات مانا کرتے ہیں نا۔؟''

بس اندر سے یہی صدا اٹھ رہی تھی۔ یہ نکاح نہیں ہونے دینا۔ جس طرح
بھی ہو سکے۔ باقی عبد سنبھال لیں گے۔ انہوں نے دعویٰ کیا تھا۔ ایمان کی خاطر بہت
کچھ کریں گے۔ بہت ساری امیدیں ان کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اعتماد کی ڈور بھی ان
کے ہاتھ میں تھما دی۔

''مانا تو کرتے ہیں۔ کیوں۔؟ یقین کیوں متزلزل ہو رہا ہے؟'' واصل
آفریدی انتہائی شفقت سے پوچھنے لگے۔ نظریں بیٹی کے پرکشش چہرے پر جمی تھیں جو
آج کچھ اپ سیٹ سی دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً ہو گی۔ خیال آیا۔ اچانک جو اتنی
بڑی تقریب کا خصوصی مہرہ بن گئی تھی۔ نہ پہلے سے کوئی خبر نہ اطلاع۔ نہ کوئی تیاری کر
سکی۔ نہ ذہنی نہ جسمانی۔ لڑکیاں خوبصورت لباس بنواتی ہیں' بیوٹی پارلروں میں جاتی
ہیں۔ زیورات کا انتخاب ہوتا ہے۔ واصل آفریدی کی سوچ ہی مختلف تھی۔

''میری بچی کو موقع ہی نہ ملا کچھ بھی کرنے کا۔ کوئی بھی ارمان نہ نکلا۔ کوئی
بھی حسرت نہ پوری ہوئی۔ نہ سہیلیاں اکٹھی ہوئیں۔ نہ چھیڑ چھاڑ۔ نہ ہنسی مذاق۔ نہ
ڈھولک مہندی۔ زلیخا کی بیماری نے سب' سب کو ہی پریشان کر ڈالا۔ شکر ہے اس کی
جان بچ گئی۔'' بہن سے بھی بہت محبت تھی۔

باپ کے چہرے پر گڑی نظروں سے گھبرا کر ایمان نے ان کے سامنے بیٹھتے
ہوئے سر گھٹنوں پر دھر دیا۔

''ہاں بولو بابا کی جان! کیا فرمائش ہے۔؟''

''وہ۔ وہ۔'' نظریں اٹھائیں۔ پہلے تھوڑا سا ہکلائی پھر ہمت مجتمع کی۔

''امریکہ کا معاشرہ بہت مختلف ہے۔ کہیں آپ کی بیٹی کی زندگی نہ برباد ہو
جائے۔ ہمایوں خاں جب واپس پاکستان آئے گا تو آپ پھر یہ تقریب منعقد کر لیں۔

ابھی....''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی واصل آفریدی اک زوردار قہقہہ لگا کر
اٹھے۔''ہمایوں خاں شرفاء کی اولاد ہے۔ جس یقین کے ساتھ میں نے اپنی بیٹی کو
میں ہوسٹل میں بھیج دیا ہے۔ اسی یقین کے ساتھ ہمایوں خاں کو اس کے والدین نے
امریکہ تعلیم کیلئے بھیجا ہوا ہے۔ میرا یقین قائم ہے نا اب تک۔؟''

ایمان نے چونک کر' سٹپٹا کر انہیں دیکھا۔

''تو اس کے لئے بھی کسی فکر یا پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے
اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بالوں کو سہلایا۔

''اگر کچھ غلط ہوتا۔ تو وہ ہی حامی نہ بھرتا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔''

واصل آفریدی نے بات ہی اس انداز میں کر دی تھی کہ وہ مزید کچھ کہہ نہ
سکی۔''تم اپنے دل سے سب وسوسے نکال دو۔''

وہ اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں باپ سے چھپانے کی کوشش میں اٹھ کر
دوسرے کمرے کی جانب چل دی۔ بابا کی عدالت میں بھی مقدمہ ہار گئی تھی۔

کیا اس کے نصیب میں شکست ہی لکھی گئی تھی۔؟

نہیں نہیں۔ خدا نہ کرے۔ نگاہوں میں' خیالوں میں صرف عابی تھا۔

نصیب کی شکست کا مطلب تھا۔ عابی سے ہمیشہ کی جدائی۔ اور وہ۔ وہ کیسے
گوارا کرے گی۔ کیسے برداشت کرے گی۔ کیسے جئے گی۔؟ مر نہ جائے گی؟

''ارسل! مجھے تمہاری فیور چاہیے۔'' اپنے آنسو پیتے ہوئے اپنی آواز کو نارمل
رکھتے ہوئے وہ بھائی کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھی۔

بڑا مان تھا اس کے بھائی ہونے پر۔ بڑا اعتماد تھا اس کی محبتوں پر۔

وہ اس کی خاطر جان بھی دے سکتا تھا۔ ہمیشہ اس کا دعویٰ رہا تھا۔ اور ایمان
کے اس دعوے پر وہ یقین بھی رکھتی تھی۔

''کس معاملے میں۔؟'' اس نے اک سرسری سی نظر اس پر ڈالی۔''تم
پریشان لگ رہی ہو۔''

''نکاح کی یہ تقریب تم ملتوی نہیں کرا سکتے۔؟''



''کیا۔؟'' وہ چونکا۔ پھر حیرتوں میں ڈوب گیا۔ پھر ہنسنے لگا۔''تمہارا دماغ تو
درست ہے۔؟''

''میری بات کا جواب دو۔''

''لیکن کیوں۔؟''

''وجہ بتانا کیا ضروری ہے۔؟ کیا اتنا ہی کافی نہیں کہ میں ابھی نہیں چاہتی۔''

''پر تم سے پوچھا کس نے ہے۔؟''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ میرے نام کی تقریب ہے۔ میری ساری زندگی
کا معاملہ ہے۔ اس لئے میری مرضی سے اسے منعقد ہونا چاہیے۔ جب چاہوں گی اور
جس سے چاہوں گی......''

''کیا کیا کیا۔؟'' اس نے اوپر تلے کئی قہقہے لگا ڈالے۔''جب چاہو گی اور
جس سے چاہو گی۔؟ پاگل ہوگئی ہو جو آج یہ سوال اٹھا رہی ہو' پندرہ بیس سال منگنی رہی
ہے۔ تم نے کبھی اعتراض کیا۔؟'' وہ اس کا مذاق اڑانے لگا۔''اور اعتراض کر بھی نہ بیٹھنا
میری پگلی سی بہن! تم لڑکیوں کو یہ حق ملتا ہی کب ہے۔ اور دے گا بھی کون۔ ہمارے
ہاں کا یہ دستور نہیں ہے کہ لڑکی اس معاملے میں زبان بھی کھولے۔ بس چپ چاپ نکاح
کراؤ اور خدا کا شکر ادا کرو کہ ہمایوں خاں میں وہ سب اوصاف موجود ہیں جو اک لڑکی
اپنے ہونے والے شوہر میں دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اک آئیڈیل انسان ہے۔''

پھر وہ اماں کے پکارنے پر ایمان کو شرارت سے اک چپت لگاتے ہوئے
کمرے سے باہر نکل گیا۔

## 23

سات آٹھ دنوں سے وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ نہ کلاس میں۔ نہ لائبریری
میں۔ یونیورسٹی آتے ہوئے' آفس سے کلاس روم تک جاتے ہوئے۔ نہ راستے میں' نہ
کسی موڑ پر' وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

رول کال کے وقت اور لیکچر دیتے ہوئے سر عبدالرحمان کلاس روم میں اک اک طالبہ کا چہرہ بغور تکتے۔ شاید کوئی پراکسی بول دے یا اس کے متعلق کوئی اطلاع کوئی خبر ہی دے دے۔

پر وہ تو ایسے غائب ہوئی تھی کہ پتہ نشان ہی نہیں مل رہا تھا۔ سوائے رجسٹر میں درج اس کے نام کے اور کوئی بھی ثبوت اس کے ہونے کا باقی نہ تھا۔

لیکن۔ لیکن۔ ان کی سانسوں میں، ان کی دھڑکنوں میں، ان کی نگاہوں میں، ان کے دماغ میں اور سوچ کی اک اک لہر میں، وہی تو تھی۔ انہیں کچھ اور سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔

رول کال لیتے تو ہر نام ''ایمان آفریدی'' پڑھا جاتا اور زبان کی نوک پر آ کر تھمتا۔ لیکچر دیتے تو نگاہ اٹھانے پر، ہر چہرہ اسی کا چاند چہرہ بن کر، ہر کسی کے شانوں پر لشکارے مارتا نظر آتا۔ وہ تو پاگل ہو رہے تھے۔ بڑی مشکل میں تھے۔ بہت خوفزدہ تھے، ان سے کوئی غلط سلط حرکت نہ سرزد ہو جائے۔ کئی لیکچر مس کر دیئے تھے۔

حالات کی ایسی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اک انسان کا یوں جذبات کے ہاتھوں شکست کھا جانا بھی تو اک حیرت انگیز حادثہ تھا جو انہیں پیش آیا تھا۔ ''یا اللہ یہ تو نے میرے ساتھ کیا کر ڈالا۔؟''

بے اختیاری و بے بسی کی تصویر بنے سوچوں میں گم سر عبدالرحمان اگلے دن کے لیکچر کی تیاری میں مصروف تھے بظاہر۔ سامنے نوٹس کی فائل تھی۔ اردگرد دونوں اطراف دو موٹی موٹی کتابیں کھلی پڑی تھیں۔ دونوں کے اوراق ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ مگر خود ان میں متوجہ نہ تھے۔ دماغ بھی حاضر نہ تھا۔

ایمان آفریدی ہی کو مسلسل سوچے جا رہے تھے۔

اس نے بتایا تھا کہ بچپن سے اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ خود اپنے حالات سے بھی باخبر تھے۔ فرحت کے ساتھ شادی ہو چکی تھی اور بے شک وہ اسے تسلیم نہیں کر رہے تھے اور پچھلے چھ سات سال سے بھاگے پھر رہے تھے زندگی سے۔ پھر بھی وہ پابندیوں میں ایسے جکڑے گئے تھے کہ اپنے آپ کو آزاد بھی نہیں سمجھتے تھے۔

پھر یہ ایمان آفریدی کن بند راستوں کو کھول کر ان کی مقید زندگی میں آ



داخل ہوئی تھی۔؟ کیوں۔؟ کیوں ایسا ہو گیا تھا۔؟

سات سالوں کی تپسیا چند دنوں میں ہی کیسے رائگاں ہو گئی تھی۔ کتنا سنبھال سنبھال کر، بچا بچا کر اپنے دل کو، جذبات کو رکھا تھا۔ پتہ ہی نہیں چلا کب اور کیسے مات کھا گئے تھے۔؟

وہ بیٹھے ان لمحات کو کھوج رہے تھے جو کمزوری دکھا گئے تھے۔ پر بہت تفتیش کے باوجود کچھ حاصل وصول نہیں ہو پایا تھا۔ البتہ اس کے ہوسٹل اور یونیورسٹی سے غائب ہونے پر انہیں یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ ایمان آفریدی کے وجود نے انہیں بہت سارے نئے اور انوکھے سے جذبوں سے روشناس کرا دیا تھا۔

اندر سرشاریاں بھی تھیں۔ دلآزاریاں بھی تھیں۔ سکون بھی تھا، بے چینی تھی۔ قرار بھی تھا، بیقراری بھی تھی۔ وہ دکھائی دے جاتی تو دل کھل اٹھتا۔ ذرا نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو خزاں کا موسم اندر آن ٹھہرتا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک نے انہیں یکایک چونکا سا دیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اجلال کہیں نہیں تھا۔ شاید کہیں باہر نکل گیا تھا۔

''احمق نے بتایا بھی نہیں۔ یس۔ کم ان۔'' وہ یہی سمجھے ساتھ والے پڑوسیوں کا افضال تھا۔ کسی نہ کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی ہو گی۔ کافی لین دین تھا آپس میں۔ دوستی بھی بہت تھی۔

اور خود جلدی سے میز کی چیزیں سمیٹنے لگے۔ فائل بند کی۔ پھر دونوں کتابیں بند کر کے ریک میں رکھ ہی رہے تھے کہ اک زنانہ مانوس سی آواز پر چونک سے پڑے۔ ''اسلام علیکم۔''

گھبرا کر گردن موڑی۔ ماھم مسکراہٹیں بکھیرتی سامنے کھڑی تھی۔ ''ارے! آپ۔ وعلیکم اسلام۔''

جلدی سے اٹھ کر صوفے پر سے بکھرے کپڑے اکٹھے کرنے لگے۔ ''یہ اجلال کی بڑی بری عادت ہے۔'' ساتھ بڑبڑائے۔ ''دیکھو تو کیا حشر برپا کئے ہوئے ہیں۔''

کمرہ بہت بے ترتیب سا ہو رہا تھا۔ زیادہ تر چیزیں اسی کی بکھری ہوئی

تھیں۔ تولیہ۔ شرٹ۔ واسکٹ۔ رومال۔ سب کچھ اٹھاتے ہوئے چہرے پر شرمند
بھی پھیل رہی تھی۔
''بیٹھو۔ کہاں تھیں اتنے دنوں سے۔ بہت غلط اسٹوڈنٹ ہو ماہم۔!''
''ویسے دوست تو ٹھیک ٹھاک ہوں نا۔؟'' بہت خوش دکھائی دے رہ
چہرے پر مسکراہٹیں تھیں۔ آنکھوں میں بجلیاں۔ نجانے کیوں۔؟
''ہاں۔ بلاشبہ دوست بہت اچھی ہو۔'' رائٹنگ ٹیبل والی کرسی اس
قریب کھینچ کر بیٹھ گئے۔ سناؤ۔ کہاں رہیں اتنے دن۔؟''
''وہ بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تو آپ مجھے میری ایمان کا حال بتائیں۔
ہوسٹل میں نہیں ہے۔ ابھی وہیں سے ہو کر آئی ہوں۔ پتہ چلا ہے پچھلے سات
دنوں سے وہ چھٹی پر ہے۔''
''ہاں۔'' مسکراتے ہوئے عبدرحمان کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیاں
رینگ گئیں۔ ''لیکن معلوم مجھے بھی نہیں کہ کیوں۔؟''
''کمال ہے۔ آپ کو تو معلوم ہونا چاہیے تھا۔'' ماہم کا انداز کچھ بامعنی
تھا۔
وہ گڑبڑا گئے۔ ''مجھے بھلا کیوں علم ہوتا۔ میں اس کے ساتھ ہوسٹل میں
نہیں رہتا۔'' انہوں نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ ''کیا خیال ہے۔
لوں ہوسٹل میں کمرہ۔ عین اس کے سامنے۔ تاکہ پھر تمہیں اس کی سرگرمیوں کی
اور تازہ ترین اطلاعات بھی بہم پہنچاتا رہوں۔''
''اطلاعات تو میں خود حاصل کرلوں گی سر! ویسے اس کے سامنے والا
بلکہ اسی کے والا سمجھئے پوری زندگی کے لئے بک ہو بھی چکا۔'' ماہم نے بظاہر
جواب مذاق میں دیا تھا مگر ساتھ ہی انہیں یہ جتا دینا بھی مقصود تھا کہ ان کے دل میں
اس کے متعلق کوئی ایسا ویسا خیال تھا تو وہ آغاز میں ہی اپنے جذبات کو لگام ڈال لیں
ماہم کا خیال تھا۔ وہ ہمایوں خاں کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ ایمان
کہاں بتایا ہوگا۔ وہ تو اسے بھی کبھی اپنی منگنی کا نام نہیں لینے دیتی تھی۔ تو انہیں
مطلع کیا ہوگا جبکہ وہ ان کی ذات میں اتنی دلچسپی لے رہی تھی۔ اسے یقین تھا



جذباتی طور پر ان سے وابستہ ہو چکی تھی' جو سراسر فاؤل تھا اور عورت کی وفا پرست
فطرت کے بالکل خلاف۔ کم از کم ایمان آفریدی جیسی اپنی اتنی پیاری دوست میں وہ
یہ خامی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔
ماہم کی اس انداز کی گفتگو سے عبدرحمان ایک دم چپ سے ہو گئے تھے۔
سنجیدہ اور ملول سے۔ ماہم کو فوراً احساس بھی ہو گیا۔
''کیا بات ہے سر۔؟'' اس نے ان کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''مجھ
سے کوئی گستاخی ہو گئی۔؟''
''گستاخی کیوں ہو گی۔ بعض حقائق ہی بڑے تلخ ہوتے ہیں بی بی! جن کا
زندگی میں سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ نادانستگی میں ہی۔'' وہ سنجیدگی کے ساتھ بڑبڑائے۔
پھر مدھم سے لہجے میں بولے۔
''میں جانتا ہوں سب کچھ' جو تم مجھے سمجھانے کی کوشش میں ہو۔''
''کیا جانتے ہیں۔؟'' وہ ہنوز اسی کیفیت میں تھی۔
''یہی کہ۔ ایمان آفریدی کی منگنی ہو چکی ہے۔''
''ارے! آپ کو کس نے بتایا۔؟'' وہ چونکی۔ ''مجھے یقین ہے کم از کم خود
اس نے تو نہیں بتایا ہوگا۔''
''تمہارے اندازے اور تمہاری یقین سب غلط ہو گئے ماہم بی بی! خود اسی
نے بتایا ہے۔''
''تو۔ تو عالی! کیا آپ پھر بھی۔'' گھبرا کر اپنی بات وہ خود ہی نامکمل چھوڑ
گئی۔ یہ وہ کس سے اور کیسی گفتگو کرنے بیٹھ گئی تھی۔ اسے تو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کسی
دوسرے کے معاملات میں مداخلت کرنے کا۔ یا ایمان کی غیر موجودگی میں اسے
ڈسکس کرنے کا۔ یا پھر کچھ بھی کریدنے کا۔ اور...... یوں بھی عبدرحمان اس کے استاد
کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسے ان کا احترام ہر طرح ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔
''میں پھر چلتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہمیشہ اندر اک منصفانہ سوچ رکھا
کرتی تھی ہر کسی کے متعلق۔ تبھی مزید بات نہیں کی۔
''اونہوں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔؟'' وہ اک تحکمانہ سے انداز میں بولے۔

"بیٹھو ابھی۔"

"کیوں۔؟" ماھم گھبرا کر واپس ٹک گئی۔

"تم نے مجھے اتنا برا میزبان کیوں سمجھ لیا کہ گھر آئے مہمان کو کوئی چائے پانی پوچھے بغیر جانے دوں گا۔"

پھر بڑے پیارے انداز میں مسکرائے۔ "چائے لاتا ہوں۔ دونوں پئیں گے اور اجلال بھی تو یہیں کہیں تھا۔ کیا اسے نہیں ملو گی۔؟"

اتنا اپنایت اور محبت بھرا لہجہ تھا کہ ماھم ان سے بے تحاشا متاثر ہو گئی۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں۔ کچن میں بھی چلتی ہوں۔ ساتھ چائے بناتے ہیں ساتھ باتیں کرتے ہیں۔"

"گڈ۔ وری گڈ۔ یہ ہوئی نا اچھی لڑکیوں کی سی بات۔ چلو آ جاؤ۔"

ماھم نے چائے بنانے میں ان کی مدد کیا کرنا تھی اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ایک پیالی چائے بنانے کے لیے پتی کتنی ڈالی جاتی ہے اور دودھ کتنا درکار ہوتا ہے۔ بس وہ تو عبد سے باتیں کرنے کے لیے ان کے ساتھ کچن میں چلی آئی تھی۔

انہوں نے خود ہی چولھے پر پانی دھرا۔ دودھ کا پیکٹ فریج میں سے نکالا۔ چینی والا ڈبہ پاس رکھا۔ وہ سب کچھ کرتے رہے، ماھم دیکھتی رہی۔ ساتھ ساتھ باتیں کرتی رہی۔

یونیورسٹی کے اتنے دن، اس کے غیر حاضر رہنے والے، کیسے گزرے۔؟ کورس کتنا ہوا؟ ایمان کے شب و روز کیسے گزرے۔؟ یونیورسٹی کے علاوہ بھی اس سے ملاقات رہی یا نہیں؟ باقی کلاس فیلوز کیسے تھے۔؟ کوئی خاص واقعہ جو پیش آیا ہو؟

بے شمار سوالات اس نے کر ڈالے تھے۔ عبد بڑی اپنایت، بڑے پیار سے اور مدھم مدھم اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیتے رہے۔ یہ آج اس کی عبد کے ساتھ پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔

"اجلال کا آئندہ زندگی میں کیا پروگرام ہے۔ کچھ آپ کو علم ہے۔؟"

ماھم کے اس سوال پر عبد نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔ "آئندہ زندگی کا پروگرام۔؟ کیا مطلب۔؟"



"یہ اجلال کی فیملی وغیرہ۔ سب لوگ کہاں ہیں۔؟ اور یہاں آپ دونوں اکیلے کیوں رہ رہے ہیں۔؟"

"یہ تم صرف اجلال کے متعلق ہی جاننا چاہتی ہو یا ہم دونوں کے متعلق ہی تفتیش کر رہی ہو۔؟"

انہوں نے اک پیاری سی، معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تو ماھم بے اختیار ہنس دی۔ ویسے ان کا انداز اچھا بھی لگا۔

"صرف اجلال کے متعلق بھائی۔!" بڑی بے تکلفی سے بولی۔ "ویسے اگر آپ کا بھی پوچھ لوں تو دوستی کے ناطے کیا یہ حق نہیں رکھتی۔؟"

"بہت سارے حقوق رکھتی ہو ڈیئر۔!" وہ بھی ہنسے۔ آنکھوں میں اک چمک سی لہرائی۔

زبان پر بے ساختہ ایمان کا ذکر آ گیا۔ "تم بھی اور ایمان بھی۔" بلا سوچے بول گئے تھے۔ پھر خود ہی لب بھینچ کر چپ بھی ہو گئے۔

اور اس لمحے ماھم نے دل ہی دل میں ایمان کی تائید کر ڈالی۔ وہ اگر عبد کیلئے دل میں کچھ رکھتی بھی تھی تو نامناسب نہ تھا۔ یہ شخص اسی قابل تھا کہ ایمان جیسی خوبصورت اور پیاری پیاری عادات والی لڑکی اس کے ساتھ محبت کرنے لگتی۔ اسے دل دے بیٹھتی۔ اس کی چاہ میں ڈوب جاتی۔

وہ بھی ویسا ہی تھا۔ اجلی صورت اور سچے کھرے دل والا۔ وجاہتوں والا۔ مسکراہٹوں والا۔

وہ ان کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ خود ہی گویا ہو گئے۔

"اور اجلال دوست ہے میرا۔ بڑا پیارا انسان ہے۔ اور۔ اور پتہ نہیں وہ تمہیں اپنے متعلق کچھ بتانا چاہے گا بھی یا نہیں۔ ایسا نہ ہو وہ کچھ مخفی رکھنا چاہتا ہو اور میں کچھ ظاہر کر دوں۔ بھئی یہ بڑا مشکل کام تم نے مجھے سونپ دیا۔"

"میرا کسی تفتیشی مہم کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ جو آپ اتنے محتاط انداز میں بات کر رہے ہیں۔" ماھم نے کھل کر اک ہلکا پھلکا قہقہہ لگایا۔

"اور نہ ہی میں اس کا کوئی راز جان کر بلیک میلنگ کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

ماھم کی بات پر عبد بھی ہنسنے لگے۔ چائے تیار ہو گئی تھی۔ ٹرے میں لگا کر ساتھ کیک اور بسکٹ وغیرہ رکھے۔

"یعنی کہ گھر گرہستی کا پورا سامان کر رکھا ہے۔" ماھم نے ستائشی نگاہوں سے ان کی کارکردگی دیکھی۔ سب کچھ کیسے سلیقے سے کر رہے تھے۔ اس کے لئے۔ وہ کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتی چلی گئی۔

"کاش ایمان! بچپن سے ہی تمہاری منگنی ہمایوں خاں سے نہ ہو گئی ہوتی۔ کاش! کاش۔ اصل میں تمہارے قابل یہی بندہ ہے۔ مخلص سا۔ پیارا سا۔"

پھر کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے عبد نے اجلال کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ پوری تفصیل سے۔ جو کچھ وہ جاننا چاہتی تھی۔

اجلال حیدر کا تعلق اسی شہر کے اک قریبی گاؤں سے تھا۔ گھرانہ بے شک زمینداروں کا تھا لیکن گردش، حالات کی وجہ سے مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تب تھوڑی سی زمین جو باقی رہ گئی تھی وہ مزارعوں کے سپرد کر کے اب اجلال خود نوکری کر رہا تھا۔

اک بہن شادی شدہ تھی۔ ایک چھوٹی دس گیارہ سال کی تھی۔ اجلال ماں کا اکلوتا بیٹا تھا اور باپ سر پر نہ تھا لہذا اماں بہن کی کفالت اس کے ذمہ تھی۔

"اور بس۔ اتنی سی کہانی ہے میرے یار کی، کوئی بری عادت نہیں ہے۔ اپنا گزارہ تنگی ترشی میں بھی کر لیتا ہے لیکن ماں اور بہنوں کو کبھی کوئی محرومی نہیں آنے دیتا۔ بہت نیک نفس ہے۔"

ماھم بڑے غور اور توجہ سے سب کچھ سن رہی تھی۔

"کچھ اور۔؟ لیکن کیوں جاننا چاہتی ہو اس کے متعلق۔؟"

اور عبد کے سوال پر ماھم یکدم گڑبڑا سی گئی۔ پھر جلدی سے خود کو سنبھالتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "اس لئے کہ میرے ڈیڈی کا بزنس انگلینڈ امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ انہیں اک قابل اعتماد شخص کی ضرورت ہے۔ وہاں امریکہ کی برانچ میں۔ اچھی خاصی تنخواہ ہو گی ڈالرز میں اور امریکی ڈالرز کو جب پاکستانی کرنسی میں تبدیل کیا



گا تو ماہوار لاکھوں بن جایا کریں گے۔ تو کیوں نہ وہ کوئی اپنا ہی بندہ ہو۔"

عبد اس کی بات سنتے ہوئے بڑے غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔

"تب میں نے ڈیڈی کے سامنے اجلال حیدر کا نام پیش کر دیا۔ ایک دن اجلال کہہ رہا تھا کہ تنخواہ میں تو بل بھی پورے نہیں ہوتے۔ تو یہ تو بڑی ہینڈسم آفر ہے۔ آپ عابی! اسے سمجھائیے گا۔ زندگی بن جائے گی اس کی۔"

"تو بی بی! تمہیں اس کی زندگی بنانے کی کیوں اتنی فکر ہے۔"

عبد نے اچانک ہی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے پوچھ لیا تو ماھم فوراً کوئی جواب نہ دے سکی۔ بلکہ قدرے سٹپٹا کر نظریں جھکا گئی۔

"وہ۔ وہ۔ دیکھئے نا سر! ہم دوست ہیں ایک دوسرے کے اور ہمیں ایک دوسرے کے لیے اچھی نیت رکھنی چاہیے۔ خلوص سے سوچنا چاہیے۔ محبت سے۔"

"ہاں ہاں محبت سے۔" عابی نے درمیان میں سے اس کی بات اچک لی۔ "محبت بہت ضروری ہے۔" پھر شرارت سے مسکرائے۔ "ہم بھی دوستی کا دعوے کرتے ہیں۔ کیا یہ آفر ہمارے لئے نہیں ہو سکتی تھی۔؟"

"کیوں نہیں۔ وہ۔ دراصل۔ وہ۔" ماھم شرمندہ سی ہو کر ہکلانے لگی۔ "وہیں آپ۔ آپ ہی۔"

"میں اسے سمجھاؤں گا۔" اس کی مشکل آسان کرنے کے لیے عبد سنجیدہ ہو گئے۔ "یہ بہت اچھی آفر ہے۔ سچ مچ اس کی زندگی بن جائے گی۔ پھر اس کا لونگ سٹینڈرڈ بھی اپ ہو جائے گا۔ تمہارے لیول کا۔"

"میرے لیول کا۔؟" عبد کی شوخ مسکراہٹ نے پھر اسے گڑبڑا سا دیا۔

"اجلال کی زندگی کی بات میں، میں بیچ میں کیسے آ گئی جی۔؟"

"تم تو بیچ میں ہمیشہ رہو گی انشاء اللہ۔" آنکھوں میں روشنیاں اتری ہوئی تھیں۔ لبوں پر شرارت تھی۔

"آپ پتہ نہیں کیا سمجھ رہے ہیں۔" نظریں جھکائے جھکائے بڑبڑائی۔

"میں وہی سمجھ رہا ہوں جو اصل بات ہے۔ ماھم بی بی! ڈیڑھ دو سو لڑکوں

لڑکیوں کو پڑھاتا ہوں۔ صرف زبانی زبانی لیکچر ہی نہیں دیتا' سب کی تربیت کرنا
شعار ہے۔ یوں ہر اک کی نہ صرف نفسیات کا بلکہ اندر باہر کا بھی مجھے علم ہوتا
پھر زندگی کے بہت سارے مسائل اور مراحل سے میں خود بھی گزرا ہوں۔ کیا چھپانا
رہی ہو مجھ سے۔؟''

''کچھ نہیں۔'' ماھم جلدی سے بول پڑی۔ ''کچھ چھپانا نہیں چاہ رہی۔
کرنا چاہ رہی ہوں۔ بحیثیت دوست کے۔ اصل بات یہ ہے عابی! میری ماما اور ڈ
ایک جگہ میرا رشتہ طے کر رہے ہیں۔''

''اور وہ تمہیں پسند نہیں ہے۔ کیونکہ تمہارے دل میں اک اور شخص بیٹھا
ہے۔ مگر وہ تمہارے فیملی سٹینڈرڈ سے کم ہے۔ بہت کم۔ اس لئے۔''

''ارے! آپ تو۔''

''ہاں۔ میں اگر پڑھاتا ہوں تو پڑھتا بھی رہتا ہوں لوگوں کو۔ تمہاری
مجھے بہت پسند آئی۔ اچھا کرو گی اگر اجلال کا اسٹینڈرڈ اپنے جیسا بنا لو گی۔ سکھی رہو
خود بھی اور اجلال کو بھی اور کیا چاہیے۔ اس کی بہت ساری پرابلمز حل ہو جائیں گی۔''

ماھم کو مشکل پڑی ہوئی تھی کہ عبد سے ساری بات کس طرح کرے۔ جھجک
رہی تھی۔ کرنا بھی چاہ رہی تھی۔ کہ اس کی کچھ مدد لے۔ پر اسے تو جیسے سب کچھ معلوم
تھا۔ بڑی عقل و فہم والا تھا۔ بڑے ہوش و حواس بیدار رکھنے والا بندہ تھا۔ اسے سن
کر حیران ہو رہی تھی۔

''وہ پاکستان سے باہر جانا پسند نہیں کرے گا۔ اپنی ماں اور دونوں بہنوں
وجہ سے۔ تم سے محبت رکھتے ہوئے بھی نہیں۔''

ماھم چونکی۔ تو انہیں یہ بھی واقفیت حاصل تھی۔ کتنے اعتماد اور یقین سے
اس کے ماضی' حال اور مستقبل کی بات کئے جا رہا تھا جیسے کوئی ماہر علم نجوم تھا یا
دست شناس۔

''وہ ذمہ داریاں نبھانے والا انسان ہے۔ لیکن میری بات وہ بہت مانتا ہے۔''

''تو پھر۔'' ماھم نے بڑی عقیدت سے عبد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے
تشکرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ''آپ اجلال سے بات کریں گے۔؟''



''بات کیا۔ حکم کروں گا۔ میں اس کا استاد نہیں ہوں بے شک مگر وہ اک
استاد ہی کی طرح میرا حکم مانتا ہے۔ لہٰذا تم یہ سمجھو۔ تمہاری ہر بات پکی۔''

ابھی عبد بہت سنجیدہ تھے۔ ایکدم پھر شوخی میں آ گئے۔

''ہر بات کونسی۔؟'' ماھم اچنبھے میں تھی۔

''یار سمجھ جاؤ نا۔ حد ہو گئی۔ اک دوست تو دوسرے دوست کی بات بولنے
سے پہلے سمجھ جایا کرتا ہے۔ میں تمہاری ماما کے پاس رشتہ طے کرنے بھی آؤں گا۔ اس
کے امریکہ جانے سے پہلے پہلے۔ ایسا نہ ہو وہاں جا کر کسی میم کے چکر میں پھنس
جائے۔ اسے زنجیروں میں جکڑ کر بھیجیں گے۔ پابند سلاسل کر کے۔''

ماھم عبد کے انداز پر ہنسنے لگی۔ عبد بھی ہنس رہے تھے۔

''کاش ایمان آفریدی! ہمایوں کی جگہ یہ عبدرحمان تمہارے پھوپھی زاد
ہوتے۔ تمہاری بچپن سے منگنی انہیں کے ساتھ طے ہوئی ہوتی۔ یہ ہمارا عابی تو بے حد
نفیس انسان ہے۔ عقل و فراست رکھنے والا۔ بیدار مغز۔ مخلص اور وفادار۔ علم دینے
والا استاد ہی نہیں ہے صرف یہ تو زندگی کے دوسرے مسائل بھی پورے خلوص' بردباری
اور دلجمعی سے حل کرتا ہے۔ دوسروں کے۔ غیروں کے۔ لیکن نہیں۔ اسٹوڈنٹس غیر کب
ہوتے ہیں۔''

''یہ تم ہنستے ہنستے کن سوچوں میں کھو گئیں ماھم! فکر نہ کرو بھئی۔ کہا نا اب یہ
اجلال والا مسئلہ سمجھو میرا ہے۔ میں خود حل کروں گا اسے۔ اجلال میرا بڑا اچھا' بڑا پیارا
دوست ہے۔ میں اس کا بھی خیر خواہ ہوں۔''

''اور میں۔؟''

''تم اس سے بھی بڑھ کر۔ تمہارا درجہ سب سے زیادہ ہے۔''

''کیوں۔؟'' وہ شرارت سے مسکرائی۔ ''میرا درجہ زیادہ کیوں۔؟''

''تم میرے اجلال کی بھی دوست ہو اور'' مزید کچھ کہے بنا چپ سے ہو گئے۔

''اور آپ کی ایمان کی بھی دوست ہوں۔ سچ ہے میرا رشتہ آپ کے ساتھ
سب سے زیادہ ہے۔'' ان کی بات ماھم نے مکمل کر ڈالی۔

ایمان کے نام پر عبد کا چہرہ دھندلا سا گیا تو ماھم نے جلدی سے بات بدل

ڈالی۔ ”ویسے آپ کا یہ اجلال چلا کہاں گیا ہے۔ آئی تھی تو مل لیتی اسے بھی۔“

بات بدلی تو دل کی بات ہی زبان پر آئی۔ تب عبد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر اٹھی۔

اسی لمحے اجلال حیدر اندر داخل ہوا۔ حسب معمول کچھ بولتا چلا آ رہا تھا۔ ماھم پر نگاہ پڑتے ہی چونکا۔

”ارے! گھر میں بہار آئی ہوئی ہے اور ہم کن ویرانوں میں بھٹک...... آہا۔“ پھر چائے کے برتن میز پر نظر آ گئے۔ ”کیک بسکٹ بھی اڑائے جا رہے ہیں۔ کچھ ہم فاقہ مستوں کیلئے بھی چھوڑ دو مہربانو...!“

ایک بسکٹ اٹھا کر پورے کا پورا منہ میں دھر لیا۔

”تم بیٹھو تمہارے لئے گرما گرم تازہ چائے لاتا ہوں۔“ عبد دانستہ کمرے سے نکل گئے۔

## 24

ہمایوں خاں اور جینی کا گھر بہت خوبصورت تھا۔ ان کے خوابوں سے بھی کہیں زیادہ۔

اور زندگی کی ہر آسائش اس گھر میں موجود تھی۔ ہنی مون منا کر جب جینی فر اور ہمایوں خاں اس گھر میں رہنے سہنے لگے تو دونوں ہی نے محسوس کیا کہ جیسے اصل زندگی یہی تھی۔

”یقیناً مجھے کوئی میری کی ہوئی نیکیوں کا پھل ملا ہے۔“ وہ بڑے فخر و غرور سے توفیق کو بتا رہا تھا۔

”جینی بھی مل گئی اور ایمان آفریدی بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری ہو گئی۔“

”ہاں۔ سب تمہاری ہی نیکیاں ہیں جو کام آئیں۔“ توفیق بڑے طنز سے مسکرایا۔ ”ہم یاروں کا تو بیچ میں کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔“



جبکہ سب کچھ توفیق ہی کی مدد اور ہمتوں سے ہوا تھا۔

یہ خوبصورت گھر جس میں وہ عیش کی زندگی گزار رہا تھا' بے شک انتخاب جینی کا تھا مگر رقم کا انتظام تو اس وقت توفیق نے ہی کر کے دیا تھا۔

پھر ماما کی بیماری کی وجہ سے ہمایوں اور ایمان کے نکاح کی بات چلی ہمایوں جب مشکل میں پھنس گیا تھا وہ بھی توفیق نے ہی سارا مسئلہ حل کیا تھا۔

جینی کے ساتھ شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ جب پاکستان سے ماما کی بیماری کی اطلاع ملی تھی۔ جینی سے سب کچھ مخفی رکھنا تھا۔ تب بڑی مصیبت میں ہمایوں خان پھنس گیا تھا۔

پھر توفیق ہی تھا جس نے اپنے فلیٹ میں سارا انتظام کر کے اسے اس اوکھے وقت میں سنبھالا دیا تھا۔ اپنے دفتر میں ہی اس کے تمام ای میل وغیرہ کا پاکستان کیلئے آنے جانے کا انتظام کر دیا تھا کہ کہیں جینی کی نظر سے کچھ گزر نہ جائے۔

جینی کے ساتھ شادی کورٹ میں ہوئی تھی اور دوسرے دن ایمان کے ساتھ نکاح توفیق کے فلیٹ میں بذریعہ فون ہوا تھا۔ یہ سارا انتظام توفیق نے ہی کیا تھا۔ ایسی دوڑ بھاگ۔ سچی تھی کہ توفیق ہی کی ہمت تھی جو نبھا گیا تھا۔

”سوری یار! میرا یہ مطلب نہ تھا۔“ ہمایوں خاں کو فوراً احساس ہوا تو نادم سا ہو گیا۔ یہ سارا اسی کی نیکیوں کا پھل نہیں تھا بلکہ اس سے محبت کرنے والوں کا بھی بڑا احسان تھا اس پر جو اسے اتارنا بھی تھا کبھی نہ کبھی۔

لیکن کچھ بھی تھا' وہ خوش بہت تھا۔

”سچ کہہ رہے ہو۔ سب کچھ تمہاری مدد سے ہوا۔ احسان مند رہوں گا تا زندگی تمہارا۔“ اسنے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

”اور اپنے والدین کا بھی۔“ پھر وہ خود ہی ایک قہقہہ لگا اٹھا۔ ”لیکن بھئی ان کا کیوں بھلا۔ وارث ہوں ان کا۔ یوں جو اتنی بڑی رقم انہوں نے مجھے بھیج دی' وہ میری ہی تو تھی۔ میں ان کا احسان مند کیوں ہوں۔ میں تو حقدار ہوں۔“

”بہت کمینے ہو۔ بہت ہی زیادہ۔“ توفیق بھی ہنسنے لگا۔ ”سب سے زیادہ ممّا اور خبیث اولاد وہ ہوتی ہے جو اکلوتی ہو اور والدین امیر ہوں۔ اور وہ تم ہو۔“

ہمایوں بڑی دیر اس کی بات پر ہنستا رہا۔ ''یعنی کہ میں برا اور خبیث ہوں تمہاری دانست میں۔ لیکن میرے خیال میں میں خوش نصیب ہوں۔''

''کوئی سا بھی نام دے لو۔ مگر رہو گے تم وہی۔''

''خبیث۔ خوش نصیب۔ انجام اچھا ہے تو سب اچھا ہے۔'' کتنی ہی دیر دونوں بیٹھے ان دنوں کو یاد کرتے رہے۔

ہمایوں خان نے ماما کا کہنا مان کر ایمان آفریدی سے فون پر ہی شادی کر لینے کا جو کارنامہ انجام دیا تھا وہ انہیں بے بہا خوشیاں عطا کر گیا تھا۔ تبھی اس کے بدلے میں انہوں نے اپنے بیٹے کو اس کی ڈیمانڈ سے بھی بڑی رقم بھیج دی تھی۔ انعام دیا تھا اسے ان کی خواہش اور ان کے ارمان پورے کرنے کا۔!

یوں اپارٹمنٹ والا توفیق کا قرض ادا کرنے کے بعد بھی اس کے پاس زندگی کی دوسری آسائشوں اور آسودگیوں کے حصول کے لئے بہت کچھ بچ گیا تھا۔

پھر ہمایوں خاں اور جینی نے مل کر بہت ساری شاپنگ کی تھی۔ گھر گرہستی کی چھوٹی چھوٹی دوسری چیزیں خریدنے کے علاوہ ہمایوں نے جینی کو اک چھوٹی خوبصورت سی، علیحدہ گاڑی بھی لے دی تھی۔

جینی اس سے بھی زیادہ خوش تھی، وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اس کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ اس کے لئے کھانا بناتی۔ اس کے کپڑے دھوتی۔ انہیں استری کرتی۔ اسے پہناتی۔ وہ ایک وجیہہ شکیل انسان تھا۔ جینی کی توجہات سے اس میں مزید نکھار آ گیا تھا۔ جینی کی محبتوں اور دلداریوں نے اسے دلبر بنا دیا تھا۔

ہمایوں خاں بہت مسرور، بہت مدہوش تھا۔ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ فضاؤں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ ہوش و حواس پر نشے سے چھا رہے تھے۔ اندازہ ہی نہیں تھا کہ زندگی اتنی خوبصورت اور پرلطف ہو جائے گی یکا یک اس کی سوچوں سے بھی اور اس کے حسین سپنوں سے بھی زیادہ۔ جینی سے شادی کرنے کا فیصلہ گرین کارڈ حصول کیلئے کیا گیا تھا۔ اور گرین کارڈ اسے زندگی کی انجوائے منٹس کیلئے تھا۔ لیکن چند دنوں میں ہی اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ گرین کارڈ اسے ملے



حیات کی تمام تر انجوائے منٹس اسے جینی کی سنگت سے ہی حاصل ہو گئی تھیں۔

وہ بہت نفیس عادات کی مالک تھی۔ وہ بہت خدمت گزار تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہی بہت خوش ہو جاتی تھی۔ اور جب خوش ہوتی تھی تو اس کے چہرے پر جو خوبصورت رنگ بکھرتے تھے، وہ اسے دنیا کی حسین ترین عورت کا روپ دے دیتے تھے۔

تب ہمایوں خاں جینی پر اٹھنے والی ہر نگاہ کے ساتھ اس پر مر مٹتا۔ بار بار۔ ہر بار۔ نجانے کہاں سے اتنا حسن چرا لائی تھی وہ۔ یا پھر یہ اس کی اپنی ہی نظروں کا اعجاز تھا۔ یوں دونوں ہی ایک دوسرے کا محبوب بن گئے تھے۔

ہمایوں خاں کے ملک کی بہاروں نے ان کے چھوٹے سے، پیارے سے گھر میں گویا ڈیرے ڈال لئے تھے۔ وہ اسے پاکستان کی بہت ساری باتیں سنایا کرتا تھا۔ اپنے والدین کی، اپنے ہاں کے موسموں کی۔ اپنے قبیلے برادری کی اور اپنے ہاں کے رسم و رواج کی۔

''جب ہمارا کوئی بچہ ہو جائے گا تو ہم اسے لے کر تمہارے خوبصورت موسموں والے ملک میں جائیں گے۔ تمہارے والدین کے پاس۔''

''کیا۔؟'' شادی کے اوائل دنوں میں ہی جینی کے منہ سے بچے کی خواہش کا سن کر ہمایوں بری طرح چونک اٹھا تھا۔ وہ تو صرف ایمان آفریدی کے بچوں کا باپ بننا چاہتا تھا۔ ''یہ تم کیسی بات کر رہی ہو۔؟'' اس نے گھبرا کر جینی کی طرف دیکھا۔ ''ابھی بچے کا نام بھی نہ لینا۔''

''کیوں۔؟'' اس نے اک محبوبانہ ادا کے ساتھ ہمایوں کے گلے میں اپنے گورے گورے بازو حمائل کر دیئے۔ ''مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''لیکن ہمارے ہاں یہ رسم ہے کہ پہلا بچہ شادی سے پورے پانچ سال بعد پیدا کیا جاتا ہے۔''

# 25

ایمان چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ماھم تیز تیز بولے جا رہی تھی۔ چہرہ کسی اندرونی کشمکش کا غماز تھا۔

"وہ تو سر! میں نے شکر کیا کہ بروقت پہنچ گئی۔ اچانک ہی میرے دل کو کچھ ہوا تھا۔" بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی سی بھی تھی۔ "آخر ابھی تک ایمان آئی کیوں نہیں۔ اتنے دن ہو گئے۔ کہیں بیمار سیمار نہ ہو۔؟ مجھے بھی پریشانی لگی تھی۔ ہوسٹل سے اس کے گھر کا کوئی فون نمبر وغیرہ معلوم کر کے میں اس کے متعلق پوچھوں تو۔"

کچھ ایسا ہی حال، ایسی ہی کیفیت عبدرحمان کی بھی تھی۔ انہیں بھی اس کی بہت پریشانی تھی۔ اک اک لمحہ انتہائی کرب میں گزر رہا تھا۔ مگر وہ ماھم کی طرح ہوسٹل میں جا کر اس کے متعلق معلوم کرنے کے مجاز نہ تھے۔

"اور جناب! وہاں میں نے کیا دیکھا۔ یہ مس صاحبہ اپنا سامان باندھ رہی تھیں۔"

"کیوں۔؟" عبد بے اختیار چونکے۔ "سامان کیوں باندھ رہی تھی۔؟"

"محترمہ مزید تعلیم جاری نہیں رکھیں گی۔ اس لئے واپس گھر جانے......"

"کیا۔؟" انہوں نے اک اچنبھے اور انتہائی رنج سے ایمان کو بغور دیکھا۔

"ہاں۔ ذرا پوچھیں نا اس سے۔ کیوں اس نے ایسا فیصلہ کیا ہے۔؟" ماھم کی آواز بھرا رہی تھی۔ "میں تو پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہوں۔ کچھ بتا ہی نہیں رہی۔ اسی لئے میں اس کو یہاں لے آئی ہوں۔ بڑی مشکل سے۔ نہیں آ رہی تھی۔"

"کیوں ایمان! یہ ماھم کیا کہہ رہی ہے۔؟" انہوں نے بڑے پیار سے بڑی دلداری کے انداز میں اسے دیکھا۔ اتنے دنوں بعد نظر آئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا دیکھتے چلے جائیں۔ آنکھوں میں بٹھا لیں۔ دل میں بسا لیں۔

ایمان نے ان کے مخاطب کرنے پر سر اٹھایا۔ لمحہ بھر کیلئے عبد کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر کوئی بھی جواب دیئے بنا نظریں جھکا گئی۔ اور نجانے اس اک نظر میں



تھا۔ عبد کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو اٹھی۔

"اتنی ذہین اور لائق اسٹوڈنٹ ہو۔ کوئی ذہنی پرابلم بھی نہیں۔ پھر؟"

سوال تو انہوں نے قابلیت کا اٹھایا تھا لیکن ذہنی حالت سے زیادہ انہیں اس کی جسمانی حالت دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ خاصی نحیف و نزار سی لگ رہی تھی۔ چہرہ بھی کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔

"عابی! آپ نے اس کی حالت دیکھی ہے۔؟" ماھم اس کیلئے بڑی بے چین تھی۔ "جیسے یہ خود نہیں ہے اس کا مردہ قبر سے اٹھ کر آ گیا ہے۔ یہ چہرہ دیکھئے اس کا۔"

اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اونچا کیا۔ "یہ دیکھیں ذرا۔ کیا یہ وہی ایمان ہے۔؟" اور عابی بڑے دکھ سے اسے مسلسل تکے جا رہے تھے۔

"کیا ہم دونوں سے بھی چھپاؤ گی۔؟ چھپا سکتی ہو۔؟ ہم تمہارے دوست ہیں۔ خدا کے لئے کچھ بولو۔ کوئی بری سے بری خبر بے شک۔"

"خدا نہ کرے۔" عبد اس کے درد میں یکلخت کہہ اٹھے تو اتنی پریشانی کے باوجود ماھم مسکرا پڑی۔

"دیکھو تو ہم تم سے کتنی محبت کرتے ہیں" ماھم مسکراہٹ دباتے ہوئے آنکھوں کے گوشوں سے عبد کو تکنے لگی۔ "کچھ ہمارا ہی خیال کرو۔ ہم تمہارے بھی خواہ ہیں۔"

"بعض اوقات زندگی میں بڑے بڑے صدمے سہنا پڑ جاتے ہیں۔ لیکن یہ تعلیم چھوڑ بیٹھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔" وہ دونوں باری باری اسے سمجھا رہے تھے۔

"اک انسان کے لئے سب سے اچھا وہ وقت ہوتا ہے جب وہ کسی کو علم سکھاتا ہے یا پھر خود سیکھتا ہے۔ وقت کا بہترین مصرف چھوڑ کر تم کیا کرنا چاہتی ہو۔ کم از کم میں تمہیں کوئی ایسا غلط فیصلہ نہیں کرنے دوں گا۔" عبد نے اپنا حق جتاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "چلو شاباش! اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ اور ہوسٹل جاتے ہی بندھا ہوا سامان کھول دینا۔" ایمان کا شانہ تھپک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "آئس کریم کھاؤ گی ماھم" مخاطب ماھم کو کیا تھا لیکن دیکھ ایمان کو رہے تھے۔

وہ خوشی سے چلا پڑی۔ ''ارے واہ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ کیا گھر میں موجود ہے۔؟'' عبد نے چٹکی بجائی۔ ''ابھی حاضر کرتا ہوں۔''

''ہاں۔ ہوسکتا ہے آئس کریم کھانے سے اس کا دماغ کچھ ٹھنڈا ہو جائے۔ اور دماغ ٹھنڈا ہونے پر کچھ اگل دے۔''

''آئس کریم رہنے دیں عابی! میں اس کے بغیر ہی سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔'' ایمان نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں عبد کے مشفق چہرے پر گاڑ دیں۔

''اپنے ہمدرد کو ہی نہیں بتاؤں گی تو پھر اور کس سے دل کا حال کہوں گی۔''

ایمان کا چہرہ غم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ خوبصورتی گہنا گئی تھی مگر پھر بھی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ نظر ہٹانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ماہم اور عبدرحمان دونوں ہی کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔

عابی سے بات کرتے کرتے آواز بھرائی پھر ساتھ ہی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اب وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ آئس کریم لانا بھول بھال پوری جان سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دل ٹکڑوں میں بٹ رہا تھا۔ جس تکلیف میں وہ مبتلا تھی وہ ان کے اندر اتر کر انہیں آزار اور پریشانی میں جکڑے جا رہی تھی۔ ان کے اعصاب تن رہے تھے اور دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوئی جا رہی تھیں۔

''میرا نکاح ہمایوں خاں سے کر دیا گیا ہے۔'' ہچکیوں اور سسکیوں کے دوران بے شمار آنسو بہاتے ہوئے ایمان نے اپنی زندگی کی بدترین خبر سنائی۔

عبد چونکے۔ دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ وجود ساکت سا ہو گیا۔ سانس لینا بھول گئے۔

''تو اس میں اس طرح رونے کی کیا بات ہے۔ مبارک ہو۔'' ماہم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی تو ایمان کے آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی۔

''میں نہیں چاہتی تھی۔ منع کرتی رہی مگر میری کسی نے سنی ہی نہیں۔ اماں! ارسل، سب کی منتیں کیں، التجائیں کیں کہ اس تقریب کو ملتوی کر دیں۔'' سسکیوں سے سارا وجود کچھ اس طرح لرز رہا تھا کہ بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ ''اماں نے عورت



کی حیثیت اور معاشرے میں اس کا مقام مجھے بتا کر، خاموش رہنے کی تلقین کر دی۔ بابا نے اعتماد کی ڈور سے بنا ہوا اک مضبوط جال مجھ پر پھینک دیا، میں اس میں جکڑی گئی۔ بھائی مذاق میں ٹال گیا۔ کسی نے میرے دل کا درد جانا ہی نہیں۔ میرا دکھ سننے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

''ہمایوں ہینڈسم ہے۔ ذہین و فطین ہے۔ لائق فائق ہے۔ امیر کبیر ہے۔ پھر تم نے بھلا منع کیوں کیا۔ اور کونسا دکھ تھا تمہیں۔؟'' ماہم نے اس کے آنسوؤں کا مذاق اڑاتے ہوئے حیرت و استعجاب بھری نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔ جیسے کوئی عجوبہ دیکھنے کو مل گیا تھا۔

اس کے الفاظ اور انداز نے ایمان کے اندر طوفان سے بپا کر دیئے۔ وہ تڑپ اٹھی۔ ہستی پہلے ہی متزلزل تھی۔ وجود بھی کانپنے لگا۔

''کاش! تمہارے ساتھ ایسا ہوتا۔ تب میں تم سے پوچھتی۔ دل میں کسی اور کی چاہ ہو تو کسی دوسرے کا بنا دیا جانا، کتنا کربناک اور اذیت ناک ہوتا ہے۔''

ایمان نے اپنی کیفیت بیان کی تو ماہم چونکی۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ یہ تو اسے بھی معلوم تھا۔ اس تکلیف سے تو خود وہ بھی گزری تھی۔ جب ماما اور ڈیڈ نے اس کا رشتہ طے کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بہت پریشان ہوئی تھی وہ۔ دو تین راتیں سو نہیں سکی تھی۔ روتی رہی تھی۔ یہ ایمان جیسی حالت تھی اس کی۔

ماہم کو اجلال حیدر اچھا لگتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے پسند کرنے لگ پڑی تھی۔ پھر اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے کئی سہانے سہانے خواب اس نے اپنی آنکھوں میں سجا لیئے تھے۔ وہ ہر وقت اس کے متعلق سوچا کرتی تھی۔ ان سپنوں کی تعبیر پانے کیلئے وہ کوشاں رہنے لگی تھی۔ تبھی، انہیں دنوں، ماما نے اسے بتایا۔ ''تمہارے ڈیڈ نے ثاقب حسن کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے بھی ثاقب بہت پسند ہے۔'' ماما بہت مطمئن تھیں۔

ماہم یہ سنتے ہی ایک دم بے سکون ہو گئی۔ دو تین دن بڑی پریشانی میں رہے۔ مگر چونکہ وہ اک ماڈرن گھرانے میں پرورش پانے والی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ وہ اک عورت کے حقوق اچھی طرح جانتی تھی۔ ان کے ہاں ہر کس کو شخصی آزادی حاصل

تھی۔ اس کی بہن نے بھی اپنی پسند کی شادی کی تھی۔

تب۔ چند دن پریشان رہنے کے بعد اس نے ماما کو صاف صاف کہہ [cut off]
وہ شادی کرے گی تو صرف اجلال کے ساتھ ورنہ کسی سے بھی نہیں۔

''تو پھر تم نے آج تک بتایا کیوں نہیں تھا۔؟''

''اس کی فیملی کا اسٹینڈرڈ ہم سے بہت پست ہے۔ اس لئے نہیں بتایا''

''تو کیا اب بلند ہو گیا ہے۔؟''

''آپ چاہیں تو ہوسکتا ہے۔'' اسے ان پریشانی کے دنوں میں ہی یہ
سوجھا تھا۔ تبھی تو والدین کے سامنے کھڑا ہونے کی دلیری پیدا ہوئی تھی۔

''ڈیڈ کو اک دیانتدار شخص کی تلاش ہے۔ کیلیفورنیا کی برانچ کا مینجر
کیلئے۔ وہ اجلال حیدر کو یہ جاب دے دیں۔ اور ساتھ ہی بیٹی بھی۔ مجھے یقین
ان کی توقعات پر پورا اترے گا۔ اور آپ کی بیٹی بھی خوش و خرم رہے گی۔''

بڑی جرأت اور ہمت سے اس نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

''ڈیڈ کی دی ہوئی جاب سے اس کا اسٹینڈرڈ اتنا بلند ہو جائے گا
آپ لوگوں کو اس کے ساتھ رشتہ داری بنانے پر کوئی شرمساری بھی محسوس نہ ہوگی

ماھم کی پرورش اتنے آزادانہ ماحول میں ہوئی تھی کہ وہ باپ کے رو [cut off]
انتہائی جرأت مندانہ سب کچھ کہہ گئی۔ ذرا جھجکی شرمائی نہیں۔

لیکن ایمان آفریدی کے حالات مختلف تھے۔ فیملی بیک گراؤنڈ ماھم
نہیں تھا کہ وہ ایسی کوئی جرأت کر سکتی۔ یوں بھی وہ فطری طور پر خاصی بزدل او [cut off]
سی لڑکی تھی۔

دوسرے ان کی برادری قبیلے کے رسم و رواج بھی مختلف تھے۔ زمانہ
سے کہاں جا پہنچا تھا مگر ان کے ہاں عورت کی حیثیت اور مقام صدیوں پرانا
اسے انسان سمجھا جاتا تھا نہ کسی فیصلے کا حق دیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی کے
معاملے میں بھی اسے بولنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

ماھم سب کچھ جانتی تھی۔ پر اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ وہ سوچ ر [cut off]
ایمان کے دل میں ویسے ہی جذبات موجزن تھے جیسے خود ماھم کے دل میں



دو چار دن ہی کتنی تکلیف میں اس کے گزرے تھے۔ ویسی ہی تکلیف میں اس وقت
ایمان بھی ہو گی۔ اسے پورا پورا احساس تھا۔

ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کیا اور اسے بغور تکنے لگی۔ کس قدر رقت اس
پر طاری تھی۔ گلابی رخسار کیسے بھیگ رہے تھے۔ خوبصورت ہونٹ کیسے لرز رہے تھے۔
اتنی ڈھیر ساری خوبصورتیوں کی مالک ایمان آفریدی کے ساتھ کیسے بدبختی آن لپٹی
تھی۔ ماھم کو اس پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا۔

''سبھی کہتے ہیں ہمایوں خاں بہت ہینڈسم ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔
کروڑوں کا مالک ہے۔ مگر میں کیا کروں ان ساری دولتوں کو۔ اصل بات تو دل کی
ہوتی ہے۔ میرا دل کسی صورت نہیں مانتا۔ کیوں عابی۔!''

روتے روتے' بولتے بولتے' یکلخت ایمان نے عبد کی طرف رخ موڑا۔

''کیا یہ نکاح جائز ہے؟ یہ زبردستی کا نکاح۔ میری اماں نانو نے پاس بیٹھ کر
مجھ سے دستخط کرا لئے۔ اپنی عزتوں کے واسطے دے کر۔ میں روتی تڑپتی رہی مگر میری
تڑپ اور بے چینی کو کسی نے نہ دیکھا۔ کسی نے لمحہ بھر کیلئے بھی احساس نہ کیا۔''

اس کے انداز سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ اس پر کیا کچھ گزر گئی ہو گی۔ اور
اس کی کیا کیفیت رہی ہو گی۔ ظالمو! تم عورت کو انسان کیوں نہیں سمجھتے۔ اس کے
جذبات و احساسات کے ساتھ کیسے اتنی بیدردی سے کھیل جاتے ہو کہ کوئی رشتہ ناتہ یاد
نہیں رہتا۔ خون تک کا بھی نہیں۔ سب محبتیں' بہن کی' بیٹی کی' پامال کر جاتے ہو۔

ماھم اپنے آنسو پی پی کر اس کے آنسو صاف کر رہی تھی۔ اور اس کے رخسار
بار بار بھیگے جا رہے تھے۔

عبدالرحمان ایک ٹک اسے تکے جا رہے تھے۔ ایمان نے جو سوال کیا تھا' اس
کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ کہ وہ خود بھی تو اسی جیسے حالات سے گزر چکے تھے۔
یہی سوال آج تک ان کے دماغ میں بھی گردش کر رہا تھا۔

وہی سوال وہ بھی تو پچھلے چھ سات سال سے پوچھنا چاہ رہے تھے مگر انہیں
ایسا کوئی نہ ملا تھا جو اس سوال کا درست جواب انہیں دے پاتا۔ تو اب وہ ایمان کو کیا
بتاتے۔؟

"مجھ سے مت پوچھو کچھ بھی۔ مجھ سے مت پوچھو۔ رسم و رواج کے
کالے ناگ نے کچھ عرصہ پہلے مجھے بھی ڈس لیا تھا۔ زہر پھیل گیا میرے سارے وجو
میں۔ کس درد اور کرب میں مبتلا ہوں اب تک۔ کچھ مت پوچھو۔"

"آپ کچھ بولے نہیں عابی! میرے سوال کا آپ نے جواب نہیں دیا۔
آپ اسٹوڈنٹس کو پڑھانے کے علاوہ ان کے دوسرے مسائل بھی حل کرنے کا
دعویٰ رکھتے ہیں۔"

عبد کچھ افسردہ، کچھ دکھی سے، کچھ ہکا بکا کبھی ماھم کو اور کبھی ایمان کو تک
رہے تھے۔ دل پر جو کچھ گزر رہی تھی اس کا عالم ہی جدا تھا۔ آنکھوں کی روشنیاں بجھ
چکی تھیں۔ لبوں پر کپکپاہٹ سی تھی۔

ایسی جذباتی کیفیات تو اس وقت بھی ان پر طاری نہیں ہوئی تھیں جو اس وقت
ایمان کی حالت دیکھ دیکھ کر ہوئی جا رہی تھیں۔ کچھ بولنے کہنے کے قابل ہی نہ تھے۔

"کہتے ہیں مرد عورت کا سائبان ہوتا ہے۔ اور اس سائبان بغیر عورت
زندگی دھوپ بارش میں بغیر چھت کے جیسی ہوتی ہے مگر میں تو اب بھی، باپ بھائی
ہوتے ہوئے بھی کھلے آسمان تلے بے سائباں کھڑی ہوں۔"

دکھ اور کرب کی انتہاؤں نے اسے جیسے جنونی سا بنا دیا تھا۔ ہذیاں کی طر
مسلسل بکے جا رہی تھی۔

"میرے دل کی، میرے جذبات کی، کسی نے بھی پرواہ نہ کی۔ خاندان،
قبیلے کے رسم و رواج ہی کو سب نے اہمیت دی۔ اور میری پوری زندگی کا یک طر
فیصلہ کر دیا۔ میرا کوئی سہارا نہ بنا۔ کوئی وکیل نہ بنا۔ کسی نے میرے لئے اک لمح
بھی نہ سوچا۔ پھر یہ سب تعلق واسطے، خون کے، رشتہ داری کے، کیا ہوئے۔ اک عور
کس کے آگے دامن پھیلائے۔ کس سے اپنے جذبوں کی بھیک مانگے۔ اس کی مد
کون پہنچے گا۔ کونسا سائبان ہوتا ہے ہم لڑکیوں کا۔ زندگی کی دھوپ بارشوں میں تنہ
بے یار و مددگار کھڑی ہیں ہم تو۔"

رو رو کر، بول بول کر اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ سوچوں خیالوں کا نہ نا
کے ساتھ، نہ جملوں و الفاظ کے ساتھ ربط رہا تھا۔ ٹوٹے جا رہے تھے سب دل کی طر



حواس کی طرح۔

اور عبد کے پاس اس کے کسی بھی سوال کا کسی بھی پوچھنے والی بات کا کوئی
جواب نہ تھا۔ اس کے دکھ اور غم کا پورا پورا احساس بھی تھا لیکن پھر بھی، کوئی تسلی کا اک
لفظ بھی ان کے پاس نہ تھا۔ ایسے تہی داماں کبھی نہ ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ دل بھی
خالی ہوا جا رہا تھا۔ اس میں اتنا کچھ ایمان کے لیے رکھنے کے باوجود، محسوس ہو رہا
تھا۔ وہ حالت فقر میں تھے۔ وہ مفلس تھے۔ وہ بے مایہ تھے۔

پھر زندہ کیوں تھے۔ یہ دل کیوں دھڑک رہا تھا۔ یہ سانس کیوں آ جا رہا
تھا۔ یہ آنکھیں اپنی بینائی کیوں نہ کھو بیٹھی تھیں۔ کان سماعتوں سے کیوں نہ محروم ہو
گئے تھے کہ ایمان کو اس حالت میں دیکھ نہ سکتے، اس کا دکھ سن نہ سکتے۔

"میں ساری زندگی کیسے گزاروں گی اس شخص کے ساتھ، جس سے مجھے کوئی
دلی لگاؤ نہیں کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ اور پھر اس حالت میں، جبکہ میرے دل میں کوئی اور
ہوگا، میرے خیالوں میں کوئی دوسرا ہوگا۔ اس کے علاوہ۔ پھر میں کیسے اس کا گھر بار
سنبھال پاؤں گی۔"

ایمان کو تو اس وقت یہ بھی احساس نہ ہو سکا کہ دل کا جو راز کسی دوسرے
کے سامنے کھولنے والا نہ تھا، فریاد کی صورت میں وہ اس کے خوبصورت لبوں پر تھرک رہا
تھا۔

ماھم نے عبد کی طرف اور عبد نے ماھم کی جانب چونک کر دیکھا۔ وہ
کہیں پاگل تو نہیں ہوگئی تھی۔؟

"اس سے بڑا کسی کے ساتھ کوئی ظلم ہو سکتا ہے۔؟ اس سے تو اچھی وہی رسم
تھی۔ کہ بیٹی کو پیدا ہوتے ہی زمین میں، مٹی تلے دفن کر دیا جاتا تھا۔ وہی اپنائے
رکھتے۔ روز روز کے مرنے سے تو بچ جاتی یہ زندگی۔ اور میں بدبخت، کیسے جیونگی یہ
پوری زندگی۔ جی سکوں گی۔؟ اس مردہ حالت میں۔؟"

پاس ہی دوسری کرسی پر عبد بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ عالم دیوانگی میں ان
کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ آٹھ دن دس دن ہی مجھ پر قیامت بن کر گزرے ہیں۔ اک ناقابل

بیان اذیت میں مبتلا ہوں۔ کتنی گھڑیاں' کتنی ساعتیں مزید برداشت کر پاؤں گی۔
ہوش و حواس سے بیگانہ اس کی حالت دیکھ کر ماھم کی آنکھیں بھی
لٹانے لگی تھیں۔

''بتایئے نا عابی! آج مجھے مسئلہ درپیش ہے۔ میری زندگی طوفان
گھری ہے۔ میں ڈوب رہی ہوں۔ گرداب میں پھنسی ہوں۔ اور آپ چپ
ساحل پہ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ میرا تماشہ۔ اپنی ایمان آفریدی کا تماشہ۔''
اس نے عبدرحمان کا تھاما ہوا ہاتھ ہولے سے جھٹکا۔

''آپ عابی! چپ کیوں ہیں۔ جبکہ میں نے آپ کی آنکھوں میں ا
لئے شاگرد کے رشتہ اور تعلق کے علاوہ بھی' دوستی کی انس سے بلند بھی کچھ اور بہت
دیکھا ہے محسوس کیا ہے۔''

عجیب سا لہجہ تھا۔ عبد نے چونک کر گڑبڑا کر' اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں
گرفت سے نکال کر سٹپٹاتے ہوئے ماھم کو دیکھا۔ حیران تو ماھم بھی ہوئی تھی' ایما
کے ان جملوں پر۔ یوں کھلم کھلا سب میں بیٹھ کر اعلان کرنے والی بات نہ تھی۔ اور
ایمان کبھی اتنی بے باک رہی تھی۔ وہ تو شرم و حیا کی پتلی تھی۔ ذرا سی' چھوٹی
سہیلیوں میں ہی کوئی بے حجابی کی بات ہو جاتی تو لجا شرما کر چھوئی موئی بن جایا کر
تھی۔ رخسار دہک کر شعلے اگلنے لگتے تھے۔

اور اب' اس وقت کتنے کرب' کیسی اذیت سے گزر رہی ہو گی جو اسے یہ
ہوش نہ رہا تھا کہ وہ کیا بول رہیت ھی اور اسے کیا نہیں بولنا چاہیے تھا۔ ماھم کی تمام
ہمدردیاں ایمان کے ساتھ تھیں۔

اور اس وقت' عین اس لمحے عبد کے ساتھ بھی' جو گھبراہٹوں میں مبتلا ہو
تھے۔ کچھ لاجواب بھی' کچھ پریشان بھی۔ ماھم انہیں مزید بوکھلاہٹوں میں گھرا
دیکھ سکتی تھی کہ اس تمام واقعہ میں ان کا قصور کوئی نہ تھا۔ تب ماھم ان سے نظر چرا کر
وہ اس سے بھی تو شرمندہ ہو رہے تھے۔ سامنے دیوار پر آویزاں اک پینٹنگ کی طرف
تکنے لگی۔ ظاہر یہی کر رہی تھی کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔

مگر ایمان اپنے لٹ مٹ جانے والے جذبات کے ماتم میں مصروف تھی



ہوش و حواس پر پوری طرح دیوانگی غالب آ چکی تھی۔ وحشتوں نے دماغ کو کھوکھلا کر دیا
تھا۔ عقل و فہم مفقود تھی۔ اک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی۔ روتے ہوئے بڑھ کر
سکتے میں آئے عبد کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ پھر ان کے گھٹنے تھام لئے۔

''کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے۔؟'' وہ یقین اور بے یقینی کے عالم میں
گھری ان سے پوچھ رہی تھی۔

کاش عبد اس وقت اپنی ساعتیں کھو چکے ہوتے' اپنی بصارتوں سے محروم ہو
چکے ہوتے۔ مگر ان کا تو رواں رواں ایمان کی فریاد کرتی' دہائی دیتی آواز کی طرف نہ
صرف متوجہ تھا بلکہ دوسری بھی تمام حسیات لبیک لبیک پکار رہی تھیں۔ پر ہائے! یہ
معاملہ تو خود ان کے اختیار سے بھی باہر تھا۔ اس نے مدد کے لئے انہیں پکارا تھا اور وہ
اک نمایاں سی بے بسی اور بیچارگی سے اس کے حسین ترین چہرے کو تک رہے تھے۔

''آپ نے بتایا نہیں عابی! کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے۔؟'' اس نے عبد
کے دونوں گھٹنے جھنجھوڑ ڈالے۔ ساتھ اپنی پھیلی پھیلی خوبصورت آنکھوں میں جنونی سا
انداز لئے ان کی آنکھوں میں گھورنے لگی۔

دوسری بار اس نے اپنا سوال دھرایا تھا۔ وہ تو پہلی بار سے بھی پہلے اس کے
اس سوال کا جواب دینے کو تیار تھے۔ ان کے وجود کا ہر عضو' رگوں میں دوڑتے خون کا
اک اک قطرہ' دل کی اک اک دھڑکن' جسم کا اک اک رواں۔ سب زبان بن کر
بول رہے تھے۔ ''ہاں ہے۔ ہاں ہے۔ ہاں ہے۔''

لیکن اس جواب کے ساتھ جو کچھ وہ اسے بتانا چاہ رہے تھے' اس کیلئے زبان
میں قوت گویائی نہ تھی۔

انہیں اس سے محبت ضرور تھی مگر وہ اس کی رفاقتوں کے ساتھی نہیں بن سکتے
تھے۔ وہ اس کی منزل نہیں تھے۔

وہ ہر وقت اس کو سوچتے تھے۔ اپنے گھر میں چلتے پھرتے ہوئے۔ اپنے
کچن میں کام کرتے ہوئے۔ اپنی بائیک کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے۔ اپنے ساتھ
یونیورسٹی میں آتے جاتے ہوئے۔ رائٹنگ ٹیبل پر اپنے سامنے کتابیں کھولے بیٹھ کر
پڑھتے پڑھاتے ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ ڈسکس کرتے ہوئے۔ گھر کی

چھوٹی موٹی چیزوں کے لیے اور ایک دوسرے کے لئے شاپنگ کرتے ہوئے۔ دل
تھی ان کی سوچ' ان کے خیال کی محور۔ لمحے لمحے کی ساتھی۔

مگر۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے کے رفیق نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ تو اک گم کردہ راہ مسافر تھے۔ اور اب وہ زندگی میں کبھی بھی اپنی م
نہیں پا سکتے تھے۔ ان کے بخت کی سیاہی نے سب نشانات مٹا ڈالے تھے۔

پاس ماھم حیرتوں میں گم دانتوں میں لب دبائے ساکت بیٹھی تھی۔ ا
جواب سننے کی منتظر۔ نجانے وہ کیا کہنے والے تھے۔ بہت کچھ جانتی بھی تھی مگر پھ
بے خبر تھی۔

''آپ کچھ بولے نہیں۔'' اور اب ایمان پوری آواز سے چیخ پڑی۔ ''م
بات کا جواب نہیں دے رہے۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے۔؟''

''ہاں ہے۔'' اس کی بار بار تکرار پہ عبد بڑی مدھم سی آواز میں' سرگوشی
سے انداز میں کچھ جھجکتے ہوئے' کچھ ہچکچاتے ہوئے آنکھوں کے گوشوں سے ا
تکتے تکتے بولے تھے۔

''کتنی۔؟''

''بہت۔ بہت۔'' اب انہوں نے کھل کر پوری آواز میں کہا۔

ماھم اٹھ کر پرے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ نہ بھی کچھ فاصلہ دے جا
انہوں نے پھر بھی اب خاموش نہیں رہنا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات کو پڑھ
تھی۔ ان کی خاموشی کی اب انتہا ہو چکی تھی۔

''جس کی نہ کوئی حد ہے' نہ حساب۔ نہ تولنے ناپنے کا آلہ ہے میر
پاس۔ نہ بتانے کیلئے الفاظ۔'' اعتراف کیا تو بولتے ہی چلے گئے۔ ''دنیا میں مو
رشتے سے زیادہ' ہر تعلق سے بڑھ کر۔ بس اک تمہیں تم ہو میرے خوابوں میں' م
خیالوں میں' میری سانسوں میں' میری دھڑکنوں میں لیکن۔''

''بس۔ آگے کچھ نہیں کہیے گا۔ مجھے پورا اطمینان حاصل ہو گیا ہے
مزید نجانے کیا بولنے والے تھے۔ ایمان نے انہیں ٹوک دیا۔

''میں اب بڑی آسانی سے مر سکتی ہوں۔ مر جاؤں گی خوشی خوشی۔ لیکن



شخص کا گھر نہیں بساؤں گی' جس کے پلے مجھے زبردستی باندھ دیا ہے۔ یہ بندھن جائز
نہیں ہے۔ دل میں آپ کو رکھوں اور چہرہ رات دن کسی دوسرے کا دیکھوں۔''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے اک سکون کے ساتھ عبد کے گھٹنوں پر اپنی پیشانی
ٹکا دی۔ ''یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے یہ تعلق منظور نہیں۔ لہذا میں نے سوچ لیا ہے مجھے جو
کچھ کرنا ہے۔ میں دوسری لڑکیوں کی طرح ایسی دوغلی زندگی کبھی نہیں گزار سکوں گی۔
کبھی نہیں۔ اک پل کے لئے نہیں۔''

''کیا سوچ رکھا ہے تم نے۔؟'' ماھم کھڑکی سے ہٹ کر اس کے پاس آ
گئی۔ ''خبردار! کوئی غلط سلط سوچ نہیں سوچنی۔''

اس نے ایمان کو بازوؤں میں بھر کر وہاں سے اٹھایا اور صوفے پر بٹھا دیا۔
پھر اپنے بے حد قیمتی دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھے۔ اس کی آنکھیں اور رخسار
صاف کیئے کہ ایمان اس کی نگاہ میں بہت بہت قیمتی تھی۔ پھر بڑے پیار سے اس کے
دونوں گال چومے۔

''اگر تم ہمایوں خاں کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔ نہ
گزارنا۔ ہم تمہاری خوشی چاہتے ہیں۔'' ماھم اسے تسلیاں دینے لگی۔

''ہم ہر طرح تمہاری مدد کریں گے۔ میں نے اور اجلال نے امریکہ جانے
کا پروگرام بنایا ہے۔ تم ہمیں ہمایوں کا ایڈریس دینا۔ ہم وہاں اس سے مل کر تمہاری
آزادی کا پروانہ حاصل کر لیں گے۔ بس تم پریشان مت ہو۔ ہم تمہیں دکھ میں مبتلا
نہیں دیکھ سکتے۔ ہم تم سے بہت' بہت محبت کرتے ہیں۔ عابی۔!''

پھر وہ عبد کی طرف گھومی۔ ''آپ نے ابھی ابھی یہ اعتراف کیا ہے نا کہ
آپ کو ایمان سے محبت ہے۔ تو عابی! اب آپ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں
کہ آپ ایمان کے آزاد ہونے تک اپنی شادی نہیں کریں گے۔ گھر والوں کے دباؤ
میں آ کر بھی نہیں۔ آپ ایمان کا انتظار کریں گے۔''

ماھم اور بھی بہت کچھ کہتی رہی۔ کچھ عبد کیلئے نصیحتیں' کچھ ایمان کیلئے تسلیاں
دلاسے۔ کچھ مستقبل کے سہانے خوابوں کی تعبیر پیش کی۔ کچھ اپنی مخلصانہ کوششوں کا
یقین دلایا۔

عبد چپ چاپ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے سنتے رہے۔ سنتے رہے۔ نگاہوں میں فرحت کا سراپا تھا۔ اک لفظ نہ بول سکے۔

"میں تمہاری محبت ضرور ہوں لیکن منزل نہیں ہوں ایمان!" لاکھ چاہنے کے باوجود وہ حقیقت پر سے پردہ نہ اٹھا سکے۔ "تم مجھ پر اعتبار نہ کرنا۔"

اتنا دکھی' اتنا پریشان اور رنجیدہ رہنے کے بعد اب کہیں ماھم ہی کی تسلیوں تشفیوں سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک لہرائی تھی۔ اس کے معطل ہوش وحواس بیدار ہوئے تھے۔

ابھی وہ کیسے اسے پھر اسی دکھ کے گہرے سمندر میں غوطے کھانے اور ڈوبنے کو دھکیل دیتے۔ وہ انہیں عزیز بھی تو بہت تھی۔ اپنی جان سے بھی زیادہ۔

اور کیا بھلا کوئی اتنا بھی بے بس ہوا ہوگا' جیسے وہ ہو گئے تھے۔ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہستی کو کیسے اک عظیم فریب میں مبتلا کر کے بیٹھے اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"بہت برا ہوں میں ایمان! مجھ پر بھروسہ مت کرنا۔"

وہ اپنی نااہلی کا اعتراف اپنے آپ ہی' دل ہی دل میں کر رہے تھے۔ شرمندگیوں سے پانی پانی ہو رہے تھے۔

زندگی میں کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ آج یہ جرم سرزد ہوا تو کس کے ساتھ۔؟

اس ہستی کے ساتھ۔ جس کے ساتھ وہ اپنی ساری وفائیں وابستہ کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ایثار اور قربانی کے تمام تر جذبے اس کے نام کرنے کو بے تاب و بے قرار تھے۔ اپنی حیات کی کل خوشیاں اور مسرتیں اس کے قدموں میں نچھاور کرنے کی تڑپ دل میں رکھتے تھے۔

آج اسی کے ساتھ یہ واردات کر گئے۔ یہ دھوکا دہی کی واردات۔ اور نجانے اس گناہ کی سزا عبدرحمان! تمہیں کیا ملے گی۔؟



# 26

اجلال حیدر کی ماں خدیجہ بی گاؤں کی اک نیک' پاکباز اور سادہ دل عورت تھی۔ آنکھ کھولی تو اپنے گھر میں باپ کی حکومت دیکھی اور ماں کی تابعداری۔

ماں کی تابعداری اور فرمانبرداری بھی نہ صرف یہ کہ شوہر کے لئے تھی بلکہ اپنے سسر اور جیٹھوں' دیوروں کے لئے بھی تھی۔

کبھی کبھار ماموں ملنے آ جاتے یا ماں کے ساتھ اس کے میکے' یعنی اپنی ننھیال جاتی تو وہاں نانا اور ماموؤں کے طور و اطوار بھی ویسے ہی تھے اور اس کی نانی اور مامیاں بھی تابعداری اور فرمانبرداریوں کی اعلیٰ مثال تھیں۔

یوں اردگرد کا ماحول آپ ہی آپ خدیجہ بی کے اندر عورت کا اک مقام بناتا گیا۔ اور وہ وفا اور خدمت گزاری کی جیتی جاگتی تصویر بن گئی۔

خدیجہ کے شوہر کی زندگی نے وفا نہ کی لیکن اس کی گھٹی میں مرد کے ہر رشتے کے ساتھ وفا کرنا داخل تھا لہٰذا وہ شوہر کے بعد بیٹے کے ساتھ اپنی ازلی فطرت کے اصول وفاداری نبھانے لگی۔

اجلال حیدر انتہائی صابر و شاکر ماں کا بیٹا تھا۔ ماں کی طرح فطرتی طور پر نیک اور شریف بھی تھا۔ یا پھر خدا نے خدیجہ بی کی نیکی' شرافت اور خدمت گزاری کا اجر دینا تھا' وہ اجلال کی صورت میں دے دیا تھا۔

ماں اپنے سر کا تاج کھونے کے بعد بیٹے کی حکومت کے سائے میں بیٹھ گئی تھی' چاچیوں' تائیوں اور مامیوں کی طرح۔ اک مرد کے سائبان تلے۔ خواہ وہ کم عمر بیٹا ہی تھا۔

مگر اجلال حیدر نے عنان حکومت سنبھالنے کے باوجود سارے اختیارات ماں کو ہی دے رکھے تھے۔ ہر کام' ہر بات' ہر مسئلہ ماں کے مشورے سے طے کرتا۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کے فیصلے بھی ماں کی اک ہاں یا نہ کی تحویل میں سونپ دیئے ہوئے تھے۔

اپنے بڑوں جیسا نہ کوئی کروفر تھا نہ مرد ہونے کا فخر وغرور۔

جب بھی گھر جاتا ماں کے قدموں میں بیٹھ کر سکون و اطمینان پاتا۔ یوں ماں کی دعائیں اور بہنوں کا پیار ہی اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔

گھر سے تعلیم اور معاش کی حصولی کیلئے نکلا تو عبدرحمان جیسا مخلص و مشفق دوست مل گیا۔ پھر کچھ مزید پانے کی جیسے حاجت ہی نہ رہی۔

پچھلے ایک سال سے خدیجہ بی نے رٹ لگائی ہوئی تھی۔

''میں اپنی زندگی میں جلی! تمہارا سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔'' ہر ویک اینڈ پر اجلال گھر جاتا تو خدیجہ بی گھٹنوں پر دھرے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے اپنی خواہش بیان کرتیں۔

پھر ایک بار تو شرارت سے خدیجہ بی کا پیارا جلی اک سہرا خرید کر گھر لے گیا۔ ماں اس کے لئے دودھ کا گلاس لے کر جب اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا وہ سہرا لگائے بیٹھا تھا۔ حیران ہی تو رہ گئیں۔

''یہ کیا جلی۔؟ تو نے شہر میں شادی کر لی ہے اور مجھے بتایا بھی نہیں۔''

دودھ کا گلاس میز پر رکھ کر خدیجہ بی رونے لگیں۔

''میں بھلا غیر تھی۔؟ مجھے بھی اپنی شادی میں بلا لیتے تو کیا تھا۔؟''

''یہ شادی والا سہرا تھوڑا ہے۔'' اجلال زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''یہ تو صرف آپ کو دکھانے کیلئے خرید کر لایا ہوں۔ آپ جو کہتی تھیں میرا سہرا دیکھنا چاہتی ہیں تو دیکھ لیں۔''

''مگر کیا اس طرح۔؟''

''پھر اور کیسے۔؟''

''تم سہرا پہنو۔ دلہن بیاہ کر لاؤ۔ گھر میں بچوں کی چیخ و پکار اور رونق ہو۔''

''تو مجھے کیا پتہ۔ آپ سہرا سہرا کہتی رہیں' میں لے آیا۔ اور باندھ لیا۔''

''پاگل ہے تو تو۔'' ماں نے بڑے پیار سے سہرا اتار کر سنبھال لیا۔

''دلہن والا سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔'' پھر اسے سمجھایا۔

''وہ پہنوا ایسے کہ گھر میں پائل کی جھنکار گونج اٹھے۔''

''اب اگلی بار پائل بھی لے آؤں گا۔''



''خالی پائل کو میں کیا کروں گی۔ ساتھ دو گورے گورے پاؤں بھی ہونا چاہیں۔ جو اندر باہر چھم چھم کے گیت سناتے پھریں۔''

''وہ پاؤں میں کہاں سے لاؤں گا۔ اماں! آپ تو شہزاد کی طرح عجیب عجیب سی فرمائشیں کرتی ہیں۔''

خدیجہ بی بیٹے کے بھولپن پر ہنس ہنس کر دوھری ہونے لگیں۔ بھولی تو خود تھیں۔ شریر کی شرارت کا نشانہ بن گئیں۔ وہ ماں کی معصومیت پر ان کی ہنسی کا ساتھ دینے لگا۔

پھر خدیجہ بی نے کتنے ہی گورے گورے پاؤں والی لڑکیوں کے نام لے ڈالے۔ جن میں کچھ رشتہ داروں کی تھیں' کچھ ملنے جلنے والوں اور دوستوں کی تھیں اور کچھ دشمنوں کی بھی تھیں۔

ایسے دشمنوں کی جن کے ساتھ زمینوں کا تنازعہ تھا اور اپنوں نے ان کی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا تھا۔ اور اب ان سے میل ملاقات بھی نہیں تھی۔

اجلال ماں کو بازوؤں میں لے کر ہنس پڑا۔ ''کوئی دشمن آپ کو اپنی بیٹی بھلا کیسے دے گا اماں۔؟''

''میں پہلے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گی پھر پلو سامنے پھیلا دوں گی۔ تم انگلی تو رکھو کسی پر۔ حاصل کرنا میرا کام۔''

خدیجہ بی کا خیال تھا شہر کے پڑھے لکھے اور وہیں نوکری کرنے والے ان کے بیٹے کی پسند کوئی انوکھی نرالی ہو گی۔ اور وہ انوکھی نرالی دو بیٹیاں ان کے دیور کی تھیں۔ بہت حسین' بہت طرحدار۔ بے حد فیشن ایبل۔

سادہ سی خدیجہ بی کے خیال میں ایسی خوبصورتی شہر میں بھی مشکل سے مل سکتی تھی جیسی خدا نے زارا سارا کو عطا کی ہوئی تھی۔

اور جس طرح انکا بیٹا ان کی ہر خواہش پوری کرنے کا ہر وقت دل میں ارمان لئے پھرتا تھا۔ اس طرح وہ بھی اس کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھیں۔ دشمن کے آگے جھولی پھیلا دینا' کوئی اتنی مشکل بات نہ تھی۔ بیٹے کی خوشی کی خاطر۔

''اماں! جو لوگ حق نہیں دے سکتے وہ بھیک بھی نہیں دیا کرتے۔''

"قدموں میں گر جاؤں گی تمہاری خاطر۔"

اس کے سوال جواب کرنے کے انداز سے خدیجہ بی یہی سمجھی تھیں کہ زارا اور سارا میں سے کسی ایک کی خوبصورتی اس کے من کو بھا چکی تھی۔

"ساری عمر ان کی غلامی کرنے کو تیار ہوں تمہاری خاطر۔"

اجلال حیدر کو ماں پر بڑا پیار آ گیا تھا۔ "تبھی تو اک ماں کے قدموں تلے اللہ نے جنت رکھ دی ہے۔"

تب اس وقت تو مامتا کے جذبوں کو انتہائی عقیدت اور قدر کی نگاہ سے تکتے ہوئے بات کو ٹال گیا تھا لیکن آج عابی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس نے اعتراف کرلیا کہ ماں اگر بخوشی رضا مند ہو جائے تو ماھم کو کسی بھی انداز میں حاصل کر لینا اس کی خوش قسمتی ہوگی۔

"امریکہ جانے کو تیار ہو۔؟"

"کہا نا تمہیں اختیار ہے۔ جس طرح چاہو اس معاملے کو نمٹا سکتے ہو۔ لیکن ماں کی خوشی اور رضا مندی سب سے مقدم۔"

"اور اگر تمہاری والدہ راضی نہ ہوں۔؟"

"تو پھر سب ختم۔"

"یعنی کہ ماھم کی چاہت ختم۔؟"

"نہیں۔ دل کے درد کی طرح مرتے دم تک اس کی یاد کو ساتھ رکھوں گا۔ ماں کی نافرمانی البتہ کبھی نہیں کروں گا۔"

"تو پھر فکر نہ کر یار!! ماں کی فرمانبرداری کے صدقے میں اللہ تمہیں ماھم ضرور عطا کرے گا۔"

اور اجلال سے ساری تفصیلی گفتگو کے بعد اگلا ویک اینڈ سر عبد رحمان نے اس کی ماں کے ساتھ گزارنے کا پروگرام بنا لیا۔

"میں صدقے' میں قربان۔ آج تو میرے گھر میں چانن ہو گیا۔ میرے جلی کا دوست آ گیا۔"

کئی سالوں سے خدیجہ بی عبد کے متعلق سن رہی تھیں۔ پھر وہ ملک سے باہر



چلا گیا۔ کتنے ہی سالوں بعد واپس آیا تو اجلال کی زبان پر پھر اسی کا نام رہنے لگا۔ ان کی نظروں میں بے شک کبھی نہیں آیا تھا مگر سماعتوں میں بہت تھا۔

اس کے نام کے ساتھ ساتھ وہ اس کی عادات و اطوار سے بھی اچھی طرح واقف تھیں۔ کیا کرتا تھا۔ کھانے پینے میں اسے کیا پسند تھا۔ اچھی طرح اس سے ملی بھی نہیں۔ پہلے جا کر چولھے پر ہانڈی چڑھا آئیں۔ منی کو چائے بنانے پر لگا دیا۔

"اچھی سی چائے بنانا۔ جلی سے بھی زیادہ خاطر تواضع کرنی ہے ان کی۔"

اک چھوٹا سا گونگا لڑکا پاس کھڑا تھا۔ تیز تیز اشاروں سے اسے کچھ بتا کر پیسے تھماتے ہوئے خود پھر بیٹی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"صاف ستھری پلیٹوں میں سب کچھ ڈال کر ساتھ لے آنا۔ ارے! تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔" عجلت میں گونگے کو اک دھموکا جڑ کر دروازے کی طرف دھکیل دیا۔

پرے برآمدے میں بیٹھے عبد اور اجلال خدیجہ بی کی جذبات بھری حرکات اور عجلتیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور ساتھ باتیں کیے جا رہے تھے۔

خدیجہ بی کے پاؤں خوشی کے مارے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ منی کو ہدایات دے کر اور گونگے کو اشارے وغیرہ سے سمجھا کر دروازے سے باہر دھکیلنے کے بعد خود پھر ان دونوں کے پاس آ بیٹھیں۔

جو کچھ عبد کے متعلق اجلال کے منہ سے سن چکی تھیں' وہ اس سے کہیں زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ اجلال حیدر گورے چٹے رنگ اور تیکھے تیکھے نقوش کا مالک تھا۔ اس کے مقابلے میں عبد کی رنگت ذرا گندمی تھی۔ سنہری سنہری سی۔ چہرے کے خدوخال بھی اجلال حیدر جیسے تیکھے تیکھے نہیں تھے۔ لیکن ان میں کچھ عجیب سی کشش تھی۔ خدیجہ بی کا دل چاہ رہا تھا اسے دیکھتی چلی جائیں۔ خصوصاً اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ اس کی ہر نظر دوسرے کو گرفت میں لے رہی تھی۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔" عبد پر نظریں جمائے جمائے وہ اجلال سے کہنے لگیں۔ "بڑا پیارا بچہ ہے۔"

"یہ بچہ ہے۔؟" اجلال نے شرارت سے ماں کو گھورا۔ "اس جتنا پورا شاید

ہی کوئی اور ہوگا۔ لڑکیوں کو پڑھاتا ہے۔"

"لڑکیوں کو۔؟ شریف تو ہے نا۔؟" خدیجہ بی نے اس قدر بے ساختگی سے پوچھا کہ عبد اور اجلال بے اختیار قہقہے لگانے لگے۔

"اماں چائے تیار ہے۔ لے آؤں۔؟" پوچھنے سے پہلے منی چائے کا ٹرے لئے اندر داخل ہو چکی تھی۔ پیچھے پیچھے دوسرے ٹرے میں گونگا چائے کی لوازمات لئے آ رہا تھا۔

اجلال نے اٹھ کر میز درست کی پھر اس پر چائے کی پیالیاں اور چائے دانی رکھتے ہوئے بڑے پیار سے منی کو دیکھا۔

"اس منی سی منی کو دیکھ رہے ہو عابی! چائے بڑے مزے کی بناتی ہے۔ ایک بار پی لی تو مجھے یقین ہے تم ہر ویک اینڈ پر اس کے ہاتھ کی بنی چائے پینے کے لئے آ جایا کرو گے۔"

"چائے کی تو ابھی بعد کی بات ہے۔ میں نے تو اس کی صورت ہی دیکھ کر ہر ویک اینڈ پر آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بہت پیاری ہے تمہاری منی۔ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ یہ تو بس مجھے ہی دے دو۔"

عبد اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار کرنے لگے۔ پھر اس کے سفید سفید نازک نازک ہاتھ تھام کر انہیں شفقت سے سہلایا۔

"میری بہنا کے اتنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ ہیں۔ یار! تمہیں ان سے کام کراتے ہوئے شرم نہیں آتی۔؟ خالہ! مہربانی کر کے اپنی بہو لائیں اور اس کا کام اسے سونپیں۔ میری بہن فالتو نہیں ہے۔"

اور اجلال کی منی عبد کے پیار اور دو چار جملوں سے ہی انکا ووٹ بن گئی۔

"ہاں بھائی میں آپ کے ساتھ شہر چلوں گی۔ جلی بھیا مجھے نہیں لے کر جاتے اور شہر دیکھنے کا مجھے بے حد شوق ہے۔"

"کیوں بھئی منی کو شہر کیوں نہیں لے جاتے۔" عبد اجلال کو جھڑکنے لگے۔

"تم بیٹا! کل ہی ہمارے ساتھ چلنا۔؟ آپ بھی خالہ۔ تیار ہو جائیں۔"

"اماں! میں ذرا فارعہ کو نہ مل آؤں۔" اجلال پیالی خالی کر کے رکھتے ہوئے



اٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھ گیا تھا کہ عبد جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ کام اس نے شروع کر دیا تھا۔ اور اجلال یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی بات ہو۔

"میں بھی آپا کی طرف جاؤں گی۔" منی نے اٹھ کر اجلال کا ہاتھ تھام لیا۔

"آ جاؤ۔" خدیجہ بی نے ابھی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ اجلال منی کا ہاتھ تھامے نکلا چلا گیا۔ فارعہ سے ملنے جانا تو تھا ہی۔ بہت پیار تھا بڑی بہن سے۔ اور اس کی بیٹی سے اس سے بھی زیادہ۔

اجلال کے جاتے ہی عبد اپنی جگہ سے اٹھ کر خدیجہ بی کے پاس جا بیٹھے۔

"خالہ! میں اک خاص کام کیلئے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

خدیجہ بی ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ تب عبد نے اجلال اور ماھم کے متعلق سب کچھ انہیں بتا ڈالا۔

"دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے ان کی خوشی کو مقدم......"

"تم تاریخ بتاؤ۔" خدیجہ بی کمال کی عقل و فہم رکھتی تھیں۔ "کب اسے سہرا باندھنا ہے۔" الماری میں سے وہی سہرا نکال لائیں۔ "کیا کل پرسوں ہی۔؟"

"آپ کی اجازت کے بغیر تو نہیں۔"

"میری اجازت ہی اجازت ہے۔ میں تو بس اپنے جلی کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس انداز میں گفتگو کرتی ہوئی وہ عبدرحمان کو بالکل اپنی اماں جیسی لگ رہی تھیں۔ دوسری بات نہیں پوچھی۔ کیسے فوراً اجلال اور ماھم کی شادی پر رضا مند ہو گئی تھیں۔ بیٹے کی خوشی کی خاطر۔

"اے کاش! میری بھی ماں زندہ ہوتی تو آج۔ ایسی دربدری میرے نصیب میں نہ لکھی گئی ہوتی۔ یہ ماں خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اور ماں کی جدائی سب سے بڑی بدنصیبی۔ ماں زندہ ہوتی تو نہ فرحت والا واقعہ رونما ہوتا اور نہ ایمان کی جدائی والی کہانی رقم ہوتی اور ان کی آنکھوں کو سدا کیلئے بدبختی کے آنسو دے جاتی۔"

عبد سوچوں میں گم تھے اور خدیجہ بی کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر آنسو جمع ہو رہے تھے جنہیں وہ اندر ہی اندر پینے میں مصروف تھیں۔

انہوں نے ایسا کب سوچا تھا کہ بیٹا ایک دن اتنی دور جا بسے گا۔ جو
بغیر ایک ہفتہ گزارنا ان کے لیے مشکل ہوا کرتا تھا۔ ایک ایک منٹ گنا کرتی
پھر ویک اینڈ کا ڈیڑھ دن اس کی چکر پھیریاں لیتی تھیں۔ رات کو سوتے ہوئے اسے
کئی کئی بار جا کر دیکھتی تھیں۔

''لحاف تو ٹھیک طرح سے اوڑھا ہوا ہے۔؟''

''پیاس تو نہیں لگی۔؟''

''کھانا کم کھایا تھا۔ پیٹ میں تکلیف نہ ہو۔؟''

''کوئی برا خواب دیکھ کر ڈر نہ گیا ہو۔؟''

کئی قسم کے وسوسوں اور اندیشوں میں ہی گھری رہتیں۔ سوچتی رہتی اور
کر قرآنی آیات پڑھ کر اس پر پھونکتی رہتیں۔

مگر ممتا تو ایثار اور قربانی کا دوسرا نام ہے۔

وہ بیٹے کی خوشی پوری کرنے کو ہر طرح تیار تھیں۔

''پھر کیا پروگرام ہے۔؟ کب تک شادی کا ارادہ ہے۔؟''

وہ لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر کر عابی سے پوچھ رہی تھیں۔

''یہ سب کچھ آپ خود ہی طے کریں گی۔ لیکن جلد۔ آٹھ دن کے
اندر۔''

''بس۔ آٹھ دن؟'' خدیجہ بی کے منہ سے آہ نکل گئی۔

عبد نے چونک کر انہیں دیکھا۔ یہ حسرت کیسی تھی۔؟

چہرہ بھی کچھ بجھ سا گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو خاصی خوش تھیں۔ چہک
تھیں۔ اک رونق' اک روشنی سی تھی رخ پر۔

''وہ شہر میں آپ کو بڑا خوبصورت بنگلہ بنوا دے گا۔'' بیٹے کی جدائی کا
کا حوالہ دیا۔

''مجھے کوئی لالچ نہ دینا پتر۔ ماں کی ممتا ان دنیاوی چیزوں سے نہیں
کرتی۔'' قدرے الجھ کر بولی تھیں۔ ''میرے پاس جو قناعت اور توکل کی دولت
اس سے بڑھ کر کوئی امارت ریاست نہیں۔ نہ مجھے کچھ چاہیے۔''



''آپ کو نہیں چاہیے لیکن منی کا مستقبل۔ پہلے تعلیم اور پھر شادی۔ اور یہ بھی
ذہن میں رکھیں۔ مہنگائی کتنی بڑھ گئی ہے۔ آج کل تو تنخواہ دار کی تنخواہ بلوں میں ہی ختم
ہو جاتی ہے۔ آپ کے جلی کو سارے اخراجات پورے کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا
ہے' یہ آپ نہیں جانتیں۔ وہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرتا ہے۔''

عبدرحمان کی اس بات پر خدیجہ بی چونکیں۔

یہ تو انہوں نے آج تک سوچا ہی نہیں تھا کہ اجلال کو ان کے لیے یہ اتنی
ساری آسائشیں مہیا کرنے کی خاطر کسی مشکل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ انہوں نے
اگر اتنی مشکلوں سے اتنی قربانیاں دے کر اسے پروان چڑھایا تھا' اسے اعلیٰ تعلیم دلائی
تھی تو وہ بھی تو ان کی خاطر کچھ قربان کر رہا تھا۔

گاؤں کے بہت سارے گھروں کی نسبت ان کے گھر میں زیادہ آسائشیں
تھیں۔ اے سی لگا ہوا تھا۔ فرج بھی تھا۔ فریزر بھی تھا۔ گاؤں کے اکثر لوگ ضرورت
پڑنے پر ان سے برف لینے آتے تھے۔ اس وقت خدیجہ بی خدا کا ہزاروں شکر بجالاتی
تھیں کہ ان کے گھر سے کئی ضرورتمندوں کی حاجتیں پوری ہوتی تھیں۔ ٹی۔ وی دیکھنے
کیلئے عورتیں' لڑکیاں بالیاں آن بیٹھتیں۔ کوئی نیکی اچھائی کی' کوئی درس و تدریس کی
بات ہوتی۔ خدیجہ بی بچیوں کو اچھی اچھی باتوں کی تلقین کرتیں۔ برائی سے منع کرتیں۔
ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے گاؤں کی تمام لڑکیاں اور عورتیں اچھے کردار کی مالک
ہوں۔

یوں ایسی ایسی شہر کی سوغاتیں ان کا جلی گھر میں لے آیا ہوا تھا کہ ان کے
اندر کی نیک اور پاکباز عورت کے نیکیاں پھیلانے والے جذبے کی تسکین بھی ہوتی
رہتی۔ رونق بھی لگی رہتی اور دل بھی لگا رہتا۔

گاؤں کی اکثر لڑکیوں کو قرآن پاک کی تعلیم خدیجہ بی ہی دیتی تھیں۔ پھر
ٹی۔ وی میں جو کوئی قرآن کے متعلق اور سنت واحادیث کے متعلق پروگرام ہوتا بچیوں
کو بلا کر دکھایا سنایا کرتیں۔ اس طرح ان کا گھر اک غریب بیوہ کا گھر ہوتے ہوئے
بھی بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہوا تھا۔

سب اجلال حیدر کی وجہ سے۔ اس کے شہر جانے کی وجہ سے۔ اس کی محنتوں

کی وجہ سے اور اس کی ماں کے ساتھ بے پناہ محبتوں کی وجہ سے۔

خدیجہ بی کے چہرے پر پھیلی پریشانی اور آنکھوں کی نمی کے معنی عبدرحمان نے سمجھ لئے تھے۔ ان کی آزردگی اس عقل و دانش رکھنے والے بندے سے مخفی نہ رہی تھی۔ ''وہاں امریکہ میں ہمارا اجلال بہت ڈھیر سارا کمائے گا۔ جس سے اس کی اپنی بھی زندگی پرمسرت اور کامیاب و کامران گزرے گی اور آپ کو بھی پہلے کی نسبت زیادہ بڑی بڑی رقوم بھیجے گا۔''

وہ ہولے ہولے' مدھم مدھم اور انتہائی ملائم سے لہجے میں خدیجہ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان کے چہرے کی افسردگی بھری دھند چھٹ جائے۔ اور وہ اجلال کو خوشی کے ساتھ اس شادی کی اور امریکہ جانے کی اجازت دیں۔ کوئی دکھ' کوئی ملال دل میں نہ رکھیں۔

''منی کی تعلیم اور شادی کے علاوہ اجلال کی بھیجی ہوئی رقومات کے ساتھ آپ دیہات میں بہت سارے سدھار کے کام کر سکتی ہیں۔ بچیوں کے لیے کسی تعلیمی ادارے کا انتظام' کوئی کڑھائی سلائی کا سکول اور یا پھر قرآن کے متعلق درس وغیرہ دینے کا کوئی شعبہ قائم کر دیں۔''

سفید پاکیزہ لباس میں ملبوس خدیجہ بی کے طور و اطوار اور انداز عبد نے دیکھے تھے۔ اور جان گئے تھے کسی ایسی ہی وجہ سے ان کا دل تھمے گا' قرار پکڑے گا اور اندر بیٹھا رنج اور ملال دور ہو گا۔ کچھ عبد کی زبان میں قدرتی طور پر اثر بہت تھا۔ جب گاؤں کی لڑکیوں کیلئے قرآنی تعلیمات دینے والے ادارے کے اجرا کی بات ہوئی تو وہ تائید میں سر ہلانے لگیں۔ اس کی ضرورت تو وہ بہت پہلے سے محسوس کر رہی تھیں کہ نہ صرف لڑکیوں کیلئے بلکہ قرآنی تعلیمات کا انتظام تو لڑکوں کیلئے بھی ضرور ہونا چاہیے تھا کہ کئی نوعمر لڑکے گاؤں کی گلیوں میں اور کھیتوں میں آوارہ پھرتے رہتے تھے۔ کوئی ڈھنگ کا کام نہ تھا۔ نہ ڈھنگ کی تربیت۔ اخروٹ اور کنچے اور گلی ڈنڈا کھیلنے میں وقت گزار دیتے تھے۔ یہی تو عمر تھی ان کی کچھ سیکھنے' پڑھنے اور حاصل کرنے کی۔ جو وہ آوارگی میں گزار رہے تھے اور اس مقصد کیلئے ایک بڑی رقم کی ضرورت بھی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کیلئے بات تو چلی تھی مگر اس لئے ادھوری رہ گئی کہ



زبانی زبانی گفتگو تو سب کر لیتے تھے۔ بڑے بڑے دعوے بھی باندھ لیتے تھے لیکن جب عملی طور پر کچھ کرنے کا وقت آتا تو جیب ڈھیلی کوئی نہ کرتا۔ اللہ کے نام پر بھی نہیں۔

اور یہ اکیلی خدیجہ بی کے بس کا کام نہیں تھا۔

''وہاں امریکہ میں کتنی تنخواہ ہو گی جلی کی؟'' بھیگی بھیگی آنکھیں جھپکتے ہوئے خدیجہ بی نے مسکرا کر پوچھا تو عبد کے چہرے پر اک آسودہ سا تبسم پھیل گیا۔

''یہی کوئی دو تین لاکھ روپیہ ماہوار۔'' ڈالرز کو روپے میں تبدیل کر کے عبد نے رقم بتائی۔ ''یا پھر شاید اس سے بھی کچھ زیادہ۔''

''اتنے ڈھیر سارے۔؟'' خدیجہ بی بی کی آنکھوں میں اک چمک سی لہرائی۔ ''پھر اسے تم ہی سمجھا دینا کہ کم از کم دس پندرہ ہزار روپیہ ہر مہینے وہ مجھے بھیج دیا کرے' باقاعدگی کے ساتھ۔ میں مسجد میں درس کا انتظام کراؤنگی۔ شہر سے بڑے عالم کو بلوائیں گے۔''

''ایک دس پندرہ ہزار۔ ارے خالہ! وہ آپ کو پچاس ہزار روپیہ ہر مہینے بھیجا کرے گا انشاء اللہ۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔''

''تو پھر کب اس کی شادی ہو گی اور کب وہ خیر سے امریکہ سدھارے گا۔''

خدیجہ بی بڑی خوشی خوشی اجلال کے امریکہ جانے کا پروگرام بنانے لگیں۔

## 27

شہر کے سب سے معروف کالج میں مدحت کا داخلہ ہوا تھا۔ کلاسیں شروع ہونے میں ابھی چند دن تھے۔ تبھی رحمان علی خاں نے سوچا اتنے دنوں میں بنگلے کی ڈیکوریشن ہو سکتی تھی۔ دو دن کا تو صرف کام تھا۔ انٹیریئر ڈیکوریٹر نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے دو تین دنوں میں وہ گھر مکمل کر کے ان کے حوالے کر دے گا۔

''اور ہاں بابا جان! عابی سے بھی ضرور ملنا ہے۔'' کالج سے نکل کر جب

ڈیکوریٹر سے بات چیت ہوگئی تو مدحت نے یاد دہانی کرائی۔

''ان سے ملے بغیر میں واپس گھر نہیں جاؤں گی۔'' یہ تیسری بار تھی جب اس نے پچھلی سیٹ پر سے قدرے آگے جھک کر دادا کا کندھا ہلایا تھا۔

''لیکن بچے! ہمیں اس کا ایڈریس معلوم نہیں ہے۔''

''آپ کیسے ان کے باپ ہیں' جو آپ کو بیٹے کے ایڈریس کا بھی علم نہیں۔'' وہ ان سے بحث لگا بیٹھی۔ رحمان علی خاں نے گردن پیچھے موڑ کر اسے دیکھا۔ روٹھا چہرہ۔ پھولے پھولے گال۔ بھیگی بھیگی آنکھیں۔ عجیب سا حلیہ ہو رہا تھا۔ پیاری بھی بہت لگی۔ اکثر ان سے کوئی نہ کوئی ضد لگائے رکھا کرتی تھی۔

تینوں ہی' رحمان علی خاں' فرحت اور مدحت شہر آئے تھے اس کے کالج میں داخلے کے لئے۔ فارغ ہوئے تو فرحت اور مدحت کو ان کا گھر دکھانے کا پروگرام انہوں نے بنا لیا۔ بس اسی وقت سے مدحو کی زبان پر عابی سے ملنے کی رٹ لگی تھی۔ اور گاڑی اپنی پوری رفتار سے نجانے کونسی منزل کی سمت رواں دواں تھی۔

اردگرد یہ اونچی اونچی بلند و بالا عمارات تھیں۔ جنہیں دیکھنے کا ہمیشہ مدحت کو بڑا شوق رہتا تھا۔ اور آج موقع ملا تھا تو ذرا بھی دلچسپی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ نہ ہی کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ زندگی کے سارے مزے تو عابی کے ساتھ تھے۔

رحمان علی خاں کا اپنا دل بھی بیٹے میں اٹکا ہوا تھا۔ مدحت کی ضد تبھی بہت اچھی لگی تھی۔ کہ ان کو بھی اسے دیکھنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ مگر۔ ہائے افسوس۔ کمند کہاں آن کر ٹوٹی تھی۔ پاس ایڈریس ہی نہ تھا۔

''آپ کیسے ان کے باپ ہیں۔ کیسے ان کے باپ ہیں۔'' کانوں میں پوتی کا دیا ہوا طعنہ پوری آواز سے گونج رہا تھا۔ اور نگاہوں میں عابی کی صورت اپنی وجاہتوں کے ساتھ تھرک رہی تھی۔

''ہاں شاید ہم ہی غلط باپ ثابت ہوئے۔ کھو دیا اپنے ہیرے جیسے بیٹے کو۔'' وہ سوچوں میں اپنے آپ سے ہی ہمکلام تھے۔ ''رحمان علی خاں! تمہاری عقل پر اس وقت پتھر کیوں پڑ گئے تھے۔؟''

اپنے آپ سے ابھی پوچھ ہی رہے تھے کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی فرحت کی آواز



اعت سے ٹکرائی۔ ''خدا کے لئے کبھی عقل کو بھی تھام لیا کرو۔'' وہ مدحت کو ڈانٹ ہی تھی۔ شاید عابی سے ملنے کی ضد ہی اس ڈانٹ کی وجہ بنی تھی۔

''ہاں۔ اسی کی خاطر ہماری عقل پر پتھر پڑے تھے فرحت کی خاطر۔'' جب ہی موقع ملتا اپنا محاسبہ کرنا شروع کر دیتے۔ ''پر اس کا بھی ہمارے سوا کون تھا اور۔''

''ویسے بھی کچھ رسم و رواج کا پاس تھا۔ کچھ اس کا مستقبل نگاہوں میں تھا۔ کچھ......''

''اک میں ہی آپ کا کچھ نہ تھا۔'' خیال کے جھروکے سے عابی نے انک کر گلہ کیا۔ ''میرے ہی لئے دل میں کوئی نرم گوشہ نہ تھا۔''

انہوں نے گھبرا کر اردگرد دیکھا۔ ''یہ عابی کی آواز کہاں سے آئی ہے۔؟'' ے ہی پوچھ رہے تھے۔

''بابا جان! یونیورسٹی چلتے ہیں۔ ان کے گھر کا پتہ نہیں تو یونیورسٹی سے تو علوم ہو ہی جائے گا۔ ہوسکتا ہے وہ وہیں مل جائیں۔''

''ارے واہ! ہماری مدحو تو بڑی عقلمند ہے۔'' رحمان علی خاں اس کی پیش کی ئی تجویز پر خوش ہو گئے۔

''لیکن بابا جان! بھلا کیا آج ملنا بہت ضروری ہے۔ آپ اس کی ہر ضد ن کر اسے خراب کر رہے ہیں۔'' فرحت کا موڈ بہت خراب ہو رہا تھا۔

''خراب۔؟ میں۔؟ ارے ماما! عابی تو کہتے ہیں۔ مدحو دنیا کا سب سے اچھا بہ ہے۔''

''اب تم بچہ نہیں رہی ہو۔ اپنے خیالات درست کرو۔ جواں ہوگئی ہو۔ کالج ں داخلہ لے لیا ہے۔ کب تک بچہ بنی رہو گی۔؟'' فرحت چڑچڑے پن سے ڑبڑائی۔

''جب تک میرے عابی مجھے بچہ کہتے رہیں گے۔'' وہ ماں کے چہرے پر پھیلے غصے کے تاثرات کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگی تھی۔

''دادا!'' ہاتھ بڑھا کر پھر رحمان علی خاں کا کندھا ہلایا۔ ''یہ میری ماما ہر وقت انہیں کیوں چھپائے رکھتی ہیں۔؟ چلیں آئیں انہیں آئس کریم کھلائیں۔ تاکہ کچھ

مرچوں کی تلخی کم ہو اور یہ ہم سے میٹھا میٹھا بولیں۔''

مدحو کا بات کرنے کا انداز ہی ایسا تھا۔ فرحت مسکرا پڑی۔ ''چلو اب نئی ضد شروع۔ آئس کریم کا خیال آ گیا ہے۔''

''ضد تو وہی عابی والی رہے گی۔ پہلے انہیں ڈھونڈیں پھر سب مل کر آئس کریم کھائیں گے۔''

مدحت نے پھر سیٹ پر سے اچک کر دادا کے دونوں کندھے تھام لیے۔

''چلیں اب گاڑی کو یونیورسٹی کی طرف موڑلیں۔ سب سے پہلے ہم اپنے عابی کو اپنی آمد کی سرپرائز دیں۔ پھر سب مل کر آئس کریم کھائیں گے اور اس کے بعد اکٹھے اپنے نئے گھر کو وزٹ کریں گے۔''

مدحو نے پورے کا پورا پروگرام دادا کے حضور پیش کر دیا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ ہمیشہ اسی کی مانی جاتی تھی۔

''لیکن مدحو جان! آپ کا گھر تو وہ سامنے۔ ارے ارے ادھر دائیں ہاتھ موڑ لو۔ وہ سفید بڑے سے گیٹ کی طرف۔'' اس سے بات کرتے کرتے رحمان علی خاں نے ڈرائیور کو ڈائریکشن دیں۔

اس کا بنایا ہوا سارا پروگرام اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ آخری آئٹم سب سے پہلے آ گئی تھی۔ لیکن وہ ہر معاملے میں جلد مطمئن ہو جایا کرتی تھی۔

وہ پہلی بار یہ نیا بنگلہ دیکھ رہی تھی۔ جس میں اس کی آنے والی زندگی گزرنا تھی۔ دو چار پانچ سال۔ یا پھر پتہ نہیں خدا کو کیا منظور تھا۔ لیکن وہ پرجوش بہت تھی۔ دادا اور ماں سے بھی پہلے گاڑی سے نکل کر اندر کی سمت چل دی۔

وہاں باہر لان میں مالی کچھ کام کر رہا تھا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار رحمان علی خان سے کچھ بات کرنے لگا تھا۔ اس نے کسی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ گرے اور سفید کلر کے امتزاج سے یہ عمارت باہر سے ہی بڑی خوبصورت دکھائی دی تھی۔ وہ جلد از جلد اس کا اندرونی حصہ دیکھنا چاہ رہی تھی۔

اندر کمرے چونکہ خالی تھے اس لئے آوازیں گونج رہی تھیں۔ بچوں کی طرح بلاضرورت ہی اک اک کمرے میں گھس کر بولے جا رہی تھی۔ اور یوں خوشی کا بے



پایاں اظہار کرتے ہوئے وہ اک اک کمرہ گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی۔ فرحت البتہ بالکل خاموش تھی۔ جیسے اسے کسی بات سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔

چوکیدار سے بات کرنے کے بعد رحمان علی خاں بھی ان کے ساتھ آن ملے تھے۔ ''یہ ٹی۔ وی لاؤنج ہے اور یہ گیسٹ روم۔'' وہ انہیں وضاحت سے بتانے لگے۔

''اور دادا! یہ والا کمرہ۔؟'' گونجتی آوازیں کانوں میں اترتی بڑی اچھی لگ رہی تھیں اس لئے وہ ایڈونچر کے طور پر بلا ضرورت ہی پوچھ رہی تھی۔

دادا بھی ہمیشہ کی طرح اس کے کھیل میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔

''یہ میری مدحو کا بیڈ روم ہے۔ اپنی اپنی پسند کے رنگ بھی بتاتی جاؤ۔ تاکہ ہر کسی کی پسند کے مطابق بیڈ کور اور پردوں کے رنگ کے کپڑے کی بھی آج ہی خریداری کر لی جائے۔''

''مجھے تو پنک پسند ہے۔'' مدحو نے فوراً اپنا پسندیدہ رنگ بتا دیا۔

لیکن فرحت خاموش رہی۔ وہ ابھی تک اک لفظ نہیں بولی تھی۔ بیٹی اور بابا جان کے ایکو کے کھیل میں بھی حصہ نہیں لیا تھا۔

''بیٹی! تم بھی کچھ بولو۔ اپنے بیڈ روم کے لئے کونسا رنگ پسند کرو گی۔؟''

رحمان علی خاں کو فرحت کی خاموشی کھل رہی تھی۔

''میرے عابی کا بیڈ روم کونسا ہے۔؟'' فرحت کے جواب دینے سے پہلے مدحو بول پڑی۔ بے انتہا مزہ آ رہا تھا ایکو میں بولنے کا۔ ''اپنے عابی کے بیڈ روم کا رنگ میں بتاؤں گی۔ میری پسند کا ہونا چاہیے۔'' اسے اپنا حق استعمال کرنے کی عادت تھی۔ شروع سے پڑی ہوئی تھی۔ اور سب مانتے بھی تھے۔ اسی لئے فوراً بولی تھی۔

''یہ رہا ماسٹر بیڈ روم۔'' رحمان علی خاں نے دوسرے اک نسبتاً بڑے کمرے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور ساتھ ہی اس کے اندر داخل ہو گئے۔ مدحت نے ان کے قدموں سے قدم ملائے۔

''تمہارے عابی کا اور ماما کا بیڈ روم۔''

فرحت آخر میں تھی۔ ابھی کمرے میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ رحمان علی خان کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ اگلا قدم بھی نہ اٹھا سکی وہیں تھم گئی۔ پھر جھکی جھکی نظریں

اٹھا کر چور آنکھوں سے آگے جاتی مدحت کو دیکھا۔ پورے وجود پر اک لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ دیوار کو تھام کر رہ گئی۔

''بھلا بابا جان کو یہ وضاحت کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔''

''کیا دادا جان۔؟ یہ بیڈ روم کس کا ہے۔؟'' مدحت نے شاید سنا نہیں تھا۔ دوبارہ سے پوچھا۔

''یہ تمہاری ماما کا اور تمہارے عابی کا۔'' رحمان علی خان نے اپنے الفاظ دہرائے۔

اسی مقصد کی خاطر تو انہوں نے یہ اتنی کثیر رقم خرچ کی تھی۔ صرف ان دونوں کی خانہ آبادی کی خاطر۔ ورنہ ان کی رہائش کے لئے حویلی کم تھی کیا۔ اتنی وسیع وعریض۔ بیسیوں کمرے تھے۔ ہر قسم کی آسائش تھی وہاں۔ ماڈرن زمانے کی ہر سہولت وہاں موجود تھی۔

''ماما کا اور عابی کا۔؟ وہ کیوں۔؟'' مدحت وہیں کی وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پر اک دم پیچھے مڑ کر ماں کی جانب دیکھا۔

فرحت دروازے کے باہر ہی دیوار کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ چند لمحے انہیں تکتے رہنے کے بعد یکا یک گھوم کر کھڑکی میں کھڑے، باہر لان کا نظارہ کرتے ہوئے دادا پر نظریں جما دیں۔ پھر چند قدم تیزی سے بڑھا کر ان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ''ہمیشہ ماما کا اور میرا کمرہ مشترک ہوتا ہے۔ اب مجھے الگ کیوں کر دیا ہے دادا جان۔؟''

''شہر کا ایسا ہی دستور ہے بیٹے۔! بچوں کا بیڈ روم علیحدہ ہوتا ہے اور والدین کا علیحدہ۔''

دادا کا جواب سن کر مدحت چپ سی ہو گئی۔ مزید کچھ نہیں بولی۔ اور پھر باقی سارا وقت کوئی بات نہیں کی۔ رحمان علی خان نے باقی کمرے بھی اسی طرح پوری تفصیل اور وضاحت سے دکھائے۔ نجانے کیا کیا بتاتے رہے۔ مگر مدحت اپنی ہی سوچوں میں گم رہی۔ اب کمروں میں گونجنے والی آواز بھی اسے اٹریکٹ نہیں کر رہی تھیں۔ یوں ایکو کا کھیل کھیلنا بھی ترک کر دیا۔



وہ سارے کمرے، کچن اور اسٹورز وغیرہ دکھانے کے بعد لان میں آ گئے تھے۔ وہاں لگے پھولوں اور ان کی کیاریوں اور گملوں کے متعلق بتایا کہ کہاں کہاں سے اور کیسے کیسے نایاب پودے انہوں نے منگوائے تھے۔

عابی کو پھولوں پودوں سے عشق تھا۔ اس کی پسند کے تمام اکٹھے کر لئے تھے۔ بیٹے کے ساتھ اپنا عشق نبھانے کے لئے اس کے عشق کی آبیاری کر رہے تھے۔

سارا گھر دکھا کر جب واپسی کا ارادہ کیا تو مدحو کو اپنے بازو کو گھیرے میں لے کر پوچھنے لگے۔ ''ہمارے بچے کو اپنا گھر کیسا لگا۔؟''

''اچھا ہے۔'' سرسری سا جواب دیتے ہوئے مدحت جلدی سے گاڑی میں جا بیٹھی۔ پھر چوکیدار اور مالی کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد رحمان علی خاں بھی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

''اب کہاں جانا ہے۔؟ کیا عابی کے پاس۔؟'' اک متوقع سوچ کے ساتھ گردن پھیر کر انہوں نے ماں بیٹی کا جائزہ لیا۔

''نہیں۔ بس گھر چلیں۔''

''آئس کریم تو ہماری مدحو کھائے گی ہی۔''

''نہیں۔ وہ بھی نہیں۔'' صاف جواب ملا۔ موڈ بہت خراب تھا۔ ناراض سی لگ رہی تھی۔

''ارے کیا ہوا۔؟'' بڑے پیار سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' بہت تیکھے سے لہجے میں جواب دیا۔ ''بس مجھے گھر جانا ہے۔'' ''بھئی فرحت! تم ہی ہماری بیٹی سے پوچھو ناں......''

''گھر جا کر پوچھ لوں گی۔'' کٹ کرنے کے انداز میں فرحت نے بھی بات ختم کر دی۔

''ابھی تو اس نے عابی سے ملنے کی اور آئس کریم کھانے کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔''

''چند دنوں تک یہیں تو آ جانا ہے۔ ساری خواہشیں پوری ہوتی رہیں گی۔ اس وقت بہتر ہے واپس ہی چلیں

فرحت اس کے مزاج کو زیادہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ تبھی سارا پروگرام کینسل کر دیا۔ "میری بھی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"چلو پھر جمیل! واپسی کا ہی رستہ پکڑو۔" آخر ڈرائیور کو حکم دے کر سر سیٹ کی بیک کے ساتھ ٹکا لیا۔

مدحت کے بدلتے موڈ سے خاصے پریشان تھے مگر کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ان کی پریشانی سے فرحت بھی تو پریشان ہو جاتی تھی۔

حویلی پہنچتے ہی دادا اپنے کمرے میں چلے گئے تو مدحت ماں کے پاس جا پہنچی۔ فرحت کے سر میں شاید درد تھا' وہ بیڈ پر لیٹ گئی تھی اور جیراں کو چائے بنانے کا کہا تھا۔

"ماما! آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔؟"

"ہوں۔" فرحت نے ذرا پرے کھسک کر پہلو میں اسے بیٹھنے کی جگہ دی۔

"یہ آپ اور بابا جان مل کر کونسا کھیل کھیلنے والے ہیں۔؟ میرے چاچو کو ٹریپ کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب۔؟" فرحت اس کی بات سن کر حیرت زدہ سی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے آپ نے جو کچھ چھپا رکھا ہے' وہ مجھے بہت عرصہ ہوا معلوم ہو چکا ہے۔"

"کیا چھپایا ہوا ہے اور کیا معلوم ہو چکا ہے؟" فرحت کے لہجے میں ہکلاہٹ سی تھی۔

"یہی کہ میرے پاپا کی ڈیتھ کے بعد آپ کی شادی عابی سے ہو گئی تھی۔" وہ بڑی بے دردی سے بولی تھی۔ فرحت کا دل دھک کر کے رہ گیا۔

"اور عابی چونکہ رضامند نہیں تھے اس لئے وہ گھر سے چلے گئے۔"

فرحت نظریں جھکائے چپ بیٹھی تھی۔ کچھ بھی کہے بغیر گم سم سی تھی۔

"میں اب بچہ نہیں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔ میں نے ابھی بے شک صرف میٹرک تک ہی تعلیم حاصل کی ہے لیکن آپ بڑوں کی زندگیوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ پھر میں گھر میں اکیلی اولاد تھی۔ کوئی ہم عمر ساتھی ساتھ نہ تھا جو کسی کھیل



وغیرہ میں مصروف ہو جایا کرتی اور میرا وقت گزر جاتا' تب کورس کی کتابوں کے علاوہ فارغ وقت میں میں نے صرف مطالعہ کیا ہے اور یا پھر ٹی۔ وی کے پروگرام دیکھے ہیں۔ یوں میں عمر سے بھی پہلے باشعور ہو چکی ہوں ماما۔"

"جانتی ہوں۔ پر یہ بتاؤ یہ اتنی لمبی تمہید کس لئے باندھی جا رہی ہے۔؟"

فرحت نے گویا بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن اندر سے بے حد خوفزدہ تھی۔ مدحت کا موڈ بڑا عجیب سا ہو رہا تھا۔

"آپ ماما! بڑی تھیں۔ جب عابی اس رشتے پر راضی نہیں تھے' پھر آپ نے کیوں یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔ ہمارے ہاں کی عورت اتنی بزدل کیوں ہے۔ اپنی تو اپنی' ساتھ میرے عابی کی بھی زندگی تباہ کر ڈالی۔ انہیں گھر سے بے گھر کر دیا۔ اس وقت اگر آپ بھی سٹینڈ لے لیتیں تو دونوں کے ساتھ یہ ظالمانہ رویہ رکھنے سے دادا بھی اور برادری قبیلے والے بھی شاید باز آ جاتے۔"

اسے پتہ نہیں کس نے اور کس انداز میں سب کچھ بتایا تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے عابی کی طرفداری میں فرحت پر سارا الزام دھرے جا رہی تھی۔ اور فرحت بوکھلائی گھبرائی ہوئی اسے تک رہی تھی' اسے سن رہی تھی۔

"میں کیسے بغاوت کرتی اپنے بزرگوں کے بنائے رسم و رواج کے خلاف۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا۔" بڑی مشکل سے' ہکلا ہکلا کر اپنے دفاع میں بس یہ دو جملے بول سکی۔

"پیدا کرتیں حوصلہ۔ اپنے حق کے لئے۔ عابی کے حق کے لئے۔ بولتیں کچھ۔ کیا کر لیتے برادری قبیلے والے۔ زیادہ سے زیادہ یہی نا۔ آپ دونوں کو سزا کا مستحق قرار دے دیا جاتا۔ دونوں کو گولی سے اڑا دیتے۔"

فرحت نے ہول کر بیٹی کو دیکھا۔

"اور آپ دونوں مر جاتے۔ اب کونسا جی رہے ہیں۔ یہ آپ کیا سمجھتی ہیں زندگی جی رہی ہیں؟ اس جینے سے بہتر ہے بندہ بہادری کی موت مر جائے۔ حدیث [illegible] ہے کہ ظالم کا ہاتھ اگر روکو گے نہیں تو یہ بھی ظلم میں شمار ہو گا۔ آپ عورتیں تو خود ظلم کا ساتھ دیتی ہیں۔ خاموش رہ کر۔ مظالم سہہ کر۔ اپنے حقوق چھوڑ کر۔ کیا حاصل کیا

آپ نے۔؟ بتایئے نا ذرا مجھے۔''

یہ پندرہ سولہ سالہ اس کی بیٹی بول رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ حیرتیں بھرے فرحت اسے تکے جا رہی تھی۔

''خاموش رہ کر' آواز نہ اٹھا کر' کونسا تیر آپ نے مار لیا۔ کونسا فائدہ حاصل کر لیا۔ کونسا نام کما لیا۔؟ نرے خسارے میں ہی رہیں۔ حویلی کے کمروں میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزار لی۔ مزید زندگی آپ کے کام آئی اور نہ کسی دوسرے کے۔ ناکام ترین زندگی گزاری۔ آپ کی جگہ میں ہوتی تو۔''

''ہائے خدا نہ کرے۔''

''خدا نہ کرے' کیا ہوا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ضرور ہو سکتا ہے۔ تو میں تو یوں بے بس کبھی نہ ہوتی۔ میں اپنے پیارے دیور کو کبھی اتنی مشکلات سہنے اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے اور گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور نہ کر دیتی' خاموش رہ کر۔ اس زیادتی کے سامنے سر جھکا کر۔''

فرحت نے مسلسل بولتی ہوئی مدحت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا جیسے پوچھ رہی تھی۔ ''پھر تم کیا کرتیں۔؟''

''ان رسم و رواج کے نام پر ظلم کرنے والوں کے سامنے سر بلند کر کے' تن کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی نکاح نامے پر دستخط نہ کرتی۔ بلکہ۔ بلکہ ماما! اگر میرا دیور احتجاج نہ کرتا' چپکے سے ان فرسودہ رسومات کے سامنے سر جھکا دیتا تو میں اسے بھی ایسا کرنے سے منع کرتی۔ اسے بھی سمجھاتی۔ اسے اپنے حقوق لینے اور دوسروں کے دینے کے آداب سکھاتی۔''

''یہ تم۔ تم نے اتنی باتیں کہاں سے سیکھ لیں۔؟''

''آپ کی کمزوری نے مجھے سکھائی ہیں۔ عابی کی محرومیوں نے سکھائی ہیں۔ مجھے عمر سے پہلے باشعور کر دیا ہے۔ آپ کے حبس زدہ ماحول اور حالات نے مجھے بہادر بنا دیا ہے۔ مجھے اپنے' یعنی عورت کے اصل مقام سے آگاہ کر دیا ہے۔''

فرحت سر جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھوں کو مسل رہی تھی۔

''آپ نے بہت ظلم کیا ہے ماما۔ خود پر بھی' عابی پر بھی۔ اور اب میں آپ



کو مزید نہ ظلم سہنے دوں گی اور نہ عابی پر مزید ظلم کرنے دوں گی۔''

فرحت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ مدحت نے ماں کے بہتے آنسو دیکھے تو آگے بڑھی۔ روتی ہوئی فرحت کو بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ جیسے وہ خود ماں تھی اور اس کے بازوؤں میں سمٹی فرحت اس کی بیٹی تھی۔ پھر اس کے آنسو صاف کیے۔

''رو کیوں رہی ہیں۔ خوش ہوں کہ آج کسی نے آپ کو اپنے پر ظلم کرنے سے روکا ہے۔ اور روکنے والا ہاتھ کسی غیر کا نہیں آپ کی بیٹی کا ہے۔ آپ کی اپنی بیٹی کا۔ کسی کا احسان نہیں چڑھا آپ پر۔''

فرحت نے اک تشکر بھری نگاہ مدحت کے بے حد معصوم اور خوبصورت چہرے پر ڈالی۔ ''بس اب آئندہ زندگی آپ اپنی مرضی اور آزادی سے گزاریں گی۔ آپ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہوئی ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے شہر میں شفٹ ہو جائیں گے تو عابی سے کہہ کر آپ کے لیے کسی ٹیوٹر کا انتظام کراؤں گی۔ میرا اپنا ارادہ وکالت کرنے کا ہے۔ مجھے بے انتہا خوشی ہو گی اگر آپ بھی اپنی بیٹی کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے ایسی ہی کوئی پروفیشنل تعلیم حاصل کر لیں۔''

فرحت نے تائید میں گردن ہلائی۔

''ابھی آپ کی عمر کتنی ہے۔ صرف پچیس سال۔ آپ ینگ ہیں ماما! آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ آپ بہادر بنیں۔ مجھے یہ فخر دیں کہ میں اک بہادر اور گریٹ عورت کی بیٹی ہوں۔ پچھلی زندگی میں جو کچھ ہو چکا بھلا دیں ان سب حالات کو فراموش کر دیں یہ سب کہ آپ کسی کی پابند ہیں۔ نکلیں کھلے آسمان تلے۔ ہر وقت سوچوں میں کھو کر اور کڑھ کڑھ کر آپ نے اپنی صحت بگاڑ لی ہوئی ہے۔ ٹھیک کریں اپنی صحت کو۔'' فرحت بڑے غور سے سن رہی تھی۔ ''دنیا میں' ہمارے اردگرد بہت سارے لوگ ایسے ہیں جنہیں آپ کی ضرورت ہے۔ انہیں سہارا دیں۔ آسرے تلاش کرنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے بندہ کسی کا آسرا بنے۔''

فرحت کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔

''اپنی بیساکھیاں پھینک کر دوسرے کی بیساکھی بننے میں ہی عظمت ہے۔''

اب فرحت کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور مدحت ماں کی آنکھوں پر روشنیاں اتار کر اس کی چمکتی بھڑکتی آنکھوں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ ”یہ ہوئی نا بات۔ اور اب ابھی جا کر دادا سے بات کریں۔“

”کونسی بات۔؟“ فرحت پھر سہم سی گئی۔ اب نجانے مزید وہ کیا کہنے والی تھی۔

مدحت کو ماں کی ہیئت کذائی پر پھر ہنسی آ گئی۔ ”یہی کہ وہ ماسٹر بیڈروم میرا اور آپ کا ہوگا۔ اس کی کلر سکیم پنک ہونی چاہیے۔ میری پسند کی اور دوسرا بیڈروم عابی کا ہوگا۔ اور مجھے معلوم ہے۔ عابی کے لئے جو رنگ میں کہہ دوں گی وہی وہ پسند کرلیں گے۔ تو ان کیلئے آسمانی ٹھیک رہے گا۔ ہیں نا۔؟“

”ہاں۔ وہ نیلے کا ہر شیڈ پسند کرتا ہے۔“ کئی سالوں بعد آج پہلی بار فرحت نے عابی کے متعلق کھل کر بات کی تھی۔

”اور تین چار دنوں تک ہم اپنے سفید بنگلے میں شفٹ کر جائیں گے انشاء اللہ۔ پھر وہاں تین دوست مل کر پیاری پیاری زندگی گزاریں گے۔ میں، میری ماما اور میرے عابی۔“

فرحت کے چہرے پر بھی اطمینان اور سکون پھیل رہا تھا۔

”اور ہاں ماما! وہاں سب ملنے جلنے والوں اور محلے والوں کو یہی بتائیں گے کہ میں آپ کی بیٹی ہوں اور عابی میرے چاچو ہیں۔“

”سچ مچ۔؟“ فرحت اندر سے ریلیکس ہوئی تو مدحت سے مذاق کرنے لگی۔

”تم کیا واقعی میری بیٹی ہو۔؟“

”ہاں ماما؟ ہاں۔“ مدحت نے وفور مسرت سے بے قابو ہوتے ہوئے ماں سے لپٹ پڑی۔ ”اور مجھے بہت فخر ہے آپ کی بیٹی ہونے پر۔“

فرحت نے اپنے ساتھ لپٹی ہوئی مدحت کا چہرہ اونچا کر کے اس کی پیشانی چوم لی۔ ”اور مجھے اس بات کی خوشی کہ میری بیٹی آنے والی زندگی میں اپنا مقام بحیثیت عورت کے بہت اونچا بنالے گی۔ جو کہ اس معاشرے میں اک مشکل کام ہے۔“

”نہ صرف اپنا بلکہ ساتھ اپنی ماما کو بھی لے کر بلندیوں تک پہنچوں گی انشاء اللہ!



عورت بہادر بنے، ہمت کرے تو بہت کچھ کرسکتی ہے۔ بہت سکھی رہ سکتی ہے، خود بھی اور دوسروں میں بھی سکھ بانٹ سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے۔“

”پروردگار تمہارا یقین قائم رکھے۔“

فرحت نے اسے صدق دل سے دعا دی۔

”اور میرا دل چاہتا ہے ماما! ہم دونوں مل کر عابی کی زندگی میں کچھ آسانیاں داخل کردیں۔ بیچارے میرے عابی کتنے ہی سالوں سے آپ سے بھی کہیں زیادہ دکھی اور پریشان زندگی گزار رہے ہیں، اس ناپسندیدہ اور نارضامندی والے رشتے میں بندھ کر۔“

”وہ کیسے جان؟ اس کا حل بھی تمہیں ہی سوچنا ہوگا۔“

## 28

”اتنا خوشی کا موقع ہے اور عابی! آپ کی آنکھوں میں، میں پھر وہی اداسیاں اتری ہوئی دیکھ رہی ہوں۔ کیوں عابی! یہ ایسا کیوں ہے۔؟ کیا آپ مجھے نہیں بتائیں گے کچھ۔“

جواب میں عبدرحمان خاموش رہے تو ایمان آفریدی پھر بولی۔

”آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ اپنا ہر دکھ سکھ میرے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔“

عبد نے ایمان کی بات سنی بھی مگر ان سنی کرتے ہوئے جلدی سے اس گداگر کی جانب متوجہ ہوگئے جو کاسہ پھیلائے ان کی سمت بڑھا چلا آ رہا تھا۔

”ایک تو شاپنگ کرنا بھی نرا عذاب ہے۔ کچھ مہنگائی بہت ہے اوپر سے یہ بھکاری قدم قدم پر راستہ روک لیتے ہیں۔“

”جوڑی سلامت رہے۔ آباد رہے۔ کل سے بھوکا ہوں شاہ جی! کچھ اس فقیر کی جھولی میں بھی ڈال دیں۔ یہ دیکھیں پیٹ کیسے کمر کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔“

جبکہ اس کی اچھی بھلی توند لٹکی ہوئی تھی۔ مگر وہ پھر بھی ایسی صدائیں لگا

رہا تھا۔

کتنے ہی سارے شاپرز ایمان اور عبد نے اٹھا رکھے تھے۔ مانگنے والے کی نظریں انہیں پر جمی تھیں۔ جیسے اس کا بس چلتا تو روٹی کی بجائے ان شاپرز میں جو تھا' وہی اپنے پیٹ میں اتار لیتا۔

''اس کی صدا سن رہے ہیں عابی۔؟'' ایمان کے چہرے پر پھیلتی سرخی نے اسے مزید حسن اور نکھار بخش دیا تھا۔

''یہ ہم لوگوں کو نفسیاتی طور پر الجھانے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔''

اور عبد رحمان کو ایمان آفریدی کے چہرے پر اترتے' پھیلتے' بکھرتے رنگ نے الجھا دیا تھا۔ سوچوں میں کھوئے کھوئے اس کے رخ زیبا کی خوبصورتی بڑھاتی اس قوس وقزح کو تکتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر والٹ نکالنے کی کوشش میں ہی تھے کہ اٹھائے ہوئے تین چار شاپرز میں سے ایک بھاری بھرکم نیچے گر گیا۔

''مجھے بتائیں نا کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔ میرا ایک ہاتھ فارغ ہے۔''

ایمان خاصی بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے وہ گرا ہوا شاپر اٹھانے لگی تھی گداگر نے جلدی سے بڑھ کر وہ شاپر اٹھا لیا۔

''کہاں پہنچانا ہے شاہ جی! مجھے حکم کریں۔'' اسے احساس تھا کہ ان کی خاطر یہ سب ہوا تھا۔ تبھی ان کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ پورے خلوص نیت کے ساتھ۔

ایمان کو اس کی پیشکش پر ہنسی آ گئی۔ ''تو تم بھیک مانگنے کے بجائے یہ اٹھا کر دوسروں کو آسانی عطا کرنے کا دھندا کیوں نہیں کر لیتے۔؟ ثواب کا ثواب کی کمائی۔ مسلمان ہو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مانگنا کتنا گناہ ہے۔''

شاپر گر جانے کے باوجود عبد کا ہاتھ فارغ نہیں ہوا تھا۔ کہنی اور کمر میں ا اور شاپر دبا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ پھر جیب ٹٹول رہے تھے۔

ایمان ان کا مسئلہ سمجھتے ہوئے' گداگر سے بات کرتے کرتے' ان کی ذ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ عبد مشکل میں تھے اور ادھر تلقین و تبلیغ بھی فرض۔

''والٹ نکالنا ہے۔؟ میں نکال دیتی ہوں۔''

عبد کا جواب سننے سے پہلے ہی ایمان ان کی پتلون کی جیب میں ہاتھ



دیا۔ اور عین اسی لمحے ''عابی۔ عابی۔'' پکارتے ہوئے مدحت ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ چہرے پر لالیوں کے لالہ زار تھے۔ آنکھوں میں جیسے ہیروں کی چمک تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی بجلیاں۔

''ارے! میرا بچہ۔'' عبد کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ نہ دیکھا کہ وہ کہاں کھڑے تھے۔ چلتی سڑک کے کنارے سرراہ۔ نہ خیال رہا کہ کیا کر رہے تھے۔ سارے شاپرز گداگر کو پکڑانے کیلئے اس پر پھینکے۔

ایمان جیب میں سے والٹ نکال رہی تھی۔ اس کا ہاتھ جھٹک کر پرے ہٹاتے ہوئے عجلت سے والٹ خود نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا اور لپک کر لمبے لمبے پھیلے بازوؤں میں مدحت کو سمیٹ لیا۔ ''تم یہاں کیسے۔؟''

اسے گلے سے لگا کر سر کو بوسہ دیتے ہوئے بولے۔ ''میں آج ہی تمہارے پاس آنے والا تھا۔''

''گپ نہیں چلے گی عابی۔!''

ایمان کو سر سے پاؤں تک معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے مدحت نے مسکرا کر عبد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

ان کی نظریں اس کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ چلی تھیں۔ ایمان کے وجود سے ہوتی ہوئی مدحت کی ان کی آنکھوں میں اور ان کی مدحت کی آنکھوں میں آن کر ٹھہر گئی تھیں۔

''یہ ایمان ہیں۔ میری ایک اسٹوڈنٹ۔'' جلدی سے ایمان کا تعارف کرایا۔

''اور یہ ساری خریداری۔؟'' مدحت کی شوخیوں بھرے شرارے لٹاتی آنکھوں میں کچھ مشکوک عناصر آن موجود ہوئے۔

لیکن عبد نے نہ اس کی نظروں کے شک کو محسوس کیا اور نہ معنی خیزی کو اور نہ اپنی پوزیشن یا حالت اور حلیے سے گھبرائے۔ انتہائی نارمل انداز میں وجاہت بھرے چہرے پر خوشی کا بھرپور تاثر لئے بولے۔

''اجلال کی شادی ہے نا۔ یہ ساری خریداری اسی لئے ہوئی ہے۔ اور تم۔؟''

پھر سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ نزدیک بھی۔ فاصلے پر بھی۔ لیکن کوئی اور شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا تو نظریں واپس مدحت کی طرف پلٹ آئیں۔

"پر تم اکیلی کیسے ہو یہاں۔؟" وہ اچنبھے میں مبتلا ہو گئے تھے۔

مدحت زور سے ہنس پڑی۔ "وہ ادھر۔ دور۔ گاڑی میں ہیں۔ ماما اور دادا۔"

پھر اس کی مسکراہٹوں بھری نظروں کے زاویے اور انداز بدلے۔

"جناب! نئی گاڑی ہے۔ آپ کہاں پہچان پائیں گے۔ آپ کے لئے ہی تو دادا نے خریدی ہے۔"

مدحت کی بات پر عبد نے گھبرا کر ایمان کی طرف دیکھا۔ وہ شاید دانستہ گداگر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ ان چچا بھتیجی کو مکمل پرائیویسی دینے کی خاطر۔ بڑی تیز تیز اس کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی جواب میں وہ زور زور سے سر ہلا رہا تھا۔

"پروگرام کیا ہے تمہارا۔؟" اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ پھر مدحت کی سمت گھوم گئے تھے۔

"پروگرام کیا ہونا ہے۔ یہاں آپ کے شہر میں شفٹ ہو گئے ہیں پورے کے پورے۔" اس کی نظریں اپنے عابی کے چہرے پر سے جیسے نثار ہوئی جا رہی تھیں۔

"اور میرے عابی جناب پتہ نہیں کہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔"

"وہ۔ وہ۔" عابی کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا کہ جس بات کی وہ باز پرس کر رہی تھی، وہ سارا مسئلہ انہوں نے خود ہی بنایا تھا۔ دانستہ بابا جان کو اپنا کوئی اتہ پتہ نہیں دیا تھا۔ وہ کیا لگتے تھے عبدرحمان کے۔ جو وہ اپنا پتہ انہیں دیتے۔ مدحت سے سروکار رکھتے تھے۔ اسے مل لیا کرتے تھے۔ وہ تو ان کی جند جان تھی۔ ذمہ داری تھی۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا فرض تھی۔

"ہمارے ہی، آپ کی مدحت کے ہی، جذبے صادق تھے چاچو! جو آپ مجھے دکھائی دے گئے۔ یہاں۔"

پھر شرارت سے مسکرا کر عبد کی آنکھوں میں تکتے ہوئے ہولے سے بولی۔

"آپ کو کسی اور نے نہیں دیکھا۔ بے فکر رہیں۔"



"شریر۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" مدحو کے سر پر ہلکی سی، ہزاروں محبتوں اور پیار سے بھری اک چپت لگائی۔

اور۔ "اس کوئی بات نہیں۔" کے معنی مدحت کو ان کے بلش ہوتے چہرے پر صاف دکھائی دے گئے۔

"گھر کا ایڈریس مجھے بتاؤ۔ میں ابھی ایک گھنٹے تک پہنچتا ہوں۔ پھر وہیں تفصیلی بات ہو گی۔"

"او چاچو پیارے! تفصیلی بات کیا ہونی ہے۔ آپ کا گھر ہے۔ ہم مہمان تشریف لائے ہیں۔ میزبانی کیلئے جناب! آپ کو پہنچنا ہی ہو گا۔ فوراً سے بھی پیشتر۔"

"مدحو بہت بولتی ہو۔ ضرورت سے بھی کچھ زیادہ۔" عبد نے سوچتے ہوئے پھر گڑبڑا کر ایمان پر نظر ڈالی۔

وہ اب ٹریفک کو دیکھ رہی تھی اور گداگر سارا سامان اٹھائے قلی بنا پاس کھڑا تھا۔ "اچھا سر۔" سمجھدار بھی کافی تھی۔ عابی کے گڑبڑانے پر جلدی جلدی انہیں اپنا ایڈریس سمجھانے لگی۔ "اپنا سامان لے آیئے گا۔ بابا جان نے واپس حویلی بھی جانا ہے۔ اور ہم اکیلی خواتین اتنے بڑے شہر میں ڈریں گی۔"

ہولے ہولے، مدھم مدھم سی آواز میں عابی کو تاکیدیں کرتے کرتے وہ ایک دم ایمان سے مخاطب ہو گئی۔

"اچھا جی۔ پھر ملاقات ہو گی انشاء اللہ۔ اس وقت جلدی میں ہوں۔"

مدحت اچانک ہی حملہ آور ہوئی تھی۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو ایمان نے سٹپٹا کر ہاتھ میں تھام لیا۔ "ہاں ہاں۔ پھر ملاقات ہو گی۔"

ساتھ ہی گرفت مضبوط کر لی۔ ویسے دل تو چاہ رہا تھا اس معصوم سی، پیاری سی لڑکی کو گلے لگا لے۔ چمکیلی چمکیلی آنکھوں والی۔ بڑی کیوٹ سی، سویٹ سی تھی وہ۔ اس کے عابی کی بھتیجی۔ اسی جیسی من موہنی حرکات والی۔

اسی کیلئے شاید کچھ دن پہلے ایمان نے خریداری بھی کی تھی۔ بڑی محبتوں اور چاہتوں کے ساتھ۔ عبد سے جو اک دل کا رشتہ تھا، سمندر جیسی گہرائیوں میں اتری ہوئی تھی۔ تن من ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ اور دکھائی اور سوجھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

کچھ اس کی وجہ سے بھی وہ بہت اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ اتنی' اس قدر' کہ دل میں تو اسے اتار لیا تھا' نظروں میں بھی سما گئی تھی۔ بس گلے لگانے والی خواہش کو پورا کرنے کیلئے ہاتھ بازو فارغ نہ تھے۔

اور ابھی سوچ کے راستے میں ہی تھی کہ وہ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر تیز تیز قدموں سے واپس چل دی۔ ایمان اسے جاتے ہوئے دور تک دیکھتی رہی۔

اس کے جاتے ہی عبد پر ایک دم جلدی سوار ہو گئی تھی۔ ابھی کچھ خریداری باقی تھی۔ لیکن عبد نے فوراً ہی اک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دے ڈالا۔ اس کے اشارے پر وہ رکی تو گداگر عبد کے انداز کو سمجھتے ہوئے جلدی جلدی سارے شاپرز ٹیکسی میں بھرنے لگا۔

''ارے! میرا والٹ۔؟'' عبد کو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ انہوں نے ایمان کو تھما دیا تھا۔ اور اب خود گھبرا گھبرا کر اپنی دوسری جیبیں ٹٹول رہے تھے۔

''یہ جو سر پر سوار ہے اس کو بھیک تو دوں۔'' اتنی عجلت میں بڑبڑائے۔

''بھیک نہیں۔ مزدوری کہیئے۔'' ایمان نے عبد کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے والٹ ان کی طرف بڑھا دیا۔

''تو یہ جیب کترنے کی واردات تم نے کی ہے۔؟'' مسکراتی نگاہیں ایمان کے چہرے پر جم گئیں۔

''یہ جیب کترنے کی واردات نہیں ہے۔ اپنا حق استعمال کیا ہے۔''

مگر عبد پر کچھ اس طرح عجلت سوار تھی کہ ایمان کے بولے ہوئے جملے کو انجوائے بھی نہیں کر سکے۔ والٹ میں سے ایک سرخ نوٹ نکال کر گداگر کی طرف بڑھا دیا۔ ''نہیں جی۔ میں یہ نہیں لوں گا۔''

گداگر کے منع کرنے پر انہوں نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر ایک دم انہیں غصہ آ گیا۔

''دیکھو تو آج کل بھیک بھی یہ لوگ اپنی مرضی کی لیتے ہیں۔''

''بھیک نہیں جی۔ بھیک نہیں۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ حساب سے مزدوری دیں



ہیں۔ یہ رقم مزدوری سے بہت زیادہ ہے۔''

''کیا۔؟'' عبد چونک کر اک بے یقینی کے عالم میں اسے تکنے لگے۔ جیسے کہہ رہے تھے ''یہ تمہارا دماغ کیوں اک دم خراب ہو گیا ہے۔''

''ہاں جی۔ بی بی نے مجھے سمجھایا ہے۔'' اس نے عبد کی تمام حیرتوں کا جواب دے دیا اب میں بھیک نہیں مانگوں گا۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔''

بڑی عقیدت بھری نگاہوں سے ایمان کے سراپا کو تکتے ہوئے وہ بولا۔

''اور اب تو یہ بھی نہیں۔ یہ میری بہن ہیں جی۔'' اس نے عبد کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو' جس میں وہ نوٹ تھامے ہوئے تھے' پرے ہٹایا۔ ''اور جی معصوم بہنوں سے جو وعدہ کیا جاتا ہے' وہ توڑنا تو نہیں چاہیے نا۔''

وہ نجانے کس منزل پر پہنچ گیا تھا۔

اور تبھی اس کی بات سنتے ہی عبد نے نظر بھر کر ایمان کو دیکھا۔ کیا اس لڑکی کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ اک ذرا سا سمجھانے پر وہ گداگر اپنا آبائی پیشہ چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس کی خوبصورتیوں اور کشش کے تو قائل تھے ہی۔ آج اس کی زبان اور لب و لہجہ سے بھی متاثر ہو رہے تھے۔

ہاں۔ یہ سچ تھا۔ اس کی زبان و کلام کا دھیما پن اور شیریں سا انداز بھی دوسرے کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ غرض اس کی پوری ذات اور وجود میں ہی کوئی جادو بکھرا تھا کہ وہ عبد رحمان' جنہوں نے دل ہی دل میں عزم کر رکھا تھا کہ زندگی میں کبھی کسی کے سامنے اپنے جذبوں کو سرنگوں نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیشہ اپنے جذبات احساسات کو قابو میں رکھیں گے کہ ان کے گھریلو حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔

مگر وہ عزم' اپنے ساتھ کیا ہوا وہ عہد۔ کیسے سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اک چھوٹی سی' نازک سی لڑکی نے چپکے چپکے ان کے اندر نقب لگائی تھی۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا تھا وہ سب تسخیر کر لے گئی تھی۔

''چلیں نا عابی! خالہ انتظار کر رہی ہوں گی۔'' ایمان نے ان کا بازو ہلایا۔ ''وہ تو ذرا دیر ہو جائے مصلے بچھا کر بیٹھ جاتی ہیں۔'' اجلال کی امی کی بات کر رہی تھی۔ عبد چونک کر ہوش میں آئے۔

"وہ گداگر۔" ہاتھ میں پکڑے نوٹ کو بغور دیکھا۔

"وہ تو چلا بھی گیا" ایمان ہنسی۔ "مجھے اپنی بہن بنا بیٹھا ہے۔ اور کہہ رہا تھا بھیک کبھی لینا نہیں آئندہ۔ اور بہن کا کام کر کے بھلا کوئی بھائی مزدوری بھی لیتا ہے۔؟"

"دیکھیں تو ذرا۔ اپنا کتنا نقصان کر گیا۔ آج سر عبد رحمان نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری تھی۔ سو کا نوٹ دان کر رہے تھے۔" خوبصورت آنکھوں میں ناچتی شوخی کی پریاں اچھی لگ رہی تھیں۔

"اور آج ہی......"

ایمان شرارت سے ہنسے جا رہی تھی۔

"تو تمہارا کیا مطلب ہے میں کنجوس ہوں۔ میں بخیل ہوں۔"

اپنے دفاع میں عبد نے بھی جھگڑا شروع کر دیا۔ اس کی بات پوری سنی ہی نہیں۔ "سر! کہاں جانا ہے۔؟" ٹیکسی والا پوچھ رہا تھا۔

"اوہ۔!" عبد خجل سے ہو کر اسے ایڈریس بتانے لگے۔

## 29

اچانک ہی نظر اٹھی تھی اس کی۔ ماما اور دادا سے بات کرتے کرتے، کھڑکی کے شیشے سے اس پار۔ عابی تھے اور ساتھ اک خوبصورت سی، پیاری سی، نازک سی خاتون تھی۔

مدحت یکدم ٹھٹھک گئی تھی۔ بات کرتے کرتے آواز وہیں حلق میں کہیں ڈوب کر رہ گئی تھی۔

"وہ۔ وہ...... بابا جان!" پھر چلا چلا کر عابی کے متعلق بتانے ہی لگی تھی کہ اندر اک سوچ ابھری۔ حسین عورت۔ یہ کوئی عابی کا راز نہیں تھا۔؟

"وہ۔ میری اک دوست۔ ذرا گاڑی رکوائیے۔" فوراً عقل کام کر گئی۔



عابی کے معاملے میں ہمیشہ عقل ساتھ دے جایا کرتی تھی۔ ان کی محبتوں میں پور پور ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کیلئے اس پوری دنیا میں عابی سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ ماں بھی نہیں۔ دادا بھی نہیں۔ سب کچھ عابی ہی تھے۔

"صرف دو دن کالج گئی ہے۔ دوستیاں بھی شروع ہو گئیں۔"

گاڑی رکواتے ہوئے رحمان علی خان نے ہنس کر گردن موڑی۔

"میں ابھی آئی۔" اسنے دادا کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔ نہ ماما کی نگاہ کے سوال کا جواب دے سکی۔

"کونسی دوست۔؟" فرحت کی نگاہیں پوچھ رہی تھیں۔

بس اک دم دروازہ کھول، نکل بھاگی۔ گاڑی رکتے رکتے بھی چند گز کا فاصلہ دے گئی تھی۔ اتنا کہ۔ گاڑی میں بیٹھنے والوں کو عابی نظر نہیں آ سکتے تھے۔ کچھ رش بھی بہت تھا۔ کچھ ٹریفک درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔

یوں عابی کا راز، راز ہی رہ گیا تھا۔ مدحت کے علاوہ کوئی اور کچھ بھی جان نہیں سکا تھا۔ نہ ماما اور نہ دادا جان۔ مدحت مطمئن تھی۔ عابی سے مل کر واپس گاڑی میں آن بیٹھی۔ چہرے کا رنگ ہی اور تھا۔ اور دماغ میں سوچیں بھی مختلف۔ آج عابی کے متعلق کوئی سوچ نہیں تھی فی الحال۔

"وہ کون تھی۔؟" وہ بس اسی نفیس سی خاتون کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

"وہ پیاری سی، نازک سی۔ گلاب جیسے عارضوں والی۔ ستاروں جیسی چمکتی آنکھوں والی۔ نہ صرف خود ہی حسین تھی بلکہ لگ رہا تھا اس کی ہستی کا، اس کے وجود کا حسن اردگرد بھی بکھر رہا تھا۔ کچھ ایسے جلوے تھے کہ میری بھی آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔ پر وہ کون تھی۔؟"

سوئی پھر وہیں آن اٹکی تھی۔ "عابی کے کہنے کے مطابق کیا واقعی کوئی اسٹوڈنٹ؟" اس نے بے کلی سے پہلو بدلا۔ "مگر کوئی اسٹوڈنٹ اتنی بے تکلف نہیں ہو سکتی۔ اپنے ٹیچر کے ساتھ۔ اس کا ہاتھ عابی کی جیب میں تھا۔"

کچھ سٹپٹا کر مدحت نے ماما کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی بیٹھی تھیں۔ بہت ساری خریداری کی تھی۔ تھک گئی تھیں بہت۔

”توبہ! کس قدر رش ہے اس علاقے میں۔ دکانیں اور لوگ اور ساتھ آتی جاتی گاڑیاں۔ میں تو اتنے میں ہی پریشان ہوگئی۔ اس شہر کی زندگی سے۔“

فرحت کی بڑابڑاہٹ اس کی سماعت میں اتری تھی مگر اسے اپنی سوچوں اور اپنے خیالوں سے ہی فرصت نہ تھی جو جواب دیتی۔

”اسٹوڈنٹ نہیں تو پھر کون تھی وہ۔؟“ ایک دم سے ہی دماغ میں اک کوندا سا لپکا۔ ”کیا۔؟“

عابی کے چہرے پر بڑے خوبصورت رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ایسے۔ جیسے پہلے کبھی نہ اس نے دیکھے تھے۔ لبوں پر عجب آسودہ سا تبسم پھیلا تھا۔ پھر اپنا والٹ بھی اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ ایسا استحقاق۔؟

”کیا وہ چاچی ہے میری۔؟“

”دھت بدتمیز۔!“ اس سوچ کے ساتھ ہی اس نے خود کو ہی ڈانٹ دیا۔ ”میرے عابی ایسے ہو ہی نہیں سکتے۔“

اک اضطراب کے ساتھ اس نے نظر پھیر کر دیکھا۔ ”کچھ بھی ہو وہ اک سچے کھرے اصول پرست انسان ہیں۔ جو کچھ کریں گے ڈنکے کی چوٹ کریں گے۔ چوری چکاری ان کی سرشت میں داخل نہیں ہے۔“

وہ کچھ اتنی اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ راستہ کٹنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ کب گھر پہنچ گئے۔ وہ کہاں تھی۔ کیا کر رہی تھی۔؟ اسے نہیں پتہ تھا۔

”وہ تھی بہت پیاری۔ میری چاچی بننے کے قابل۔ ہائے! کیا ظلم کر ڈالا دادا نے۔ چاچو کی ساری زندگی کے ساتھ کھیل گئے۔“

گھر پہنچتے ہی فرحت اپنے بیڈروم میں جا گھسی تھی۔ سر میں درد تھا۔ ”میں تھوڑا آرام کروں گی۔“

فرحت کے اعلان کے باوجود وہ اس کے پیچھے پیچھے ہی گئی تھی۔

”ویسے تو ماما بھی بہت پیاری ہیں۔ لیکن دل کی بات ہے نا۔ دادا نے کیوں عابی کے ساتھ زبردستی کی۔ جب کہ وہ کھلم کھلا منع کرتے رہے۔ اور۔“

پھر اسے ماضی کے بے شمار واقعات یاد آنے لگے۔ عابی اور اس کی ماما کے



تعلقات کتنے پیارے اور خلوص و محبت بھرے ہوتے تھے۔ بہن بھائی جیسے۔ ماں بیٹے جیسے۔ ساتھ ہنس بول رہے ہوتے۔ ساتھ کھاتے پیتے۔ ساتھ کھیلتے۔ ساتھ شاپنگ کرنے جاتے۔

کتنا خوبصورت تھا گھر کا ماحول۔ حویلی قہقہوں سے گونجا کرتی۔ لوگ ان کے رشتوں اور ان کی محبتوں پر رشک کیا کرتے تھے۔

پھر پاپا چلے گئے۔ غم کے بادل ان کی زندگیوں پہ کچھ یوں چھا گئے کہ......

آج تک خوشی کے سورج کی اک ننھی سی کرن کو ترس رہے تھے سب۔ سب دادا جان کی ضد کی وجہ سے۔

برادری قبیلے کے رسم و رواج ہی کو لے کر بیٹھ گئے۔ جیتے جی سب کو مار ڈالا۔

”ماما کے پاس تو میں تھی۔ کیا ملا میرے عابی کو۔ جلاوطنی۔ دربدری۔ غربت وافلاس۔ اپنوں کی جدائی۔ بے خانمائی۔ ہائے دادا! یہ آپ نے کیا کیا؟ سب سے ہی سب کچھ چھین لیا۔ ایک رشتہ بناتے بناتے سب کے سارے رشتے توڑ ڈالے۔ کسی کا بھی کچھ نہ بنا۔ نہیں کرتے کسی کے ساتھ ظلم۔ نہیں کرتے۔ آپ نے میرے عابی کے ساتھ ظلم کیا میرے اور ماما کی خاطر۔ ہماری بھلائی کے لئے۔“

وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو پی رہی تھی۔ مگر اندر دل پوری طرح گریہ و زاری میں مصروف تھا۔

”اور وہ ظلم ساتھ ہم پر بھی آن پڑا۔ نہ مجھے کوئی خوشی ملی‘ نہ میری ماما کو۔ اور عابی بیچارے تو۔ کیا کر سکتی ہوں عابی! میں آپ کیلئے۔“

اس سوچ کے ساتھ ہی مدحت کی آنکھوں میں وہ مسکراہٹیں اور خوبصورتیاں بکھیرتی خاتون پھر آن ٹھہری۔

”کیا بات ہے۔ جب سے کسی دوست سے مل کر آئی ہو‘ تم پر کچھ خاموشی سی طاری ہوگئی ہے۔ ورنہ پہلے تو میری بلبل بہت چہک رہی تھی۔“

فرحت نجانے کب سے اسے واچ کر رہی تھی۔ اور اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے خدوخال کو دیکھ دیکھ کر کیا کچھ محسوس کر رہی تھی۔

”وہ کوئی دوست نہیں تھی ماما! وہ عابی تھے۔“ بے اختیاری میں اس کے منہ

سے نکل گیا تو وہ خود ہی چونک سی پڑی۔

اور اب۔ کچھ اور بات نہیں بن سکتی تھی۔ ''وہ آئیں گے۔''

عابی کے ذکر سے چہرے کے بگڑے نقوش سنور سے گئے۔ مسکرا کر بولی۔

''انہوں نے وعدہ کیا ہے پکا پکا۔''

اس کی بات سنتے ہی فرحت پہلے تو گڑبڑائی۔ پھر تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد نارمل ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

''تو اسی وقت انہیں ساتھ آنے کیلئے کہنا تھا نا۔ بابا جان کو بھی اطمینان حاصل ہو جاتا۔''

''وہ میرے ساتھ نہیں آ سکتے تھے۔''

''کیوں۔؟''

''ان کے ساتھ کوئی خاتون تھیں۔''

پہلے جھجک کر بات کر رہی تھی۔ پھر عابی کا ذکر ہوا تو حسب معمول جذباتی ہو گئی۔ ایمان کچھ اس طرح حواس پر چھا گئی تھی کہ خود پر اختیار رہا نہ قابو۔

''ہائے ماما! کیا بتاؤں۔ وہ خاتون کتنی پیاری اور نازک سی تھیں۔ اور ان کے ساتھ کھڑے عابی۔ ایک دم جوڑی فرسٹ کلاس۔ آئیڈیل کپل۔''

پھر بولتے بولتے یکایک ہونٹ بھینچ گئی۔ یہ وہ کیا بکواس کئے جا رہی تھی؟ خود کو سنبھالا۔ ماں کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرا گیا تھا۔ اسے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ بری طرح اپ سیٹ ہو گئی۔

تھی تو بچی ہی۔ عمر سے پہلے باشعور ہونے کے دعوے کرنے کے باوجود عقل وفہم عمر کے حساب سے ہی تھے۔

''وہ۔ جیراں ابھی تک آپ کے لئے چائے نہیں لائی۔ میں لاتی ہوں۔''

اس وقت وہاں سے اٹھ جانے میں ہی اس کی عافیت تھی۔ وہ یہی سمجھ پائی۔

''سنو مدحو!'' جاتی جاتی کو فرحت نے پکار لیا تو وہ پلٹ آئی۔

ندامت کے مارے نظریں کچھ جھکی جھکی سی تھیں۔ ماں کا رشتہ عابی کے ساتھ جو تھا' اس کے تقاضے مختلف تھے۔ اور وہ انہیں نظر انداز کئے جا رہی تھی۔ اندر کی دنیا



میں پچھتاوے ہلچل مچانے لگے۔

''سوری ماما! آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔''

مگر فرحت نے اس کی سوری یا توجیہہ کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ ''اپنے دادا کو بتا دو۔ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''کیا۔؟'' وہ ماں کے چہرے ہی کو دیکھے جا رہی تھی۔ متاسف سی۔ متذبذب سی۔ ''کیا بتاؤں۔؟'' غیر حاضر دماغی سے ہی سوال کیا۔

''کہ عابی خود ہی آ جائے گا۔'' ماما کا بات کرنے کا انداز بڑا سرسری اور نارمل سا تھا۔ ''اس کیلئے وہ ہر وقت فکروں میں مبتلا رہتے ہیں۔''

''تو اچھا ہے نا۔ انہیں ان حالوں میں پہنچانے والے بھی تو وہی ہیں نا۔ اللہ میاں نے اچھا بدلہ لیا ہے۔''

''اونہوں۔ تم ایسے مت بولو۔ وہ اس کے باپ تھے۔ اس کو کچھ بھی حکم دے سکتے تھے۔''

''کیا مطلب۔؟'' وہ واپس فرحت کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

''پر ظلم کرنے کی بھی تو کہیں اجازت نہیں ملی۔ رشتہ خواہ باپ بیٹے کا ہو۔ نہ قرآن میں نہ کسی حدیث میں۔ یہ کہیں رقم نہیں کہ باپ بیٹے پر ظلم کر سکتا ہے۔''

''تو یہ ظلم تھا۔ یہی خیال ہے نا تمہارا۔'' آج کی نسل کی سوچ مختلف تھی۔ مگر فرحت اپنی صنف' اپنی ذات کا دفاع کر رہی تھی۔

اور احتجاج کے انداز میں آواز قدرے ابنارمل ہو گئی تھی۔ مدحت کو احساس ہوا۔ ماں بھی تو مظلوم تھی۔ تب چونکی۔

''آپ کا ان کے ساتھ اس رشتے میں باندھ دیا جانا ظلم نہیں تھا۔ ظلم تھا تو یہ کہ ایک انسان کی مرضی کے خلاف ساری عمر کے لئے اسے ایسے رشتے میں جکڑ دیا جائے کہ وہ قفس میں بند پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتا ہی رہے مگر آزاد نہ ہو سکے۔ آپ کے ساتھ بھی تو ہوا یہ۔ دونوں کے ساتھ ظلم ہو گیا۔ مجھے یہ دکھ ہے۔ دونوں میری عزیز ترین ہستیاں۔'' اس نے جھک کر ماں کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ ''مجھے آپ دونوں سے ہی بے پناہ محبت ہے۔ میں آپ دونوں کو ہی خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایسے ہی۔

جیسے آج عابی کو......" بات کرتے کرتے پھر بڑبڑائی۔ "مگر مطلب ہے۔ ساری زندگی
ہی عابی بیچارے بغیر کسی گناہ یا قصور کے سزا بھگتتے رہے۔ آپ کے پاس تو میں۔ اور
ہاں۔ میں عابی کی بھی تو ہوں۔ بس ماما! مجھے نہیں پتہ۔ کیا ہونا چاہیے تھا۔ ویسے ہو کچھ
غلط گیا ہے۔ بہت غلط۔"

وہ سٹپٹائی ہوئی سی نجانے کیا کچھ کہتی گئی۔ ماں کا دل بھی رکھنا چاہتی تھی کہ
اس کی باتوں سے فرحت کے چہرے پر ملال کے رنگ پھیل رہے تھے۔

مدحت عابی کو مظلوم کہتی تھی تو فرحت کی نگاہ میں اپنا وجود حقیر ہو جاتا تھا۔

"جیراں سے کہو چائے کے ساتھ مجھے سر درد کی گولی بھی دے جائے۔"

فرحت نے چائے اور گولی مانگ کر اس موضوع کو ٹالنا چاہا تھا۔ "کیا میری
وجہ سے سر میں درد ہونے لگا ہے ماما۔؟"

"نہیں بیٹا! عورت کے مقدر کا سوچ کر سر کو درد ہونے لگی ہے۔ کیا کبھی کوئی
اس کے جذبات و احساسات کو بھی پوچھے گا۔ باپ، بھائی، ماں، بیٹی۔ جن کی خاطر ہر
قربانی دے ڈالتی ہے عورت۔ وہ اس کے مقابل کھڑے مرد کی حمایت میں بولنے لگتے
ہیں۔ مرد ہے ہی مقدر کا سکندر۔ ہمارے معاشرے میں۔"

اک زہر خند فرحت کے لبوں پر پھیل گیا۔

## 30

صرف دو کمروں کا فلیٹ تھا ان کے پاس۔ دونوں کے پاس۔ افورڈ ہی اتنا
کر سکتے تھے۔ عبد رحمان اور اجلال حیدر۔ تقریباً ایک سال سے اکٹھے رہ رہے تھے۔
کچن بھی دونوں شیئر کیا کرتے تھے۔ حساب کبھی نہیں کیا تھا۔

"حساب کتاب کیا جائے تو برکت اٹھ جاتی ہے۔"

جس چیز کی ضرورت ہوتی کبھی وہ اٹھا لاتا، کبھی وہ خرید لاتا۔ "میں نے
زیادہ خرچ کئے۔ تم نے کم کیے۔" کبھی کسی ایک کو دوسرے کے ساتھ یہ شکایت نہیں



پیدا ہوئی تھی۔ ایک کمرے میں ایک کا بیڈ لگا تھا۔ دوسرے میں دوسرے کا۔ اور کچن
کے اخراجات کی طرح فلیٹ کا کرایہ بھی کبھی ایک دے دیتا، کبھی دوسرا۔

کوئی طے نہیں تھا کہ یا آدھا آدھا دیں گے یا ایک مہینے اجلال دے گا اور
دوسرے مہینے عبد دے گا۔ کبھی اوپر تلے دو تین مہینے ایک دیتا رہتا کہ دوسرے کی جیب
خالی تھی۔ بلاچوں و چراں اور بلا حیل و حجت۔ اور جب رقم ہاتھ آ جاتی تو دوسرا دینا
شروع کر دیتا۔

دونوں کے ہی دل بھی بڑے تھے اور ظرف بھی اعلیٰ۔

یوں دونوں کی دوستی بھی قائم تھی اور محبت بھی۔ لہٰذا برکت ہی برکت تھی اور
خیر ہی خیر تھی۔

اجلال کی زندگی میں ماہم آ گئی۔ کچھ ایسے کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ
ہو گیا۔ دوست کی زندگی بن رہی تھی۔ عبد ایسا سرگرم رکن تھا، اس طرح اس میں
مصروف تھا کہ جیسے خود اس کی زندگی کا معاملہ تھا۔ بیچ میں پڑ کر خود سارے معاملات
طے کرائے۔ بھاگا بھاگا کبھی اجلال کی ماں کے پاس گاؤں جا رہا ہوتا تھا تو کبھی ماہم
کی ممی کے ساتھ اس کی میٹنگ ہوتی۔

ماہم کے والد کو کیلیفورنیا میں پندرہویں دن فرم کا مینجر حاضر ملنا چاہیے تھا۔
اس نے اپائنٹمنٹ لیٹر اور پیشگی تنخواہ اور کرائے کی رقم بھی بھیج دی۔

"اوہ خدایا! اتنے سارے کام اور اتنا کم وقت۔"

جب سب کچھ طے پا گیا تو عبد رحمان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اجلال پر یہ وقت، تیزیوں کا، عجلتوں کا، بھاگ دوڑ کا، آن پڑا تھا تو
عبد رحمان کے سوا اور کون کاٹنے والا تھا۔

سوچنے سے لے کر عمل تک۔ سب کچھ شیئر کرنا تھا عبد رحمان کو۔

"یار! یہ تو شریر شریر، تیز تیز لڑکیوں کو لیکچر دے کر روٹی کما کھانے سے
بھی مشکل کام ہے۔"

---

خدیجہ بی اور منی کو عبد رحمان اپنے ساتھ ہی شہر لے آئے تھے۔ اپنے فلیٹ
میں۔ دو کمروں والے فلیٹ میں، جواب بے حد تنگ اور چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔

ماھم کی ماما کے پاس باقاعدہ رشتہ طے کرنے جانا تھا۔ اور پھر شادی وغیرہ بھی ہونا تھی۔ ایسی شادی جس کے لیے ماما بضد تھیں کہ مایوں مہندی وغیرہ سب کچھ ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ ان کی ماھم کی خوشی تھی اور پھر اس نے ایک طویل عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے جانا تھا۔

''اک لمبی جدائی۔ معلوم نہیں پھر زندگی میں ملنا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔'' کچھ ایسی حسرت بھری آہ کھینچ کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر انہوں نے کہا تھا کہ اس وقت وہاں موجود ہر کسی کا دل بھر آیا تھا۔

خدیجہ بی' عبدرحمان اور ایمان تک کا۔ ویسے ایمان تو پہلے ہی بڑی دلگیر ہو رہی تھی۔ ماھم اس کے لیے دوست سے بھی بڑھ کر کچھ تھی۔

اور عبدرحمان اجلال کیلئے دل میں ڈھیروں ڈھیر گداز لئے پھرتے تھے۔ ''واقعی۔ پتہ نہیں پھر کب ملاقات ہو۔'' ایسا ہی کچھ وہ اجلال کے لئے سوچ رہے تھے۔ اور اسی قسم کے جذبے خدیجہ بی کے اندر اترے ہوئے تھے اور انہیں ہر لمحہ عذابوں میں مبتلا کئے رکھتے تھے۔ مگر وہ تھی ہی صابر اور شاکر عورت۔ دکھ کو سکھ سمجھ لینے کی اور آنسوؤں کو مسکراہٹوں میں ڈھال لینے کی توفیق خدا نے دی ہوئی تھی۔

تب بھی ماھم کی ماما کی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور اس کیلئے بہت سارے انتظامات کی ضرورت تھی۔ پیسہ اب اجلال کی مجبوری نہیں رہا تھا۔ اور وقت کی کمی کو عبد نے مجبوری نہیں بننے دینا تھا۔ ''دوست کی یاری پھر کس دن کام آئے گی۔''

عابی نے اجلال کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر وعدہ کرلیا تھا۔ اور اک عزم پورا کرنے والا اور وعدے نبھانے والا انسان تھا وہ۔

بری کے نام پر تو ابھی کوئی شاپنگ ہی نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ ماھم کی ممی نے کہا تھا۔ ''میری بیٹی بڑی باذوق ہے۔ بے شک کم جوڑے بنا لینا مگر ہونے نفیس اور خوبصورت چاہئیں۔ ایسا نہ ہو جہیز کے مقابلے میں اوئے اوئے ہو جائے۔ پھر نہ مجھے کچھ کہنا۔''

اور عبدرحمان نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔ ''دیکھیئے گا جناب ہمارا بھی ذوق اوئے اوئے کیوں ہو گی بھلا۔''



خدیجہ دیہات کی رہنے والی سادہ سی عورت تھی۔ ساری عمر بڑی سادگی سے گزاری تھی۔ ہمیشہ سادہ ہی کھایا' سادہ ہی پہنا۔ انہیں پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ''یہ ذوق کیا ہوتا ہے اور یہ نفاستیں کیا ہوتی ہیں۔ مجھے نہیں پتہ۔''

صرف ایک بار عبد کے ساتھ شاپنگ کے لئے گئی تھیں۔ پھر انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگا لئے۔ ''یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ یہاں شہر میں تو ہر قدم پر غیر مرد کے کندھے کے ساتھ کندھا ٹکراتا ہے۔ بڑھاپے میں مجھے اپنی عاقبت نہیں خراب کرنا۔''

''تو پھر خالہ! یہ سب کچھ کیسے ہو گا۔؟'' عبد کی پریشانی کی حد نہ رہی۔ ہاتھوں میں سر تھامے شاپنگ کی لمبی لسٹ لئے تشریف فرما تھے۔

اور اجلال ان کی پریشانی پر قہقہے لگا رہا تھا۔ ''بڑا چیلنج قبول کرنے بیٹھے تھے۔ افراد کی قوت ہمارے پاس ہے نہیں۔ اور چلے ہیں مقابلے بازی کرنے۔''

عبد کو منہ بھر بھر کر طعنے لگا رہا تھا۔ ''اب بھگتو۔''

''تو فارحہ وہاں کیا کر رہی ہے۔ اسے ہی بلا لیں۔''

منی چائے لاتی نظر آئی تو عبد کو اجلال کی بڑی بہن کا خیال آ گیا۔

''اس کی ساس بیمار ہے۔ اسے کس پر چھوڑ آئے۔''

''تو کیا وہ بھائی کی شادی میں بھی شریک نہیں ہو گی۔''

''یہ شادیاں اور ان کے رسم و رواج تو فالتو ہوتے ہیں۔ فارغ لوگوں کے چونچلے۔'' خدیجہ بی نے صاف کھری بات کی۔'' اور بیمار ساس کو سنبھالنا اس کا فرض اور ذمہ داری ہے۔ میں نے ہی ابھی آنے کو منع کیا تھا۔''

''ورنہ وہ تو آنے کو تیار بیٹھی تھی۔'' اجلال نے بات مکمل کر کے عبد کو بالکل مایوسی میں مبتلا کر دیا۔ ''وہ تو بس وقت کے وقت آئے گی اب۔''

''اور اب اک یہ تولہ بھر کی منی کے ساتھ مل کر میں کیسے اچھی اور باذوق سی بری تیار کروں۔ ابھی جیولر کے پاس بھی جانا ہے۔''

''ماھم ہی کی مدد کیوں نہیں لے لیتے۔'' اجلال نے مشورہ دیا۔

''ماھم بڑی غدار ثابت ہوئی ہے۔ بات کر چکا ہوں اس سے۔''

عبد پر اس وقت خاصا اوکھا وقت تھا۔ تبھی مزاج بھی برہم ہو رہا تھا۔

"اچھا۔ چائے تو پیو۔ کرتے ہیں کچھ۔" اجلال کو اس کے مزاج کی ہم
سے معاملے کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ ورنہ عبد جیسا ٹھنڈا میٹھا تو شاید ہی کوئی اور
گا۔ اسے یہ بھی علم تھا۔

"وہ مارا۔" چائے کی آدھی پیالی چھوڑ عبد خوشی کا نعرہ مار اٹھے۔

"کیا۔؟ کیا سوجھی اب۔؟" اجلال پوچھتا ہی رہ گیا۔

مگر کوئی بھی جواب دیئے بغیر عبدالرحمان صاحب عجب سے انداز
میں مسکراتے ہوئے اور چہرے کی رونقوں کو بحال کرتے ہوئے کمرے سے واک
آؤٹ کر گئے۔

"بتاؤ نا۔ اب کیا کریں ہم۔" انہوں نے اپنا مسئلہ ایمان کے آگے جا رکھا
تھا۔ ہر بندے کو زندگی کے چھوٹے موٹے مسائل حل کرنے کیلئے کوئی نہ کوئی مشورہ کار
درکار ہوتا ہے۔ اور عبدالرحمان کو پتہ ہی نہیں چلا' کب اور کیسے انہوں نے یہ معتبر عہدہ
ایمان کے سپرد کر دیا تھا۔ اپنی ہستی' اپنے دل' اپنے ہوش و حواس کی مالک تو اسے سمجھتے
ہی تھے۔ اب چھوٹے موٹے دکھ سکھ بھی' سب کچھ ہی اس کے دامن میں انڈیلنے لگے
تھے۔ وہ بھی اک نامحسوس انداز میں سمیٹ لیتی تھی۔

اور یہ اجلال اور ماہم کی شادی کا مسئلہ تو ایسا تھا کہ اس کے ساتھ ایمان کی
بھی دلچسپی وابستہ تھی۔ ماہم کی خوشی' ایمان کی خوشی تھی' نہ صرف خوشی بلکہ وہ تو اپنا فرض
سمجھتی تھی۔ جس دن عبد اور خدیجہ بی اجلال کا رشتہ لے کر پہلی بار ماہم کی ماما کے
پاس گئے تھے تو ایمان کو ماہم ہوسٹل سے کھینچ لائی تھی۔

"سب کچھ میری مرضی' پسند اور خواہش سے ہو رہا ہے مگر پھر بھی میں گھبرائی
جا رہی ہوں۔ تم میرے ساتھ ہوتی ہو تو مجھے حوصلہ رہتا ہے۔" ماہم نے کچھ غلط نہیں
کہا تھا۔ ایمان کو بھی تو ہر معاملے میں ماہم کے ساتھ ہی تسلی ہوتی تھی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں۔" ایمان نے کافی سوچ بچار کے بعد معذوری کا
اظہار کر دیا۔ "ہوسٹل میں ہوتی ہوں۔ ادھر ماہم میرا پلہ نہیں چھوڑتی۔ ورنہ۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ بندھی رہو اسی کے پلے کے ساتھ۔" عبد الا
سے ناراض ہو گئے۔ اس وقت انہیں ضرورت تھی تو کوئی ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ خفا



گیا۔ پریشان ہو گئے۔ اور اب یہ ایمان بھی۔ جو صرف اور صرف ان کی تھی۔ ان کی
اپنی۔ "محبت ہم سے کرے اور مددگار ماہم کی بنے۔" کچھ اس طرح بے ساختہ اور
اپنائیت بھرے انداز میں بڑبڑائے تھے کہ ایمان چونک سی پڑی۔ محبتیں بے اختیار ہو
گئیں۔ دل دھڑا دھڑ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خود کو سنبھال کر ہاتھ عابی کے ہاتھ پر
دھر دیا۔

"عابی! حکم کریں مجھے۔ میں ہر طرح آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ماہم کو
سمجھا دوں گی۔" پھر کچھ سوچ کر پریشانی سے بولی۔ "ایک تو روز روز ہوسٹل سے نکلنے
کی اجازت ملنا مشکل ہے۔"

"ایسا کیوں نہیں کرتیں' ان دس پندرہ دنوں کیلئے میرے پاس آ جاؤ۔"

"جی۔ کیا۔؟" اسنے گڑبڑا کر اسے گھورا۔ چہرے پر حیا کی لالی پھیل گئی۔

"وہ۔ وہ میرا مطلب ہے خالہ کے پاس۔ ہر وقت ان کے ساتھ رہو گی تو سارے
انتظامات درزی کے پاس آنا جانا۔ جیولر کے ہاں کے چکر اور باقی سب کچھ' سہولت
سے ہو جائے گا۔"

اندر سے دل بری طرح اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ دھڑکنیں تیزی کا راگ الاپ
رہی تھیں۔ "یا اللہ! ایمان مان جائے۔ انکار نہ کر دے کہیں۔ کتنا اچھا لگے گا۔"
چند دنوں کیلئے ہی سہی۔ ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے گی۔ آہ زندگی! تو
کبھی اپنے اس عبدالرحمان پر بھی مہربان ہو سکتی ہے۔؟ چند گھڑیاں' خوشی اور سکون کی'
کیا عابی! تیرے نصیب میں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔"

ساری زندگی کی بخت کو ملی حسرتیں نوحہ کناں تھیں۔ "کاش! کاش!" دل
میں' سوچوں میں' خیالوں میں' اندر کا شہر پورے کا پورا ستاروں سے سجا لیا۔ "وہ کروں
گا۔ یہ کروں گا۔ انجوائے منٹ ہی انجوائے منٹ۔"

"میں وارڈن سے بات کر کے اجازت لے دیتا ہوں۔ پلیز تم......"

"نہیں نہیں۔" اچانک خیال آیا۔ ایمان بڑبڑا کر بولی۔ "وارڈن سے بات
نہ کریں۔ میں ماہم سے کہوں گی۔ وہ اس کی رشتہ دار ہیں۔" ایمان کو بھی عبد کا یہ
پروگرام پسند آیا تھا۔ وہ اپنے دل کی مجبوری کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بھی خواہشات کچھ

کچھ ایسی ہی تھیں۔ عابی کی قربت' عابی کا ساتھ۔ بہانہ بن جائے گا۔ بہانہ مل جائے گا۔ دل کے ارمان بھی پورے ہوں گے۔ ہر وقت نظروں کے سامنے بھی رہیں گے اور ان کی خدمت بھی کرے گی۔ ان کی محبتوں کا قرض' خدمت سے ادا کر پائے گی۔

ماھم نے سنا یہ پروگرام تو علیحدہ بھڑک اٹھی۔ ''میں آج ہی آنٹی سے بات کرتی ہوں۔'' وہ اجلال کی امی سے ملنے آئی ہوئی تھی جب اس سے عبد نے بات کی تھی۔ بہانے بہانے تقریباً روزانہ ہی آ جایا کرتی تھی۔ ماما سے اور گھر والوں سے چوری۔ کہ شادی ہونے والی تھی اس لئے اس کا اس گھر میں داخلہ بند تھا۔ مگر وہ ماھم ہی کیا جو کوئی پابندی قبول کر لے۔

''ہمارا عابی بس ہے بڑا فرسٹ کلاس۔'' پڑھائی ختم ہو چکی تھی اس لئے اب عبدرحمان ٹیچر تو رہے نہیں تھے۔ بے تکلف دوست بن چکے تھے۔ اجلال کی طرف سے بھی تعلق تھا۔ ''عقل فہم والا۔ دور کی کوڑی لاتا ہے۔ کتنا مزہ رہے گا۔ ہوسٹل کی حاضری کی قید ختم ہو جائے گی۔ پھر میں اور ایمان ساری ساری رات باتیں کیا کریں گی۔''

''محترمہ! ہوش میں تو ہو۔ ہوسٹل سے اسے لانے کا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ آسمان سے گرا کر ہم اسے کھجور سے اٹکا دیں گے۔''

''کیا مطلب۔؟''

''ایمان رہے گی تو ہمارے پاس۔ یہاں اس گھر میں۔ جہاں آج کل تمہارا داخلہ بند ہے۔ تو پھر تم رات بھر اس سے باتیں کیسے کرو گی۔ ہوسٹل سے رہائی دلانے کا مقصد خالہ کو سہولت دینا ہے نہ کہ تمہیں اک اچھا سامع مہیا کر دیں۔ منہ دھو رکھو۔ اور جاؤ اپنے گھر۔''

دونوں جب اکٹھی ہو جاتی تھیں تو انہیں کسی تیسرے کا خیال ہی نہیں رہتا تھا۔ اتنی باتیں کرتی تھیں۔ عبد کو ان کے ساتھ گلہ ہی رہتا تھا۔ اور پھر اپنے ارمان دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے۔

''ہائے ہائے دوست میری اور مجھے ہی ٹھینگا دکھا رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔'' ایمان کو ماھم خالص اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ عبد سے جھگڑا کرنے لگی۔



خدیجہ بی اور اجلال سن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔

''عقل کے ناخن لو ماھم۔'' عبد بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہے تھے۔ وہ ایمان کو صرف اور صرف اپنا سمجھتے تھے۔ کوئی اور یہاں تک کہ ماھم بھی' اس پر حق جتائے یہ کیسے ممکن تھا۔ ''تمہاری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے جو تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ ایمان کو ہوسٹل سے چھٹی ہم دلا رہے ہیں۔ اس گھر کی وہ ضرورت ہے اس وقت۔ اور تم اسے اپنے گھر لے جانے پر مصر ہو۔ صرف فضول کی باتیں شاتیں کرنے اور گپیں لگانے کی خاطر۔''

عبد نے اتنے حسین سپنے دیکھ ڈالے تھے اس پروگرام کے ساتھ ساتھ اور یہ رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئی تھی۔ وہ کون ہوتی تھی اس پر قبضہ جمانے والی۔ انہیں اس کی دھاندلی پہ غصہ آنے لگا تھا۔ ''چلو اٹھو جاؤ تم اپنے گھر۔ اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہمیں شادی کے بہت کام ہیں اور ہمارے پاس مین پاور بھی کم ہے۔ کیا تمہیں اس کا بھی احساس نہیں۔''

''نہیں بس۔ ایمان میرے ساتھ' میرے پاس رہے گی۔ میں تبھی اس کو چھٹی دلاؤں گی آنٹی سے۔''

ماھم بھی کافی جھگڑالو تھی۔ یوں بھی شکست ماننا اس کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ ''ایک عورت کام کرنے والی میں بھیج دوں گی۔ بہت محنتی ہے۔ ان تھک کام کرتی ہے۔''

''ہاں۔ وہ تمہاری ماما کی پسند کے مطابق بڑی نفیس اور باذوق سی بری بھی بنا لے گی اور ہمارے ساتھ شاپنگ کے لئے بھی جایا کرے گی اور اچھے اچھے مشورے بھی دے گی۔''

عبد کو اس کی آفر پر مزید غصہ آ گیا تھا۔ طنزیہ لہجہ اختیار کر کے بلند آواز میں بڑبڑانے لگے۔ پھر پاس بیٹھے' ان کی باتیں سن سن کر مسکراتے ہوئے اجلال کی طرف رخ موڑا۔ ''یار! تم ہی اس کو کچھ سمجھاؤ۔''

''تمہیں کیوں نہ سمجھاؤں۔ تم غصے میں کیوں آئے جا رہے ہو۔''

''کیا مطلب۔؟''

"چند دنوں میں اس کی شادی ہونے والی ہے۔ تم بھلا کیوں اس دلہن بی بی کے ساتھ جھگڑا کر رہے ہو۔ مان لو اس کی بات۔ کچھ اس کی حیثیت کا ہی احترام کر لو۔"

"احترام۔؟ اس بیوقوف کا۔؟ تم بھی پاگل دیوانے ہو رہے ہو اس بے عقل کے پیچھے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو ایسی لڑکی سے شادی کرنے سے سرے سے ہی انکار کر دیتا۔ اور تم ہو کہ الٹا اس کی طرفداری کر رہے ہو۔"

اجلال مسکرائے جا رہا تھا۔ "تو کیا شادی سے ہی انکار کر دوں۔؟"

"ہاں تو اور کیا۔ رتی بھر تو عقل نہیں ہے اس لڑکی کو۔ کیا خاک تمہارا گھر سنبھالے گی۔ اور جو گھر ہی نہ سنبھال سکے اس سے شادی کیا کرنی۔"

"کہا تھا نا۔ کام کے لئے اک عورت بھیج دوں گی۔ تو عابی! اس کام والی عورت سے اپنے دوست کی شادی کر دو۔ وہ گھر تو سنبھال لیتی ہے لہذا گھر والی بھی پھر وہی بننے کی حقدار ہے۔ اور میں اب چلوں پھر۔"

ماھم ہنستی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا کیا۔؟" عابی چونکا۔ کھڑی جانے کو تیار ماھم کی طرف دیکھا۔ "یہ تم کہاں چل دیں۔"

"خود ہی تو اجلال کو مشورہ دے رہے ہیں کہ شادی سے انکار کرو۔ تو پھر میں تو فارغ ہو گئی نا۔"

"لیکن۔ میرا مطلب یہ کب تھا۔" وہ گھبرا گھبرا کر اجلال، خدیجہ بی اور ماھم کو باری باری تکنے لگے۔ "میں تو۔ میں تو۔"

"ایمان کے لئے بیقرار تھا۔" ماھم نے شوخی سے آنکھیں نچائیں۔ پھر اجلال بھی قہقہے لگانے لگا جب ماھم نے عابی کا جملہ مکمل کیا۔

"برے پھنسے۔" عبد نے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ تو دونوں ہی اسے چھیڑ رہے تھے۔ مذاق کر رہے تھے۔

"بھئی کیوں تنگ کر رہے ہو میرے بیٹے کو۔" خدیجہ بی نے اٹھ کر عابی کے سر پر ہاتھ پھیرا پیار کیا۔ پیشانی پہ بوسہ دیا۔ "مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ جلی سے



فارغ ہو کر پھر تمہارا کچھ کروں گی۔ ماشاء اللہ میری دونوں بہوئیں فجر کے نام کی ہا۔"

بے حد پیار سے ماھم کی جانب دیکھنے کے بعد پھر عابی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "جلی کا تو جلدی میں کر رہی ہوں۔ تمہاری باری خوب ارمان نکالوں گی۔ اور ابھی تو مجھے شہر کا کچھ اچھی طرح پتہ بھی نہیں چلتا۔ پھر ساری شاپنگیں خود کروں گی۔ دیکھنا تو سہی۔ ہنسنے دے ان شریروں کو۔ پیار بھی تم سے بہت کرتے ہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے۔"

خدیجہ بی نے عابی کو پیار کر کے ان دونوں کا راز کھول ڈالا۔ ویسے عبد کو پہلے ہی ماھم کی شرارت کا علم ہو گیا تھا۔ اور اندر ہی اندر دل ہی دل میں خود کو کوس رہے تھے۔

بیوقوف ماھم کو کہہ رہے تھے اور بن خود گئے تھے۔ تبھی یکایک ہی خاموشی اختیار کر لی۔ اور جب خاموشی اختیار کی تو عقل و فہم بھی دماغ میں آن بیٹھی۔ "پر تمہیں عبدالرحمان! یہ سب کچھ کہنے کا حق کب پہنچتا ہے۔" فوراً اپنی بے بسی اور بیچارگی کا احساس ہو گیا۔ اپنے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کا خیال آ گیا تھا۔

دل ہی دل میں اعتراف کر رہے تھے۔ ہمارے پاس تو ترپ کا کوئی پتا ہی نہیں ہے پھر ہم ماھم سے ضد کیسی لگائے بیٹھے تھے۔ کیوں عابی! تمہیں تو زندگی کی بچھی اس بساط کے سامنے بیٹھنے کا حق ہی کوئی نہیں ہے پھر کس بنیاد پر مہروں کو ترتیب دے رہے ہو۔ کیا کھیلو گے۔ کیسے کھیلو گے۔؟"

عبد چپ سے ہو گئے تھے۔ ماھم سمجھی۔ وہ ایمان کے متعلق سوچ رہے تھے "آپ فکر نہ کریں بھائی۔ کل ایمان کو چھٹی دلا کر یہاں چھوڑ جاؤں گی۔" پھر آپ ہی آپ ہنسی۔ آج کل اندر کا موسم اتنا پر بہار تھا کہ ہر وقت ہنسی کے گلاب کھلتے رہتے۔

"میں نے وعدہ کر رکھا ہے نا کہ امریکہ جاتے ہی ہمایوں خاں سے ملونگی۔"

مزید وہ پتہ نہیں کیا کیا کہتی رہی۔ خدیجہ بی ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی تھیں۔ وہ عابی کو تسلیاں دلاسے دیئے جا رہی تھی۔ یہ جو کبھی کبھی عبدالرحمان چپ سے ہو جاتے ہیں اس کے خیال میں وجہ ایمان کا نکاح تھا۔

"ماھم بی بی! تم بہت مخلص ہو۔ لیکن تمہیں کیا بتاؤں۔ تم ہمایوں خان کے دیس میں جا کر بھی ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکو گی۔ جن زنجیروں میں' میں جکڑا ہوا ہوں وہ ایمان آفریدی کی زنجیروں سے بھی زیادہ مضبوط ہیں اور نہ صرف مضبوط بلکہ ان کو لگے قفل کی تو چابی بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایمان آفریدی کو ہمایوں خان سے آزاد کرالو گی مگر مجھے کیسے آزاد کرا پاؤ گی۔"

عبد کی نگاہوں میں مدحت گھوم رہی تھی۔ اس کا ہنستا مسکراتا پیکر ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں ڈول رہا تھا۔ وہ ماھم کی تسلی دلاسوں کے باوجود زیادہ افسردہ زیادہ ملول ہوئے جا رہے تھے کہ روز بروز دل زیادہ سے زیادہ بے سکون اور بے قرار ہوتا جاتا تھا۔ اپنے آپ ہی کو بہت سمجھانے کی کوشش کرتے۔ مگر دل ناتواں سمجھنے ہی میں نہ آتا۔ نہ حالات کا احساس کرتا اور نہ مجبوریوں کا۔ بس ہر وقت اکھڑا اکھڑا' بے چین بے چین اور مضطرب سا ہی رہتا۔

اگلے ہی دن ماھم نے وارڈن سے بات کر کے ایمان کو پندرہ دنوں کے لیے ہوسٹل کی پابندیوں سے آزاد کرا لیا۔ پھر خود اسے اس کی ضرورت کے سامان سمیت عابی اور اجلال کے گھر چھوڑ گئی۔ بہت ساری نصیحتیں اور بہت ساری تاکیدیں کر کر کے۔ "میری دوست بڑی قیمتی ہے۔ اس کا خیال اچھی طرح رکھنا۔ اس کی خاطر تواضع کسی وی۔ آئی۔ پی مہمان کی طرح کرنا۔"

اور عابی سے تو بطور خاص بولی تھی۔ "اس کا دل بھی لگانا ہے۔ یہی نہیں کہ بس کام ہی کراتے رہنا ہے۔ پھولوں جیسی نازک ہے میری دوست۔ اور میں اسے روزانہ دیکھنے بھی آیا کروں گی۔"

عابی کو اس کی اس بات پر بڑی ہنسی آئی تھی۔ ایمان کو نظروں کے سامنے پا کر اندر سکون و اطمینان جو اتر آیا تھا۔ دل کی بستی میں پھول کھل اٹھے تھے۔

"تم اب کیوں روزانہ آؤ گی۔ خدا کیلئے اب چار دن سکون سے گھر بیٹھو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کیسی دلہن ہے۔ چار دن شادی میں رہ گئے ہیں اور سسرال والوں کے گھر کے چکر ہی لگاتی رہتی ہے۔ ذرا شرم حیا نہیں ہے۔" ایمان کو سامنے دیکھ کر شوخ ہو گئے۔



"کچھ کہتے رہیں لوگ۔ میں نے کبھی کسی کی باتوں کی پرواہ نہیں کی۔" اس نے بے پرواہی سے کندھے جھٹک دیئے تھے۔

ایمان نے آتے ہی سارے گھر کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ کچھ اس طرح جیسے یہ اس کا اپنے ہی گھر کا معاملہ تھا۔ کچن سے لے کر بازار' مارکیٹیں اور شاپنگ سنٹر تک۔ لمبی لمبی لسٹیں بن گئی تھیں۔ دن زیادہ تر شاپنگ میں گزر جاتا۔

خدیجہ بی کو تو کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ کیا کرنا تھا کیا نہیں۔ بولائی بولائی ہی اندر باہر پھرتی رہتیں۔ منی نے اردگرد فلیٹوں میں سے بہت ساری سہیلیاں بنالی تھیں۔ رات ہوتے ہی سب ڈھولک لے بیٹھتیں۔ بہت ڈھیر سارے اسے گاؤں کے گانے یاد تھے۔ پنجابی زبان کے۔ بے تحاشا رونق لگتی۔

"ارے! ہماری منی تو بڑے گنوں کی مالک ہے۔"

عابی حیران بھی ہوتے پھر اس کے مقابل خود آن بیٹھتے۔ بڑی ترنگ میں تھے ان دنوں۔ صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے ایمان ساتھ ہوتی تھی۔ کلاسیں اٹینڈ کر کے اکٹھے واپس آتے تھے۔ پھر شاپنگ کیلئے ایمان کا ساتھ۔ اکٹھے شاپنگ کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی پیار ومحبت کی باتیں ہوتی رہتیں۔ پھر چھوٹے موٹے اختلاف بھی ہو جاتے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے۔ پھر صلح ہوتی۔ کچھ شوخیاں شرارتیں ہوتیں ایک دوسرے کے ساتھ۔ زندگی میں اتنی خوبصورتیاں تھیں۔ یہ تو انہیں اب ہی پتہ چلا تھا۔ اور ان خوبصورتیوں نے ان کے اندر عجب سا سکون و اطمینان اتار دیا تھا۔

تب منی کے مقابلے میں بیٹھ کر عابی اپنی بے حد خوبصورت آواز کے ساتھ بھی کوئی غزل' کوئی گیت' کوئی نظم سناتے۔ سارے ماحول میں حسن ہی حسن اور ترنم ہی ترنم پھیل جاتا۔

خدیجہ بی اور ایمان پاس بیٹھ کر حساب لگاتی رہتیں۔ سارے دن کی شاپنگ چیک کرتیں۔ ان کی پیکنگ کی جاتی۔ اگلے دن کے لیے پروگرام بنتا۔ اور کیا کیا باقی رہ گیا تھا اور کیا کیا خریداری مزید ہونا تھی۔ ساتھ ساتھ ایمان کی نظریں عبد کی نذر اتارتی رہتیں۔ اور عبد کی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرتی رہتیں۔ کیسے جذبے اور کیسی وارفتگی ہوتی دونوں کی نگاہوں میں۔ یہ دونوں ہی جانتے تھے اور دونوں ہی

مسرور ومسحور ہوئے رہتے۔ دونوں کے حالات کا یہ تقاضا نہ تھا کہ دونوں ایک جگہ
قربتوں میں اکٹھے رہتے۔ ان کے لئے دوریاں بہت ضروری تھیں مگر حالات کی ستم
ظریفی نے دونوں کو ایک گھر میں یکجا کر دیا تو ان کے جذبات مزید شدتیں اختیار کر
گئے۔

ایمان ہر وقت عابی کا بہت خیال رکھتی۔ یونیورسٹی جانے سے پہلے اپنے
ساتھ ساتھ ان کے کپڑے بھی پریس کر کے رکھ دیتی۔ اپنے ساتھ ان کا ناشتہ بھی تیار
کر دیتی۔ پھر واپس گھر پہنچنے پر اس کے کھانے پینے کا ہمہ وقت اسے خیال رہتا۔ اس
کی چیزیں سنبھال کر رکھتی۔ اس کی گھر گرہستی پر پوری توجہ دیتی۔

عابی تو جیسے اک دم ہی جنت میں آ گیا تھا۔

مسکراہٹوں کی بجلیاں گراتی وہ ساحرہ اس کے آس پاس کام کرتی پھرتی تو
عابی کا دل ہر قدم پر محبت کی اک نئی اور انوکھی منزل طے کرتے ہوئے عشق کی
انتہاؤں تک پہنچے جا رہا تھا۔

اور۔ ایمان آفریدی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

ہمایوں خاں سے نکاح ہونے کا جتنا دکھ' غم اور پریشانی لگی تھی۔ جس طرح
زندگی سے بیزاریوں میں مبتلا ہوئی تھی۔ ایسا عذاب نہ کسی پر اترا ہو گا کبھی اور نہ کسی کو
ملا ہو گا۔ نجانے وہ کیسے جی گئی تھی۔

اجلال اور ماھم کی شادی' شاید اسی کا ازالہ تھا پروردگار کی طرف سے۔ کچھ
ماھم کے وعدوں نے زخم بھرے تھے اور کچھ شادی کے کاموں میں مصروف ہو کر وہ
نکاح والی ساری پریشانی اور اذیت برائے چندے بھلا سی بیٹھی تھی۔

''یہ اللہ میاں بھی بڑا مہربان اور کارساز ہے۔ کیسے کیسے اپنے بندوں کو
انعامات سے نواز دیتا ہے۔''

اور یہ انعام اسے عابی کی صورت میں ملا تھا۔ اس کے دماغ میں ایسی ہی
سوچیں سمائی رہتیں۔ اور وہ اندر کے جذبوں میں سرشار اور مگن رہتی۔ پھر اس کا دل
چاہتا وہ عابی کی بے انتہا خدمت کرے۔ اتنی کہ عابی کی محبت جو دل میں اتر چکی تھی'
اور اس کی جو ایک انوکھی سی بیقراری مسلسل اندر لگی رہتی تھی' اسے کچھ سکون آ جائے۔



ویسے تو عبدالرحمان آج کل زیادہ وقت نظروں کے سامنے ہی رہتے تھے۔ یہ
بھی دل کے سکون اور قرار کا باعث بن رہا تھا۔ مزید برآں ان کے کام اپنے ہاتھوں
سے کرتی ان کی خدمت میں وقت گزارتی تو لگتا یہی سب اس کی زندگی کا حاصل تھا۔
یہی اس کی آرزوئیں اور ارمان تھے۔ اور یہی حیات کی سربلندی اور سرفرازی۔ اسے اور
کیا چاہیے تھا۔ اسے تو کنارے مل گئے تھے۔ اس کی تو ڈوبتی ناؤ پار لگ گئی تھی۔ خوشیاں
مسرتیں کچھ اس طرح اس کے چہرے کا احاطہ کئے رکھتیں کہ جتنی وہ پہلے حسین تھی اس
سے کہیں زیادہ حسین تر دکھائی دیتی۔ کچھ ایسا رنگ روپ اس کے چہرے پر جگمگاتا رہتا۔

''یہ تم آج کل کیسا میک اپ کرنے لگی ہو۔'' ماھم اس سے حیران ہو کر
پوچھتی۔ ''نگاہ ہی نہیں ہٹتی تمہارے چہرے سے اتنی زیادہ خوبصورت ہو رہی ہو۔''

''تمہیں پتہ ہے میں میک اپ کبھی نہیں کرتی عام دنوں میں۔ جب تک
کوئی خاص فنکشن نہ ہو۔ وہ بھی ہلکا ہلکا سا۔''

''مگر یہ تمہارے عام دن تو نہیں ہیں۔ بلکہ بطور خاص کسی تقریب کے دن
ہی سمجھو۔ یہ سر عبدالرحمان جو ہر وقت سر پر مسلط رہتے ہیں۔ تمہارے لئے تو ہر ہر لمحہ
تقریب بن جاتا ہو گا۔''

''اور میں پل پل بعد اٹھ کر میک اپ کرتی ہوں گی۔'' نقرئی سے قہقہے کے
ساتھ چوٹ کی۔

''تمہارا حسن تو کچھ ایسی ہی چغلی کھا رہا ہے۔'' ماھم ڈھٹائی سے بولی۔

''بکواس کر رہی ہو۔'' ایمان کے چہرے پر مزید لالیاں بکھر اٹھتیں۔ وہ
انگاروں کی طرح دہکنے لگتی۔ حیا و حجاب میک اپ بن کر پھیل جاتا وہ اور بھی حسین ہو جاتی۔

ماھم اپنے گھر والوں سے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر روزانہ ہی تو ادھر آ جاتی
تھی۔ ادھر والی محفلیں اسے زیادہ پررونق لگتیں۔ اجلال تھا یہاں۔ خدیجہ بی تھیں۔ اس
پر قربان اور نثار ہوتی رہتیں۔ بیٹے کا انتخاب انہیں بہت پسند آ گیا ہوا تھا۔ اس
کے علاوہ وہ عابی تھا۔

اب تو عابی کی حیثیت اور مقام ماھم کی نظروں میں کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔
بہت اور بڑے بھائی جیسا۔ اور ایمان کے تعلق سے عزیز ترین۔ پھر سارے ہی

شادی کے پروگرام عابی ہی فائنل کر رہے تھے۔ ماھم کے بھی۔ ادھر اجلال کی طرف کے بھی۔ اپنے مفید مفید مشوروں سے بھی نواز رہے تھے اور پایہ تکمیل کو بھی بصد خلوص نیت پہنچا رہے تھے۔ انتہائی محبتوں اور پرواہ اور ذمہ داری کے ساتھ۔ بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

پھر سب سے بڑھ کر ایمان تھی یہاں۔ جس کے بغیر اک پل بھی جیسے اس کا گزارہ نہ تھا۔ آتے ہی پہلے ادھر اپنے گھر کے سارے معاملات اور فیملی کی پرابلمز اور جھگڑے وغیرہ سرگوشیوں اور کھسر پھسر کے ذریعے گوش گزار کرتی۔ پھر آنے والے وقت کے بظاہر شورے کرتی لیکن درپردہ اپنی اس عادت کی تسکین کرتی جو ہر بات میں ایمان سے شیئر کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔

''فلاں فلاں کپڑا سلوا چکی ہوں۔ لہذا تم اب خریداری کرتے ہوئے خیال رکھنا کہ اس قسم کے اور اسی رنگ میں مزید نہ بن جائیں۔''

نئے نئے فیشن اور ڈیزائن کے ملبوسات بنوانے کا تو اسے کریز تھا۔ ہمیشہ سے ہی۔ اور اب تو اس نے امریکہ چلے جانا تھا۔ نجانے کتنے عرصہ کیلئے۔ بیسیوں سینکڑوں بنوا رہی تھی۔ جہیز میں بھی۔ بری میں بھی۔ وہ بھی ہدایات ایمان کے ذریعے جاری کرتی تھی۔

''منی! بھابھی آئی ہے۔ اس کے لیے میں نے حلوا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ گرم کر کے لے آؤ۔ اور ساتھ پکوڑے بھی جھٹ پٹ نکال لینا۔ اور ہاں کیک بھی۔''

ماھم کے آتے ہی خدیجہ بی کو اس کی خاطر مدارات کی پڑ جاتی۔ منی کو بھگانے کے بعد بھی تسلی نہ ہوتی تو خود کچن کا رخ کرتیں۔ اور جو کچھ اسے بتایا ہوتا اس سے کہیں زیادہ لوازمات کے ساتھ بھرے ٹرے لئے آتیں۔

کھانے کی اتنی ساری چیزیں دیکھ کر اجلال بھی لپک آتا۔ ان میں گھس کر بیٹھ جاتا۔ کھاتا پیتا۔ منی کے ساتھ ڈھولک پر بے سرے راگ الاپتا۔ ایمان اور ماھم تو ہنستی رہتیں عابی کو البتہ تپ چڑھنے لگتی۔

اتنے کام تھے اور اجلال تنکا بھی توڑ کر نہیں دیتا تھا۔ ''واہ میری شادی ہے۔ میں کیوں کام کروں۔ تمہیں معلوم نہیں یہ ہمارے ہاں کا رواج ہے۔ کہ دولھا کام نہیں



کیا کرتا۔ پھر تم اس عہدے پر فائز ہی نہیں ہوئے ابھی تو تمہیں کیسے معلوم ہوتا۔''

''تمہارے بعد اس کی بھی باری آ جائے گی خیر سے۔ میں خود سارے شگن کروں گی اپنے اس پتر کے۔'' خدیجہ بی کہیں نہ کہیں سے فوراً نکل کر آ جاتیں اس وقت اور عابی کیلئے اپنی محبتوں کا اظہار کرنے سے کبھی نہ چوکتیں۔''

عابی گڑبڑا کر' پریشان ہو کر کسی اور طرف اپنی توجہ مرکوز کر دیتا۔ اندر ہی اندر اداسیاں سی اتر جاتیں۔ اردگرد اتنی ڈھیر ساری بکھری رونقوں کے باوجود۔ سامنے بیٹھی ایمان کی سحر انگیز ہستی کے باوجود۔ اسے لگتا وہ کسی لق و دق صحرا میں تنہا کھڑا تھا۔ ناکام و نامراد۔ بھوکا پیاسا۔ بے نام ونشان۔ کوئی منزل نہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں۔

## 31

''مدحو۔ مدحو۔ میری بات سن چندا۔ میری جان۔ چاچو کی جان۔''

عابی مدحت کو منا رہا تھا۔ بتا رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا۔ ''جب تک اجلال کی شادی کا ہنگامہ اور مصروفیت ہے میں یہاں شفٹ نہیں ہو سکتا۔'' وہ منہ سجائے پھلائے بیٹھی تھی۔ ''اس کڑے وقت میں ان سب کو میں اکیلا کیسے چھوڑ دوں۔ جبکہ سب کچھ ہی تو مجھے کرنا پڑ رہا ہے۔''

''آپ جیسے بڑے تجربہ کار ہیں نا۔''

''چلو تجربہ کار نہ سہی' پر لوگ تمہارے چاچو کو اک ذمہ دار انسان تو سمجھتے ہیں نا۔ اور اسی لئے کچھ ذمہ داریاں مجھ پر ڈال دی ہیں۔ لہذا اب انہیں نبھانا میرا فرض بن گیا ہے۔''

اور کہاں مدحت نے شہر میں پہنچتے ہی اک اک لمحہ اپنے عابی کی سنگت میں گزار دینے کے ہزاروں سپنے دیکھ رکھے تھے۔ سینکڑوں پروگرام دل ہی دل میں بنائے ہوئے تھے۔ مگر تین دن ہو گئے تھے۔ آئے ہوئے اور عابی اب پہنچے تھے۔ وہ بھی گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے۔ جس کا اعلان آتے ہی انہوں نے کر دیا تھا۔ اب بھلا اسے

غصہ نہ آتا تو کیا ہوتا۔ وہ ناراضگی کا اظہار نہ کرتی تو کیا محبت کا اظہار کرتی۔؟ عابی
محبت ہی تو اسے اتنی بڑی حویلی سے نکال کر اس کنال بھر کے بنگلے میں لے آئی تھی
جبکہ اسے حویلی میں رہنا بہت پسند بھی تھا۔

ہوسٹل میں انتظام ہو جاتا تو ہر ویک اینڈ پر حویلی چلی جایا کرتی اور پھر چھٹیاں
جب جب ہوتیں وہ حویلی میں منایا کرتی۔ مگر صرف عابی کی محبت کی خاطر اس نے یہاں
آنے کی حامی بُھری تھی۔ ہر وقت عابی تو ساتھ ہوں گے۔ کیا انہیں خود سے معلوم نہ تھا
وہ شاکی نظروں سے انہیں تک رہی تھی۔ ''اچھا بس نا اب اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔''

''چلیں آئیں آپ کو سارا گھر دکھاؤں۔ چائے بعد میں پلاؤں گی۔'' اک
مدھم سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ لئے مدحت عابی کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ ٹی۔ وی لاؤنج ہے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔''

''اچھا۔؟ مجھے تو نہیں معلوم تھا۔ بہت اچھا کیا تم نے بتا دیا۔''

عابی نے مذاق اڑایا تو وہ پھر چڑ گئی۔ ''آپ ایسے کریں گے تو میں پھر
ناراض ہو جاؤں گی۔ اور اب ناراض ہوئی تو صلح بھی نہیں کروں گی۔''

مدحت نے دھمکی دی۔ مگر عابی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''اوئے ہوئے۔ صلح بھی
نہیں کرو گی تو پھر میرا کھانا کیسے ہضم ہو گیا۔ اور اگر کھانا......''

''عابی۔!'' اس نے چیخ کر عبد کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

دوسرے ہاتھ سے بازو پکڑ کھینچتے ہوئے سامنے والے کمرے کا دروازہ
کھولا۔ ''یہ ماما کا اور میرا بیڈروم۔''

اور اسی طرح اسے کھینچتے ہوئے اک اگلے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر
داخل ہو گئی۔ ''یہ میرے پیارے پیارے جان سے پیارے چاچو کا کمرہ۔''

اس کے پردے' بیڈ کور' میٹنگ اور قالین سب آسمانی رنگ میں تھے۔ ''اچھا
ہے نا۔ عین آپ کی پسند کے مطابق۔'' بڑے پیار سے پوچھ رہی تھی۔

اور واقعی کمرے کی آرائش و زیبائش اتنے اچھے انداز میں کی گئی تھی کہ
بے حد خوبصورت اور بڑا نفیس لگ رہا تھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے۔'' دل سے معترف تھا۔ مگر آنکھوں میں شوخی بھی



ستارے چمک رہے تھے۔ لہجے اور انداز کی طرف مدحت نے دھیان ہی نہیں دیا۔

''سارا گھر ہی ٹھیک ہے۔ بس صرف اک بات میری مرضی کے مطابق نہیں۔ لیکن کیا کیا
جائے۔'' حسرت بھری آہ کھینچی۔ ''اللہ کی مرضی۔ سوائے صبر کے کوئی اور چارہ نہیں۔''

''کیا عابی۔؟ کیا۔؟'' بے تابی سے پوچھا۔ ''بتائیں کونسی بات مرضی کے
مطابق نہیں۔ دادا سے کہہ کر بدلوا دوں گی۔''

''پر یہاں تمہارے دادا صاحب بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

''وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ بتائیں تو سہی۔'' وہ پوچھنے پر مصر تھی۔

''بس۔ بھتیجی مرضی کے مطابق نہیں۔ ان سے کہہ کر اسے بدلوا دو۔'' انتہائی
دکھی ہو کر جملہ بولا۔ ساتھ ہی بھاگ پڑے۔ اس کا ردعمل کیا ہونا تھا۔ اس سے بخوبی
واقف تھے۔

''اچھا۔ اچھا۔ اب بھتیجی بدلوانے کی خواہش ہے۔''

آگے آگے عابی بھاگ رہے تھے پیچھے پیچھے مدحت تھی۔ سارے گھر میں
ہی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ اور پھر اچانک ہی یہ دوڑ اس کمرے تک آ کر تھم گئی۔ وہاں بابا
جان تھے۔

عابی انہیں دیکھتے ہی پلٹے تو۔ مدحت سے ٹکرا گئے۔ وہ ان تک پہنچ چکی تھی۔
ایک دم سے ہی ان سے لپٹ گئی۔

''یہ بابا جان ہمیشہ میری شکست کا باعث ہی بنتے ہیں۔'' دل ہی دل میں
بڑبڑا کر رحم طلب نگاہوں سے مدحت کو دیکھا۔ ''ساری زندگی ہی شکست خوردہ ہو کر رہ
گئی۔'' گزری زندگی کا ہر لمحہ اک لمحے میں آنکھوں میں گھوم گیا۔

پر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مدحت نے عابی کو بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ پھر
انہیں کھینچتے ہوئے لا کر لاؤنج میں اک صوفے پر پٹخ دیا۔

''بھتیجی بدلنا چاہتے ہیں۔ ہیں۔؟ بھتیجی بدلیں گے۔؟''

عابی کی پشت پر مکے رسید کئے۔ عابی کے بال کھینچے۔ بگاڑے۔ نوچے
کھسوٹے۔ اس پر اپنا بچپن پورا کا پورا سوار ہو گیا تھا۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہو
جاتی۔ خصوصاً عابی سے۔ تو اسی طرح اس کا حشر نشر کر دیا کرتی تھی۔ بہت سارے

سالوں بعد آج ویسا ہی واقعہ پھر پیش آ گیا تھا۔ جواب میں عابی ہنسے جا رہے تھے۔ بہت اچھا لگ رہا تھا یہ سب۔

اور ایسے میں، جبکہ اندر کا موسم پورے جوبن پر تھا۔ جشن بہاراں کا سماں تھا۔ بڑی شدت کے ساتھ ایمان آفریدی یاد آ گئی۔ دل مچل اٹھا۔ ''ارے! مجھے جلد واپس پہنچنا تھا۔'' پھر یکایک چونکے۔ ''اور آج بائیک بھی کچھ تنگ کر رہی ہے۔'' کلائی کی گھڑی کی طرف نظریں گھمائیں۔

ایمان کے ساتھ شاپنگ کے لئے جانا تھا۔ وعدہ کیا ہوا تھا۔ وقت دیا ہوا تھا۔ آدھا گھنٹہ لیٹ ہو گئے تھے۔ اوپر سے بائیک کی خرابی کا خیال آ گیا۔

''تو اپنی گاڑی لے جائیں نا۔''

''اپنی گاڑی۔؟'' موڈ یکدم تبدیل ہو گیا۔ ''میں کس دن گاڑی کا مالک تھا۔؟'' بہت ساری محرومیاں یاد آ گئیں۔ جو قدم قدم پر ملی تھیں بہت ساری تشنگیاں بہت ساری نا آسودہ ساعتیں، نگاہوں میں گھوم گئیں۔ جو سب کچھ ہوتے ہوئے سب کچھ رکھتے ہوئے بخت نے دی تھیں۔ مقدر میں رقم ہو گئی تھیں۔

''کوئی ایک گاڑی اور کوئی ایک دن ملکیت کا۔ سب کچھ آپ ہی کا تو ہے۔ آپ ہی تو مالک ہیں ان سب چیزوں کے۔''

عابی کے کندھے پر تھوڑی ٹکائے ہوئے، پیار برساتی نظروں سے تکتے ہوئے بولی تھی۔ ''مائی ڈیئر چاچو! یہ جو باہر سفید گاڑی کھڑی ہے۔ تو یہ آپ ہی کے لیے دادا جان نے خریدی ہے۔'' پھر اس پر ایک دم شرارت سوار ہو گئی۔ ''آپ ابھی کہہ رہے تھے جلد واپس پہنچنا ہے۔ تو جناب عابی صاحب! آپ نے کہاں پہنچنا ہے؟ بائی دا وے۔؟ ویسے آپ نے جہاں پہنچنا تھا، وہاں تو آپ پہنچ چکے ہیں۔ یہ آپ کا کا گھر ہے۔'' پھر اپنے سینے پر ایک انگلی دھری۔ ''یہ آپ کی اولاد ہے۔ اس سب کو چھوڑ کر کہاں جانے کا ارادہ ہے آپ کا۔؟ کیا اس کے پاس۔؟''

چمکیلی چمکیلی آنکھیں جھپکیں۔ شوخی بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی تو عابی رحمان گڑبڑا سے گئے۔ ''وہ جو جیب میں ہاتھ گھسائے کھڑی تھی۔ کون تھی وہ۔؟ کیا لگتی تھی آپ کی، جو ڈاکہ ڈالنے والی تھی میرے عابی کی جیب پر۔ کیا میری چاچی۔؟''



''وہ۔ وہ تمہیں بتایا تو تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ تھی اور بس۔''

''بس کیوں۔؟ میں نے کب چاہا ہے کہ بس۔ بس تو میری اجازت سے ہو گی۔'' نجانے مدحت کیا کیا بولے جا رہی تھی۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' اس کی باتوں سے، اس کی آنکھوں کے شریر اشاروں سے گھبرا کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میری کسی بات سے ناراض ہو گئے ہیں کیا۔؟'' ہنوز اسی شرارتی انداز اور لب و لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

اسی لمحے عبد کو خیال آیا۔ اسے تو کوئی بات معلوم نہیں تھی شاید۔ پھر وہ اس معصوم کے ان شوخ جملوں اور حملوں سے گھبرا کیوں رہے تھے۔؟ اس کے چاچو تھے۔ ان سے چھیڑ چھاڑ کا اسے پورا حق تھا۔ اگر ماں کے ساتھ نکاح والے معاملے کا علم ہوتا تو ایمان کو چاچی کہہ کر کبھی انہیں نہ چھیڑتی۔

وہ سب سے زیادہ محبت بھی تو انہیں سے کرتی تھی۔ اور محبت میں سو شوخیاں شرارتیں جائز ہوتی ہیں۔ تب اسی محبت کے نام پر عابی نے ایک بڑا خوبصورت سا قہقہہ لگایا اور اسے بازو میں لے کر پہلو کے ساتھ لپٹا لیا۔

''تم سے ناراض ہو سکتا ہوں چاچو کی جان۔!''

''تو پھر جا کہاں رہے ہیں۔ اپنے گھر میں رہیئے۔ اپنی مدحو کے پاس۔''

''بس ایک ہفتہ۔ صرف ایک ہفتے کی مہلت دے دو۔ اگلے جمعہ کو اپنے سارے سامان سمیت تمہارا عابی یہاں ہو گا۔''

بات کرتے کرتے دونوں سفید گاڑی کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔

''اس کی چابی لاؤں۔؟''

''نہیں نہیں۔ میں بائیک پر جاؤں گا۔''

عابی بائیک کی سمت بڑھ گئے۔ ''میں بائیک پر ہی جاؤں گا۔ مجھے گاڑی سے کوئی سروکار نہیں۔ میں درویش بندہ ہوں۔ اس شان و شوکت کا اہل......''

''عابی! پلیز۔'' ان کی بات کاٹتے ہوئے مدحت ان کا راستہ روک کر کھڑی تھی۔ بائیک کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے دم وہیں رک گئے۔

پھر مدحت نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیئے۔

"میری ماما اور دادا جان کو معاف کر دیجئے پلیز! یہ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ لوٹ آیئے اپنی دنیا میں۔ اپنی زندگی میں۔ آپ جو کچھ چاہیں گے، وہ سب کچھ ہو گا۔"

## 32

ویک اینڈ گزارنے کے لئے ایمان آفریدی اپنے گھر آئی تھی۔ پورے مہینے بعد۔ کوئی خبر نہیں۔ کوئی اطلاع نہیں۔ بس اچانک ہی آ گئی تھی۔ جبکہ اتنا عرصہ نہ فون کیا تھا اور نہ فون پر ملی تھی۔

نکاح کے بعد لڑکیاں نکھر آتی ہیں۔ ان کے چہرے گلاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ستارے جگمگانے لگتے ہیں۔ مگر اس پر نکاح کا الٹا اثر ہوا تھا۔

کوئی خامی ہمایوں میں نہ تھی۔ کوئی کمی پھوپھو کی محبتوں میں نہ تھی۔ پھر نجانے کیوں وہ بڑی مشکلوں سے نکاح پر راضی ہوئی تھی۔ صفیہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھیں۔ اور راضی بھی کیا ہونا تھا۔ پتہ نہیں اس کے دل میں کیا تھا۔ شاید راضی بھی نہ ہوئی تھی۔ بس نکاح نامے پر دستخط کر دیئے تھے۔

لیکن کیوں۔؟ ایسا سب کیوں ہوا تھا۔؟

یہ معمہ کسی طرح حل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ صفیہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھیں۔ شوہر سے بھی اس مسئلے پر بات نہیں کر سکتی تھیں۔ بیٹی کا معاملہ تھا۔ اور وہ پریشان رہتی تھیں۔

نکاح کے بعد پندرہ دن مسلسل اسے بخار ہی آتا رہا تھا۔ یقیناً وہ خوش نہیں تھی۔ تبھی تو۔ پر کیوں۔؟ کیوں۔؟

ہر وقت اسی کی سوچیں دل و دماغ کو بے چین رکھتی تھیں۔

تب پریشانی میں دو تین بار اس کے ہوسٹل فون کرایا۔ مگر وہ ملی نہیں۔



معلوم ہوا۔ وہ سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔

ایمان غلط لڑکی نہ تھی۔ صفیہ کو اس پر مکمل یقین و اعتماد تھا۔ بس جن حالات میں گئی تھی ان کی وجہ سے فکرمند تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا یہ سب ان کے واہمے ہوں۔ لیکن اک ماں تھیں نا۔ مامتا کے ہاتھوں مجبور۔

دو مہینے گزر گئے تھے اسے گئے ہوئے۔ امتحانات بھی سر پر تھے۔ مگر پھر بھی۔ اچانک۔ آج اسے سامنے دیکھ کر جہاں بے اختیار صفیہ کے بازو پھیل اٹھے تھے وہاں آنکھوں میں بھی اتر آئی تھی۔

کس قدر اداس اور ویران ہو رہی تھیں اس کے بغیر۔

"میری جان! میری چندا! کتنی ہی بار تمہیں ہوسٹل میں فون کرایا ہے۔ مگر تم ملی ہی نہیں۔" بے تحاشا اس کے گال اور ماتھا چومتے ہوئے وہ کہتی چلی گئیں۔ "ماں کو اتنی لمبی جدائی کی مار نہیں دیا کرتے۔ وہ کتنی بھی بری ہو۔ پھر بھی نہیں۔"

"ہائے اماں! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ بھلا کوئی ماں بھی کبھی بری ہوتی ہے۔" وہ جان نثار نگاہوں سے ماں کو تکتی چلی گئی۔ اس کے خیال میں اماں بے شک ارسل کو زیادہ پیار کرتی تھیں مگر پھر بھی ان کی محبتیں، بے پایاں محبتیں اور ہر ہر لمحے کی قربانیاں، بے شمار قربانیاں، اسے یاد آ گئیں، جو بغیر جتائے، بغیر بتائے، بغیر اسے احساس دلائے کرتی ہی چلی جایا کرتی تھیں۔

"اماں! ماھم کی شادی تھی۔ بس اسی میں لگی رہی۔" اپنی لاپرواہی پر کچھ نادم بھی تھی۔ اور صفیہ بوڑھے گالوں پر لڑھکتے آنسو لئے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامے، کتنی ہی دیر اسے تکتی رہی تھیں۔

پھر اسے بہت سارا پیار کر کے وہ اس کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنے اٹھ گئیں۔ اس کے باوجود کہ گھر میں نوکروں کی کمی نہ تھی۔

"تمہاری پسند کی چیزیں تمہارے لئے پکاؤں گی آج۔"

زبان پر تو کھانے دانے کی بات تھی لیکن دل میں خوشی اور انبساط کی لہریں تھیں۔ جو خراب موڈ اور خستہ حالی لے کر گئی تھی۔ جس نے انہیں یہ گزرے ڈیڑھ دو ماہ بے کل و بے قرار رکھا تھا، اس کی طرف سے تسلی ہو گئی تھی۔

وہ بہت خوش، بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔ چہرہ کھلا کھلا تھا۔ آنکھوں میں
روشنیاں سی تھیں۔ ہونٹوں کے کونوں میں دبکی ہوئی مسکراہٹیں بھی ان تجربہ کار نگاہوں
سے دیکھ لی تھیں۔ صفیہ کچن میں آ گئیں تو وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔

اماں پتہ نہیں کیا کیا پکاتی رہیں۔ ایمان پاس بیٹھی ماھم اور اجلال کی شادی
کے قصے سناتی رہی۔ بے شمار ہنسی مخلول کے واقعات پیش آئے تھے ان دنوں، سب سنا
ڈالے۔ صفیہ بھی ہنستی رہیں۔ بہت دنوں بعد آج وہ بھی کھل کر اور جی بھر کر ہنسی بولی
تھیں۔ انہوں نے برادری خاندان میں جو حادثات و سانحات پچھلے گزرنے والے
دنوں میں پیش آئے تھے ان کی چیدہ چیدہ خبریں اس کے گوش گزار کر دیں۔ ان خبروں
میں پھوپھو کی دوبارہ طبیعت کی خرابی کی بھی خبر تھی اور صحت کی بھی۔ ساتھ ہی ہمایوں خان
کے متعلق اطلاع تھی کہ وہ جلد پاکستان آنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ جتنی جلد ہو سکے
ایمان کی رخصتی ہو جائے۔ اب اس کا اس کے بغیر پردیس میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

اور دل لگے بھی کیوں۔ اب وہ شرعاً قانوناً اس کی بیوی بن چکی تھی۔ لہذا
اس کے بغیر وہ اور اداس ہونے اور تنہائی محسوس کرنے کا پورا پورا حق رکھتا تھا۔

صفیہ نے اندر ہی اندر کچھ ڈرتے ڈرتے ہی یہ خبر سنائی تھی۔ وہ کنفرم کرنا
چاہ رہی تھیں کہ ایمان کے چہرے کا سکون و اطمینان محض عارضی تو نہ تھا اتنے دنوں
بعد گھر آئی تھی اور ہمیشہ کی طرح گھر آنے پر بہت مسرور و شاداں تھی اور بس۔

شادی اور رخصتی کی بات پر پھر اکھڑ تو نہ جائے گی اور رونا دھونا مچا کر
گھر والوں کے زندگی سے ہی قدم تو نہ اکھاڑ دے گی۔ صفیہ دم سادھے اسے دزدیدہ
نظروں سے تکے بھی جا رہی تھیں۔

مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ نہ چونکی بدکی۔ نہ چہرہ ہی دھواں دار ہوا۔ نہ
آنکھوں میں نمی اتری۔ شاید شرم کی وجہ سے، شادی کی بات ٹال کر ماھم ہی کی کوئی
دوسری بات کرنے لگی تھی۔ جو اچانک اسے یاد آ گئی تھی۔

تب صفیہ نے اندر ہی اندر شکر ادا کیا۔ "ارے ہاں تمہیں اک مزے کی
بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ سنا ہے فرتی شہر چلی گئی ہے۔ اس کی بیٹی نے کالج میں داخلہ
لینا تھا۔ اور دادا کو اس کیلئے ہوسٹل کی رہائش پسند نہ تھی۔"



"ہوسٹل کو کیا ہے۔؟ پتہ نہیں یہ بڑے بڑے خانوں نے ہوسٹلوں کو اتنا
بدنام کیوں کر چھوڑا ہے کہ پھر بیٹوں کو مزید تعلیم ہی نہیں دلاتے۔" ایمان بڑبڑانے لگی
تو صفیہ مسکرا دی۔ "مگر تمہارے باپ نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔"

"میرے بابا جان تو مثالی انسان ہیں۔" باپ کی محبت میں سرشار وہ بے
ساختہ کہہ اٹھی۔

صفیہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ دوبارہ خدا کا شکر ادا کیا۔ گویا کہ
نکاح کے معاملے میں جو کدورت باپ کی طرف سے تھی، جس کا ان کے سامنے ایمان
نے دو تین بار اظہار بھی کیا تھا، وہ بھی ڈھل چکی تھی۔

اطمینان بھرا طویل سانس لیتے ہوئے صفیہ نے فرتی والی خبر مکمل کی۔

"ہوسٹل کی ناپسندیدگی والی دادا کی سوچ ماں کی خوش بختی بن گئی۔"

"وہ کیسے۔؟"

"اب شہر میں فرتی شوہر کے ساتھ رہے گی۔ سسر نے گھر بھی خرید دیا ہے۔
سنا ہے بڑا خوبصورت گھر ہے۔ پورے سات سال بعد خدا نے اس کی سنی ہے۔ گاڑی
وغیرہ بھی خرید لی ہے۔ گھر آباد ہو گیا۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے اماں! اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔"

پھر بڑے اشتیاق سے ایمان نے ماں کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے اپنی
دیرینہ خواہش کا اظہار کیا۔ شوخی سے مسکراتے ہوئے۔

"سینکڑوں ہی سال ہو گئے ہیں فرتی خالہ سے ملے ہوئے اب تو اماں مجھے
ان کی شکل بھی یاد نہیں رہی۔ کبھی ان سے ملوا تو دیں۔ اور ان کے "ان" سے بھی ملنے
کا بڑا شوق ہے۔"

"کن سے۔؟" صفیہ نے پورا جملہ نہیں سنا تھا۔

"کالو سے۔" ایمان کے جواب پر اماں بے ساختہ قہقہہ لگا اٹھیں۔

"چھوٹے کالو سے۔؟"

خود ایمان بھی ہنسنے لگی۔ "ان دنوں کتنا مزہ آیا کرتا تھا اماں۔!"

"تم تو چھوٹی تھیں۔ تمہیں کیا یاد ہوگا۔؟"

"یاد تو نہیں اتنا لیکن آپ کے بتاتے رہنے سے یوں لگنے لگا ہے جیسے سب کچھ سامنے ہی ہوا۔"

"مزہ تو زیادہ اس وقت آیا تھا جب تم بھی ارسل کے ساتھ ساتھ کالو کہنا شروع ہو گئی تھیں۔"

صفیہ بھی بیتے وقتوں کی باتیں یاد کرنے لگیں۔ "اچھا بھلا تم خالو کہا کرتی تھیں۔ ارسل نے جب توتلے پن کی وجہ سے دو تین بار "کالو' کالو" کہا تو سب بہت ہنسے۔ تم سمجھیں یہ کوئی بڑی اچھی بات ہے۔ سب خوش ہو کر ہنستے ہیں۔ لہٰذا تمہیں بھی کالو ہی کہنا چاہیے۔ یوں بیچارے اچھے بھلے گورے چٹے بندے کا نام ہی کالو پڑ گیا۔"

"اور اب جو یہ دوسرے شوہر ہیں فرتی خالہ کے' یہ چھوٹے کالو ہوئے ناں۔؟"

صفیہ کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔ "ہاں چھوٹے کالو۔"

"ویسے ان کا اصلی نام کیا ہے۔؟"

"کسی سے ملا جلا ہو تو نام معلوم ہو ناں۔ پہلے اپنی تعلیم کی وجہ سے اکثر شہر میں رہا۔ پھر نکاح کے بعد' اسی رات گھر سے چلا گیا۔ ہم نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ تمہاری نانو کو معلوم ہوگا۔ بہت پیار ہے فرتی سے۔ وہ تو اس کی سسرال بھی جاتی آتی رہتی ہے۔ ہر دکھ سکھ کے وقت پہنچی ہوتی ہیں۔"

"اور آپ کا آنا جانا کیوں ختم ہو گیا۔؟"

"ختم کیوں ہوگا۔ بڑے کالو کی وفات پر میں گئی تھی۔"

اور صفیہ کے بڑے کالو کہنے پر ایمان پھر ہنسنے لگی۔ ایمان کی ہنسی میں صفیہ کی بھی ہنسی شامل ہو گئی تو وہ مزید بات کرتے کرتے رک گئیں۔ پھر قدرے توقف کے بعد ہولے سے بولیں۔ "اب فرتی بسنے رہنے لگی ہے۔ تمہاری نانو کے کہنے کے مطابق کسی دن ملنے چلیں گے۔ تو تم اس کے منہ پر اسے کالو نہ کہہ دینا۔ پتہ نہیں کس مزاج کا بندہ ہے۔ برا مان لے۔ اور فرتی کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اتنی مشکل سے تو بیچاری کا گھر بسا ہے۔"

"نہیں اماں بے عقل ضرور ہوں پر اتنی بھی نہیں۔" پھر شرارت سے ماں کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "ویسے اگر ایک بار کہہ لوں تو۔ کیا وہ پھر گھر سے بھاگ جائے گا۔؟"



صفیہ نے بڑے پیار سے اسے اک ہلکی سی دھپ لگائی۔ "تو اب بھی شرارتوں سے باز نہیں آتی۔"

"وہاں یونیورسٹی میں تو میں بہت سنجیدہ رہتی ہوں اماں! یقین کریں۔"

یونہی باتیں کرتے کرتے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ باہر لاؤنج سے ارسل کی آواز سماعتوں میں اتری تو وہ چونکی۔

بابا کے ساتھ وہ زمینوں پر گیا ہوا تھا۔ مزارعوں سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہ سنتے ہی بیٹے کا جوان خون ابل پڑا تھا۔

"میں جا کر بات کرتا ہوں نا۔" باپ سے پہلے اٹھ کر چل دیا تھا۔

صفیہ نے ساری بات اسے بتائی تھی۔

"یہ کہیں پڑھائی سے زیادہ زمینوں جائدادوں میں تو دلچسپی نہیں لینے لگا۔" ایمان تشویش بھرے لہجے میں بولی تھی۔ "اماں! اسے سمجھا دیں۔ اس نے بہت پڑھنا ہے۔ ابھی سے ان زمینوں کے چکروں میں نہ پڑے۔"

ابھی اسی کی بات ہو رہی تھی جب ارسل کی آواز کان پڑی تھی۔ "اماں! کہاں ہیں آپ۔؟"

"اماں یہاں کچن میں اپنی پیاری پیاری بیٹی کے لئے اچھے اور اس کے پسندیدہ کھانے تیار کر رہی تھیں۔"

ایمان بولتے بولتے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تو ارسل کے چہرے پر چھائی سنجیدگی پر مسکراہٹ غالب آ گئی۔ ساتھ ہی خوشی کے مارے نہ صرف چہرہ کھل اٹھا بلکہ چمک بھی اٹھا۔

"اوہو۔ تو ایمان آفریدی تمہاری شان نزول ہو بھی گئی۔ میں بھلا خدا سے کچھ اور مانگ لیتا۔"

ارسل کے سینے کے ساتھ سر لگائے ہوئے وہ شکوہ بلب تھی۔ "تو کیا میرا آنا بہت برا ہے جو کچھ اور مانگنا تھا۔"

حالانکہ اماں نے بتایا بھی تھا کہ آج صبح ہی صبح ارسل اسے یاد کر رہا تھا۔

"آج کہیں ایمان آ جائے نا۔ یا اس کا فون ہی۔ بہت ملنے کو دل چاہ رہا

ہے۔ بہت اداس ہو رہا ہوں اس کے بغیر۔"

"تو تم خود کیوں نہیں چلے جاتے اس کے پاس۔" اماں ابھی اس کے جانے
کی بات ہی کر رہی تھیں کہ واصل آفریدی اندر داخل ہوئے۔

بڑی جلدی میں تھے۔ کچھ غصے میں بھی تھے۔ الجھے ہوئے۔ جھنجلائے
ہوئے۔ "سنا ہے تم نے ارسل!" بیٹے کو مخاطب کر کے اس جھگڑے کی نوعیت بتانے
لگے جس کی وجہ سے ان کا موڈ آف تھا۔ ناشتہ بھی اچھی طرح نہیں کیا۔ غصے میں اور
کر سکتے تھے بھلا۔ پراٹھے کے دو نوالے لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" بابا جان غصے میں تھے۔ کہیں کسی
سے الجھ نہ پڑیں۔ یوں بھی پٹھان لوگوں کے خون میں دوسروں کی نسبت گرمی ذرا کچھ
زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی کندھے پر بندوق اور کمر میں گولیوں کی پیٹی۔ پتا ہی نہیں
چلتا کب اور کیسے بارود سے کھیل جاتے ہیں۔

اور ویسے بھی وہ جوان بیٹا تھا باپ کا۔ گرم خون اس کی رگوں میں بھی دوڑ
رہا تھا۔ رک ہی نہ سکا۔ صفیہ منع کرتی رہیں مگر وہ باپ کے پیچھے پیچھے چل دیا تھا۔

پھر وہ انہیں باپ بیٹے کے لیے پریشان بیٹھی تھیں جب اچانک ایمان آ گئی
تھی۔ اور اب ایک دم ہی گھر میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ مزارعوں سے متوقع جھگڑا
بھی صلح صفائی سے نمٹ گیا تھا اور ایمان بھی اتنے دنوں بعد دکھائی دی تھی۔ دونوں
عیدیں جیسے اکٹھی اس بار ان کے گھر آ گئی تھیں۔ صفیہ نہال نہال ہوئی جا رہی تھیں۔
دو تین سالن بنانے کے بعد میٹھا بھی بنانے لگی تھیں۔

ایمان جب تک ارسل سے گلے شکوے گزار کر فارغ ہوئی واصل آفریدی بھی
آ پہنچے تھے۔ باپ کے سائے تلے پناہ پاتے ہی ارسل سے جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ ہمیشہ
کی طرح۔ درمیان میں آنے والا اڑھائی تین ماہ کا کرائسز جیسے کسی کو یاد ہی نہیں رہا
تھا۔ ایمان کا نکاح۔ اس کا رونا دھونا۔ اس کا منع کرنا۔ اس کی منتیں سماجتیں۔ پھر نکاح کے
بعد بیمار ہو جانا اور سارا سارا دن سر منہ لپیٹے پڑے رہنا۔ سب کچھ بھول سا گیا تھا۔

اب ایمان کے چہرے پر رونقیں تھیں، خوبصورتی تھی۔ زندگی تھی۔ مزاجاً اخلاقاً
بھی بہت ہشاش بشاش تھی۔ سبھی مسرور تھے۔ مطمئن تھے۔



صفیہ کے پکائے ہوئے کھانوں نے اور ارسل کے لطیفوں اور چٹکلوں نے ہر
چیز، ہر پل کا مزہ دوبالا کر دیا تھا۔ سبھی بہت انجوائے کر رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں بہن بھائی نے اپنے وسیع و عریض لان میں
واک بھی کی۔ پھر ایمان اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"آج سفر کی وجہ سے تھکی ہوئی ہوں۔ کل ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔"
اپنے جلد سو جانے کی بظاہر توجیہہ پیش کرتے ہوئے بیڈروم میں گھس تو آئی تھی مگر
اصل میں اسے دل کے اندر کھد بد لگی ہوئی تھی۔

"یہ اک چھوٹی سی فلم ہے۔ میری شادی کے دنوں کی۔ اکیلے میں دیکھنا۔"

جاتے جاتے ماھم نے اسے اک کیسٹ پکڑائی تھی۔ "یہ وہاں تمہارے
ہمایوں خاں کو دکھاؤں گی۔ مجھے امید ہے تمہارا کام بڑی جلدی بن جائے گا۔ تمہیں
اس سے آزادی مل جائے گی۔ بس تم مایوسی کو قریب نہ پھٹکنے دینا۔ اور خوش رہنا اسی
طرح۔ جیسے آج کل ہو۔" شرارت سے اک آنکھ دبا کر اس کی چٹکی بھی لی تھی۔ اس
کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہی تھی۔ ادھر اجلال اسے آوازیں دیئے جا رہا تھا۔

ماھم کے امریکہ چلے جانے کا ڈیپریشن یقیناً ایمان کو بہت ہوتا مگر ساتھ ہی
وہ جو کام نمٹانے کا بیڑا اٹھا گئی اس نے اس پر وہ ڈیپریشن طاری نہیں ہونے دیا تھا
جس کا احتمال تھا۔

دوسرے اسے وہ فلم دیکھنے کی لگن لگ گئی تھی جو اتنی رازداری سے ماھم اس
کے سپرد کر گئی تھی۔ نجانے اس فلم میں کیا تھا۔ ماھم نے کہا تھا۔ "اکیلے میں دیکھنا۔"

اس کے جانے کے دو تین دن بعد تک ایمان وہی تنہائی ڈھونڈتی رہی تھی،
جس کی تاکید ماھم نے کی تھی۔ پر وہ فلم دیکھنے کے لیے اسے میسر نہ آ سکی تھی۔ نہ کسی
سہیلی کے پاس۔ نہ ہوسٹل میں اور نہ ہی ماھم کے گھر میں۔ عابی بھی اب اپنے فلیٹ
میں اکیلا رہ گیا تھا وہاں بھی جانا مناسب نہ تھا۔

تبھی وہ اچانک ہی اپنے گھر چلی آئی تھی۔ آرام کرنے کا بہانہ کر کے
بیڈروم میں گھستے ہی اس نے دروازہ لاک کیا اور ٹی۔ وی اور وی۔ سی۔ آر آن کر کے
بیٹھ گئی۔

# 33

بہت ہی اچھی تھی جینی فر۔! اک آئیڈیل بیوی۔! اک سگھڑ اور باسلیقہ مشرقی عورت جیسی، شوہر کی خدمت گزار اور وفادار۔! اس نے گھر کو بہت ہی خوبصورتی سے آراستہ کیا تھا اور دونوں بے حد پرلطف زندگی گزار رہے تھے۔ ہمایوں خاں بہت مطمئن اور پرسکون تھا۔ لیکن کبھی کبھی جو جینی بچے کا ذکر چھیڑ دیتی تو وہ ایک دم ہی اپ سیٹ ہو جاتا۔ جتنی اسے بچے کی خواہش شدید تھی۔ اتنا ہی ہمایوں خاں اس سے الرجک تھا۔

جن حالات میں اس نے جینی سے شادی کی تھی، ان کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ وہ اب بچے بھی پیدا کر کے اک مکمل گھر گرہستی بنا کر بیٹھ جاتا۔ یہ بچوں والا خواب تو اس نے ایمان آفریدی کے ساتھ ملکر بسانے والے گھر کے لئے دیکھا تھا اور وہیں پورا ہونا چاہیے تھا۔ پاکستان میں۔ جہاں اس کے والدین بھی تھے۔ محبت کرنے والے۔ قربانیاں دینے والے۔ اور وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ ہر چیز کا واحد وارث اور مالک۔ ان کی خوشیوں کا امانت دار۔ ان کے دکھ سکھ کاٹنے والا اور ان کے بڑھاپے کا سہارا۔

لہٰذا یہاں امریکہ میں ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کچھ نہیں۔ بس وقتی انجوائے منٹ تھی یہاں۔ اور گرین کارڈ کے حصول کی اک کوشش۔

''خدا کے لئے مجھے بتاؤ توفیق! میں کیا کروں۔؟'' کل تو باقاعدہ جینی سے اسی بات پر جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ اور تبھی اب ہمایوں خاں توفیق کے آفس میں بیٹھا اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''جینی کو کس طرح اس کی ضد سے باز رکھوں۔'' اس سے اپنی پریشانی کا حل طلب کر رہا تھا۔

اور توفیق ہمیشہ کی طرح ہنسے جا رہا تھا۔ کیسے کیسے سکھوں بھرے دکھ اس کے دوست کی جان کو چمٹ گئے تھے۔ ہائے بیچارا۔!

''یہ تمہاری ہنسی مجھے زہر لگ رہی ہے۔ میرے خون کو کھولا رہی ہے۔''



''سنو۔'' توفیق سنجیدہ ہو گیا۔ ''سکھ کے ساگر میں کبھی کبھی دکھ کا کوئی چھوٹا سا کنکر گر جانے سے جو گرداب پیدا ہوتا ہے اس سے گھبرا نہیں جانا چاہیے۔ کچھ وقت کی بات ہوتی ہے۔ وہ پھیلتا ہے۔ بکھرتا ہے اور پھر مٹ بھی جایا کرتا ہے۔ دو چار بار کہے گی۔ تم سنی ان سنی کرتے رہنا۔ پھر خود ہی چپ ہو جائے گی۔''

''لیکن ان چھوٹے چھوٹے کنکروں سے جو ساگر بے سکون ہو جاتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ارتعاش بھی تو مچ اٹھتا ہے۔ اور میں مکمل طور پر سکون چاہتا ہوں۔ فل انجوائے منٹ۔'' ہمایوں خاں بڑے دلکش انداز میں مسکرایا۔ ''میرے گھر کا سکھ آرام تم نے کبھی دیکھا ہے۔ محسوس کیا ہے۔ واہ! کیا زندگی ہے۔''

''تم بڑے عجیب انسان ہو۔'' توفیق کی تیوریوں پر ہلکے ہلکے بل تھے۔

''زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔'' بیسیوں بار بولا ہوا جملہ پھر ہمایوں خاں نے بولا۔

''سب کو ہی ایک بار ملتی ہے مگر تم جیسا لالچی انسان میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔''

''شکریہ ادا کرو میرا کہ میں نے تمہیں دکھا دیا ہے۔'' وہ ڈھیٹ بن کر ہنسنے لگا۔

''تو مجھ سے تم اب کیا چاہتے ہو۔؟''

''تمہاری فیور۔''

''کیا مطلب۔؟''

''وہ تمہاری بہت عزت کرتی ہے۔ تمہیں بہت مانتی ہے۔''

''ہاں یہ بھی میں جانتا ہوں۔''

''تو پھر تم اس سے بات کرو۔''

''پاگل ہو گئے ہو۔'' توفیق حیرتوں میں ڈوب گیا۔ ''یہ خالص تم دونوں کا ذاتی اور گھریلو معاملہ ہے۔ میں اس مسئلے پر کوئی بات کروں۔ بالکل مناسب نہیں لگتا۔''

''میرے ہر حکم پر سر خم کرتی ہے۔ بس اک بچے کا اسے اتنا شوق ہے کہ اس کے متعلق کچھ بھی سننے کو تیار ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے میں نے سوچا تھا شاید تمہاری

بات سن لے اور کچھ سمجھ جائے۔ میں بہت پریشان ہوں یار۔!''

اس کے چہرے سے بھی پریشانی عیاں ہو رہی تھی۔ توفیق کا دل اس کی ہمدردی سے بھر گیا۔ تب بڑی سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا۔ ہمایوں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ ہونٹوں پر اک بڑی خوبصورت سی انگریزی دھن تھی۔ جب اس کی پریشانی حد سے بڑھ جاتی تو کوئی نہ کوئی دھن اسی طرح سیٹی پر بجانا شروع کر دیتا تھا۔

''خدا کے لئے تم یہ ٹیں ٹیں تو بند کرو۔ مجھ سے کچھ سوچا نہیں جا رہا ہے۔'' اور عادت کے مطابق توفیق اس کے مسئلے میں پوری طرح انوالو ہو چکا تھا۔ تبھی کچھ الجھ کر بولا تھا۔

''یہ ٹیں ٹیں ہے۔؟'' ہمایوں ہنس پڑا۔ ''اس وقت کا سب سے زیادہ مشہور سونگ ہے۔ جینی کے گھر میں آج کل ہر وقت یہ گونجتا رہتا ہے۔''

''جینی کے گھر میں۔؟'' توفیق نے چونک کر معنی خیز انداز میں' اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''وہ تمہارا گھر نہیں ہے۔؟''

''سمجھو تو نہیں۔''

''رقمیں خرچ کر کے بھی نہیں۔؟''

''رقموں کو کون دیکھتا ہے کہ کس نے خرچ کیں۔ کاغذات میں ملکیت تو اسی کی ہے۔ میں نے اس کے نام پر ہی خریدا تھا۔ ویسے وہ حق رکھتی ہے مالک بننے کی۔''

''کیوں۔؟''

''یہ گھر اس کا انتخاب ہے۔ اس کی پسند ہے۔ اسی نے سجایا بنایا ہے۔ اسی کا شوق اور ذوق ہے۔ غرض اس گھر کی ہر خوبصورتی اس کے ذہن کا کمال ہے۔''

''واقعی یہ سچ ہے۔'' اس کی تائید تو توفیق نے بھی بے اختیار کر دی۔ ''تمہارے گھر میں قدم رکھ دیں تو لگتا ہے کسی جنت میں جا کھڑے ہوئے ہیں۔ ادھر سے اس کے انتظامات۔ ہر چیز مکمل اور خوبصورت۔''

''تھینک یو۔'' ہمایوں' توفیق کے چہرے پر سے بھی ستائش و تعریف پڑھ رہا تھا۔ ''اور آج کا تمہارا ڈنر ہمارے ہاں۔'' اس نے سرشار ہو کر دعوت دے ڈالی۔



''جینی سے مشورہ کیئے بغیر ہی مجھے انوائیٹ کر رہے ہو۔؟''

''یہی تو اس لیڈی کی خصوصیات ہیں۔ کسی بھی وقت میں کچھ بھی کر دوں۔ بڑی خوش دلی سے مجھے آنر کرتی ہے۔''

ہمایوں کے چہرے پر جینی کی محبتوں چاہتوں کے رنگ بکھر اٹھے۔ توفیق بغور تکنے لگا۔

''لیکن۔ آہ۔! بس اک اسی معاملے میں۔ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ کیا کروں۔؟''

''تو ہمایوں خاں! وہ تمہارا اتنا خیال کرتی ہے۔ اتنی پرواہ کرتی ہے تمہاری۔ اتنی محبت کرتی ہے تم سے۔ تو تم اس کی کیا ایک خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے۔؟'' توفیق نے ذرا مختلف انداز اور سوچ کے ساتھ اسے دیکھا اور گویا ہوا۔ ''جبکہ وہ تمہاری ہر خواہش کو آنر کرتی ہے تو تم اس کا اک یہ ارمان پورا کر دو۔ بننے دو اسے ماں۔ کیا فرق پڑے گا۔ کر دو یہ احسان اس پر۔ کیا بگڑ جائے گا تمہارا۔؟''

ہمایوں نے یکایک چونک کر اسے دیکھا۔ ''یار! تم بھی۔؟ لیکن میری دیرینہ خواہش۔ میں اپنے بچوں کی ماں صرف ایمان آفریدی کو بنانا چاہتا ہوں۔''

''بڑے کمینے ہو۔ بڑے خود غرض ہو۔ اپنی ہر خواہش پوری کرا رہے ہو۔'' توفیق کو غصہ آ گیا۔ ''دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ رہے ہو۔'' دوست اس کا تھا۔ فیور جینی کو کرنے لگا۔

''میں لوٹ رہا ہوں۔؟''

''اور نہیں تو۔'' وہ اس کی حمایت میں بولے گیا۔ ''اس کی محبتیں سمیٹ رہے ہو۔ اسکی خدمتیں' اس کی وفاداریاں۔ سب تمہارے لئے ہیں۔ بدلے میں تم نے اسے کیا دیا ہے۔؟'' جینی کے کیئے گئے سارے سلوکوں کو احسانات کی صورت دے کر توفیق اسے جتاتے ہوئے اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''کیا سوچے گی وہ۔؟ یہ پاکستانی لوگ کیسے ہوتے ہیں۔؟''

''یہ مت کہو۔ پاکستانی بھی اپنا سب کچھ لٹا جایا کرتے ہیں۔ اپنی محنتیں' اپنی کمائیاں' اپنی جوانیاں' اپنے جذبے' اپنی حب الوطنی' اپنی رشتہ داریاں' ماں باپ' بہن بھائی بعض اوقات بیوی بچے تک۔ سب کچھ یہاں کی عورتوں کی خاطر بھلا ڈالتے

ہیں۔ لوٹ لیا ہے امریکہ' انگلینڈ اور دوسرے مغربی ممالک نے پاکستانیوں معصوموں کو۔'' اپنے دلائل پیش کرنے کے بعد ہمایوں خاں مسکرا پڑا۔ پھر اک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نجانے کس کی حمایت میں تھا۔ کس کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔ اپنا۔ جینی کا۔ پاکستان کا۔ امریکہ۔؟'' اینی وے۔ چلو چھوڑو۔ بات بچے کی تھی۔''

''ہاں۔ بات بچے کی تھی۔'' توفیق نے بھی اک گہرا سانس کھینچا۔

''میں کر دیتا اس کی خواہش پوری۔'' ہمایوں کچھ کھویا کھویا سا پھر بولا۔''اگر لڑکی ہوگئی تو۔؟''

''بن گئے نا پھر خودغرض۔'' توفیق کو پتنگے سے لگ گئے۔'' وہی قبائلی علاقوں والے پٹھانوں کی ذہنیت۔ جینی بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔؟'' تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔'' اپنی باری سب کچھ سمیٹ لیا مطلبی انسان۔! احسان فراموش۔''

''خودغرضی' مطلب پرستی یا احسان فراموشی کی بات نہیں ہے یار! سارا جھگڑا اس ملک کے کلچر کا ہے۔ یہاں کی عورت نے خود کو بڑا سستا کر لیا ہے۔ میں اپنی بیٹی کو ایسا نہیں دیکھ سکوں گا۔''

''اس کے جوان ہونے تک کیا تم یہاں بیٹھے رہو گے۔؟'' توفیق کی طنزیہ مسکراہٹ قابل توجہ تھی۔'' گرین کارڈ مل گیا تو تم پھر کر کے اڑ جاؤ گے۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔'' ہمایوں خان مطمئن انداز میں ہنس پڑا۔ توفیق کی طنز بھری مسکراہٹ کی طرف اس نے توجہ ہی نہیں دی۔

''پھر جب انجوائے منٹ کے لئے سال دو سال بعد پاکستان سے یہاں آیا کروں گا تو پھر۔''

اس نے توفیق کو آنکھ ماری۔ اک طویل سا قہقہہ لگایا۔ بازو بڑھا کر ہاتھ ملایا۔'' امریکہ بہت بڑا ملک ہے۔ اکیاون ریاستوں والا۔ پھر کسی دوسری جگہ' دوسرے شہر میں ڈیرے ڈال لیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔؟''

اور جواب میں توفیق نہ اس کی تائید کر سکا اور نہ تردید ہی۔ بس گم صم سا اسے تکتا ہی رہ گیا۔'' جب پاکستانی امریکہ میں آ کر سیٹل ہو جاتے ہیں تو ان کے جذبات و احساسات اور سوچیں کچھ مختلف کیوں ہو جاتی ہیں۔ وہ گرمی' وہ تپش' وہ



حدت کیوں نہیں ان میں رہتی جو اپنے ملک میں ہوتے ہوئے اپنوں کے لئے ہوتی ہے۔'' توفیق سوچ رہا تھا۔

## 34

ماہم کی شادی کی فلم تھی وہ۔

مگر نہ اس کے آغاز میں دولہا دلھن کی کلوزاپ میں تصاویر تھیں' نہ کوئی شادی کی مبارک کے خوبصورت سے مونوگرام اور نہ کوئی بیک گراؤنڈ میں مایوں' مہندی اور شادی بیاہ کے گیت وغیرہ۔

''ارے۔!'' تکیوں کے سہارے بڑے آرام سے نیم درازسی تھی۔ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔ یہ۔ یہ تو وہ خود تھی سامنے۔ پہلے ہی سین میں۔ تحیر سے آنکھیں پھیل گئیں۔

وہ زرد سوٹ میں تھی۔ بالوں میں پھول کلیاں گندھی تھیں۔ کانوں میں گلے میں سونے کے زیورات تھے۔ جگمگ جگمگ کر رہا تھا اس کا وجود۔ اور چہرے کی خوبصورتی۔ اف توبہ۔! آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔

اسے یاد آیا۔ اچانک ہی ماہم کی شادی کا ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے پاس وہاں ہوسٹل میں مایوں' مہندی اور شادی میں پہننے والے ملبوسات نہ تھے۔ سب گھر میں پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ گھر جا کر لانا نہیں چاہتی تھی۔ نکاح کی وجہ سے اپنے گھر والوں سے ناراض تھی۔ کسی کا سامنا کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ویسے وقت بھی نہیں تھا۔ ایک دم ہی عابی نے جلدی ڈال دی تھی اور وہ ماہم کی بری بنانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

''اتنی خریداریاں کرتی پھر رہی ہو۔ اپنے لئے بھی کچھ خریدا ہے۔؟ میری خواہش ہے کہ میری شادی میں تم سب سے زیادہ اچھی لگو۔ سب میں نمایاں۔ منفرد۔ میری ایمان۔'' جذبوں میں غرق تھی۔

ایمان ماھم کے مطالبے پر مسکرا دی تھی۔ پھر اس نے سچ سچ بتا دیا۔ "گھر جانے اور وہاں سے شادیوں وغیرہ کے موقع پر پہننے والے ملبوسات لانے کا میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہے۔ اور نہ ہی فرصت۔ بس جیسے ہی سادہ سے پارٹی ڈریسز ہیں انہیں سے گزارہ کرلوں گی۔ یوں بھی تمہیں معلوم ہی ہے۔ میں سادگی پسند ہوں۔"

تب ماھم اگلے ہی دن اپنے وہ تمام ڈریسز اٹھا لائی تھی جو ابھی پچھلے ہی دنوں اس نے بنوائے تھے۔ اک کزن کی شادی کے لئے۔ جو کہ بہت قیمتی اور زرق برق تھے۔ "یہ مایوں کے دن' یہ مہندی اور یہ برات ولیمے والے دن۔" اس نے سب اسے سمجھا دیا اور ساتھ بے شمار قسمیں بھی ڈال دیں۔ کہ اسے پہننا ہوں گے۔

"اور تم۔؟ تم کیا پہنو گی۔؟" ایمان بلا سوچے سمجھے گھبرائی گھبرائی بول اٹھی تھی۔ تب ماھم کے قہقہے بلند ہو گئے تھے۔ "پگلی! میری تو شادی ہے۔ ادھر بھی' ادھر بھی' ساری خریداریاں میرے ہی لئے تو ہو رہی ہیں۔"

اور اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ایمان بھی ہنسنے لگی تھی۔

یوں۔ یہ سامنے وڈیو میں' چلتی پھرتی' سجی سنوری ہوئی' حسن و خوبصورتی کا پیکر' شعلہ جوالہ بنی نوجوان دلوں کو آگ لگاتی اور بھسم کرتی ہوئی اپنے پورے ناز و انداز کے ساتھ ایمان تھی۔ ٹی۔وی کی پوری کی پوری سکرین پر وہ ہی وہ تو تھی۔

ماھم کے مایوں کا فنکشن تھا۔ مگر لگ رہا تھا صرف اس کا' اکیلی کا کوئی فنکشن تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اکیلی ہی سکرین پر رہی۔ حالانکہ اس دن اور بھی بہت مہمان تھے۔ خدیجہ بی تھیں۔ منی بھی تھی۔ فارحہ بھی تھی۔ ماھم کی فیملی کے بہت سارے لوگ تھے۔

ماھم کی ماما رسم و رواج نبھانے کی بڑی دلدادہ تھیں۔ بے حد رونقی طبیعت کی مالک۔ دولتیں بھی بے تحاشا پاس تھیں۔ دل بھی کھلا۔ فضول خرچیاں کرنے والا۔ فیشنوں کی متوالی۔ جس طرح ماھم سے بڑی کی شادی کی تھی اس سے کہیں زیادہ ماھم کی شادی میں میلے لگا لئے تھے۔ مجال ہے کوئی چھوٹی سے چھوٹی بھی رسم بھولی ہوں۔

"آخری بیٹی کی شادی ہے۔ میں تو سارے ارمان نکالوں گی۔"

یوں انہوں نے ارمان بھی خوب پورے کئے۔ اجلال حیدر کے مالی حالات



ہیں تھے کہ مقابلے میں پورا اترتے۔ پاس سے رقمیں بہانے بہانے دے دے کر ہوں نے اپنی مرضی پوری کرالی۔

ادھر سے سارے انتظامات کرنے والے عبد رحمان تھے۔ اجلال حیدر کے کچھ۔ اور ایمان گھریلو ذمہ داریوں کو نبھانے والی۔ تقریباً ہر جگہ دونوں اکٹھے ہی ہو۔ اندر بھی باہر بھی۔ ادھر بھی ادھر بھی۔ سارے کام نبھاتے ہوئے۔ شاپنگ تے ہوئے۔ مہمانوں کو سنبھالتے ہوئے۔ میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ے۔ اور۔ ماھم کے گھر میں مہمان بنتے ہوئے۔ تمام رسمیں ادا کرتے ہوئے۔ ہنستے کھلاتے ہوئے۔ ناچتے گاتے ہوئے۔ تالیاں بجاتے ہوئے۔ کچھ ہر رسم میں' ہر ت رواج میں موجود بھی تھے۔ کچھ ان کی خوبصورتیوں' حسن اور وجاہتوں نے بھی ں نمایاں کیا ہوا تھا۔ غرض۔ ہر جگہ جیسے وہی وہ موجود تھے۔

اور یہ فلم ان دونوں کی ہی بنی ہوئی تھی۔

کہیں اور کوئی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

ادھر عابی کے اپنے گھر میں بھی' ادھر ماھم کے گھر بھی' جب مایوں کے لئے ے' پھر مہندی لے کر۔ پھر برات اور ولیمے کے دن۔ ایک سے ایک اعلیٰ لباس میں وہ ی اور عابی بھی۔ اپنے پورے بانکپن کے ساتھ کبھی سوٹ بوٹ میں' کبھی پنجابی گھبرو کے روپ میں۔ کرتہ شلوار پہنے ہوئے۔ ساری فرمائشیں ماھم کی تھیں۔

عابی کو اپنا سگا سگا بھائی بنا بیٹھی تھی۔

ان کے ہر دن کا' ہر موقع کا لباس اس کا ہی منتخب کیا ہوا تھا۔

اور یہ۔ یہ۔ نجانے کیمرے کا کونسا ٹرک استعمال کیا تھا۔

ایمان آفریدی کو اچھی طرح یاد تھا۔ ہر موقع پر ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے لوگ تھے لیکن اس فلم میں' جو وہ دیکھ رہی تھی' صرف وہ اور عابی تھے زیادہ تر۔

کہیں کام کرتے ہوئے۔ کہیں کھڑے باتیں کرتے ہوئے۔ کہیں بیٹھے ہنستے ہوئے۔ کہیں ایک دوسرے کو جذبات سے مخمور نگاہوں سے تکتے ہوئے۔ کھانے کے اوقات میں ایک دوسرے کو پلیٹوں میں ڈال ڈال کر دیتے ہوئے۔

اس فلم میں تو ایسے ایسے نظارے ایمان آفریدی کو دکھائی دیئے جن سے وہ

خود لاعلم تھی کہ کب پیش آ گئے۔ کب وہ ایکٹ کئے گئے اور کب شوٹ بھی ہو
ایک دو جگہ پر ایسا سین بھی تھا۔ عابی بڑی خوبصورت مسکراہٹوں کے
اس کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے اور ایمان نے شرما کر رخ پھیر لیا تھا۔ پھر ا
سین میں عابی نے قہقہہ لگاتے ہوئے ایمان کو انگلی سے اشارہ کر کے پرے کچھ
دکھایا تھا۔ جواب میں ایمان نے مسکراتے ہوئے ان کے شانے پر ہلکی سی دھپ
تھی۔ اور وہ سارا سین تو کمال کا شوٹ ہوا تھا۔

مہندی والی رات سب کے پرزور اصرار پر عابی نے اک گیت سنا
بہت ڈوب کر' بے حد خوبصورت ترنم کے ساتھ۔ وجاہتوں بھری مسکراہٹیں لئے۔

ایمان ماھم کے پاس علیحدہ ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''ہائے عابی کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ ایمان دیکھ رہی ہو نا۔'' ا
ایمان کا کندھا ہلا کر اسے مخاطب کیا تھا۔ پھر اپنی مٹھی میں پکڑا ہوا اک پانچ سو کا
اسے تھمانے لگی۔ ''میرے بھائی کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ دیکھ رہی ہو کتنی لڑکی
ندیدی ندیدی نظریں ان پر پڑ رہی ہیں۔ ذرا تم یہ نوٹ اس پر سے وار کر چھو
کو دے آؤ۔''

ایمان اتنے بڑے مجمع میں' اتنے سارے لوگوں کے سامنے یہ حرکت ک
کو قطعی تیار نہ تھی۔ وہ تو حتی الامکان بھری محفل میں عابی کے ساتھ بات کرنے
گریزاں رہتی تھی اور کہاں سب کے درمیان بیٹھے ہوئے عابی کے سر پر سے
وارتی۔ ''نہیں نہیں۔ کسی اور سے کہہ دو۔''

ایمان نے منع کیا۔ ویسے وہ اس وقت ماھم کے خیال کی تائید میں
گیت کے بول تو اچھے تھے ہی' عابی نے دھن بھی بڑی اچھی نکالی تھی اور خود
مسکرا کر اجلال حیدر کی طرف تکتے ہوئے' اس انداز میں بے حد پرکشش لگ
تھے اس کا معترف ایمان کا بے ایمان دل بھی تھا۔

تب ماھم کے بار بار اصرار پر نوٹ پکڑ کر وہ اٹھ پڑی تھی۔

اور جب وہ نوٹ عابی پر سے وار رہی تھی تو اس وقت عابی نے سر ا
جن نظروں سے اسے دیکھا تھا' وہ سارا سین اس پلاسٹک کے فیتے میں مقید ہو چکا



بہت خوبصورت نظارہ تھا۔ جذبات سے بھرپور۔ دلوں کو گدگدا دینے والا اور دلوں
کو تسخیر کر لینے والا۔ وہ مسحور سی ہو گئی۔

ایمان نے جھٹ پٹ اسے ریوائنڈ کر کے دوبارہ سہ بارہ دیکھا۔

اور پھر۔ وہ چونکی۔ لیکن۔ یہ فلم۔ ماھم کی شادی کی تو نہیں۔ اس میں تو نہ
دلہن تھی اور نہ دولہا۔ اور نہ براتی۔ بیسیوں لوگوں کی موجودگی میں بنائی گئی اس فلم میں
صرف وہ اور عابی ہی کیوں تھے۔؟

''یہ میرا کزن ہے۔ فوٹو گرافی سیکھ رہا ہے۔ اجلال کی طرف والی ساری
مووی یہی بنائے گا۔'' ماھم نے بڑی رازداری سے ایمان سے بات کی تھی۔ خدیجہ بی
کی وجہ سے۔

''مووی۔؟'' ایمان قدرے ہچکچائی تھی۔ ''لیکن میں نے کبھی مووی نہیں
بنوائی۔''

اجلال کی خواہش ہے۔ اپنی ماں بہنوں کا اکلوتا ہے۔ اتنی دور چلا جائے گا۔
پھر دل کی اداسیاں دور کرنے کو یہ تصویریں اور فلمیں شاملیں ہی رہ جائیں گی نا۔ کبھی
کبھار اماں بہنوں کو دیکھ لیا کرے گا۔''

یہ ساری بات مایوں کی رسم سے دو دن پہلے ہوئی تھی۔ ایمان کو سب کچھ یاد
آ گیا۔ اور یہ بھی۔ کہ پھر اگلے ہی دن سے کاشف مووی کیمرہ لئے آن موجود ہوا
تھا۔ سارا سارا دن وہیں رہتا تھا۔ کیمرہ ہر وقت کندھے پہ ہوتا تھا۔

لیکن۔ لیکن۔ فلم میں سے خدیجہ بی' منی اور فارحہ کہاں گئیں۔؟ ایمان
سوچنے لگ پڑی۔ ماھم کے کہنے کے مطابق کاشف نے ان تینوں کو سب سے زیادہ
فوکس کرنا تھا۔ مگر وہ تو اس فلم میں کم کم ہی موجود تھیں۔

ایمان پاگل ہو اٹھی۔ اس کے سر پر جنون سوار ہو گیا۔ دیوانوں کی طرح بار
بار ریوائنڈ کر کر کے دو تین بار فلم دیکھ ڈالی۔ مگر کوئی اور اس میں ہوتا تو دکھائی دیتا
ناں۔ بار بار وہ نوٹ وارنے کا سین نظر آ جاتا۔

پھر تالیاں بھی خوب پیٹی گئی تھیں۔ سب بہت ہنسے تھے۔ قہقہے لگے تھے۔
محظوظ ہوئے تھے۔ اک اک سین ایمان کو ازبر ہو گیا تھا۔ مایوں والے دن کے۔

دونوں مہندیوں کے دنوں کے۔ برات اور ولیمے کے دنوں کے تمام تر لمحات' جو گزرتے وقت اسے پتہ بھی نہیں چلا تھا' اسے جذبوں کی وہ کہانی سنا رہے تھے جو ان دونوں کے درمیان ایکٹ نہیں ہونا چاہیے تھی۔ اور ہو گئی تھی۔ ان کے دلوں میں اگر تھی بھی تو۔ تو بھی اس فیتے پر منتقل نہیں ہونا چاہیے تھی۔ پھر وہ واقعات بھی اور وہ حرکات و سکنات بھی جو دونوں سے جذبات کی بے اختیاری میں رونما ہو گئے تھے۔ کچھ علیحدگی میں۔ کچھ بے خودی میں۔ کچھ چوری چھپے۔ ایک دوسرے کی محبت اور چاہت میں۔

خصوصاً کھانوں کے اوقات میں تو اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا۔ ایمان کاموں میں لگی رہتی تھی۔ دوسروں کی تواضع میں مصروف رہتی تھی۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہوتی' وہی بھاگ بھاگ کر مہیا کرتی۔ عابی اور اجلال کی جائے رہائش پر تو یہ سب اس کی ذمہ داری تھی ہی۔ مہندی' برات اور ولیمے کی دعوتوں میں بھی وہ میزبان ہی بنی رہتی۔ ماہم بھی تو اس کی اپنی ہی تھی۔ یوں ادھر ان کی طرف بھی وہ میزبانی ہی کرتی نظر آتی۔ ایک ایک کو پوچھتی۔ خوبصورت لباس میں سجی سنوری۔ زمانے بھر کی خوبصورتیاں سمیٹے بس بھاگی بھاگی ہی پھرتی۔

اپنے آپ کا' اپنے وجود کی ضرورت کا' کھانے پینے کا بھی کوئی ہوش نہ ہوتا۔ تب تقریباً ہر کھانے کا وقت نکل جانے کے بعد عابی ہی اسے کسی نہ کسی کونے میں' علیحدہ جگہ پر بازو سے پکڑ گھسیٹ لے جاتا۔ ''بہت اچھا ہوتا ہے وہ انسان جو سب کا دوست ہو۔ جو سب کے ساتھ تواضع سے پیش آئے۔ جو سب کا خیال رکھے۔ مگر اپنے ساتھ دشمنی کرنے کا بھی اللہ تعالیٰ نے کہیں حکم نہیں دیا۔ اپنی ذات کے بھی کچھ حقوق انسان پر واجب ہیں جو ادا نہ کیے تو اللہ پوچھے گا۔''

''وہ۔ وہ۔'' ایمان اس کی نگاہوں کی تپش اور جذبات کی وارفتگیوں سے پگھل سی جاتی۔ زبان میں لکنت آ جاتی۔ کچھ کہہ نہ پاتی۔ ہکلانے لگتی۔ پلکیں گر جاتیں۔ نظریں جھک جاتیں۔ پھر عجیب قسم کی سرشاری کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی۔ اور وہ اس کے ہاتھ میں بھری ہوئی پلیٹ تھما دیتا۔ ''لو جلدی جلدی کچھ کھا لو۔''

''مگر۔ مگر یہ پلیٹ تو شاید۔ آپ کھا رہے تھے۔'' اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کو وہ اسی کی سمجھی تھی۔



''یہ کیسے ممکن ہے کہ تم بھوکی پیاسی کاموں میں مصروف رہو اور میں کھا ٹھوس...... ارے۔!''

اپنی والہانہ حرکات پر خود ہی شرمندہ سا ہوتے ہوئے عابی اپنی بات کو نامکمل چھوڑ دیتے۔ پھر گھبرا سے جاتے۔ ''چلو میری چھوڑو۔ میں کسی وقت بھی کچھ نہ کچھ کھا لوں گا۔'' پھر شرارت سے' شوخی سے ہنس پڑتے۔ ''میں تو اس گھر کا مالک ہوں۔ آدھی رات کو کچن میں گھسا کھسڑ پٹر کر رہا ہوں گا تو کوئی کچھ نہ کہے گا۔ مگر تم پر چوری کا الزام لگ سکتا ہے۔ اگر تم کوئی ایسی حرکت کرو گی۔''

بات بنانے کا فن عابی پر ختم تھا۔ وہ ہنس پڑتی۔

دو تین بار تو ایسے ہوا۔ وہ اپنی اور اس کی پوزیشن کو یکسر فراموش ہی کر بیٹھی۔ بس رہا تو ایک ہی خیال کہ وہ بھی تو بھوکا تھا۔

''چلیں جلدی جلدی دو چار نوالے اسی پلیٹ میں سے لے لیں۔ میرے لیے زیادہ ہے۔''

پھر دونوں کو پتا ہی نہ چلتا کہ کیا کر رہے تھے اور کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کاموں کی جلدی پڑی ہوتی تھی۔ ذمہ داریوں کا احساس ہوتا تھا۔

پھر نہ عمروں کا خیال رہتا' نہ رشتوں یا تعلقات کا اور نہ دنیا زمانے کا' اور نہ ان باتوں کا جو کوئی دوسرا انہیں یہاں' اس پوزیشن میں' اس علیحدگی اور تنہائی میں دیکھ کر بناتا۔ بس نگاہ میں ہوتا تو ایک دوسرے کا خیال اور ہمدردی' صرف انسانیت کے ناطے۔ اور۔ ان سارے چھوٹے چھوٹے اور معصومیتوں بھرے مناظر کو جانے کہاں کہاں سے اور کس کس طرح سے اور کن کن لینز سے کاشف نے کیچ کر لیا تھا۔ اس کے کیمرے کی آنکھ آخر کتنی تیز تھی۔؟ وہ حیران ہو رہی تھی۔

ان مناظر میں سے کئی تو ایمان کے ذہن کی سطح پر کوئی عکس چھوڑے بغیر گذر گئے تھے اور اسے اب مووی دیکھ کر یاد آئے تھے۔

''ہاں۔ ایسا ہوا تھا۔ ہاں۔ یہ بھی ہوا تھا۔''

بہت کچھ اس کی لاعلمی اور بے خبری میں ہو گیا تھا۔ بے ساختہ۔ بلا ارادہ۔ مگر۔ مووی میں تو یہ سب۔ بنی بر حقیقت تھی یہ فلم جیسے۔ کیسے کیسے ان کے جذبے

عیاں ہوئے تھے۔ دونوں کے ہی۔ ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے۔ سرشاریوں میں مبتلا۔ دنیا زمانے سے بے پرواہ۔ اپنوں بیگانوں سے بے نیاز بس وہی وہ تھے دونوں۔

ہائے یہ کس بے رحم، کس ظالم کا کارنامہ تھا۔؟ اور۔ کیوں ایسا کیا گیا تھا۔؟؟

کئی بار ریوائنڈ کر کے دیکھنے کے بعد ایمان آفریدی گھٹنوں میں چہرہ دیئے سوچے جا رہی تھی۔ کاشف کو ماھم نے بھیجا تھا۔ اسی مقصد کے لئے۔ کیا۔؟ یہ حقیقت تھی۔؟

مگر ماھم اس کی دشمن تو نہ تھی۔

پھر۔؟ کاشف کے پیچھے کون تھا۔؟

یہ ماھم کا کندھا کس نے استعمال کیا تھا۔؟

وہ اتھاہ سوچوں میں ڈوبی تھی۔ آنکھیں پانیوں سے لبریز ہوئی جا رہی تھیں۔

''میری دوست! تم سے کس نے یہ دشمنی کرا دی۔؟'' وہ ندامتوں شرمساریوں میں ڈوب رہی تھی۔ ''عداوت کا یہ انداز تم نے کس سے سیکھا ہے'' وہ خیال ہی خیال میں ماھم سے پوچھ رہی تھی۔

وہ بے حد بے کل و مضطرب ہو گئی تھی۔ یہ سب جو کچھ اس فلم میں تھا۔ ان تمام اعمال و افعال اور حرکات و سکنات کے پیچھے کسی بری نیت یا ارادے کو دخل نہ تھا۔ دونوں کے ایک دوسرے کیلئے دلوں میں محبت' پرواہ' خلوص اور اعتبار کے ناطے عیاں ضرور ہو رہے تھے مگر ان کی بدکرداری یا بدفعلی اس میں نہ تھی۔ وہ ایسے نہیں تھے۔ بالکل نہیں تھے۔ یہ تو ان کے معصوم معصوم سے بے اختیارانہ جذبات و احساسات تھے جو خود بخود ہی واضح ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں کیسے اور کیوں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے دلوں میں چھپے بسے بے ضرر سے جذبوں پر کنٹرول کر ہی نہیں سکے تھے۔

''یا اللہ! یہ کیسی بے اختیاری تھی۔''

''یہ فلم میں ہمایوں خاں کو دکھاؤں گی۔'' ماھم نے جاتے جاتے یہ کیسٹ اسے تھمائی تھی۔ ''پڑھا لکھا' عقل و شعور رکھنے والا انسان ہے۔ یقیناً سمجھ جائے گا۔''

ماھم نے تو ان کے ان معصوم جذبوں کو گناہ بنا ڈالا تھا۔ اوہ۔! یہ کیا ہوا۔؟



اپنی آنکھوں سے جب سب کچھ دیکھ لے گا تو۔'' ماھم کا مسکرانے کا انداز بڑا ب سا تھا۔ جس کی اس وقت اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔

''یقیناً بہت طیش میں آ جائے گا۔ اور مجھے یقین ہے پھر تمہاری آزادی ل ہو جائے گی۔ تم بالکل کوئی فکر نہ کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''نہیں نہیں ماھم! ایسے نہ کرنا۔ آزادی حاصل کرنے کا یہ طریقہ مناسب ں ہے۔'' وہ پریشان ہو کر چلا سی پڑی۔ بے اختیاری میں آواز بلند ہو گئی ا۔ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر پھر اس نے اپنی آواز دبائی۔ مگر آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکی۔

''یہ تم نے کیا کر ڈالا۔؟ میری حمایت' میری دوستی میں تم نے میری پاکیزہ ں کو......'' رات خاموشیوں میں اس کی سسکیاں سسکنے لگیں۔ ''یہ سب ہمایوں خان کو کھانا۔ ہمارے معصوم جذبے دنیا والوں کی نظر میں ہمارا گناہ بن جائیں گے۔ پھر یہ میرے والدین تک پہنچے گی۔ نہیں۔ خدا کیلئے نہیں۔ ایسا نہ کرنا۔'' وہ بے تحاشا ے جا رہی تھی۔ ''وہ تو جیتے جی مر جائیں گے۔ آزادی پتہ نہیں حاصل ہوتی ہے یا ا میں بدنام و رسوا ضرور ہو جاؤں گی۔''

وہ لاانتہا ہی سوچوں میں گم تھی۔ ''لوگ کیا کہیں گے۔ عزیز رشتہ دار واصل ری کو کیسی کیسی باتیں نہیں بنائیں گے۔ اور اماں کا برادری قبیلے کی عورتوں میں اٹھنا عذاب ہو جائے گا اور میرا ارسل۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ''سوچنے لگی تو۔ کیسی بھیانک تصویر بنی تھی آنے والے وقت کی۔

گھبرا کر اس نے آنکھیں میچ لیں۔ لیکن دل و دماغ تو پوری طرح بیدار ۔ اور۔ ان کی برادری قبیلے میں جو یہ بیداری جنم لے رہی تھی۔ اکا دکا لوگ اپنی یوں کو تعلیم دلانے لگے تھے۔ ٹی۔ وی۔ دیکھ کر۔ ریڈیو سن کر۔ کچھ شعور لوگوں نے لگا تھا۔ مگر سوچیں کہاں سے کہاں جا پہنچیں۔

یہ انکے معصوم معصوم جذبوں کی بے ضرر سی داستان بدنامی اور رسوائی بنکر گھر پہنچے گی اور پھر۔ وہی جہالت کی اتھاہ تاریکی عورت ذات کا مقدر بن جائے گی۔ آج کچھ ذہن روشن اور منور ہونے لگے تھے۔ وہ پھر انہیں بدعتوں اور رسم و رواج پابندیوں میں محصور ہو جائیں گے۔

"ماھم! یہ تم کیا کرنے لگی ہو۔؟ نہیں نہیں۔ مجھے ایسی آزادی
نہیں ہے۔ آنے والی نسل کے روشن مستقبل کی قربانی لے کر' انہیں واپس تاریکیوں
سپرد کر کے میں زندگی کی کونسی خوشی حاصل کر لوں گی۔ عابی کی محبت۔؟ عابی
ساتھ۔؟ یہ خوشی۔؟ پھر کیا یہ خوشی مجھے خوشی دے گی۔؟"

پورے ہفتے کی چھٹیاں لے کر گھر آئی تھی۔ اتنے سارے دن شادی
کاموں میں مصروف رہ کر بہت تھک گئی تھی۔ اب ذرا آرام کرے گی۔ امتحان بھی
پر تھے۔ کچھ ان کی تیاری بھی کرے گی۔ اطمینان اور سکون کے ساتھ۔

مگر سب کچھ ہی چوپٹ ہو گیا۔ اطمینان اور چین بھی۔ سکون و قرار بھی
آنسو صاف کیے۔ بستر پر سے اٹھی۔

"نہیں نہیں۔ یہ سب مجھے منظور نہیں۔ زندگی کی یہ بدنمائی مجھے قبول نہیں
ماھم! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس قیمت پر عابی کی محبت خریدوں گی۔ آنے
زندگی کی خوشیاں حاصل کروں گی۔ اپنے سارے گھر والوں کے سر ندامت
شرمندگیوں سے جھکا کر اپنے دل کا سکھ چین قرار اپنے مقدر میں سجا لوں گی۔"

وہ پیڈ اور قلم لے کر ماھم کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

## 35

سفید بنگلے کے پانچ چھ گھر دائیں اور پانچ گھر بائیں طرف اور دس بارہ
سامنے' سب میں مدحت نے دوستیاں لگالی تھیں۔ جس گھر میں اس کی کوئی ہم عمر
نہیں تھی۔ وہاں کے سات آٹھ سے لے کر دس بارہ سال تک کے بچوں سے
ومحبت کی پینگیں بڑھالی تھیں۔ اور جہاں نہ بچے تھے' نہ ہم عمر لڑکیاں' وہاں کے ادھیڑ
مردوں اور عورتوں یعنی انکلوں اور آنٹیوں سے ہی موصوفہ نے راہ و رسم پیدا کر
ہوئے تھے۔

اس کے دوستوں میں سرفہرست کرنل عمیر آفندی تھے۔ زارا' ماہا اور



کے ہوتے ہوئے بھی اسے انکل آفندی کے ساتھ وقت گزارنا سب سے زیادہ پسند
تھا۔ ویسے بھی ان کے اور مدحت کے گھر کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ دیر سویر کی
کوئی بات ہی نہ تھی نہ اندھیرے اجالے کی۔ جب جی چاہتا ادھر اسٹول دھرتی' اس پر
پاؤں ٹکاتی اور دیوار پھلانگ انکل آفندی کے پاس جا پہنچتی۔

وہ باتیں بڑے مزے کی کرتے تھے۔ گھنٹوں بیٹھی سنا کرتی۔ مدحت کو اپنے
پاپا زید رحمان یاد تھے۔ حویلی میں جو پاپا کی تصویر لگی تھی بالکل ویسی ہی تصویر انکل
آفندی کی ان کے لاؤنج میں آویزاں تھی۔ یہ بڑی سی قد آدم تصویر۔ یونیفارم میں وہ
کس قدر شاندار لگتے تھے۔ جتنی دیر ان کے پاس بیٹھتی' ان سے زیادہ ان کی تصویر کو
تکا کرتی۔ "اسلام علیکم انکل۔!"

دبے دبے پاؤں بلی کی چال چل کر ہمیشہ ان کی پشت کی سمت سے بلند
آواز میں بول کر انہیں چونکا دیتی۔ پھر اس کی گفتگو کا آغاز اک منا سا قہقہہ لگا کر مزاج
پرسی کے ساتھ ہوتا۔ "طبیعت کیسی ہے۔؟"

"اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ہیں۔" کسی کتاب یا اخبار یا میگزین وغیرہ
جس کا بھی مطالعہ کر رہے ہوتے' سامنے میز پر اسے دھر دیتے۔ "آپ بتائیں۔ آج
کالج میں وقت کیسا گزرا۔ بنچ پہ کھڑے ہو کر تو نہیں۔؟" وہ انتہائی خوشگوار لہجے میں
پوچھتے۔

"اوہ انکل! اب میری کلاس بطور کسی سزا بنچ پہ کھڑے ہونے والی
نہیں ہے۔ میں کالج میں پڑھتی ہوں کالج میں۔ کسی پرائمری سکول میں نہیں۔"

"دیکھنے میں تو گڑیا سی نظر آتی ہو۔"

"دیکھنے کی بات چھوڑیں۔ آپ کو یہ علم ہونا چاہیے کہ مدحت اک ذہین
لڑکی ہے۔ گریجویشن کرنے کے بعد لاء کر کے وکالت کرنے والی ہے۔ بہت بلند
کرے گی اپنے بڑوں کا نام' کوئی ایویں سی لڑکی نہیں ہے۔"

کرنل کو اس کا بات کرنے کا معصوم سا انداز ہمیشہ ہی بڑا اچھا لگتا۔ ان کی
بیٹی کوئی نہیں تھی۔ صرف ایک بیٹا تھا جو امریکہ میں اپنے ماموں کے پاس تعلیم حاصل
کر رہا تھا۔ اس اکلوتے بیٹے کی پیدائش پر بھی انہوں نے بیٹی کی دعا مانگی تھی کہ وہ خود

بھی چار بھائی تھے، بہن کوئی نہ تھی۔ یوں ان کے خاندان میں عورت کی کمی ہی رہی۔

''انکل چائے بنا دوں۔؟'' وہ اپنے بڑا ہونے کا اظہار چائے بنانے کی پیشکش کر کے کیا کرتی۔ ویسے بھی ان کے لیے کچھ کرنے کو اس کا دل مچلتا رہتا۔ پاپا ہوتے تو کیا کچھ نہ کرتی ان کے لئے۔

پھر اک نظر ان کی یہ یونیفارم والی تصویر پر ڈالتی۔

''نہ مجھے بری عادتیں ڈالو۔'' انکل چائے والی پیشکش کا جواب دیتے۔

''اولاد سے خدمت کرانے والی عادت بری ہے کیا۔؟'' خود کو ان کی اولاد ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتی۔ کیسے سرخ و سفید رنگت اور نکھری ہوئی عادات والے نفیس سے انسان تھے۔ وہ قابل رشک نگاہوں سے انہیں تکتی رہتی۔ اور وہ بڑی براؤن مونچھوں تلے ہونٹ دبائے مسکراتے رہتے۔

''پچھلے دس سالوں سے اپنے کام خود کر رہا ہوں۔'' خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائے ''اچھی ہی عادت سمجھ کر ناں۔''

وہ اک زور کا قہقہہ لگا کر ہنس دیتی۔ ''اور میں جو آپکے لئے چائے بنا دیتی ہوں، تو یہ بھی اچھی ہی عادت کا مظاہرہ کرتی ہوں۔''

''تو کبھی میں بھی تو اچھی عادات کا مظاہرہ کروں نا۔''

''وہ تو آپ دس سالوں سے کر رہے ہیں۔''

''شاباش۔ شاباش۔ مستقبل کی اک اچھی وکیل بنو گی۔ اپنی منزل کا صحیح انتخاب کیا ہے میری بیٹی نے لاء کرنے کا فیصلہ کر کے۔'' ان کے ساتھ جس طرح بحث میں الجھی رہتی، بڑے پیار سے اس کی تعریف کرتے تو وہ بے پناہ خوش ہو جاتی۔

یہ پیاری سی گڑیا جیسی بچی چند دنوں میں ہی ان کے گھر کی رونق بن گئی تھی۔ جس دن دکھائی نہ دیتی ان کی آنکھیں اسے ڈھونڈتی رہتیں۔ بظاہر مطالعے میں غرق ہوتے مگر متلاشی نظریں بار بار بیرونی دروازے کی طرف اٹھتی رہتیں۔

''لاء کرنے کا فیصلہ تو میں نے انکل! اپنے خاندان اور برادری میں ہونے والے لاقانونیت کے فیصلوں کی وجہ سے کیا ہے۔ ان غلط رسم و رواج کی وجہ سے کیا ہے جو ہم لوگوں کی زندگیوں کو برباد کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔''



وہ انہیں تقریباً ہر ملاقات میں یہ باور کرانے کی کوشش میں نئے سرے سے پرانی بحث لے بیٹھتی۔ محض ان کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے لئے۔

ویسے کرنل عمیر آفندی کی زندگی کے واقعات بھی بڑے دلچسپ ہوتے تھے۔ دل چاہتا گھنٹوں بیٹھی سنتی رہے۔ اوپر سے ان کا انداز بیان۔ واہ! اللہ میاں نے بھی کیسے کیسے خوبیوں والے انسان اس دنیا میں بھیج چھوڑے ہیں۔ ایک اکیلے ہی اپنی محفل تھے وہ!

''ماما! چلیں میں آج آپ کی ملاقات انکل سے کراؤں۔''

''کون سے انکل۔؟''

''کرنل انکل۔ میرے دوست ہیں۔''

''تمہارے دوست۔؟'' فرحت نے اک طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

دبلی پتلی ننھی سی مدحت اور اک فوجی شخص، جسے وہ کرنل کہہ رہی تھی۔ یقیناً اس سے تین چار گنا زیادہ عمر کے ہوں گے۔ ان دونوں کی دوستی۔ اچنبھے ہی کی بات لگتا۔ فرحت کی مسکراہٹ خاصی طویل تھی اور نگاہوں میں مذاق کا رنگ بھی گہرا تھا۔

''ہاں میرے۔ کیوں میرا کوئی دوست نہیں ہو سکتا۔؟''

اور پھر وہیں کھڑے کھڑے ماں کا بازو پکڑے پکڑے اس نے اپنے چھوٹے بڑے، ہم عمر، سبھی دوستوں کے نام اور کوائف فرحت کو بتا ڈالے۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کے دوستوں کی لسٹ اتنی طویل ہو چکی تھی تو آگے چل کر کیا ہوگا۔

فرحت حیرتوں میں ڈوبی سن رہی تھی۔ مدحت وہاں ہر وقت حویلی کے اندر رہتی۔ سوائے شمائلہ کے اس کا کسی اور سے ملنا جلنا نہ تھا۔ ہر وقت کمرے میں گھسی کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی تھی۔

ہاں تبھی۔ یہاں شہر میں آ کر دادا کی لگائی پابندیاں اٹھیں تو وہ۔ ہاں۔ یہ بڑا ہے بھی زیادہ دوست بنانے کی۔ نارمل سے ہٹ کر جو بھی کچھ ہو گا پھر اس کا نتیجہ بھی ابنارمل ہی ہو گا۔

سچ ہے۔ مدحت کی زندگی کا ہر سٹیپ ہی نارمل سے ہٹ کر تھا۔

"چلیں نا۔ آپ سوچ کیا رہی ہیں۔؟" وہ ضد کئے کھڑی تھی۔ ماما کے
بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ "میں آپ کو بتا دوں۔ آج میں آپ کو انکل سے ملا کر رہو
گی۔"

"لیکن سنو۔ سنو مدحو۔!" فرحت چلاتی رہ گئی۔ "سنو تو۔"

مگر مدحت کی ضد کے آگے فرحت کی ایک نہ چلی۔ اسی طرح بازو پکڑ
پکڑے اس نے اپنی ماما کو کرنل عمیر آفندی کے روبرو لے جا کر کھڑا کر دیا۔

"انکل! یہ میری ماما ہیں۔" وہ اک تفاخرانہ سے انداز میں انہیں د
ہوئے بولی۔ "اور ماما! یہ میرے انکل ہیں۔"

کرنل اک دم گڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ میں ا
تھا۔ گود میں ایک میگزین تھا۔ دونوں ہی نیچے گر پڑے تھے۔ جو کہ ہمیشہ اس چلبلا
لڑکی کے آنے پر احتیاط سے سامنے پڑی میز پر رکھا کرتے تھے۔ انہیں جھک
اٹھانے کا بھی ہوش نہ رہا۔

"آپ۔؟ مسز زید رحمان آپ۔؟" پھر چونکے۔ "اسلام علیکم۔"

پھر اوپر تلے دو تین چار قہقہے لگا ڈالے۔ "یہ چند گز کے فاصلے پر اک
سی دیوار کے پرے آپ تھیں اور مجھے معلوم ہی نہ تھا۔"

"ارے! آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔؟" مدحت حیران
کر پوچھ رہی تھی۔

"کوئی ایسا ویسا۔" کرنل نے پھر اک قہقہہ لگایا۔ "تشریف رکھئے"
فرحت کو بغور دیکھا سر سے پاؤں تک۔

"شکر ہے آپ دونوں پرانے دوست نکلے۔"

بیٹی کے ریمارکس پر فرحت جیسے ہوش میں آ گئی۔ "تمہارے پاپا او
صاحب دوست تھے۔"

فرحت نے کرنل صاحب کے سامنے والی نشست سنبھالتے ہوئے
بتایا۔ "اور ہم پورے دو سال ایک ہی چھاؤنی میں اکٹھے بھی رہے تھے۔"

پھر فرحت اک تجسس کے ساتھ کرنل صاحب سے مخاطب ہو گئی۔ "دہلی

اور وہ ہمارا منو۔ وہ کیوٹ سا بچہ۔ میں اسے بہت پیار کیا کرتی تھی۔ وہ کہاں
؟"

فرحت ماضی کی یادوں میں ڈوبنے ابھرنے لگی۔ "اور زید بھی اسے بہت
پیار کیا کرتے تھے۔ یاد ہے نا کرنل صاحب! زید ہمیشہ اسے سوتے کو جگا دیا کرتے
اور پھر ملیحہ کا اور ان کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔"

"ہاں۔ بہت مزے کے دن تھے وہ۔ کبھی نہیں بھول سکتا۔ کبھی نہیں۔" کرنل
ی بھی ان یادوں کو کھنگالنے لگے۔ "وہ جھگڑا بھی کتنا مزیدار ہوتا تھا۔" بے حد
ہنسی سے انہوں نے اک لمبا سا واقعہ سنا ڈالا۔

"اب یقیناً انکل! آپ میری ماما کی کوئی تواضع وغیرہ کرنا چاہیں گے۔"
ن ساری گفتگو کے بعد اچانک مدحو ہی کو خیال آیا۔

"کیوں نہیں۔ ضرور۔ ضرور۔ ان کے بہت قرض ہیں مجھ پر۔"

"قرض۔؟" مدحت نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ "کتنی رقم۔"

"رقم میں نہیں ہے قرض۔ چائے پیالیوں کی صورت میں ہے۔"

"کیا مطلب۔؟" مدحو پوچھ گچھ کر رہی تھی اور فرحت ہنسے جا رہی تھی۔

"یہ دن میں کئی بار ہمارے ہاں آ کر چائے پیا کرتے تھے اور ہر بار ساتھ
کہا کرتے تھے کہ گنتی کرتی رہو مسز زید! سارے قرضے چکا دوں گا۔ ایک ایک پیالی
گن گن کر۔"

"تو پھر قرضہ چکانے کا آغاز کر دوں۔؟ بنا لاؤں چائے۔؟ خادم کہیں نظر
نہیں آ رہا۔"

"ہاں بناؤ۔ اب تو تم پر حق شفعہ ہے ہمارا۔ اور ساتھ کچن میں، فرج میں، جو
کچھ ملے سب لے آنا۔" کرنل آفندی بہت اپنایت اور بہت بے تکلفی سے بولے۔

"اس وقت نہیں کرنل صاحب!" فرحت اٹھ کھڑی ہوئی۔ "پھر آؤں گی۔"

"نہیں مسز زید! آج قرضے کی پہلی قسط کی ادائیگی تو ہو کر رہے گی۔ کوئی
بہانہ نہیں چلے گا۔ جاؤ مدحو بیٹا! آپ چائے کا انتظام کریں۔"

"لیکن......"

"تو لیکن ویکن۔" کرنل آفندی نے فرحت کو مزید بولنے ہی نہیں دیا۔ "بیٹھ جائیے۔"

جس تحکمانہ انداز میں کرنل صاحب نے حکم لگایا تھا اسی خادمانہ انداز میں فرحت نے حکم مانا۔ جلدی سے واپس بیٹھ گئی۔

"ارے ہاں۔ میں نے ملیحہ کا اور منو کا پوچھا تھا۔"

"منو تو امریکہ میں اپنے ماموں کے پاس ہوتا ہے اور ملیحہ۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کرنل آفندی دلگیر سے لہجے میں بولے۔ "وہ مجھ سے ناراض ہو گئی۔"

"کیا۔؟" فرحت نے چونک کر انہیں بغور دیکھا۔ ان کے اس جملے کا مفہوم جان نہیں پائی تھی۔

"تین سال ہوئے' ڈیتھ ہوگئی۔"

"اوہ خدایا۔!" فرحت کے چہرے پر عجیب سا' دکھ کا تاثر تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ "کیا ہوا تھا۔؟"

"کینسر تھا پیٹ میں۔ معلوم ہی اس وقت ہوا جب مرض لاعلاج ہوگیا۔"

کتنی ہی دیر فرحت کچھ نہ بول سکی۔ بس اسی طرح ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی رہی۔ مدحت چائے بنا کر لے آئی تو تبھی فرحت نے ہاتھوں میں سے سر نکالا۔ رخسار آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے۔

"کیا ہوا ماما۔؟ انکل! آپ نے میری ماما کو کیوں رلا دیا ہے۔؟"

"نہیں نہیں۔" فرحت جلدی سے چہرہ صاف کرتے ہوئے مسکرائی۔ ا[illegible] کیلئے یہ خبر نئی تازہ تھی مگر کرنل تو سمجھوتہ کر چکے تھے شاید۔ مدحت کو چائے لاتے دیکھ جلدی جلدی میز کو خالی کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

"ہاں۔ میں نے رلا دیا ہے تمہاری ماما کو۔ بہت مارا ہے۔ بھلا اتنے دن کیوں چھپی رہیں۔ ہمارے پاس تو بہت سارے دکھ سکھ شیئر کرنے والے تھے۔"

"تو اب کرلیں۔" اس نے بھی کرنل آفندی سے شوخ لہجے میں کہا۔ "میں چلی جاتی ہوں یہاں سے۔"



"ارے ارے۔!" انہوں نے مدحت کو بازو سے پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ "تم کہاں جاتی ہو۔ تمہیں تو ابھی ہم ایوارڈ دینے والے ہیں۔ ہماری گم شدہ پڑوسن ہم سے ملا دی۔"

"اور وہ بھی عین بین اسی ناطے کے ساتھ۔ کمال کی بات ہے نا۔" مدحت نے ان کی بات مکمل کر دی تو تینوں ہی بے ساختہ ہنسنے لگے۔

"ہاں۔ اسی رشتے کے ساتھ۔" کرنل بہت زیادہ خوش تھے۔ "اک پیاری سی پڑوسن کے روپ میں۔"

ان تعریفی جملوں پر فرحت نے کچھ چونک کر کچھ شرما کر ان کی طرف دیکھا۔ "آپ بھی کرنل صاحب کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس وقت تو آپ مجھے اور ملیحہ کو بڑے بڑے خطابات سے نوازا کرتے تھے۔ جب اللہ میاں حسن' سلیقہ' خوش اخلاقی تقسیم کر رہا تھا تو ملیحہ اور فرحت کہیں مٹرگشت کرنے نکلی ہوئی تھیں۔"

مدحت انکی بات ماما کے منہ سے سن کر بے ساختہ قہقہے لگانے لگی۔ "اور آپ نے یقین کر لیا ماما۔"

"ابھی انہوں نے میری گنوائی ہوئی تعریفوں میں سے ایک کم کر دی ہے۔ عقل وخرد۔ خیر سے دونوں ہی خواتین عقل سے پیدل تھیں۔ ہماری ہر بات کا یقین کر لیا کرتی تھیں۔"

"اس وقت کی عورت بہت بھولی اور معصوم ہوتی تھی۔ اعتبار کر لیتی تھی مرد کا۔" فرحت نے خجل سی ہوتے ہوئے گویا صفائی پیش کی۔

"اور مزے کی بات یہ ہے مدحت بیٹے! اس وقت چھاؤنی میں جتنے افسران کی بیویاں تھیں' ان میں سے میں تمہاری ماما سے سب سے زیادہ متاثر تھا۔"

"سچ انکل۔؟ تھینک یو انکل۔" کرنل آفندی کے منہ سے اپنی ماما کی تعریف سن کر مدحت نہال ہی ہو اٹھی۔

"اور مجھے یقین ہے یہ ابھی تک ویسی ہی ہوں گی۔ اسی طرح اپنا پڑوسن والا رشتہ نبھائیں گی۔" کرنل نے کمال ہوشیاری سے آنے والے وقت کیلئے راہیں ہموار کیں۔ "کیوں مسز زید رحمان! ہمیں اسی طرح لفٹ دیں گی ناں۔؟"

جواب میں فرحت تو ابھی کچھ نہیں بولی تھی مدحت البتہ یکا یک کہہ اٹھی۔

''ارے یہ کیا لفٹ دیں گی۔ ہم سے بات کریں انکل! ہم سے۔ اب ہمارا سلوک دیکھئے گا۔ اس دور کی بھی اگر کوئی کمی رہ گئی ہوگی تو وہ بھی پوری کر دوں گی۔''

''ارے ہاں۔ اب تو ہمارا یہ ووٹ بھی ہے۔''

پاس بیٹھی مدحت کو ایک بار پھر بازو میں لے کر ساتھ لپٹا لیا۔

''ہماری اپنی بیٹی۔ ہماری تنہائی کو رونقوں سے سجانے والی۔ بہت مشکور ہیں ہم اس کے۔''

''آپ اکیلے ہوتے ہیں یہاں۔؟ میرا مطلب ہے گھر میں۔''

''نہیں۔ خادم ہے نا۔ اردلی۔ وہ آج کل چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ میں نے فوج سے ریٹائرمنٹ لی تو اس نے بھی لے لی۔ صرف میری خاطر۔'' پھر جیسے اپنے ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے فرحت سے پوچھنے لگے۔ ''آپ کے گھر میں آپ دونوں کے علاوہ اور کون ہوتا ہے۔؟''

''وہ۔ وہ۔ میرے......'' فرحت گھبرا گھبرا کر ہکلا ہکلا کر انہیں دیکھتی رہ گئی۔ فیصلہ ہی نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا بتائے۔؟ ایسے الجھے ہوئے اس کے رشتے تھے سارے۔!

''میں اور ماما ہوتی ہیں۔'' مدحت نے جلدی سے ماں کو سنبھالا دیا۔ ان کی پوزیشن کو سمجھ رہی تھی۔ ''دادا آ جاتے ہیں کبھی کبھار جب زمینوں اور حویلی کے کاموں سے فرصت ملے اور میرے چاچو ہوتے ہیں۔ ارے! آپ کو میں نے بتایا نہیں پہلے۔؟'' پھر وہ بڑے پرجوش انداز میں بولے گئی۔

''میرے چاچو یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ بہت لائق فائق ہیں۔''

''سنگل ہیں کیا۔؟ ابھی شادی نہیں کی۔؟''

کرنل کے استفسار پر دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگیں۔ عابی کے متعلق فرحت تو بات کر سکتی ہی نہیں تھی۔ اور وہ بھی مدحت سامنے، جس نے ماں سے بڑی تاکید کی تھی۔ ''ماما! آپ عابی کے متعلق یہاں سب یہی بتایئے گا کہ وہ میرے بس چاچو ہیں۔ اس کے علاوہ اور کسی کو بھی، کچھ بھی بتانے



کی ضرورت نہیں ہے۔''

تبھی کرنل عمیر آفندی کے استفسار پر فرحت ہکلانے لگی۔ ''وہ۔ وہ۔''

''کچھ دیر پہلے ہی تو وہ اسٹیٹس سے آئے ہیں۔'' فرحت کو پریشانی میں مبتلا دیکھ کر مدحت نے فوراً اس کی مدد کی۔ ''چھ سات سال بعد۔''

''کوئی میم شمیم کا چکر تو نہیں چلا آیا جوان۔'' کرنل نے خوشگوار انداز میں اک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''ہماری ینگ جنریشن کے لوگ بیرون ملک کی خواتین سے ذرا جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً ان کی خوبصورتیوں......''

''نہیں نہیں۔'' مدحت نے اک دم ہی ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قطع کر ڈالی۔ ''میرے چاچو ایسے نہیں ہیں۔ بالکل نہیں۔'' کوئی اسکے عابی کو غلط یا برا کہے یہ بھی اسے کب گوارا تھا۔ اس کا پور پور عابی کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔

''میرے بیٹے کا چاچو بھی ایسا نہیں تھا۔ پر باہر کی ہوائیں فضائیں۔ ہماری نوجوان نسل کو بہت راس آ جاتی ہیں۔'' فرحت جیسی ہمدرد ہستی سامنے تھی درد دل نوک زبان پہ آ گیا' کچھ سنجیدہ اور ساتھ ہی افسردہ سے ہو گئے تھے۔

''اینی وے۔ ہم تو اکیلے رہ گئے نا۔ بہن کوئی تھی نہیں۔ بھائی دوسرے ملکوں کے ہو گئے۔ کوئی نوکری کے بہانے' کوئی بزنس کے لئے اور کوئی عورت کی خاطر۔'' فرحت کو تفصیل سے بتانے لگے۔ ''میں اکثر سوچتا ہوں مسز رحمان! اک اکیلا میں ہی رہ گیا تھا ساری وفاداریاں نبھانے کو۔'' لبوں پر زہرخند لئے وہ بولتے چلے گئے۔ ''ملیحہ مرحومہ کی وفاداری۔ وطن کی وفاداری۔ فوج کی وفاداری' آبائی گھر کی وفاداری۔ اور یہ سب وفاداریاں نبھاتے نبھاتے اکیلا رہ گیا اس اتنے بڑے گھر میں۔ اور اب کتنے ہی سالوں سے یوں تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔''

''آپ تنہا کب ہیں انکل! میں آپ کی بیٹی ہوں تو آپ کے پاس۔'' پاس بیٹھی مدحت نے اپنا منا سا سر ان کے چوڑے کندھے پر ٹکا دیا۔

''ارے ہاں تو۔ میں بھی کیسا بے وفا نکلا۔ یہ کیا کہہ گیا۔ سٹھیا گیا ہوں وقت سے پہلے ہی۔ مدحو بیٹی ہے تو میرے پاس۔''

انہوں نے بڑے پیار سے مدحت کا سر تھپتھپایا۔ چہرے پر سے یکا یک

افسردگی پھیلی دھند چھٹ گئی۔ وہ پھر ویسے کے ویسے دکھائی دینے لگے۔ روشن روشن چہرے والے۔ مسکراہٹیں بکھیرتے لبوں والے۔ جگمگ جگمگ کرتی آنکھوں والے
مدحت بڑی دلچسپی سے انکے چہرے کو تک رہی تھی۔ کتنی مہارت رکھتے تھے وہ اندر کے موسموں کو بدل لینے کی۔ یہی ادا تو اسے ان کی پسند تھی بہت۔

"ارے! آپ نے یہ کیک بسکٹ کچھ بھی نہیں لیا۔" وہ اسی خوشگوار لہجے اور انداز میں فرحت سے مخاطب تھے۔ "ہم نے آپ کے کیک اور بسکٹ بھی بہت کھائے ہیں۔ بہت مقروض ہیں آپ کے۔ خدا کے لئے میرا کچھ بوجھ ہلکا کریں۔ آگے جانے سے پہلے پہلے میرا کچھ حساب کتاب درست کر دیں۔"

"ہائے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ جہاں آپ دوسری وفاداریاں نبھاتے رہے ہیں' وہاں اب آپ نے باقی عمر اپنی اس دوست کی وفاداری بھی نبھانی ہے۔" بڑے اپنایت بھرے انداز میں کرنل کی ٹھوڑی پکڑ کر ان کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

"وہ کیسے۔؟ اس کا طریقہ میری منی سی دوست خود ہی بتا دے۔"

"فی الحال تو ایسے کہ کل آپ میرے ساتھ ڈنر کریں گے۔ میرے گھر میں۔ کیونکہ میری ماما کوکنگ بہت اچھی کرتی ہیں۔"

"اور آپ سے وفاداری کرتے کرتے مسز رحمان سے بے وفائی کر جاؤں"

"بے شک۔ میری توبہ۔ آپ کو پتہ نہیں ابھی' میں کتنا کھایا کرتا تھا۔" کنکھیوں سے فرحت کو تکنے لگے۔ مسکراہٹیں ہونٹوں کے کونوں میں دبا رہے تھے۔

"کب۔؟" فرحت نے جلدی سے تردید کر دی۔ "آپ کی خوراک تو بہت کم ہوا کرتی تھی۔"

"کم ہوا کرتی تھی۔؟" لہجے میں وہی شوخی تھی۔ "پھر آپ زید کو اور مجھے ہمیشہ پیٹو کا خطاب کیوں دیا کرتی تھیں۔؟"

"وہ تو مدحو بیٹے! میں اور ملیحہ اپنے بدلے لینے کے لیے صرف پیٹو ہی نہیں اور بھی بہت کچھ انہیں کہہ ڈالا کرتی تھیں۔" فرحت ہنس ہنس کر مدحت کو بتانے لگی۔
اس وقت کتنے خوبصورت رنگ ماما کے چہرے پر پھیل رہے تھے۔ مدحت



نے بہت عرصہ بعد ماں کا یہ روپ دیکھا تھا۔ ہنستا ہوا' خوشی کا بھرپور تاثر دیتا ہوا یہ چہرہ۔ "ارے! میری ماما تو خاصی حسین عورت ہیں۔" ستائش بھری نگاہوں سے فرحت کو تکتے ہوئے مدحو دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ پھر چونکی۔

"بس پھر ٹھیک ہے انکل! آپ ذرا سا تو کھاتے ہیں۔ ماما کے بیان کے مطابق۔ لہٰذا ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا' اک آپ کو ڈنر کھلا دینے سے۔ اس لئے کل کی دعوت پکی۔"

"دیکھو دیکھو یہ لڑکی مجھے کیسے ٹریپ کر رہی ہے۔" فرحت سے فریادی ہوئے۔

"ٹریپ نہیں۔ محبت' دوستی اور ہمسائیگی کے اصولوں کی ادائیگی۔ آپ اکیلے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی دو چار لوگوں کے ساتھ مل بیٹھ کر دیکھیں۔ کتنا مزہ آتا ہے۔"

"تو اب ہماری بیٹی ہمیں زندگی کے مزے چکھانا چاہتی ہے۔ نہ خراب کرو میری عادتیں۔ ایسا نہ ہو پھر تمہاری ڈنر کی ٹیبل پر مستقبل اک ناخواندہ مہمان کا اضافہ ہو جائے۔"

"عادتیں ہی تو خراب کرنا چاہتی ہوں۔"

"چلو مدحو۔" فرحت کچھ سوچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ماسی جیراں ہمیں ڈھونڈ رہی ہو گی۔ اچھا کرنل صاحب! انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔"

فرحت اک دم ہی چل پڑی تھی۔ تب مدحو بھی اٹھی۔ ساتھ ہی کرنل صاحب بھی مسلسل مدحت سے باتیں کیے جا رہے تھے۔ یوں باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا۔ اپنے گھر سے نکل کر ان کے گیٹ تک چلے آئے تھے۔

"تو آپ برے کو اس کے گھر تک پہنچانے کے قائل ہیں۔؟"

فرحت نے شوخی سے مسکراتے ہوئے جملہ بولا اسی پرانے انداز میں۔ جب زید رحمان اور ملیحہ ان کی زندگیوں میں تھے۔ کرنل صاحب نے بے اختیار اک قہقہہ لگایا اور جلدی سے اپنے گیٹ کی طرف پلٹ گئے۔

"ارے!" مدحت نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ بہت حیران ہو رہی تھی۔ کیا اس کی ماما ایسی بذلہ سنجی کی کوئی بات کر سکتی تھیں۔؟ اس نے تو ہمیشہ ان کے ہونٹوں پر

چپ کے قفل ہی لگے دیکھے تھے۔ اور ساتھ مزاج میں افسردگی و رنجیدگی۔!! بڑی اچھی تبدیلی تھی یہ۔ اور کرنل عمیر آفندی کی ہستی کا ہی اعجاز تھا شاید۔ وہ ایکدم ہی ان سے مزید متاثر ہوگئی۔

''دیکھا کتنے اچھے' کتنے پیارے ہیں میرے انکل۔ میرے بیسٹ فرینڈ۔''

''ہاں۔ ملیحہ بھی بہت اچھی تھی۔''

پھر گیٹ سے لاؤنج تک آتے آتے فرحت نے اسے کتنی ساری باتیں ملیحہ کی سنا ڈالیں۔''اس جیسی نفیس خاتون دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہو۔'' فرحت کی آنکھیں ملیحہ کی یاد میں بھیگ رہی تھیں۔

''تبھی تو انکل ان کی یادوں کو ابھی تک سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔''

''ہاں۔ ورنہ مرد تو بہانے ڈھونڈتا ہے دوسری شادی رچانے کے۔''

''اور انہیں بہانہ ملا بھی تو اپنوں نے نہیں کی۔ کیسے اکیلے زندگی گزارے جا رہے ہیں۔ بڑا سناٹا ہوتا ہے ان کے گھر میں۔ مجھے بہت ترس آتا ہے۔''

''ارے ہاں۔'' پھر یکایک فرحت کو کچھ خیال آیا۔''تم نے مجھ سے مشورہ کیئے بغیر انہیں کل کی دعوت کا کیوں کہہ ڈالا۔؟''

''آپ کی خاطر۔''

''میری خاطر۔؟'' فرحت حیران ہوئی۔

''انہیں مل کر آپ بہت خوش تھیں۔''

''ہاں۔ میں خوش تو تھی۔'' فرحت نے اعتراف کیا۔''ہمارا بہت اچھا ساتھ رہا تھا۔ بطور پڑوسیوں کے۔ پر اس وقت زید خود تھے۔ اور اب۔''

وہ کسی اندرونی سوچ میں کھوئی کھوئی بڑبڑائی۔''تمہارے دادا کو پتہ چلا تو وہ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔''

''کیوں۔؟'' مدحو یکدم ہی بھڑک اٹھی۔''انہیں یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ آپ کو کسی سے ملنے جلنے سے بھی منع کر دیں۔ آپ ان کی قیدی ہیں کیا۔؟''

''آہستہ بولو۔ وہ میرے باپ برابر ہیں۔ مجھ پر ہر حق رکھتے ہیں۔''

''ہونہہ باپ برابر۔ ہر حق رکھتے ہیں۔؟'' وہ بے لحاظی سے با آواز بلند



بڑبڑانے لگی۔''بڑا اچھا کر رہے ہیں نا آپ کے ساتھ۔ باندھ رکھا ہے آپ کو۔ جیسے کسی گائے کو کھوٹے کے ساتھ باندھ دیں اور پھر بھول جائیں۔ جانور ہیں آپ۔؟ انسان نہیں ہیں؟''

''ہائے ہائے۔ یہ کیا بکے جا رہی ہو۔؟''

''تو اور نہیں کیا۔ ذرا اپنے بیٹے کو دیکھیں۔ عابی جس سے چاہتے ہیں ملتے ہیں۔'' چاچے کی محبت علیحدہ تھی۔ ڈھیروں ڈھیر۔ لیکن حق سچ بات کہنے سے وہ کبھی بھی چوکا نہیں کرتی تھی۔ بڑبڑ کیئے گئی۔ ماں کے لیے احتجاج کرنا جیسے اس کا فرض تھا۔

''مرد عورت میں فرق ہوتا ہے۔'' فرحت نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

''کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جب خدا نے دل ایک جیسا دیا ہے تو اس میں جذبات بھی ایک جیسے ہی ہوں گے۔ پھر عورت پر ایسی ایسی پابندیاں کیوں۔؟''

''تم ابھی چھوٹی ہو۔ ان معاملات میں مت پڑو۔ نہیں سمجھ سکو گی۔''

''چھوٹی ضرور ہوں لیکن عقل شعور بڑوں جیسا ہے میرے پاس۔'' وہی اپنا دعویٰ دھرایا۔''تم خواہ مخواہ ہی مجھے ادھر لے گئیں۔'' فرحت نے خود کلامی کے انداز میں جیسے اپنے پچھتاوے کا اظہار کیا۔''میں نہیں چاہتی گھر میں کوئی ہنگامہ کھڑا ہو۔''

''سارا دن اندر کمروں میں گھسی رہتی ہیں۔ میں تو ابھی آپ کو اپنے دوسرے دوستوں سے بھی ملواؤں گی۔'' وہ بولے چلی گئی۔ تھی تو بچی ہی۔ کچی عمر کی۔

''ماہ نور کی ماما سے بھی۔ آنٹی گل رخ سے بھی۔ انکل آفندی سے تیسرے گھر میں رہتی ہیں۔ ہائے ان کی سیامی بلی۔ کیا بتاؤں کتنی پیاری ہے۔ اپنی سب دوستوں سے ملواؤں گی انشاء اللہ۔''

''تمہاری دوستوں میں بلیاں بھی ہیں۔؟'' فرحت نے اس سنجیدہ اور تلخ موضوع سے اس کا ذہن ہٹانے کو بات مذاق میں ڈال دی۔

''ہاں۔ بلیاں بھی ہیں۔ ان سے بھی ملواؤں گی۔ ہمارے معاشرے میں ہماری جنس کو کب انسان سمجھا جاتا ہے۔ گائے' بھینس' بکریاں' بلیاں ہی تو ہیں ہم۔ کیوں نہ ملیں گی ان سے۔ اپنی جنس سے۔''

بڑبڑاتے بڑبڑاتے اٹھی۔ ٹی۔ وی آن کیا۔ پھر بیٹھ گئی۔ اب ساتھ ساتھ

ٹی۔ وی واچ کر رہی تھی ساتھ ساتھ زبان کو بھی چلائے جا رہی تھی۔ آرے کی طرح کاٹ کر رہی تھی۔ اندر کی تلخی اگلے جا رہی تھی۔ اتنے سالوں سے یہی کچھ تو دیکھ رہی تھی گھر میں۔ ''ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے ہمیں یہاں آئے ہوئے' میں دیکھ رہی ہوں آپ کو۔ کیسی زندگی گزار رہی ہیں۔ حویلی میں پھر نوکر چاکر تھے۔ اردگرد سے مزارعوں کی عورتیں اپنے اپنے مسائل لے کر آ جایا کرتی تھیں۔ آپ کے اندر اگر سناٹے اور ویرانی تھی تو باہر تو کچھ رونق ہو جاتی تھی۔ اسی سے دل کچھ بہل جاتا ہوگا۔ مگر یہاں۔'' ماں کی زندگی میں جو ویرانے تھے ان کا احساس شدت سے تھا۔ ''یہاں شہر میں آ کر تو آپ وہاں سے بھی زیادہ مقید و محبوس ہو گئی ہیں۔''

شدت احساس سے وہ بڑے بڑے الفاظ بولنے لگی تھی۔ فرحت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔ مگر اسے دیکھنے کا ہوش کب تھا۔

''یہاں بس اک آپ ہیں۔ اک ماسی جیراں اور ایک مالی بابا۔ رات کو عالی آ جاتے ہیں تو آپ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی ہیں۔ دن کو بھی کہیں آتی جاتی نہیں۔ کہا تھا آگے پڑھائی شروع کر لیں۔ مگر ناں جی۔ وہ بھی نہیں۔''

سرخ سرخ' تپا تپا چہرہ ماں کی طرف گھمایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''خدا کے لئے مجھے بتا تو دیں کہ آپ اپنی زندگی کے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ کس پیٹرن کی' کس اسٹائل کی آخر آپ زندگی گزارنا چاہتی ہیں باقی کی۔''

اس کے چراغوں جیسی روشن آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی تھی۔ دھند ہی دھند۔ ہر طرف ''مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے آپ کو یوں اپنی زندگی بگاڑتے دیکھ کر۔''

''بگاڑتے دیکھ کر۔؟''

''ہاں۔ ایسی زندگی کو سنوری ہوئی زندگی تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ راہبانہ سی زندگی۔ نہ ٹی وی دیکھتی ہیں۔ نہ کچھ پڑھتی ہیں۔ نہ کہیں آتی جاتی ہیں۔ ہمارے اسلام میں ایسی زندگی کا بھی کوئی تصور نہیں پیش کیا گیا۔ بس سوچوں میں کھوئے رہنا ہر وقت اور اٹھنا اور نماز پڑھ لینا اور بس۔ یہ بگڑی ہوئی زندگی کی اک شکل ہے۔ جیسے آپ کسی سے انتقام لے رہی ہیں۔'' وہ پھر جوش میں آ گئی۔ ''اپنی زندگی کا کسی دوسرے سے انتقام لینا۔ یہ کیسا فعل ہے۔؟ نہیں ماما! نہیں۔ ایسے نہیں۔''



پھر بڑھ کر ٹی۔ وی آف کر دیا۔ نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ماما سامنے تھیں۔ ماما دائیں طرف تھیں۔ ماما بائیں طرف تھیں۔ ماما پیچھے تھیں۔ ماما اوپر تھیں۔ اردگرد ہر سمت وہی پھیلی ہوئی تھیں۔ اندر بھی۔ سینے میں دھڑکتے دل میں' دماغ کی اک اک لہر میں' سوچ میں۔

''کبھی میری جگہ اپنے آپ کو رکھ کر دیکھیں۔ کتنی دکھی اور پریشان زندگی گزار رہی ہوں۔ صرف آپ کی وجہ سے۔ ہر وقت دل پر اک بوجھ سا رہتا ہے۔ میری ماما کا کیا بنے گا۔؟ اللہ آپ کو سدا سلامت رکھے۔ ابھی تو آپ کی بہت زندگی پڑی ہے۔'' پتہ ہی نہیں چلا۔ کب آنسو رخساروں پر پھیلنے لگ پڑے تھے۔ ہاتھ کی پشت سے انہیں رگڑ کر پونچھا۔ ''تبھی آپ کو انکل آفندی سے' ملانے لے گئی تھی۔ زبردستی۔ آپ کی مرضی کے خلاف۔ اور پھر کل ڈنر پر انوائیٹ بھی کر لیا۔ سچی ماما! میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار آپ کے چہرے پر ایسی چمک اور رونق دیکھی ہے۔ آپ جب انکل سے ماضی کی باتیں کر رہی تھیں۔ آپ کے لبوں پر اک انتہائی حسین سا تبسم تھا۔ مجھے یقین ہے آپ کو پاپا یاد آ رہے ہوں گے۔''

مدحت ماں کے سامنے قالین پر بیٹھ گئی۔ پھر ان کے دونوں گھٹنے تھام لئے۔

''آپ انکل سے ملا کریں۔ ہر روز ملا کریں۔ ماضی کے جھروکوں میں جھانکا کریں۔ پرانی یادیں اگر کوئی اچھے لمحات دے جائیں۔ خوشی اور مسرت کے۔ تو انہیں بصورت جگنوؤں کی طرح راستے کے دیئے بنا لیں۔'' پھر وہ جھک کر فرحت کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ''انکل بھی مجھے بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ہیں نا؟ ماما ان سے اتنے دنوں سے مل رہی تھی مگر میں نے محسوس کیا ہے آپ سے مل کر جو خوشی انہیں ہوئی ہے' وہ بے اندازہ تھی۔ قہقہے پہ قہقہے لگا رہے تھے۔ آپ دونوں اپنے دکھ اور اپنا ماضی ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر لیا کریں۔ آنٹی ملیحہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے چہرے پر بھی روشنی سی پھیل رہی تھی۔ آپ سے ملاقات کی خوشی ان کی اک اک حرکت سے عیاں ہو رہی تھی۔ اور مجھے آپ دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔''

''اتنی ساری قیاس آرائیاں کر لیں۔ اتنے سارے قیافے لگا لئے۔''

فرحت نے مسکراتے ہوئے بڑے لاڈ پیار سے مدحت کے گال پر اک ہلکی سی چپت لگائی۔ اسے اندازہ ہو گیا۔ ماں نے اس کی کسی بات کا برا نہیں منایا تھا۔

''یوں سب سے کٹ کر تنہا ہو کر' کسی قفس میں بند پر کٹے پنچھی کی طرح کمروں کی گھٹی گھٹی فضا میں رہ کر' اپنے آپ پر ظلم نہ کریں ماما! نہ کریں۔ میں بہت پریشان' بہت بے سکون ہو جاتی ہوں۔ میری خاطر ماما! میری خاطر ہی۔ پنجرہ کھول دیں۔ اپنے دل کے پنچھی کو آزاد فضاؤں کے حوالے کر دیں۔ پلیز ماما! پلیز۔''

اور اس نے فرحت کے گھٹنوں پر پیشانی ٹکا دی۔ فرحت اس کے بال سہلانے لگی۔

## 36

آفس کے کسی کام کی وجہ سے ہمایوں خاں کو واشنگٹن جانا پڑا تھا۔ اسے وہاں ایک پرانی دوست مل گئی۔ وہ جب امریکہ آیا تھا تو یہاں سب سے پہلے اس کی جس کے ساتھ دوستی ہوئی تھی' وہ یہی تھی۔ ایلس۔ بہت خوبصورت' بہت طرحدار' نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی۔ شوخ وشنگ اور چنچل۔ ذہین اور باشعور۔

پہلی ہی ملاقات میں دونوں کی دوستی آخری زینے پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔ پھر دونوں پورے چھ مہینے اکٹھے ایک ہی اپارٹمنٹ میں بھی رہے تھے۔ اگر ایلس کو کسی وجہ سے کیلیفورنیا نہ چھوڑنا پڑتا تو شاید جینی فر کی بجائے آج وہی ہمایوں خاں کی لائف پارٹنر ہوتی۔

بہت انجوائے کی تھی زندگی ان چھ مہینوں کی' جو دونوں نے اکٹھے گزاری تھی۔ بڑی اچھی یادیں دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھیں۔

ہمایوں خاں صرف دو دنوں کے لئے واشنگٹن گیا تھا مگر جب وہاں اچانک ایلس مل گئی تو پورا ہفتہ ہی اس نے اس کے ساتھ گزار دیا۔ نہ صرف اپنے جذبات کے ہاتھوں شکست کھا گیا تھا بلکہ خود ایلس کے پرزور اصرار نے بھی جینی کو برائے چندے



ذہن سے نکال ڈالا کہ وہ اس بیوی کا شوہر بھی تھا۔ اور اس کے بہت سارے حق حقوق اور ذمہ داریاں اس پر واجب تھیں۔

اس ملک کا یہی دستور تھا۔ اور یہی انداز اور طریقے تھے زندگی گزارنے کے۔ آزاد ماحول' آزاد فضائیں' آزاد لوگ' آزاد رشتے' آزاد رسم و رواج۔ ایلس نے اسے پورے واشنگٹن کی خوب سیر کرائی تھی۔ دونوں نے مختلف ہوٹلوں میں کھانے کھائے تھے۔ تین چار عریاں سی فلمیں بھی مل کر دیکھ ڈالی تھیں۔ مختصر سے مختصر لباس کے ساتھ مختلف سیر گاہوں میں سن باتھ بھی کئے تھے۔

یوں ایک بار پھر انہیں گزرے وقت جیسی انجوائے منٹ نصیب ہوئی تھی۔ لہٰذا بہت خوش تھے دونوں۔

''میری بیوی اتنی لمبی غیر حاضری پر جب باز پرس کرے گی تو کیا جواب دوں گا اسے کہ میں نے یہ وقت کہاں' کیسے اور کس کے ساتھ گزارا۔؟'' اس من چلے نے بڑی شرارت سے پوچھا تھا۔ آنکھوں میں جگمگاہٹیں لئے اس کی نیلی آنکھوں میں تکے جا رہا تھا۔ ڈوبے جا رہا تھا۔

''کچھ نہیں کہے گی۔ بے شک بتا بھی دینا۔'' ایلس لاپرواہی سے بولی تھی۔

''یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔''

''مگر ہمارے ملک میں تو۔''

''جانتی ہوں سب کچھ۔ تمہارے ہاں کے لوگ بہت دقیانوسی ذہنیت رکھتے ہیں۔ اور یہاں کی عورت اور مرد دونوں ہی بہت براڈ مائنڈڈ ہوتے ہیں۔''

''سیدھا سیدھا بے وفا ہرجائی کہو نا۔ عورت بھی' مرد بھی۔''

ہمایوں خاں نے اس کا مذاق اڑایا تھا تو وہ بڑے کھلے دل سے ہنس پڑی تھی۔ اور زور زور سے سر ہلا کر اپنے پاس سے بھی بہت کچھ کہہ ڈالا تھا کہ ان کے ہاں جھوٹ بولنے کی روایت نہ تھی۔ سب کچھ کھلے بندوں' سرعام کرتے تھے۔ اچھائی بھی' برائی بھی۔ نہ کسی سے جھجکتے تھے۔ نہ چھپاتے تھے۔

اور۔ وفاؤں کی قائل وہ بھی تھی۔ اندر سے۔ دل سے۔ مگر اپنے ملک کے کلچر کے ہاتھوں مار کھا جانے والی عورت کے لحاظ سے اسے آخر خاموش ہو جانا پڑا تھا۔

ہمایوں خان بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت کے ساتھ اتنے شب و روز گزار کر بہت ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوا تھا۔ آخر بنیادی طور پر تھا تو اک پاکستانی مرد ہی۔ مگر...... گھر کی روشنیوں اور ڈرائیووے سے بیڈ روم تک پھولوں سے آراستہ گھر کو دیکھ کر چونک بھی پڑا تھا۔ پھر جینی فر کا چہرہ۔ وہ تو ایسے دمک رہا تھا کہ اس کے سہاگ رات والے چہرے کو بھی مات کر رہا تھا۔ ''یہ۔ یہ سب کیا ہے۔؟''

''بس۔ بوجھ لو۔'' جینی نے اپنے سفید سفید بازوؤں کا ہار اس کے گلے میں ڈال کر اس کے چہرے پر کئی پیار کر ڈالے۔

''ہمایوں کھاں! میں بہت خوش ہوں۔ بوجھو گے تو انعام دوں گی۔''

ہمایوں نے اسے بہت سارے اردو کے الفاظ سکھا دیئے ہوئے تھے۔ وہ انگریزی میں مکس کر کے جب بولتی تھی تو بہت اچھی لگتی تھی۔

ہمایوں اس کے انداز پر نثار ہو ہو گیا۔ ''مجھے یہ جو تمہاری صورت میں انعام مل چکا ہے اس سے اعلیٰ کی اور کیا توقع کر سکتا ہوں۔ اور کیا سوچ سکتا ہوں۔''

کچھ خوشامد بھی مقصود تھی۔ اور کچھ دل کی آواز بھی زبان پر آ گئی تھی۔ یوں بھی اتنے دنوں کی غیر حاضری کا جینی نے ذکر تو کیا' جتایا تک نہیں تھا۔ نہ موڈ خراب کیا تھا۔ پاکستانی عورتوں کی طرح۔ اس لئے بھی وہ زیادہ ہی خوش تھا اور تبھی ریلیکس بھی خاصا ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر اردگرد' در و دیوار پر نگاہ دوڑائی۔

''ارے۔!'' وہ چونکا۔ روشنیوں اور راستے میں بکھرے پھولوں کے علاوہ بیڈ روم کی دیواروں پر بہت ساری نئی نئی تصویریں لگی تھیں۔ اور ہر تصویر میں ان دونوں کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔

نجانے یہ تصویریں اس نے کب اور کیسے بنوائی تھیں اور یہ بچہ وہ کہاں سے لے آئی تھی جو کسی تصویر میں ان دونوں کے درمیان تھا۔ کسی میں ایک کی گود میں تو کسی میں دوسرے کی گود میں اور کسی تصویر میں سامنے قالین پر تھا۔ اور ہمایوں اور جینی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

''یہ سب تصویریں میں نے خود بنائی ہیں۔'' ہمایوں خاں کی نظروں کے ساتھ ساتھ جینی کی نگاہیں گھومتی ہوئی' اس کے چہرے پر آن ٹکی تھیں۔



''اوہ!'' ہمایوں خاں نے اک گہرا سانس کھینچا۔ ''تو یہ کمپیوٹر کا کمال ہے۔''

جینی کمپیوٹر کی ماہر تھی۔ ہمایوں نے تصویروں کو سراہتے ہوئے ستائش بھری نگاہیں جینی کے مسکراہٹیں بکھیرتے چہرے پر گاڑ دیں۔

''میرے پیچھے تم یہی کام کرتی رہیں۔؟''

''اور بھی بہت کام کیے ہیں۔ آؤ دکھاؤں۔'' پھر اس نے وارڈ روب کھولا۔

''یہ دیکھو۔''

جینی کے اپنے ملبوسات اک کونے میں لگے تھے اور باقی ساری جگہ پر اوپر سے نیچے والے سب خانوں میں کسی بچے کے مختلف اقسام کے منے منے سے ملبوسات ہینگروں میں لٹکے ہوئے تھے۔ بہت سارے تھے۔ بہت قیمتی تھے' مختلف رنگوں کے مختلف اسٹائلز کے۔ ''ارے؟ یہ کیا۔؟'' تو جینی کا بچے والا جنوں اس حد تک پہنچ گیا تھا۔ ہمایوں کے چہرے پر تردد بھری لکیریں پھیل گئیں۔

''کچھ عقل کرو۔ اللہ نے جب بچہ دینا ہو گا دے دے گا۔ اور پھر ایسی ایسی ساری خریداریاں بھی کر لینا۔ ابھی رقمیں ضائع کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔؟''

ساتھ ہی اس بڑی رقم کا خیال آ گیا جو ایلس کے ساتھ اجاڑ کر آیا تھا۔ جوائنٹ اکاؤنٹ میں اس کی بھی کمی پوری کرنا تھی۔ ابھی جینی کو معلوم ہونے سے پہلے پہلے۔

''ضائع کچھ نہیں ہوا ہمایوں کھاں! میں سچ مچ پریگننٹ ہوں۔ جس دن تم گئے ہو اسی دن مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ میری طبیعت خراب تھی۔ یاد نہیں۔؟ کیا بھول گئے ہو۔'' ساتھ ہی وہ ہمایوں سے لپٹ گئی۔ ''ہمایوں! میں بہت خوش ہوں۔ بے حد۔'' وہ بچے کے لئے اتنی پر جوش تھی' اس قدر جذباتی ہو رہی تھی کہ اپنی حرکات و حالات پر کوئی اختیار ہی نہیں رہا تھا۔

اور ہمایوں خاں یہ خوشخبری سن کر خاصا بے مزہ ہو گیا تھا۔ ساری محبتیں' تمام وضع داریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ اک جھٹکے کے ساتھ سینے سے لگی جینی کو علیحدہ کیا۔ جیسے مزے دار نوالہ چباتے چباتے دانتوں میں اک دم کوئی پتھر آ جائے۔ اور نوالہ ہی اگلنا پڑے۔ یہی انداز تھا جینی کو پرے ہٹانے کا۔ لیکن وہ اپنی ترنگ میں تھا مگر کہ حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔ بے پایاں خوشی کی بے اختیاری تھی۔

''ہم اس خوشی کو کیسے سیلیبریٹ کر سکتے ہیں کہاں۔؟''
''کر تو لیا'' وہ مارے مروت کے مسکرایا۔ ''یہ روشنی' یہ پھول' یہ تصویریں' یہ تمہارے انداز۔ اس سے بڑھ کر اور سیلیبریشن کیا ہو گی۔؟''
''نہیں۔ ہم آج ڈنر کسی بڑے ہوٹل میں کریں گے۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو گفٹ دیں گے جو ایک دوسرے سے چھپا کر خریدا جائے گا۔ دونوں کیلئے سرپرائز ہو گا۔ پھر مقابلہ کریں گے کس کا زیادہ خوبصورت اور قیمتی ہے۔''
''یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟''
''ہے نا۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں ہم دونوں میں سے کون زیادہ خوش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خبر تمہارے لئے بھی بے انداز خوشی کا باعث ہوئی ہو گی۔''
وہ جو بولنے میں اکثر اختصار سے کام لیا کرتی تھی۔ وہ ان تھک بولے جا رہی گئی۔ آج تو اس کی زبان کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گزرے دنوں کی ساری سوچیں اس نے ہمایوں خاں کے کانوں میں انڈیل دیں۔
تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے کہے بنا ہی چائے یا کافی کا مگ لا حاضر کر کرتی تھی۔ اتنے دنوں بعد گھر آیا تھا۔ دو گھنٹے ہو گئے تھے آ کر بیٹھے ہوئے کو۔ نہ کھانے کو پوچھا تھا۔ نہ چائے کافی یا کسی دوسرے ڈرنک سے تواضع کی تھی۔ مست تھی اس خوشخبری کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنے میں۔
پھر اس نے پانچ سات لڑکیوں کے اور پانچ سات لڑکوں کے ناموں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ''یہ مجھے بہت پسند ہیں۔ یا پھر تم اپنی پسند کا رکھ لینا۔ تمہارے مذہب اور ملک میں جیسے رکھتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔''
تو محترمہ جینی صاحبہ نے نام بھی تجویز کر لیا تھا۔ اس کی بے انداز خوشی اور والہانہ حرکات کو دیکھتے ہوئے ہمایوں خاں نے اپنی بدمزگی اندر ہی اندر دبا لی تھی۔ ہونٹوں پر زبردستی اک مسکراہٹ بھی بکھیر لی تھی۔ اسے جینی عزیز بھی تو بہت تھی۔ اس کی زندگی میں آ کر اس نے اسے خوشیاں اور سکھ بھی بہت دیئے تھے۔ اس کے شب روز بہت خوبصورت رنگوں سے سجا دیئے تھے۔
''مجھے یقین ہے میرا گفٹ تمہارے والے سے زیادہ شاندار ہو



خوبصورت جذبے اندر چھپا کر بظاہر خوشی و مسرت کا اظہار کرنے میں وہ ماہر تھا۔ اور ملمع لگانے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔
''یعنی کہ تم بچے کے لئے مجھ سے بھی زیادہ بے چین و بے قرار تھے۔؟''
جینی نے اک طویل سی چیخ کے ساتھ اپنی حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا تھا۔
ہمایوں خاں نے گلے میں اٹکا ہوا کچھ نگلا۔ ''ہاں۔ میری جینی اتنی خوش ہے تو میں کیسے نہیں ہوں گا۔ میرا تو ہر آتا جاتا سانس تمہارے لئے ہے۔ اور ہر دھڑکن کی لے میں تمہارے سر بولتے ہیں۔''
''اوہ ہمایوں کہاں! تم پاکستانی لوگ کتنے وفادار' محبت کرنے والے اور نرس ہوتے ہو۔ ہم اپنے بچے کو پہلی سیر ہی پاکستان کی کرائیں گے۔ تمہارے ممی ڈیڈی کتنا خوش ہوں گے۔'' اسے معلوم تھا وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور وہ بھی لڑکا۔ جو پالنے سے پاؤں نکالتا ہے تو وہاں کی عورت بہو اور پوتے کے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہے اور باپ وارث مل جانے کے غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اپنے ملک اور قبیلے کے بیشتر رسم و رواج اور عادات و خصائل کے متعلق خاصی تفصیل سے ہمایوں خاں نے اسے باخبر کیا ہوا تھا۔
''ہاں ہاں۔ ضرور چلیں گے۔ بہت خوش ہوں گے میرے پیرنٹس۔''
وہ خلاؤں میں کھویا کھویا بڑبڑایا۔ نگاہوں میں ایمان آفریدی کا پیکر تھرک رہا تھا۔ اس کے اردگرد دو تین پیارے پیارے سے پاکستانی بچے گھیرا ڈالے تھے۔ ہمایوں خاں نے سوچ ہی سوچ میں ان سب کو اپنے حصار میں لیتے کے لیے دل کے بازو پھیلا دیئے۔

## 37

اس نے منت کی تھی۔ اس نے التجا کی تھی۔ اور یہاں تک کہ اپنے منے منے سے ہاتھ بھی جوڑ دیئے تھے اپنے چاچو کے روبرو۔

''ہماری دنیا میں لوٹ آیئے عابی۔!''

وہ اس کی سیدھے سادے اور سرسری سے انداز میں کی ہوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا تو یہ۔ یہ اس کا لب و لہجہ' یہ آنکھوں کی نمی اور یہ بندھے ہاتھ۔ عبدرحمان اتھل پتھل ہو گیا۔ اس کے بندھے ہاتھ تھامتے ہوئے اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ پھر اسے گلے سے لگا کر سر کا بوسہ لیا۔

''نہیں میرا بچہ۔ یہ عابی تمہارا ہے۔ صرف تمہارا۔ اور ہمیشہ تمہاری دنیا میں ہی رہے گا۔''

تب عابی اپنے سارے سامان سمیت سفید بنگلے میں شفٹ ہو گئے تھے اجلال اور ماھم کی شادی اور پھر امریکہ سدھار جانے کے بعد۔ اور اب گاڑی بھی باقاعدہ اس کے تصرف میں تھی۔ جو رحمان علی خاں نے خریدی ہی اس کے نام پر تھی۔

صبح مدحت اور وہ اکٹھے ہی گھر سے نکلتے تھے۔ پھر مدحت کو کالج ڈراپ کر کے عابی خود یونیورسٹی چلے جاتے تھے۔ واپسی کا دونوں کا وقت ایک نہیں تھا۔ سر عبدرحمان اپنے اسٹوڈنٹس کو' جنہیں امتحانات قریب ہونے کی وجہ سے' کلاسز کے علاوہ بھی وقت دے رہے تھے' انتظار میں چھوڑ کر پہلے مدحت کو گھر پہنچانے جاتے تھے۔ اور پھر دوبارہ یونیورسٹی آتے تھے۔

بابا جان مدحت کے معاملے میں کسی ڈرائیور پر بھی بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ گو یہ ان کا حکم تھا۔ مگر عابی کو ان کے گھر میں نہ رہائش رکھنے کی ضرورت تھی اور نہ یہ مدحت والے احکامات کی بجا آوری کی پرواہ۔ یہ تو بس مدحت کیلئے اس کے اپنے جذبے تھے اور زید رحمان کے بعد اولاد کی طرح اس کی تمام ذمہ داریاں قبول کرنے والے وعدے کی پاسداری اور لحاظ۔ وہ بھی باپ کی طرح اپنے اصولوں کا اور دھن کا پکا انسان تھا۔ اسی لیے یہ سب کچھ وہ بڑی خوشی اور مسرت سے کر رہا تھا۔ مگر مدحت چند دنوں میں ہی پریشان ہو گئی۔

''ہائے عابی! آپ کو میری خاطر گھر کے' کالج کے' یونیورسٹی کے' اتنے چکر لگانا پڑتے ہیں۔ آپ کا اتنا سارا اور اتنا قیمتی وقت تو ڈرائیونگ میں ہی برباد ہو جاتا ہے۔''



''یہ وقت کی بربادی نہیں ہے عابی کی جان۔! یہ میرا فرض ہے۔ ہر نسل اگلی آنے والی نسل کو جب وقت کی باگ ڈور تھماتی ہے تو اس کا فرض بنتا ہے' بہت احسن طریقے سے پہلے اس کی تربیت کرے اور پھر تخت حکومت اسے سونپے۔ اور یہ ہم اپنے زلف نبھا رہے ہیں۔ اچھی تعلیم' اچھی تربیت' اور۔''

''بس۔'' عابی کے ہونٹوں پر ہاتھ دھر دیا۔ ''مزید لیکچر اپنی کلاس میں جا کر دیجئے گا۔ فی الحال میرا پروگرام سنئے۔ میری اک کلاس فیلو یہ سامنے والی لائن میں رہتی ہے۔ جاتے ہوئے آپ ہم دونوں کو کالج میں ڈراپ کر دیا کریں اور واپسی پہ ہم دونوں اس کے ابو کے ساتھ آ جایا کریں گی۔ ہمارے ملک کے حالات کا تقاضا یہی ہے کہ ہر معاملے میں کفایت شعاری سے کام لیں۔ کھانے پینے پہننے میں بھی اور پٹرول وغیرہ کے خرچ میں بھی۔''

مدحت ہر معاملے میں باخبر رہتی تھی۔ چند دنوں میں ہی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ عابی نے اگر ان کے ساتھ رہنا منظور کیا تھا تو دوسرے تمام اخراجات میں حتی الوسع خود کفیل تھے۔ کھانے کے اوقات میں اکثر گھر سے غائب ہوتے تھے۔ اور دوسری اور کوئی بھی ضرورت ان کی گھر میں سے پوری نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہے تھے۔ مدحت کی ضد سے گاڑی میں اگر وہ آنے جانے لگے تھے تو اس کا پٹرول وغیرہ کا وہ خود اپنی جیب سے خرچ کرتے تھے۔ اور اس طرح اسے کالج سے لانے لے جانے میں ان پر زیادہ بوجھ پڑتا تھا۔ بڑی عقلوں کی مالک تھی۔ ہر وقت ہر معاملے میں بہت غور و فکر سے کام لیتی تھی۔ خود سے بھی اور اکثر فرحت کے ساتھ بھی گھر کے مختلف معاملات میں ڈسکشن ہوتی رہتی تھی۔ اور جی ہی جی میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے فیصلے کرتی رہتی تھی۔

پٹرول کا خرچ یوں اعتدال پر آ گیا تو اب مدحت کو عابی کے کھانے پینے اور دوسرے چھوٹے موٹے اخراجات کا فکر پڑ گیا۔ زمینوں سے دادا کو لاکھوں کی آمدن تھی اور عابی اپنی اک اک ضرورت پوری کرنے کے لیے اتنی محنت کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے علاوہ کچھ ٹیوشنز بھی لیتے تھے۔ باتوں باتوں میں سب معلومات حاصل کر چکی تھی وہ۔

"یونیورسٹی کی جاب کے علاوہ یہ آپ ٹیوشنیں کیوں لیتے ہیں۔؟"

"اپنی قوم کو لائق فائق بنانے کے لیے۔" وہ صاف اسے ٹال گئے تھے۔

"میرا دل چاہتا ہے جو علم میں نے اتنے ممالک پھر کر' اتنی محنتوں سے حاصل کیا ہے وہ پوری دیانتداری کے ساتھ اگلی نسل میں منتقل کر دوں۔"

"تو کیا آپ کوئی فیس وغیرہ نہیں لیتے۔؟" مدحت نے بھی کمال کا دماغ پایا تھا۔ "لینا تو نہیں چاہتا۔ مگر تمہارے چاچو کو اللہ میاں نے......" پھر اچانک ہی عابی خاموش ہو کر کسی سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو۔؟" پھر چونک کر استفسار کیا۔

"یونہی اپنی نالج کے لئے۔" بظاہر ٹال گئی۔ پھر مسکرائی۔ "مجھے معلوم ہونا چاہیے نا کہ میرے چاچو کے مشاغل کیا کیا ہیں۔ اور جو ہیں وہ کیوں ہیں۔؟"

"پھر کیا سمجھ آئی۔؟ جو معلومات حاصل کی ہیں ان سے کیا نتیجہ اخذ کیا۔ ملک کی نامور دانشور صاحبہ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"

"میں کم عقل بچی بھلا کیا نتیجہ اخذ کر سکتی ہوں۔ ہاں البتہ اجازت دیں تو اپنے دل کا حال سنا سکتی ہوں۔"

"دل کا حال۔؟" عابی نے اک زور دار قہقہہ لگایا۔ "اس منے سے وجود میں کوئی دل صاحب بھی ہیں جو ابھی سے دھڑکنا شروع ہو گئے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔" انہوں نے بڑی شوخی سے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔ "کالج پہنچتے ہی۔ کیا جلدی نہیں دھڑکنا شروع ہو گیا' جس کا حال چاچو کو سنانے کی ضرورت پڑ گئی؟؟"

چاچے بھتیجی کے آپس میں بڑے مذاق شذاق بھی تھے۔ بہت سی بے تکلفی اور اپنائیت بھی تھی۔

"اوں عابی!" کچھ شرمائی۔ پھر دو تین مکے بازو پر جڑ دیئے۔ چہرے پر سرخیاں پھیل گئیں۔ "مجھے کیا اپنے جیسا سمجھا ہوا ہے۔؟" ایمان والی ملاقات فوراً خیال میں آ گئی تھی۔ اس کا طعنہ دے کر جوابی حملہ بھی کر دیا۔

اور اب عبدالرحمان کو ہوش آیا۔ وہ اب عمر کی اس منزل پر تھی کہ سب کچھ سوچ سکتی تھی اور سمجھ سکتی تھی۔



"ارے! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اور رہی وہ اس دل والی بات۔ وہ تو میری اسٹوڈنٹ تھی۔"

"آپ کیوں کانشس ہو رہے ہیں۔ میں نے کچھ کہا۔؟" اب ہنسی اڑانے کی اس کی باری تھی اور عابی خجل سے ہو کر سر کھجانے لگے۔

مقصد عابی کو شرمندہ کرنا بھی نہیں تھا۔ تب پھر ہنستے ہنستے یکا یک سنجیدہ ہو گئی۔ "دراصل عابی! میں کہنا یہ چاہ رہی تھی کہ جب سے یہاں شہر میں آئی ہوں۔ میرا دل آپ کے بغیر زیادہ اداس رہنے لگا ہے۔"

"ارے! وہ کیوں۔؟ اب تو میں تمہارے پاس ہوتا ہوں۔"

"آپ رات گئے آتے ہیں۔ میں اس وقت تقریباً آدھی سو چکی ہوتی ہوں۔ پھر صبح سویرے جاگتے ہی ہم دونوں کی کالج یونیورسٹی جانے کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ پوری طرح ناشتہ بھی نہیں کر پاتے۔ آپ تو صرف چائے کی ایک پیالی لیتے ہیں اور دوڑ اٹھتے ہیں دونوں۔ بتائیے کتنی ملاقات ہوئی ہماری۔ اداس نہیں ہوں گی تو اور کیا ہوگا۔؟" پوری تفصیل سے مدحت نے اپنے دل کا حال بیان کر دیا۔ "اگر آپ کو لنچ میرے ساتھ کرنے کا وقت نہیں ملتا تو عابی! کم از کم آپ ڈنر تو اپنی مدحو کے ساتھ کر لیا کریں۔"

کچھ اتنے پیارے اور محبت بھرے انداز میں اس نے چاچو کے گلے میں باہیں ڈال کر' گال سے گال لگا کر فرمائش کی تھی کہ اگلے دن سے ہی عبدالرحمان آٹھ بجے گھر پہنچنے لگے۔ جب اس کے لئے اپنی انا اور خودداری کو پس پشت ڈال ہی دیا تھا اور اپنی ذات اور اپنے وجود کو وقف کر ہی دیا تھا تو پھر یہ سب' اپنے اخراجات وغیرہ خود اٹھانے کی دھن یا عزم چہ معنی دارد۔

مدحت بے حد مسرور رہنے لگی تھی۔ "ہائے عابی! کتنا اچھا لگتا ہے آپ کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھانا۔"

اور مدحو کی خوشی تو عابی کو بھی نہال نہال کر دیتی تھی۔ وہ بڑی باقاعدگی سے رات کے کھانے کے وقت گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔ کیونکہ اگر کبھی کسی وجہ سے دیر ہو جاتی تو وہ بھوکی بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہتی تھی۔

پھر کھانے کے بعد دونوں سونے سے پہلے واک بھی کرتے تھے۔ واک کے
ساتھ مدحت کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ اپنے گزرے ہوئے سارے دن کی
کارگزاریاں ان کے گوش گزار کرتی تھی۔

''میں نے آپ کو اپنے سب دوستوں کے متعلق بتایا ہوا ہے نا۔؟''

''ہاں۔ توبہ توبہ۔'' عابی نے شرارت سے کانوں کو ہاتھ لگا دیئے اس کی پوری
بات سننے سے پہلے ہی۔ ''اتنے دوست تو میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں بنائے
جتنے محترمہ نے ان چار دنوں میں بنا ڈالے ہیں۔''

''اپنا بیان درست کریں جی۔ چار نہیں۔ تیس پنتیس دن گزر چکے ہیں
ہمیں اس گھر میں آئے۔''

''اوہ ہاں۔ تیس پنتیس دنوں میں اتنے ہی دوست تو بننا چاہئیں تھے۔''

''اونہوں چاچو! طنز وغیرہ کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کو کوئی
اعتراض ہے تو آپ یونیورسٹی کی کلاسز لینے کے بعد سیدھے گھر آ جایا کریں۔ ایمان
سے مجھے کبھی کسی دوسرے کی دوستی کی ضرورت نہ پڑے جب آپ میرے پاس ہوا
تو۔''

''اچھا اچھا۔ تم وہ سناؤ جو بات کرنے لگی تھیں۔'' وہ ٹریک بدل رہی تھی،
عابی نے گویا اس کا رخ سیدھا کیا۔ مدحت کے ساتھ جو بھی ان کا وقت گزرتا تھا' دن
کے چوبیس گھنٹوں میں سے' وہ بہترین ہوتا تھا۔ گزری زندگی کی ہر تلخی ذہن سے
فراموش ہو جاتی تھی۔

''ہاں۔'' وہ واپس ٹریک پر آ گئی۔ ''میں نے آپ کو کرنل عمیر آفندی کے
متعلق بتایا تھا نا۔؟''

''وہ۔ جو بڑے مزیدار انسان ہیں۔ بہت چٹ پٹے۔ مصالحے دار۔''

''ہاں عابی! ایسے نہیں کہا تھا۔'' واک سے واپس آ کر ان کے کمرے میں
بیڈ پہ ان کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ ان کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر منہ بند کر دیا۔

''بس اب بیچ میں بولے اور ٹوکے کے بغیر میری بات سنتے جائیے۔ ہاں تو
میں کہہ رہی تھی۔ کچھ عجیب سی کشش ہے ان میں۔ آپ کے بعد ان کے ساتھ وقت



گزارنا مجھے ہمیشہ بہت اچھا لگا کرتا تھا۔''

''لگا کرتا تھا۔'' اچانک بے خیالی میں مدحت کا ہاتھ ہونٹوں سے ہٹ گیا تو
عابی فوراً درمیان میں بول پڑے۔

''کیا مطلب۔ وہ اب نہیں ہیں۔؟ فرشتہ اجل کے ہتھے چڑھ گئے۔؟''

''ہائے اللہ نہ کرے۔'' مدحو اک دم چیخ پڑی۔ ''آپ میرے دوستوں کے
متعلق ایسا سوچتے ہیں۔'' بسورتی شکل کے ساتھ وہ شکوہ کرنے لگی۔

''دیکھیں عابی! پھر میں بھی آپ کی دوستوں کو کچھ ایسا ہی کہہ دوں گی۔''

''کیسا۔؟'' عابی اس کی سنجیدگی بھری سوچوں سے بے پرواہ اسی شوخی میں
پوچھ بیٹھے۔ ''ماما نے مجھے بتایا ہوا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ دوسرے
مذاہب رکھنے والوں کے معبودوں کے متعلق کچھ برا مت کہو مبادا وہ جواب
میں تمہارے خدا کی شان میں کوئی گستاخی (نعوذ باللہ) کر ڈالیں۔''

''ہائے میرے اللہ! تم اتنی بڑی بڑی اور سمجھداری کی باتیں کرنے لگ گئی
ہو۔'' عابی نے اک اچنبھے کے ساتھ اس کے پورے وجود کو نظر بھر کر دیکھا۔

''جی جناب!'' وہ اترائی۔ ''میرے دوستوں کی زندگی کی دعا کیا کریں ورنہ
پھر میں بھی۔'' پھر یکایک مدحت کی آنکھیں چمکیں۔ ''وہ۔ اس دن جو آپ کی
اسٹوڈنٹ آپ کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ میں کہیں اس کی زندگی کے متعلق
کچھ ایسا ویسا۔''

اور اس سے پہلے کہ مدحو مزید کچھ بولتی' عابی نے اک نمایاں سی عجلت اور
بے تابی کے ساتھ اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''خبردار! جو آگے کچھ اور کہا۔'' لہجے میں عجیب سی تلخی تھی۔ اور اس لہجے اور
اس انداز میں عابی نے کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔

مدحت چونک کر' سہم کر انہیں بغور تکنے لگی۔ پھر اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں
میں پانی بھی بھر آیا۔ پھر قطرے اس کے گلابی رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ اور اس کی یہ
حالت' یہ کیفیت جو ہو گئی تھی' ایسی پہلے عابی کے دیکھنے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ بھی
گھبرا گئے۔

"اوہ ساری!" اسے کھینچ کر سینے کے ساتھ لگا لیا۔ وہ رونے لگی تھی۔

"ارے میرا بچہ! میں نے تمہیں تو کچھ بھی نہیں کہا۔" بڑی ندامت سے اس کی پشت تھپکی۔ اس کے سنہری سنہری بالوں والا سر سہلایا۔

مگر وہ روتی ہی رہی۔ عابی کے سینے پر سے قمیض بھیگنے لگی۔

"پلیز مدحو۔!" اب وہ کچھ سنجیدہ ہو گئے۔ "آخر مجھ سے ایسا کیا ہو گیا ہے۔ کیا کہہ دیا ہے میں نے۔؟"

"آپ نے نہیں چاچو! مجھے اپنے آپ پر افسوس ہے۔ تبھی رونا آ رہا ہے۔ میں نے آپ کو ہرٹ کیا ہے۔ ہیں نا عابی۔؟"

چہرہ اٹھا کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تکنے لگی۔ "وہ۔ وہ آپ کو بہت عزیز ہیں نا۔؟" پھر اک دبی دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بہت ہولے سے رازدارانہ بولی۔ "آپ کو ان سے بہت پیار ہے۔؟ آپ انہیں میری چاچی بنانا چاہتے ہیں۔ مگر۔"

عابی خاموشی سے نظریں جھکا گئے۔ جھوٹ کیسے بولتے' اتنے بڑے سچ کے جواب میں۔ زبان کو زیب ہی نہیں دیا۔ ایسے بھی اس حقیقت کو جھٹلانا ان کے بس میں نہیں تھا۔

"میں آپ کی دوست ہوں عابی۔" مدحو نے بڑے پیار سے عابی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "دادا سے بات کروں۔؟"

عابی نے ٹپٹا کر اسے دیکھا۔ بھلا کیا اسے سارے حالات کا علم نہیں تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ اب تو ماشاء اللہ بہت بڑی ہو چکی تھی۔

"آپ کی یوں محرومیوں میں ساری زندگی گزر جائے۔ کیا اچھی بات ہے چاچو۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔" اور اس نے بڑے ہونے کا ثبوت بھی پیش کر دیا۔ "ماما کے پاس تو میں ہوں نا۔ مگر آپ کے پاس زندگی کی کوئی خوشی نہیں ہے۔"

"ارے۔!" اور اب عابی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ پھر مسکرائے۔

"چاچو کی جان! آپ جو ہو میری خوشی۔ بس آگے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنی۔"



"لیکن میں ان کے متعلق بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کن کے متعلق۔؟" وہ دانستہ انجان بن گئے۔

"آپ جانتے ہیں میں کن کے متعلق پوچھ رہی ہوں۔" مدحت ضد کرنے لگ... "بس مجھے سب کچھ بتا دیں۔ ہم دونوں دوست ہیں۔ ورنہ پھر میں دوستی ختم کر د... ا۔"

"کیسے۔؟ دوستی تو اب کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔"

"دادا سے بات کر دوں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

اور یہ بڑی زبردست دھمکی تھی۔ ویسے کچھ جذبات کے تقاضے بھی تھے۔ مدحت نے اس کا ذکر کر کے دل کے تار چھیڑ دیئے تھے۔ ان کا اپنا دل بھی اس کی باتیں کرنے کو چاہ اٹھا۔ مدحت جان تو گئی تھی سب کچھ۔ پھر وہ کیا چھپا رہے تھے۔؟ یوں بھی عشق اور مشک بھلا چھپائے بھی چھپتا ہے۔ اس کو بتانے کے حق میں دل نے بے شمار تاویلیں پیش کر دیں۔

"بتائیں نا۔ وہ آپ کو کہاں ملی تھیں۔ اور اب اسٹوڈنٹ بن گئی ہیں مجھے بتانے کو۔"

عابی زور سے ہنس دیئے۔ "صرف تمہیں بتانے کو نہیں۔ وہ سچ مچ میری اسٹوڈنٹ ہے۔ انگلش میں ماسٹرز کر رہی ہے۔" پھر نظریں جھکا کر کچھ شرمانے والے انداز میں دھیرے سے بولے۔ "ویسے پہلی بار اک جیولر کی شاپ میں اسے دیکھا تھا۔" نگاہوں میں وہ سارا نظارہ گھوم گیا تو وہ کھو سے گئے۔

"پھر۔ پھر دوستی کیسے ہوئی۔؟" مدحت نے عابی کا بازو جھنجھوڑا۔ "یہ کیا اکیلے اکیلے میں ان کے پاس پہنچ گئے۔ مجھے بھی ساتھ لے لیں۔"

"شریر۔" عابی نے چونک کر اسے گھورا۔ اور پھر پہلی ملاقات کے بعد کے چیدہ چیدہ واقعات اسے بتانے لگے۔

"ارے! آپ کی کہانی تو بڑی دلچسپ ہے۔ اسے مکمل ضرور ہونا چاہیے۔" سب کچھ سن کر آخر میں مدحت اک عزم کے ساتھ بولی۔ "اور عابی! اسے انجام تک پہنچانے کی میں کوشش کروں گی۔ انشاء اللہ۔"

"اچھا اچھا۔" اسے پہلو کے ساتھ لگا کر بظاہر ہنس دیئے لیکن اس کے ذکر کے بعد اندر جو زخم کراہ اٹھے تھے' ان کے متعلق اسے باخبر نہ کر سکے۔ نہ ان کی طرف سے' نہ ایمان کی طرف سے' کوئی صورت تھی ہی نہیں اس داستان کے اچھے انجام کے ساتھ مکمل ہونے کی۔

اور۔ اور۔ وہ پھر بھی ایمان سے محبت کئے جا رہے تھے۔ اس کا خیال دل سے نکال دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اک درد' اک کرب ان کے رگ و پے میں پھیل گیا۔

"عابی! مجھے ان سے ملائیں گے۔؟ اس دن اچھی طرح۔"

"وہ تم اپنے کرنل آفندی کے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں۔" عابی نے مزید اس موضوع پر بات کرنے سے گریز کرتے ہوئے اس کا ٹریک بدلنے کی کوشش کی۔

"ارے ہاں۔ وہ بات تو بیچ میں ہی رہ گئی تھی۔" وہ بڑی آسانی سے پٹڑی بدل گئی۔ "کل آپ ذرا جلدی آ جایئے گا۔ میں نے انہیں ڈنر پہ انوائیٹ کیا ہے۔"

"اللہ رحم کرے ان کے حال پر۔ اب اس بیچارے کرنل کی شامت آ گئی۔"

"یعنی کہ میں عذاب ہوں آفت ہوں۔ مصیبت ہوں۔" عابی کے سینے پر مکوں گھونسوں کی بارش کر دی۔

اور جواب میں عابی ہنس ہنس کر دوھرے ہونے لگے۔ مدحت کو چھیڑ کر بڑا مزہ آتا تھا۔ "ویسے۔ ویسے۔ یہ آخر اس بیچارے پر اتنی مہربانیاں کیوں ہو رہی ہیں۔؟" انداز میں ابھی تک شوخی اور مذاق تھا۔

"اس لئے عابی! کہ وہ میرے پاپا کے دوست ہیں۔"

"کیا۔؟ بھائی کے دوست۔؟" یکا یک ہنسی تھمی اور چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ "یہ کرنل عمیر آفندی' ہمارے پڑوسی۔؟ تمہیں کیسے پتلا چلا۔؟" ایک دم لہجے میں احترام بھر آیا۔

"ماما نے پہچانا ہے۔" مدحت کا انداز بھی نارمل ہو گیا۔ "دو سال ایک ہی چھاؤنی میں ہماری فیملی اور کرنل عمیر آفندی کی فیملی ساتھ ساتھ رہے تھے۔ تبھی ماما نے انہیں ڈنر پر بلایا ہے۔"



"یہ تو بہت اچھا کیا۔" بھائی کی یاد سے عابی کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ "بھائی کے دوست تھے تو سمجھو میرے بھی دوست ٹھہرے۔ میں انہیں ضرور ملوں گا۔"

"مگر ماما کہتی ہیں دادا کہیں ناراض نہ ہوں۔"

"خواہ مخواہ ہی۔ اب ہر بات میں دادا کی تو نہیں چلے گی۔" عابی یکا یک ہی جوش میں آ گئے۔ "آخر وہ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔"

"ہم سب کا ابا۔" بے ساختہ مدحت بول پڑی تو عابی کی بھی ہنسی نکل گئی۔

"بہت شریر ہو تم۔"

"اپ ہی کی ہوں۔ شریر کہیں یا شریف کہیں۔" چاچو کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر پھر ہنسی۔

"چلو اٹھو۔ بھاگو یہاں سے۔ بہت رات ہو گئی۔ صبح کالج بھی جانا ہے۔" سامنے دیوار پر لگے کلاک کی جانب اچانک عابی کی نظر اٹھ گئی تو گھبرا کر بولے۔ "اور مجھے کل کام بھی بہت سارے ہیں۔" جلدی سے خود بھی اٹھے۔ "تم میرا بہت وقت ضائع کرتی ہو۔ آئندہ اپنے کمرے میں تمہارا داخلہ ممنوع قرار دے دوں گا۔"

"ایسا میرے ساتھ کوئی نہیں کر سکتا۔" مدحت نے اٹھتے اٹھتے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "کیا کر سکتے ہیں۔" اک مان اعتماد سے پوچھنے لگی۔

"یہی تو مصیبت ہے۔" وہ ہولے سے بڑبڑائے۔ "ورنہ آج میرے حالات ایسے ہوتے۔؟" اتنا مدھم بولے تھے مدحت سن نہ سکی۔ لیکن دروازے تک پہنچتے پہنچتے پتہ نہیں کیا سوچا تھا پھر واپس ان کے پاس چلی آئی۔ چہرے پر بڑی سنجیدگی تھی۔

"عابی! میں بڑی دیر سے آپ کے ساتھ ایک بات کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر۔" جھجک کر پھر خاموش ہو گئی۔ عابی نے کچھ حیرت اور اچنبھے سے اسے دیکھا۔ یہ جھجک' ہچکچاہٹ' سراسر اس کی عادت کے خلاف تھی۔ ورنہ وہ تو بڑی بے تکلفی سے سب کچھ کہہ ڈالا کرتی تھی۔ جو بھی خیال میں آتا۔ جو بھی منہ میں آتا۔ کم از کم عابی سے اس نے کبھی تکلف نہیں کیا تھا۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر عابی نے اسے پھر سے پاس بٹھا لیا۔ "ہاں کہو۔"

"میری بات مانیں گے ناں۔؟"

"تم بتاؤ تو۔" اس کی ہچکچاہٹیں اور تاکیدیں اسے بہت پراسرار سا بنا رہی تھیں تبھی عابی بیقرار سے ہو کر قدرے جھنجھلا پڑے۔ پتہ نہیں اب کیا منوا رہی تھی۔؟

"آپ ماما سے صلح کر لیں۔"

"کیا مطلب۔؟" عابی بڑے زور سے چونکے۔

یہ لڑکی کیا چاہتی تھی آخر۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایمان کو اپنی چاچی بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ دادا سے بات کرنے کو تیار تھی۔ اور اب۔ اپنی ماما سے صلح کی ڈیمانڈ کر رہی تھی۔ "عابی۔ عابی۔ یہ آپ گم کہاں ہو گئے۔؟"

"وہ۔ وہ۔" عابی کے وجود میں آتش فشاں سے ابلنے لگے۔ "یہ۔ یہ۔" زبان پر ہکلاہٹ طاری ہو گئی۔ کچھ بول ہی نہیں پا رہے تھے۔ ہاتھوں میں سر تھام کر لمبے لمبے سے سانس لینے لگے۔ مدحت جو چاہتی تھی یہ ان کے بس میں نہیں تھا۔ خصوصاً اب۔ جبکہ ایمان اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ان کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔ ان کے روم روم میں بس چکی تھی۔ ان کے دل و دماغ پر پوری طرح قابض ہو چکی تھی۔ ہر وقت وہ اسی کو سوچتے تھے اور وہ سامنے ہو نہ ہو' نگاہیں اسی کو دیکھتی رہتی تھیں۔

"آپ نے میری بات کا کچھ جواب نہیں دیا۔" وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھی۔

انکی حالت ان کی کیفیت سے ناواقف تھی۔ وہ جن طوفانوں میں گھر گئے تھے اس کا اسے رتی بھر بھی اندازہ نہیں تھا۔

"جب میرے پاپا ابھی حیات تھے تو آپ اور ماما کے جیسے مراسم تھے۔ ایک دوسرے سے آپ بولتے چالتے تھے۔ ایک دوسرے کے کام وام کر دیا کرتے تھے۔ جیسے ایک گھر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ ایک وابستگی' اک تعلق' اک ذمہ داری سی ہوتی ہے' کیا اسی انداز میں آپ دونوں پھر نہیں رہ سکتے۔؟"

"کیا۔؟" اک طویل سا سانس کھینچتے ہوئے عابی نے ہاتھوں میں سے سر نکالا۔ وہ اس کا مطلب شاید کچھ غلط اخذ کر گئے تھے۔



"ہاں عابی! آپ دونوں آپس میں کوئی تو تعلق واسطہ رکھیں۔ میں نے سب کو یہی بتایا ہوا ہے کہ ماما' میں اور چاچو اکٹھے رہتے ہیں۔ بہت صلح و محبت ہمارے درمیان سے سوئی تک نہیں گزرتی' ہم تینوں ایسے ایک ہیں۔" وہ بڑی بیت سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھی۔ "میں نے کسی کو یہ بالکل نہیں بتایا کہ آپ ماہیں صلح نہیں ہے۔"

عابی کے چہرے پر عجیب دھند سی پھیل رہی تھی۔ "اوہ بابا جان! یہ آپ نے لیا۔ ہم میں ایک مضبوط رشتہ بناتے بناتے ہمارا وہ پہلے والا رشتہ بھی توڑ دیا۔"

"اب دیکھیں نا۔" وہ ان کے چہرے پر پھیلی تاریک سی پرچھائیاں دیکھے وس کئے بنا مسلسل بولے جا رہی تھی۔ "کل کرنل انکل آئیں گے۔ ایک ہی میز کر' ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے تو کیا اچھا لگے گا۔ جب آپ اور ماما ایک ے سے منہ سجائے بیٹھے ہوں گے۔ بات نہیں کریں گے۔ ایک دوسرے کی طرف ل گے تک نہیں۔"

اوہ۔ تو مدحت کا مطلب یہ تھا۔ کرنل عمیر آفندی کا ڈنر۔ اس کے لئے پرابلم اتھا۔ عابی کچھ بحال ہوئے۔ قدرے ریلیکس ہوئے۔ دھڑ دھڑ دھڑکتا دل ل پر آیا۔

"پھر وہ آپ دونوں کے متعلق کیا سوچیں گے۔ کہ یہ کیسے جھگڑالو لوگ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے کلام نہیں کرتے' دوسروں کے نے بھی۔ کیسے ان پڑھ جاہل لوگ ہیں۔ میری تو عزت اک کوڑی کی نہیں رہے وہ میرے اتنے دوست ہیں اور اب تو پاپا کے بھی دوست نکل آئے ہیں۔"

فکر و تردد میں گھرا اس کا معصوم سا' پیارا سا چہرہ بڑا اچھا' بڑا پرکشش لگ رہا عابی تکے جا رہے تھے۔

"آپ کچھ بول نہیں رہے۔ میں بڑی پریشان ہوں چاچو! خدا کیلئے کچھ نا۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے جو ہم تینوں گزار رہے ہیں۔ اور اب تو خاص میری ت کا معاملہ ہے' بلکہ آپ کی بھی عزت کا۔"

"میری عزت کا کیوں۔؟" عابی مسکرا پڑے۔ شرارت پر اتر آئے۔

"آپ ماما سے چھوٹے ہیں۔ عمر میں بھی، رشتے میں بھی۔ کیا انکل یہ نہیں سوچیں گے کہ میرا چاچو ہی غلط ہے۔ کیونکہ ماما کو وہ پہلے سے جانتے ہیں۔ ہائے! کچھ خیال کریں۔ کچھ میری پریشانی کی طرف دھیان دیں۔"

"اچھا اچھا۔ اب جا کر سو جاؤ۔ بے فکر ہو کر۔" عابی کو اس پر ترس آ گیا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو گا۔ تمہاری عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں چاچو۔؟" وہ بے اختیار کھل اٹھی۔

"بالکل۔ تمہارے دوست انکل تمہارے چاچو کے متعلق بڑی اچھی رائے قائم کر کے یہاں سے جائیں گے۔ یہ میرا تمہارے ساتھ وعدہ ہے۔"

عابی بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے۔ وہ پاس کھڑی تھی۔ دونوں بازو بڑھا کر عابی کے سر کو حلقے میں لے لیا پھر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے رقت بھری آواز میں بڑبڑائی۔ "عابی! آپ جیسا اچھا اس ساری دنیا میں دوسرا کوئی نہ ہو گا۔"

آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ "مجھے آپ پر فخر ہے۔"

## 38

"میں آپ کا مجرم ہوں۔"

"میں بابا جان کا مجرم ہوں۔"

"میں مدحت کا بھی مجرم ہوں۔"

"اور شاید میں ساری دنیا کا ہی مجرم ہوں۔"

عبدرحمان فرحت کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ "اپنی ہر غلطی، ہر قصور، ہر خطا اور ہر گناہ کا اعتراف کرتا ہوں۔"

فرحت نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا اس لئے اس کا چہرہ اور اس پر پھیلے بکھرے تاثرات اچھی طرح دکھائی نہیں دیئے تھے لیکن آواز میں سوز بھرا تھا



لہجہ ٹوٹا ہوا سا تھا۔

"میں نے زندگی میں جو کچھ چاہا تھا۔ وہ، کچھ بھی نہ پا سکا۔" اس نے اک طویل سانس لینے سے خارج کی۔ "گھر بار بھی کھویا۔ محبتیں بھی قربان کیں۔ وطن بھی چھوڑا۔ لیکن پھر بھی۔" لمحہ بھر کے لئے توقف کیا ساتھ ہی اک دکھ بھری آہ کھینچی۔

"اک ناکام و نامراد زندگی ہی میرے نصیب میں ہوئی۔ مجھ سے زیادہ شکست خوردہ کوئی انسان اس دنیا میں ہو گا۔؟ مجھ سے زیادہ بدبختیوں کا مالک کوئی اس جگ میں ہو گا۔؟"

پتہ نہیں آنکھوں کو کیا ہوا تھا، پتلون کی جیب سے رومال نکال کر انہیں بے تحاشا رگڑنے لگا۔ سرخ ہو گئی تھیں پھر بھی رگڑے گیا اور اتنی دیر فرحت سانس کھینچے بیٹھی چور آنکھوں سے اسے تکتی رہی۔

"بھائی تو گیا ہی تھا۔ قبیلے برادری کے رسم و رواج نے مجھ سے میرے باقی عزیز بھی چھین لئے۔ وہ سب، جن سے میں بے پناہ محبت کرتا تھا۔ جن سے اک لمحے کی جدائی میں گوارا نہیں کر سکتا تھا۔"

شاید اس کی سمت نظریں اٹھانے کے لیے اس نے سر کو جنبش دی تھی۔ جھکے ہوئے کو اونچا کیا تھا۔ فرحت نے جلدی سے رخ پھیر لیا تھا۔ کہیں نظر سے نظر نہ ٹکرا جائے۔ نگاہ سے نگاہ نہ مل جائے۔

"بابا جان آپ اور مدحت اور آپ سب کی محبتیں ہی میری زندگی کا سرمایہ تھیں۔ اور میری حیات کا سکھ چین۔ مگر واہ ری قسمت! میری ساری دولتیں اپنے قبضے میں کر لیں۔" فرحت نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ دل چاہا کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔ "اور اب میں خالی ہاتھ، خالی دامن لئے زندگی کے اس ویرانے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ مجھے میری ذات، میرا وجود، میرا سکھ چین لوٹا دیں۔ کہ یہ آپ کی دسترس میں ہے۔ میں آپ سے ان محبتوں کی بھیک مانگتا ہوں جو سماج نے مجھ سے چھین لی تھیں اور آپ وہ میری جھولی میں ڈال سکتی ہیں۔" عابی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "میری بیٹی کو ان کی ضرورت ہے اور۔"

کئی لمحات گزر گئے۔ اس نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔

"اور۔؟" فرحت مرتعش لہجے میں بدبدائی۔ آواز میں تجسس تھا۔ "میری ضرورت ہے۔ آپ کی ضرورت ہے۔"

وہ چونکی۔ کیا مطلب تھا اس کا۔؟

"ہمیشہ جب بھی کوئی ضرورت پیش آیا کرتی تھی تو میں آپ ہی کا پلو تھام کر آپ سے اسے پوری کرنے کی التجا کیا کرتا تھا۔ یوں آج بھی میں ایسی ہی اک خواہش' اک مطالبہ لئے آپ کے روبرو پیش ہوا ہوں۔"

وہ بغیر ہچکچائے بولتا چلا گیا۔

"آپ کا مجرم ہوں۔ آپ کا گناہ گار ہوں۔ اور آپ سے ہی مدد کا طالب ہوں۔ کیا آپ میرے سب جرائم کو' سب گناہوں کو معاف کر سکتی ہیں۔؟"

سوالی نے جو سوال کیا تھا۔ بڑا عجیب تھا۔ جو بھیک مانگی تھی' وہ آج تک کسی نے کسی کے کاسے میں نہیں ڈال تھی۔ اس لئے فرحت خاموش تھی۔

"مدحت جواں ہوگئی ہے اور یہ ٹوٹا ہوا گھر اسے اپنے ہی بھرے پرے گھر میں تنہا کر رہا ہے۔ میرے اور آپ کے ہوتے ہوئے وہ خود کو بے سایہ محسوس کر کے بکھر رہی ہے۔"

وہ تھوڑا سا آگے جھکا۔ لہجہ مزید ملتجی ہوگیا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا کر اس کی زندگی کو خوشیوں' مسرتوں سے ہمکنار کر دیں۔"

وہ بہت ضدی تھا۔ بہت بااصول تھا۔ ٹوٹ تو سکتا تھا مگر جھک نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ جب بھی وہ کسی ضد پر اڑتا تھا تو وہ کسی صحیح اصول اور صحیح بات پر مبنی ہوتی تھی۔

"وہ کس طرح۔؟"

"وہ ایسے کہ ہم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے بیگانگی اختیار نہ کریں۔ ہماری مدحت اس طرح ڈسٹرب ہوتی ہے۔"

"پھر۔؟"

"کیا ہم اسی طرح نہیں رہ سکتے' جیسے بھائی کی زندگی میں رہتے تھے۔ ہمارے دکھ سکھ سانجھے تھے۔ ہمارے درمیان اک تعلق تھا' خلوص و محبت بھرا۔ ہم ایک



دوسرے کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے' مشورے کیا کرتے تھے۔ اکٹھے شاپنگ کرنے بھی جاتے تھے۔" عابی نے پھر تھوڑی دیر کے لیے سکوت کیا۔ کچھ سوچتا رہا۔ "جیسے پڑوسی ہوتے ہیں۔ اکٹھے بھی۔ الگ الگ بھی۔"

نجانے وہ کیا سمجھانے کی کوشش میں تھا۔ جس کی خود اسے بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے سمجھائے۔

"رسم و رواج کی بیڑیاں تو ہمیں پہنائی جا ہی چکی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے پابند تو ہو ہی چکے ہیں۔"

"کیا مطلب۔؟" فرحت نے پھر چونک کر اسے بڑے غور سے دیکھا۔ اور اب وہ بھی اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ نگاہ سے نگاہ مل گئی۔

اور فرحت کی آنکھوں نے اس کی نگاہ کا جو جواب پڑھا تھا وہ اس کی زبان پر بھی کھلم کھلا آ گیا۔

"نہیں نہیں۔ آپ میرے لئے اسی طرح مقدس و محترم ہیں۔ جیسے بھائی کی زندگی میں ہوتی تھیں۔ اماں کے جانے کے بعد' اماں جیسی۔ بلکہ آپ کے ساتھ تو میں دوہرے رشتے میں منسلک تھا۔ دوستی بھی میری آپ کے ساتھ۔ اور یوں بابا جان کی پہنائی ہوئی بیڑیاں بھی میرے آپ کے ساتھ جڑے دوہرے رشتے کو توڑ نہ سکی تھیں۔" فرحت نے جیسے اک اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ "اور اب بھی بابا جان اور زمانے کے رسم و رواج والا رشتہ تو میں آپ کے ساتھ کبھی بھی نہیں بنا سکتا۔ کئی بار سوچا ہے۔ پر دل میں ایسا کوئی جذبہ اترتا ہی نہیں' بہت مجبوری ہے۔ اور چونکہ پہلے والا بھی نہیں رہا اس لیے ہم حالات سے سمجھوتہ تو کر سکتے ہیں۔"

عابی کے لہجے میں دوستانہ انداز جھلک آیا تھا' جیسے وہ دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ "مدحت کہتی ہے اس نے محلے میں سب کو یہی بتایا ہے کہ آپ اس کی ماما ہیں اور میں اس کا چاچا ہوں۔ تو اس رشتے کو تو نبھایا جا سکتا ہے نا۔ آپ نے سکول کے زمانے میں کبھی کسی ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔؟ میرا مطلب ہے کچھ ایکٹنگ وغیرہ کرنی آپ کو آتی ہی ہوگی۔ میرا خیال ہے اس ہمارے جیسے ماحول میں رہنے والے ہر

بندے کو آنی چاہیے' جن کا مقدر اپنی زندگی خود جینا نہیں ہوتا۔ تو آپ۔ کیا ڈرامہ شرامہ کر لیتی ہیں۔؟''

اس کے اس سوال پر فرحت کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اسے عابی کا یہ سوال اور انداز بے حد معصوم اور بچگانہ سا لگا تھا۔ جواب بھی زندگی کو اک سنجیدہ حقیقت کے بجائے ڈرامہ بنا رہا تھا۔ ہنسی تو اس نے اندر ہی دبا لی لیکن اس کا تاثر اک مسکراہٹ کی صورت میں لبوں پر اتر آیا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے۔'' فرحت کے تبسم کو عابی نے معنی پہنا لئے۔ ''ہم اپنا وہی' پہلے والا رشتہ ہی نبھائیں گے' ڈرامے کی صورت میں۔ کیونکہ یہ ہماری بیٹی چاہتی ہے۔ اور اب ہم دونوں کی زندگی کا مقصد تو یقیناً یہی ہے۔ کہ مدحت کے لئے خوشیاں مہیا کی جائیں۔''

''ہاں۔ یہی ہے۔'' فرحت نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تو وہ ہم دونوں مل کر' کر سکتے ہیں نا۔؟''

''ہاں کر سکتے ہیں۔''

''تو اس کی ڈیمانڈ کے مطابق اسے خوشیاں دینے میں' میرے ساتھ تعاون کرنے کا آپ وعدہ کرتی ہیں۔؟''

''کس طرح کا تعاون۔؟'' فرحت جیسے اندر ہی اندر کچھ خائف سی بھی تھی۔ لیکن عابی اس سے عمر میں اتنا ڈھیر سارا چھوٹا ہونے کے باوجود مرد ہونے کے ناطے باہمت اور باحوصلہ تھا۔

''جیسے آج اس نے بھائی کے دوست کرنل عمیر آفندی کو ڈنر پر انوائیٹ کیا ہوا ہے۔ تو ہم سب یعنی گھر کے سارے افراد کو' اس کی ماما اور چاچو کو ایک ہی میز موجود ہونا چاہیے۔ اور نہ صرف موجود ہونا ضروری ہے بلکہ آئندہ کے لیے ایک تعلق اور سلوک کی بھی ضرورت ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ہم کلام بھی ہوا کریں گے بوقت ضرورت ایک دوسرے کے کام بھی آئیں گے۔ کیا آپ ایسا کر سکیں گی۔؟''

''ہاں۔'' وہ سوچتے ہوئے اک توقف کے بعد بولی تھی۔ ''میں اپنی



کوشش کروں گی۔'' وہ تو ماں تھی مدحت کی۔ اور اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار۔

''شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کھانے کا وقت ہے۔'' فرحت پہلے تھوڑا سا جھجکی۔ پھر اس کے لہجے میں مضبوطی آ گئی۔ ''عابی! کھانا کھا کر جانا۔''

وہ دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ قدم وہیں تھم گئے۔ رکا اور پلٹ آیا۔

''ارے ہاں۔ میں نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا۔ بھوک لگ رہی ہے۔''

مدحت اور اس کی سہیلی کو کالج چھوڑ کر عابی آج یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔ فرحت سے بات کرنے کی خاطر واپس چلا آیا تھا۔ دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ''ارے! یہ تو ایک بج رہا ہے۔'' پھر فرحت کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''آج دو لیکچر تھے۔ غیر حاضری ہو گئی۔ میرے اسٹوڈنٹس میری جان کو رو رہے ہوں گے۔''

انداز خود کلامی کا بھی تھا اور پرابلم فرحت سے شیئر کرنے کا بھی تھا۔ جواب میں فرحت بھی مسکرا دی تھی۔ ''جیراں! کھانا تیار ہے۔؟''

''جی بی بی۔!'' کچن میں سے وہ نمودار ہوئی۔ ''سب تیار ہے۔ بس ذرا دو روٹیاں توے پر ڈالنا رہ گئی ہیں۔ وہ سوچا تھا جب آپ نے کھانا ہو گا تو گرم گرم اتار دوں گی۔''

''چلو پھر۔ میز پر لگا دو۔''

''میز پر۔؟'' اس نے تحیر اور تجسس کے ساتھ فرحت کو دیکھا۔ کیونکہ وہ اس وقت ٹرے میں ہی لا دیا کرتی تھی۔

''ہم دونوں کے لئے۔''

# 39

بہت بے کیف دن تھے۔ بہت بے سکون راتیں تھیں۔ نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ اک اک پل ایمان آفریدی کا اضطراب میں گزر رہا تھا۔

ماھم اور اجلال ایسے گئے تھے کہ ان کی اطلاع ہی کوئی نہیں تھی۔ وہ امریکہ پہنچ بھی پائے تھے یا راستے میں ہی کہیں مرکھپ گئے تھے۔ ایمان آج کل رات دن انہیں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ماھم کو خط لکھے بھی بہت سارے دن ہو گئے تھے مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ امتحانات سے فارغ ہو کر ایمان نے فون پر ہی ماھم کی ماما سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں ملی تھیں۔

"وہ تو جی بہت دن ہو گئے انہیں گئے ہوئے۔" کسی ملازم نے ہی فون پر بات کی تھی۔

"کہاں۔؟" ایمان نے بے قراری سے پوچھا تھا۔

"امریکہ جی۔ آپ پیغام دے دیں۔"

"پیغام دے دیں۔" وہ اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گئی۔ "خاک پیغام دے دوں۔ جاتے ہوئے خود ہی اطلاع دے دیتیں تو کیا بگڑ جاتا۔؟ اتنا ہی سوچ لیتیں ہم دونوں میں کتنی دوستی ہے۔ پھر اجلال کے بھی کچھ ناتے ہیں یہاں۔"

تین چار دن پہلے خدیجہ کا بھی فون آیا تھا۔ بیٹے بہو کی خیر خیریت کی خبر جاننے کو بے تاب تھیں۔ منی تو بھائی کی جدائی میں روتی بھی رہتی تھی۔

ایمان کو اپنی پریشانی کے علاوہ ان کے دکھ کا بھی احساس تھا۔ تبھی اضطراب دو چند تھا۔

بازوؤں کے گھیرے میں گھٹنوں کو لئے بیٹھی سوچوں میں کھوئی تھی۔ ماھم کے کزن کی بنائی ہوئی مووی آنکھوں میں چل رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ اماں بابا اور ارسل تک بات نہ پہنچ جائے۔ نجانے اس نے ایگزامز کیسے دیئے تھے۔ پرچوں میں لکھنا کیا تھا اور وہ لکھ کیا گئی تھی۔ اسے کچھ علم نہ تھا۔ یہ وہ کیسی زندگی جی رہی تھی آج کل۔ کبھی کبھی اپنے آپ پر بھی ترس آنے لگتا۔



بہت سارے دن ہو گئے تھے عابی سے بھی ملے ہوئے۔ وہ کلاس روم میں آتے تھے رول کال لیتے ہوئے اسے غور سے تکتے بھی ضرور تھے۔ ایک دو بار تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ان کی آنکھیں اسے کچھ پیغام دے رہی تھیں۔ مگر اپنے اندر کی پریشانی میں اس نے دھیان ہی نہیں دیا۔ ان کے چہرے پر لکھی اس تحریر کو پڑھا ہی نہیں جو صرف اس کے لئے تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ بازوؤں کا گھیرا کھلا۔ گھٹنوں پر ٹکی ٹھوری بے آسرا ہو گئی تو چہرہ خود بخود اٹھ گیا۔

"کون ہے؟ آ جاؤ۔" یہی سمجھی تھی کوئی دوسرے کمرے کی کلاس فیلو وغیرہ ہو گی۔ نظریں دروازے پر مرکوز تھیں۔

دروازہ کھلا اور ہوسٹل کے ملازم نے اندر آ کر ایک وزیٹنگ کارڈ اسے دے دیا۔ "عبدرحمان"

دو تین بار اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں یہ نام دہرایا۔ کچھ اس انداز میں جیسے اس نام والی ہستی کو جاننے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ کیوں آ گئے۔؟" اک دکھ اک کرب کے ساتھ سوچا۔ "اور وہ بھی اس قدر بے تکلفی کے ساتھ۔؟" پھر کارڈ کو دیکھا۔ "یوں علی الاعلان اپنی آمد کا اشتہار دیتے ہوئے۔"

نظریں "عبدرحمان" کے الفاظ پر جمی تھیں۔

مگر وہ تو ابھی تک ماھم کے کزن والی بنائی ہوئی مووی کی شرمساریوں میں ہی مبتلا تھی۔ بے آرام راتیں، بے چین دن کاٹ رہی تھی۔ پشیمانی اور گناہ کی دلدل میں پھنسی تھی۔ عذاب و ثواب کی چکی میں پس رہی تھی۔ سوچ ہی سوچ میں، بدنامی اور رسوائی کے سمندر میں بہتی ہوئی وہ کہاں سے کہاں تک جا پہنچی تھی۔ اس دنیا سے اس دنیا تک۔ مشرق سے مغرب تک۔ کہیں اماں نہ تھی۔ کہیں پناہ نہ ملی تھی۔ سوچیں اتنی ظالم تھیں۔

رات کی گھڑیاں، دن کے پل، اک مسلسل اضطراب میں گزر رہے تھے۔

"عبدرحمان! تم میری زندگی میں کیوں آ گئے۔؟ بابا جان۔ اماں۔ ہمایوں

خاں۔ بہت ہی پیار کرنے والی پھوپھی۔ ارسل۔ آس پاس اتنے سارے لوگ موجود تھے۔" وہ اپنے آپ سے ہی نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔ "پھر عابی! آپ کیوں چلے آئے۔؟ میرا سکھ چین لوٹ لیا۔ میرے دل کی دنیا اجڑ گئی۔ اندر ویرانے اور سناٹے آباد ہو گئے۔"

بہت سوچا۔ سامنے ملازم کھڑا تھا۔ کارڈ ہاتھ میں لرز رہا تھا۔

"کیا ملنے سے منع کر دوں۔؟"

مگر یہ جو دل نام کا اک چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا سینے میں تھا۔ اس نے ایسا بھی نہ کرنے دیا۔ اندر جو جذبات و احساسات دھڑک بھڑک رہے تھے اتنے دنوں سے جنہیں دبانے کی کوشش میں تھی، وہ سارے وجود میں پھیل کر میٹھی میٹھی آنچ دینے لگے۔ عابی کی محبت، جو رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ اک دم سب پر غالب آ گئی۔ والدین، ہمایوں خاں، پھوپھی اور ارسل کی محبتوں پر کچھ یوں حاوی ہو گئی کہ قدم خود بخود ہی باہر کی طرف اٹھنے لگے۔

آنکھوں میں عبدالرحمان کی وجیہہ و شکیل شبیہ اتر آئی۔ اس کی شاندار پرسنالٹی کے سامنے باقی ساری صورتیں دھندلا سی گئیں۔

"اب اگر انہوں نے اتنی جرأت کر ہی لی تھی تو۔ ایمان کا اپنا دل بھی مچل اٹھا۔ ساری مصلحتیں تاک پہ رکھ کر وہ اس کی محبتوں میں گرفتار اسے ملنے ہوسٹل میں چلے ہی آئے تھے تو۔ وہ انہیں کیسے منع کرتی۔ خود بھی اتھل پتھل ہو گئی۔

ان کی اکثر اداس رہنے والی آنکھیں اور کبھی کبھی روشنیاں بکھیرنے والی آنکھیں اردگرد چاروں اطراف پھیل سی گئیں۔ ہر سمت سے جیسے اس کا احاطہ کر لیا۔ وہ بے بس ہو گئی۔ کوئی اختیار کوئی قابو ہی نہ رہا اپنے آپ پر۔ تب وہ ان کی کشش میں بندھی، کھینچی ہوئی ان کے پاس چلی آئی۔

اسی طرح ہاتھ میں کارڈ تھا۔ سفید سفید لرزتی انگلیوں میں اسے یوں تھامے تھی، جیسے عابی کی محبتوں چاہتوں کو گرفت میں لے رکھا تھا۔

ان پر نگاہ پڑتے ہی وہ ٹھٹھک سی گئی۔ بڑی واضح، بڑی خوبصورت سی مسکراہٹیں لبوں پہ لئے کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی دو قدم اس کی طرف بڑھ آئے۔



سفید کلف دار شلوار قمیض میں ہمیشہ سے کہیں زیادہ عالیشان لگ رہے تھے۔ اور ان کی مانوس سی خوشبو اس کے حواس چھیننے لے رہی تھی۔

"آپ یہاں کیوں چلے آئے۔؟" گھبرا گھبرا کر اردگرد دیکھنے لگی۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا تھا۔ مووی والی رسوائی بدنامی کا پھر خیال آ گیا۔ کیمرے کی آنکھ ہر جگہ موجود ہو سکتی تھی۔

"نہ سلام، نہ دعا۔ بات کرنے کا یہ نیا بے ادب سا انداز۔ کیوں اپنا لیا۔؟"

ایمان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اک پیار بھرے تبسم کے ساتھ شکوہ کیا تو وہ مزید گھبرا گئی۔

"چلو آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ "بہت دن ہو گئے تھے تمہیں اچھی طرح جی بھر کر اور نظر بھر کر دیکھا نہیں تھا اور نہ تفصیل سے تم سے باتیں ہوئی تھیں۔ دل بہت اداس ہو رہا تھا۔"

لیکن بیان کے مطابق آنکھوں میں ایسی کوئی اداسی بھری تحریر نہ تھی۔ ایمان نے محسوس کیا۔ وہ والی بھی نہیں جس کی کشش نے ایمان کو ان کی محبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بلکہ ان کی آنکھوں میں تو اداسی کے بجائے شوخیاں مچل رہی تھیں۔

حیرتوں میں ڈوبتے ہوئے وہ ان کی آنکھوں میں تکنے لگی۔ یہ تبدیلی۔ ان کے کونسے جذبوں کو آشکار کر رہی تھی۔؟ وہ کیوں اس قدر خوش تھے۔ وہ سوچنے لگی۔

"چلو ناں۔" مسکراہٹوں بھرا اصرار دل کی دھڑکنیں تیز کر گیا۔

"مگر آپ یہاں کس کی اجازت سے......"

"اپنے جذبوں کی اجازت سے چلا آیا ہوں۔" فوراً اس کی بات کاٹی اور اسے کوئی تسلی بخش جواب دینے کے بجائے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ایک گہرے سے تبسم نے پورے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا اور وہ نروس ہوئی جا رہی تھی۔ وڈیو جیسا کوئی نیا سین بننے والا تھا کیا؟

"چلو آؤ جلدی سے۔ وقت کم ہے۔ آٹھ بجنے سے پہلے واپس بھی جانا ہے۔"

"کہیں حاضری لگنے والی ہے۔؟"

"حاضری ہی سمجھو۔ بھتیجی کا حکم ہے۔ چلو ناں۔" پھر عجلت بھرا اصرار۔ اور ادھر ایمان کی گڑبڑاہٹ۔

"لیکن اس حلیے میں اور بغیر وارڈن کی اجازت کے۔؟" ان کے پرزور اصرار پر ایک دم انکار کا لٹھ نہ مار سکی۔ ویسے مصلحت یہی کہہ رہی تھی۔

"اجازت لے لی ہے اور تمہارا حلیہ۔؟" دوبارہ اس کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا۔ "اچھا بھلا ٹھیک ٹھاک تو ہے۔ بلکہ اس سیاہ لباس میں تو بالکل" باقی بات ہونٹوں کے کونوں میں دبالی بمعہ مسکراہٹ کے۔

"بالکل کیا۔؟" سٹپٹا ہی تو گئی۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہ رہے تھے۔؟ اپنے وجود کو تکنے لگی۔

"آفت۔" دبی ہوئی مسکراہٹ کھل گئی۔ "کبھی ذرا میری نظر سے بھی دیکھ کر دیکھ لو۔"

اس طرح کھلم کھلا کبھی اپنے جذبوں کو عیاں نہیں کرتے تھے مگر نجانے آج کیسی امنگ ترنگ میں تھے۔ بڑھ کر اس کا بازو تھامتے ہوئے اک جھٹکے سے گاڑی کی طرف دھکیلا۔

"کہاناں۔ وقت کم ہے۔" انداز میں عجیب سا استحقاق تھا۔ وہ کوئی معنی بھی نہ پہنا سکی۔ بے شک اردگرد کوئی نہ تھا۔ کسی بدنامی رسوائی کا بھی فی الوقت کوئی خدشہ نہ تھا مگر پھر بھی اک نمایاں سی جھجک کے ساتھ ایمان نے بازو چھڑایا اور جھٹ سے گاڑی کے کھلے دروازے میں داخل ہوگئی۔

"میرا کمرہ کھلا پڑا ہے۔ چیزیں بھی پھیلی بکھری ہوئی ہیں۔ عابی! آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

عابی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے اسٹارٹ بھی کر دیا تھا۔ ایمان مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھی۔ کچھ خفگی سے بار بار نظر پھیر کر انہیں دیکھ بھی رہی تھی۔

"آپ کی انہیں دھاندلیوں نے مجھے پہلے ہی پریشان کر رکھا ہے۔"

سارے وجود کو ان کی محبت کی ٹھنڈی تپش پگھلائے بھی دے رہی تھی۔ دماغ علیحدہ سنسنا رہا تھا۔ آنکھوں میں اس مووی کے مختلف سین چل رہے



تھے۔ اور اسے سرزنش بھی کر رہے تھے۔

"اتنا کچھ ہوگیا ایمان آفریدی! تم پھر اس نامحرم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی کسی نامعلوم منزل کی سمت چلی جا رہی ہو۔ اپنے بڑوں کے لیے رسوائیاں اور بدنامیوں......"

چونک کر گردن موڑی۔ عابی کا اطمینان قابل دید تھا۔ چہرے پر معصومیت بھری مسکراہٹ تھی اور ہونٹوں پر اک خوبصورت سی سیٹی کی دھن۔

"میں تمہارے سامنے ایسے کیوں بے بس ہو جاتی ہوں عابی!" اپنی پریشانی اور ان کے اطمینان کو دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر سوال و جواب ہو رہے تھے مگر زبان کھولنے کا جیسے یارا نہ تھا۔

"یہ سب مناسب نہیں ہے۔ ہائے! میں کیا کروں۔؟"

گاڑی شہر کی بارونق سڑک چھوڑ کر اک کم ٹریفک والے راستے پر رواں دواں تھی۔ پھر چونکی۔ "یہ ہم کہاں......؟"

"شی۔" انگلی اپنے ہونٹوں پہ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ اور اپنی سیٹی کی لے پر پھر اپنا سرگم مکمل کرنے لگے۔

"بہت خوش ہیں کیا۔!" جھنجھلاہٹ بھری آواز میں ان کے اس ساتھ لے جانے والے کارنامے پر طنز تھا۔ مگر ان کا یہ تنگ کرنے والا انداز دل کے اندر بھی اترا جا رہا تھا۔

"ہاں۔ بہت۔" طنز سمجھے ہی نہیں۔ البتہ کسی اندرونی خوشی کا اعتراف کر لیا جس نے انہیں بے اختیاریوں میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ بے اندازہ شوخ ہوئے جا رہے تھے۔

"کیوں۔؟" وہ پریشان ہوگئی۔

"تم جو ساتھ ہو۔" بھرپور نظروں سے، اسے دیکھا۔ "اور بہت دنوں بعد ایسا موقع ہاتھ آیا ہے۔" پھر کچھ سنجیدہ ہوئے۔ "آج تم سے بہت ساری باتیں کرنے کا ارادہ ہے۔"

"بہت ساری باتیں۔؟" ایمان چونکی۔ کیا وہی محبتوں سرشار بول اور

وارفتگیوں کی حکایت ان کے انداز و اطوار سے یہی سمجھ پائی تھی۔

"مگر عابی! میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ خدا کے لئے مجھے میرے حالات کے سپرد کر دیں۔ میں ان طوفانوں عذابوں کی متحمل نہیں ہو پا رہی جو میری ہستی کو توڑ پھوڑ رہے ہیں۔ مجھے معاشرے کے ہاتھوں سنگسار کر دینے کا تہیہ کئے ہیں۔ مجھے بچائیں عابی! مجھے ان سے بچائیں۔"

ہمایوں خاں سے نکاح والا بندھن تو روح کا کینسر بن گیا تھا۔ جینے ہی نہیں دے رہا تھا۔ زندگی جن زنجیروں میں جکڑی جا چکی تھی ان کا خیال بے طرح دکھی کر گیا۔ دل کی سب سے بڑی خوشی' بصورت عابی' یہ پاس ہی' اتنا قریب موجود ہونے کے باوجود اک دکھ اور کرب میں مبتلا تھی۔ غم اور پریشانی نے دل کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔

ہمایوں خاں کے رشتے کی زنجیریں توڑ ڈالتی تو والدین کی رسوائی اور بدنامی کا کوڑھ جان کو چمٹ جاتا۔ اور اگر وہ نہیں توڑتی تھی تو عابی کی محبت سے دستبردار ہونا اس سے بھی بڑی موت تھی۔

## 40

گاڑی اک جھٹکے سے رک گئی۔ تبھی اس نے اپنے الجھے بکھرے خیالات سے رہائی پائی۔ وہ اسی ریستوران میں تھے۔ جہاں اس کی سالگرہ پر عابی نے اک خوبصورت سی نظم اسے گفٹ کی تھی۔ اور شاید وہی نظم اس کی محبت کا عنوان بنی تھی۔

"یہاں کیوں آ گئے۔؟"

"زندگی کا اک بہت بڑا مسئلہ سلجھا تھا۔ اسی خوشی کو تمہارے ساتھ شیئر کرنے اور سیلیبریٹ کرنے۔"

"کونسا۔؟" وہ پھر چونکی۔ اسے تو پتہ ہی نہیں تھا کچھ۔ کیا ماھم کی طرف سے کوئی اطلاع مل گئی تھی۔؟

"ابھی بتاتا ہوں۔"

وہی سب سے علیحدہ ہٹ کر کونے والی میز تھی۔ جہاں وہ اسے لئے آن



تھے۔ شاید بکنگ پہلے ہو ہی گئی۔ کھانے پینے والی بے شمار چیزوں سے سجی تھی۔ کیا بڑی خوشی کی بات تھی۔؟ اور وہ ایسی بے خبر۔؟

معلوم نہیں کس کے لئے شکوہ اندر اتر آیا۔ اپنے لئے یا ان کے لئے۔؟

وہ اپنے میں مست تھے۔ اس کی سوچوں سے بے پرواہ۔ اپنی لگن میں مگن۔ ایک پلیٹ اٹھا کر' مختلف چیزوں سے بھر کر اپنی ایمان کے آگے رکھ دی تھی اور خود میز کے کنارے پر کہنیاں ٹکائے' ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ دھرے بیٹھے محبت پاش نظروں سے اسے تک رہے تھے۔

عابی کے سلوک اور نظروں کی محبت کی انتہائیں اسے سراسیمہ کئے دے رہی تھیں۔ "آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔؟"

"اچھی لگ رہی ہو۔" بڑی سادگی اور اپنائیت سے کہہ گئے۔

اور اس کے گالوں میں سرخیاں جھلک اٹھیں۔ پلکیں جھک سی گئیں۔ سیاہ بال میں سرخ و سپید' حیا و حجاب میں ڈوبا چہرہ کچھ اس طرح دمک رہا تھا' کچھ ایسا خوبصورت اور دلنشین نظارہ پیش کر رہا تھا کہ عبدرحمان کی نہ نظر پھیرتے بن رہی تھی اور نہ نگاہ ٹکائے۔ تب بات کیا کر پاتے۔ جو کرنے کے لیے اسے یہاں تک' اس جگہ میں' اس سحر انگیز اور فسوں خیز ماحول میں چلے آئے تھے۔ اسے ساتھ لے کر۔ کئی ہرڈلز سے گزر کر۔ یونیورسٹی۔ ہوسٹل۔ وارڈن کی اجازت۔ جاتے جاتے ماھم نے جو اس کی آنٹی کو سفارش کرائی تھی کہ جب سر عبدرحمان مس ایمان آفریدی کو ملنا چاہیں یا کہیں ساتھ لے جانا چاہیں تو انہیں روک ٹوک نہ کی جائے۔ یہ سب آسانیاں کوئی آسانی سے تھوڑا ملی تھیں۔

اور اب بیٹھے' اتنی دیر سے۔ ایک ٹک اسے تکے جا رہے تھے۔ اس کی خوبصورتی کو نگاہوں کے راستے دل کی بستی میں اتار رہے تھے' جہاں آج کل جشن بہاراں منایا جا رہا تھا۔

"یہ آپ نے اتنی ساری چیزیں کیوں منگوالی ہیں۔؟" ایمان آفریدی اس بھری ہوئی میز اور بھری ہوئی پلیٹ کے متعلق حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"ہوں۔؟ کیا کیا۔؟" وہ جیسے سن نہیں سکے تھے۔ ایسی مدہوشی طاری تھی۔

"میں پوچھ رہی ہوں یہ سب کیا ہے۔؟" اب کے ساتھ اشارہ بھی کیا۔

"ٹریٹ۔"

"کس بات کی۔؟"

"میں آج کل بہت خوش ہوں۔" عبدرحمان کی نظریں ہنوز اس پر تھیں۔ جذبوں کی سیری ہو ہی نہیں رہی تھی۔ کتنے دنوں بعد وہ اتنا قریب سے اور اچھی طرح دیکھنے کو ملی تھی۔

"بتایا نا۔ اک الجھا ہوا مسئلہ سلجھ گیا ہے۔اور تمہیں سب سے زیادہ پ... دنیا میں سب سے زیادہ اپنا سمجھتا ہوں۔ بلکہ ایک تمہی تم تو ہو' میری سب کچھ۔ سو یہ خوشی تمہارے ساتھ شیئر کروں۔ تمہیں بتا کر۔ تمہیں ٹریٹ دے کر۔ تمہارے سا... کچھ وقت گزار کر۔" عبد جذبات میں ڈوبے کہہ رہے تھے۔ ایمان کو ان کے بو... ہوئے الفاظ کا یقین تھا۔ وہی یقین' جو ان کی مکمل شخصیت' کردار اور محبتوں چا... نے دلایا تھا۔ ایسا مضبوط' ایسا مستحکم کہ جو قانوناً وشرعاً ہمایوں خاں کی بن جانے بعد بھی ٹوٹ نہیں پا رہا تھا۔ اور اس کی تصدیق خود ان کی روشنیاں بکھیرتی آنکھیں کر رہی تھیں۔ کیسی چمک تھی ان میں اور کیسا دلآویز سا تبسم تھا ہونٹوں پر۔ ماتھم کی ہوئی فلم والی ساری پریشانی کافور ہوگئی۔

"تو بتایئے پھر وہ گھریلو مسئلہ۔؟" وہ پوری دلچسپی' شوق اور اپنی محبت اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ ان کی جانب متوجہ ہوگئی۔

"پہلے کچھ کھاؤ۔ منہ میٹھا کرو۔" سنجیدگی پر پھر شوخی غالب آ گئی۔ "یہ ختم کرنا ہے۔"

"اوئی اللہ۔! تو کیا میں اتنی پیٹو ہوں۔؟"

"اس سے بھی زیادہ۔" شرارت سے کچھ اور بھی پلیٹ میں دھر دیا۔ گنجا نہ ہونے کے باوجود بھی۔ ساتھ ہنسی سے دوہرے ہو رہے تھے۔

اتنے پیارے انداز اختیار کئے ہوئے تھے کہ ایمان ان کی محبتوں کی گہرائی ایک بار پھر نئے سرے سے ایمان لے آئی تھی۔ اک شرمیلی سی مسکراہٹ ہونٹوں بکھری۔



"عابی! میری زندگی میں آپ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ہمایوں خاں! تمہیں مجھے آزاد کرنا ہی ہوگا۔ اماں' بابا اور ارسل! آپ لوگوں کو ان فرسودہ رسم و رواج کو خیر باد کہتے ہوئے اپنی بیٹی کے وہ بنیادی حقوق' جو اللہ نے اسے دے رکھے ہیں' ان کو ماننا اور تسلیم کرنا ہی ہوگا۔"

تجدید محبت کے عہد کے ساتھ ساتھ حقوق نسواں کا بھی پرچار کر رہی تھی۔ دل ہی دل میں۔ سوچ ہی سوچ میں۔

پھر یکایک نگاہ عابی کی خالی پلیٹ پر جا پڑی۔ "ارے! تو کیا آپ روزے سے ہیں۔؟"

"نہیں نہیں۔ روزے سے کیوں۔؟ تم سامنے ہو' آج تو میری عید ہے۔" جلدی سے پلیٹ میں اک چکن تکہ رکھ لیا۔

"یہ کیا۔؟ دن دیہاڑے فاؤل کھیل رہے ہیں۔" ایمان' عابی کی پلیٹ خود بھرنے لگی۔

"بس بس۔" اسے منع کرنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سامنے ریستوران کے داخلی دروازے کی طرف نگاہ اٹھ گئی۔ "ارے! یہ تو سر آفاق ہیں۔ یہ ادھر کدھر۔؟" بوکھلا کر ہاتھ پیچھے ہٹایا اور یکایک اٹھ کھڑے ہوئے۔ "کہیں ادھر ہی نہ چلے آئیں۔" چہرے پر سے ساری شوخیاں شرارتیں' رخصت ہوگئیں۔

"بہتر ہے میں وہیں ان سے مل کر انہیں فارغ کر دوں۔ تمہیں دیکھ لیا تو ساری یونیورسٹی میں بات پھیل جائے گی۔"

عابی بڑبڑاتے ہوئے ان کی جانب چل دیئے۔ چہرے پر خاصے خفگی کے تاثرات تھے۔ "انہیں بھی آج ہی ہوٹلنگ کی سوجھنا تھی۔" بے دلی سے اک رحم طلب نگاہ بھی اس پر ڈالی تھی۔

سب کچھ ویسے ہی پڑا رہ گیا۔ ایمان نے بھی کچھ نہیں لیا۔ پیاس لگی ہوئی تھی۔ کوک اٹھا کر اس کا اک سپ تک نہیں بھرا۔ عابی کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔

پہلے کچھ دیر وہ دونوں وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر دروازے کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گئے تھے۔ ایمان ادھر ہی تک رہی تھی۔ پھر سر آفاق کے

اشارے پر بیرے نے ان کی میز پر چائے سروکی تھی۔ اب وہ ساتھ ساتھ باتیں کیے جا رہے تھے' ساتھ ساتھ چائے سے شغل فرما رہے تھے۔ کچھ کھا بھی رہے تھے۔

''سر آفاق تو بونگے تھے ہی۔ یہ سر عبدرحمان صاحب بھی آج بونگے بن گئے۔'' اپنی میز کی اتنی ڈھیر ساری چیزیں دیکھ کر ایمان بڑبڑائی۔ ''وہ بل بھی ادا کریں گے اور پھر اس میز کی بھی پے منٹ کریں گے۔ ہے نا سراسر حماقت۔''

ساری یونیورسٹی میں سر آفاق کی کنجوسی کی داستانیں مشہور تھیں۔ یقیناً وہاں بھی چائے کا آرڈر عبد نے ہی دیا ہوگا۔ ایمان نے قیاس کیا۔ اگر انہیں چائے پلانا اتنا ہی ناگزیر ہو گیا تھا تو اسی میز پر چلے آتے۔ کتنا کچھ تھا یہاں۔

''ارے ایمان آفریدی! آپ یہاں کہاں۔؟ کس کے انتظار میں ہیں۔؟ ہمیں بھی اپنی کسی دوست کی دوست میں شامل کر لیں۔'' عبد اس طرح ایکٹ کر لیتے تو کیا بگڑ جاتا۔

وہ اکیلی بیٹھی سوچے جا رہی تھی۔ اک مکمل ڈرامے کا ڈائیلاگز سمیت پلاٹ بنا رہی تھی اور وقت گزرا جا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھنجھلا کر گھڑی بھی دیکھ لیتی۔

اف توبہ! کس قدر بوریت تھی۔ الجھن تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر خدا خدا کر کے دنوں فارغ ہو کر اٹھے تو ایمان نے اطمینان کا اک طویل سانس لیتے ہوئے پھر اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

اوہ خدایا! ہوسٹل کا گیٹ بند ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔'' اک بیقراری کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''اور ابھی اتنا طویل راستہ بھی......''

سر عبدرحمان سر آفاق کو رخصت کر کے چہرے پر شرمندگی اور خجالت کی پرچھائیاں لئے اپنے سر کو کھجاتے ہوئے اس کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

## 41

نیویارک پہنچ کر اگلے چند ہی دنوں میں اجلال حیدر نے اپنے دفتر کا چارج



سنبھال لیا تھا۔ ماھم کے ڈیڈی نے دفتر کے علاوہ بیٹی اور داماد کے لئے اک خوبصورت سا اپارٹمنٹ بھی ڈیکوریٹ کر دیا تھا۔ زندگی کی ہر آسائش' ہر سہولت' ہر آسانی اور خوبصورتی اس اپارٹمنٹ میں موجود تھی۔ اجلال اور ماھم بہت خوش تھے۔ ماھم تو خیر پہلے سے ہی ایسی آسائشوں بھری زندگی کی عادی تھی۔ اجلال کو البتہ نئی نئی ملی تھی۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔'' وہ ماھم کا ہر موقع پر شکریہ ادا کرتا۔

جب لمبی سی بڑی سی گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ماھم کے ساتھ تفریح کے لئے نکلتا تو خصوصاً اس وقت اسے بے شمار وہ لمحات یاد آ جاتے جب پاکستان میں وہ اور عابی اپنی پرانی سرانی موٹر سائیکلوں پر ٹوٹی پھوٹی سڑکیں ناپا کرتے تھے۔ راستے میں ضرور کہیں نہ کہیں' کسی کی بھی بائیک خراب ہو جایا کرتی تھی۔ پھر ہمیشہ وہ اپنی منزل پر دیر سے ہی پہنچا کرتے تھے۔ شرمندگی۔ ندامت۔ پریشانی۔ بے عزتی۔ کیا کچھ نہیں سہنا پڑتا تھا۔

''یہ بھی کوئی زندگی گزارنے کے ڈھنگ ہیں۔؟'' اجلال اکثر شکوہ کناں ہی رہتا۔ اپنے حالات سے۔ اپنے اللہ میاں سے۔ اور اپنے دوست عابی سے۔ وہ کیوں صابر اور شاکر تھا۔؟

اسے اس پر بھی کئی بار غصہ آ جاتا۔ تب بجائے کوئی احتجاج کرنے کے اس کی مشکلات کو بھی اپنی سمجھ کر تن من دھن سے وہ اس کی مدد میں جٹ جاتا۔

زندگی کا کونسا مرحلہ تھا' جہاں اس نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

اس کی تعلیم میں' فیسیں داخلے اکثر وہی چپکے چپکے ادا کر دیا کرتا تھا۔ رہائش کی ضرورت بڑی حد تک اس کی وساطت سے پوری ہوئی تھی۔ کہنے کو بظاہر دونوں کا مشترکہ فلیٹ تھا لیکن اجلال جانتا تھا درپردہ اکثر کرائے کی رقم عبدرحمان کی جیب سے جاتی تھی۔ کچن کا خرچ اور دوسری ضروریات زندگی بھی کچھ اسی طرح پوری ہوتی تھیں کہ اجلال کا باپ سر پر نہ تھا اور اسے اپنی دو یتیم بہنوں اور اک بیوہ ماں کی کفالت بھی کرنا تھی۔ وہ جو کچھ کماتا تھا' اس کا بڑا حصہ اسے گاؤں بھیجنا پڑتا تھا۔ عابی کو اس کا پورا پورا احساس تھا۔ تب کئی بار ایسا بھی ہوا۔ کسی وجہ سے اسے تنخواہ نہیں ملی' تو

وہی اس کے گھر ماہانہ خرچ کی رقم بھی بھجوا دیتا تھا۔

''یار! یہ ہم کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔؟'' اجلال اکثر اک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ عابی سے سوال کیا کرتا تھا۔

''بڑی اچھی زندگی ہے۔'' وہ فٹ پاتھ پہ پڑے کسی فقیر کی طرف اشارہ کر دیتا۔''اس سے ہزار گنا اچھے ہیں نا۔؟ شکر کرو۔'' عابی کے ایسے ایسے جملے اور صبر و شکر بھری نصیحتیں اجلال کو بڑی ہمتیں اور حوصلے دلا جاتیں۔ وہ اک نئے عزم، نئے ارادے کے ساتھ زندگی کے راستے پر اگلا قدم بڑھا دیتا۔

پھر عابی ملک سے باہر چلا گیا تو تب بھی وہ اسے نہیں بھولا۔ باقاعدگی سے نہ سہی، بے شک کبھی کبھار ہی، وہ اسے کچھ نہ کچھ بھیجتا ہی رہتا تھا۔ خصوصاً فارحہ کی شادی میں تو جو کچھ اس کے سسرال والوں کی ڈیمانڈ تھی، عابی پوری نہ کرتا تو آج تک اس کی شادی نہ ہو پاتی۔ اس کی بہن لوگوں کی باتیں سننے کو کنواری گھر میں ہی بیٹھی رہ جاتی۔ اور یہ سب اجلال کبھی نہیں بھولا تھا۔

پھر ماھم اس کی زندگی میں آ گئی۔ یہ حادثہ ایسا اچانک تھا کہ خود اجلال بھی حیرت زدہ تھا۔''کیوں ہوا۔؟ کیسے ہو گیا۔؟''

ماھم اور اجلال میں زندگی گزارنے کا اسٹینڈرڈ بہت مختلف تھا۔ تقریباً زمین آسمان کا فرق۔ کوئی صورت نہیں تھی یہ رشتہ طے ہونے کی۔ اور یہ سب عابی کی کوششوں سے ہوا تھا ورنہ اجلال تو زندگی بھر اپنی ماں سے اس موضوع پر بات نہیں کر سکتا تھا۔ نہ معاشی حالات کی وجہ سے نہ معاشرتی حالات کی وجہ سے اور نہ سماجی حالات کی وجہ سے۔ دونوں خاندانوں میں کوئی بھی تو قدر مشترک نہ تھی کہ بیٹا ماں سے اس بے جوڑ شادی کے لیے درخواست کرتا۔ تب عابی نے ہی یہ معاملہ بھی نمٹایا تھا۔ خدیجہ بی کو سمجھا بجھا کر راہ پہ لایا تھا۔ پھر جس جس طرح اس نے شادی کے انتظامات کیئے۔ وہ عابی ہی تھا، جس نے سب سنبھالا تھا۔

کئی دن اس کی ماں اور بہنوں کو نہ صرف فلیٹ میں بلکہ اپنے کمرے میں رکھا تھا۔ خود تقریباً بے گھر ہوا رہا۔ نہ وقت پر کھانا اس کے نصیب میں ہوتا تھا نہ آرام۔ سارا سارا دن شاپنگ میں اور دوسرے انتظامات کی تگ و دو میں گزارتا رہا۔



اک لمحے کے لیے تھکن کے مارے اس کی پیشانی پر کبھی بل نہیں پڑا تھا۔ بے آرامی کی وجہ سے مزاج میں ہلکا سا بھی چڑچڑا پن نہیں آیا تھا کبھی۔ ذرا بھی موڈ میں تبدیلی نہیں کوئی محسوس کر سکا تھا۔ کہ بعض اوقات وہ بڑے بے درد لمحات سے بھی گزرا تھا اس دوران۔ غرض اس قدر خوش مزاجی اور خوشگواری سے اس نے سب کچھ نبھایا تھا کہ اجلال خود ششدر سا رہ گیا تھا جو اس کے ٹھنڈے میٹھے سلوک اور رویوں سے آشنائی بھی رکھتا تھا۔ پر یہاں تک نہیں۔ اتنا بھی ارفع و اعلیٰ مزاج کا اس نے اسے نہیں جانا تھا جتنا وہ ثابت ہوا تھا۔ ہر قدم پر، ہر منزل پر۔

''کیا عابی کے احسانات کا بدلہ، کچھ تھوڑا سا ہی، میں کبھی چکا بھی سکوں گا۔''

گاڑی، گھر، اسٹیٹس اور باقی اتنی ساری آسائشیں پانے کے بعد اجلال حیدر کی سوچ میں کتنی ہی بار یہ آیا تو اک دن ماھم سے سارا مسئلہ بیان کر کے اس نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

''میں عابی کے لئے بہت ڈسٹرب رہتا ہوں۔ میں اس کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ ہے ہی ایسا نفیس انسان۔ اس کے لیے تو میں بھی کچھ ایسا ہی سوچتی ہوں۔'' ماھم نے بڑی صاف دلی سے اجلال کی تائید کی۔''لیکن۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور ہے۔'' وہ کچھ کھوئی کھوئی سی بولی۔

''کیوں۔ کیا ہوا۔؟ ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔؟'' اجلال چونکا۔

''ہم اس کے سارے احسانات کا بدلہ اسی صورت میں چکا سکتے ہیں کہ ایمان کو ہمایوں سے آزاد کرا دیں۔ عابی کو ایمان سے بہت محبت ہے۔''

''اور اس کا ثبوت تم اپنے کزن سے وہ وڈیو بنوا لائی ہو۔ جو ہمایوں خاں کو دکھاؤ گی۔ یہ کارنامہ تم نے کئی بار مجھے سنایا ہے۔'' اجلال پیار بھری نظروں سے ماھم کو دیکھتے ہوئے بولا۔''مگر تم نے ابھی تک کارروائی شروع نہیں کی۔ کب اس مہم کا آغاز کرو گی، جب اس کی رخصتی ہو جائے گی تو۔'' شرارت سے مسکراتے ہوئے طنز بھرا۔

''مہم کا آغاز تو آتے ہی کر دیتی مگر دیکھو تو ظلم کیا ہو گیا۔ ہمایوں خاں کا جو ٹریس لائی تھی وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ مل ہی نہیں رہا۔''

''کمال کی عورت ہو تم بھی۔'' اجلال کو ایک دم ہی غصہ آ گیا۔ ''اتنا اہم معاملہ' اتنی ضروری بات۔ اور تم کیسے سرسری سے انداز میں کہہ رہی ہو۔''

''ڈر رہی تھی تم سے اجلال۔!'' پھر خفیف سی مسکرائی۔ ''اور وہی بات ہو گئی۔ آخر تم بھی شوہر بن گئے۔ اک روایتی پاکستانی مرد جیسے۔''

''اس میں شوہر بننے یا اک روایتی پاکستانی مرد جیسا بننے کی کیا بات ہے۔''

اجلال کا غصہ بدستور تھا۔ ''تمہیں نہیں اندازہ کہ یہ عابی کا معاملہ ہے۔ یہ تم نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ ہمایوں خاں کا ایڈریس ہی گم کر دیا۔''

''میں نے جان بوجھ کر تھوڑا کیا ہے۔ مجھے بھی ایمان سے بہت محبت ہے۔ عابی کے احسانات کا معاملہ نہ بھی ہوتا میں تب بھی ایمان کے لیے بہت کچھ کر گزرتی۔''

''مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم اس کی محبت میں کتنی سنجیدہ ہو۔'' وہ اسی طرح بیٹھا بڑبڑاتا رہا۔ ''اب کیا ہو گا۔؟ اوپر سے اتنے دن گزار دیئے۔ اور وہاں نجانے کیا سے کیا ہو گیا ہو گا۔

''کافی پیو گے۔؟'' وہ اس کا دھیان ہٹانا چاہ رہی تھی۔

''نہیں۔'' اسی طرح غصے میں بولا۔

''ویسے کتنی عجیب بات ہے۔ اتنی جلد ہماری ازدواجی زندگی کا پہلا جھگڑا بھی ہو گیا۔'' ماھم کے چہرے پر جھگڑا مکاؤ' فساد مٹاؤ قسم کی مسکراہٹ تھی۔

''اس میں عجیب بات کیا ہے۔ جھگڑا تو روز ہی ہو سکتا ہے۔''

''کیا افسوس ہو رہا ہے کہ پہلے روز کیوں نہیں ہوا۔؟'' وہ ابھی تک مسکرا رہی تھی۔ اجلال کوئی بھی جواب دیئے بنا چہرہ پھلائے سجائے بیٹھا رہا۔

''ایک اور بھی عجیب بات ہے۔'' اور اب کچھ بھی بولے بنا وہ اسے تکنے لگا تھا۔ وہ عجیب بات سننے کے لیے۔ ''دو محبت کرنے والوں کی محبت ٹوٹنے سے بچانے کے لیے دو بہت ہی پیار کرنے والے میاں بیوی آپس میں جھگڑ پڑے۔ اپنی محبت کو توڑنے کے درپے ہو گئے۔''

اجلال کا چہرہ اک دم نارمل ہو گیا۔ وہ مسکرانے لگا۔ ''نہیں نہیں۔ خدا نہ



کرے۔''

''ماما تو پہلے ہی امریکہ آ چکی ہیں۔ میں وہاں کس سے بات کرتی۔ لہذا میں نے ہوسٹل کے پتہ پر ایمان کو خط لکھ دیا تھا۔ اسی دن۔ خود مجھے ان دونوں کا بہت احساس ہے۔''

اجلال کا موڈ نارمل ہوا تو ماھم نرمی سے' دھیمے سے لہجے میں اجلال کو ساری صورت حال سے باخبر کرنے لگی۔

''ویسے کبھی کبھی دیر اندھیر بھی کر دیا کرتی ہے۔'' اجلال کے اندر اک اور خدشے نے سر ابھارا۔

''مگر وہ دیر جو سستی کاہلی سے کی جائے۔ اور جو اللہ کی طرف سے حادثے کی طرح یا اچانک اتفاق سے ہو جائے' اس دیر کو سویر بھی مل جایا کرتی ہے۔'' ماھم نے تسلی دی۔ ''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''میری بھی ساری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔''

''ابھی یہاں کسی کافی کی بات ہو رہی تھی۔'' دل کو اطمینان ہوا تو شوخی مچل اٹھی۔ ''ہاں ہاں مجھے بھی یاد ہے۔ کافی کی بات یہ تھی کہ اجلال اپنی پیاری بیوی کو ابھی اپنے ہاتھوں سے بنا کر پلائے گا۔ پھر اسے آؤٹنگ کے لئے لے کر جائے گا۔ پھر شاپنگ کرائے گا۔''

ماھم کی ہنسی اتنی دلفریب تھی کہ اجلال ایک ٹک اسے تکے گیا۔ پھر چپ چاپ اٹھ کر کافی بنانے لگا۔

## 42

نہ عبد رحمان کو اپنے آپ پر یقین تھا اور نہ فرحت پر۔ کہ وہ دونوں ہی محبت کی التجا و منت پر پورا اتر سکیں گے۔ اک گھر میں اب رہنے تو لگے تھے۔ اکٹھے تھے۔ آمنا سامنا بھی ہونے لگا تھا۔ آتے جاتے' اٹھتے بیٹھتے' ایک ہی لاؤنج میں موجود

رہ کر کچھ دیر کیلئے ہی سہی' بعض اوقات ٹی۔ وی بھی واچ کر لیتے۔ مگر براہ راست ایک دوسرے کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ ایک میز پر اکٹھے بیٹھ کر کبھی کھانا نہیں کھایا تھا۔

پرانے سارے تعلق اور رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ سات سال ہو گئے تھے ٹوٹے ہوئے۔ اب وہ دوبارہ کیسے بن سکتے تھے جبکہ ان کے درمیان ایسا ان چاہا رشتہ قائم کر دیا گیا تھا جو عابی کو کسی صورت تسلیم ہی نہیں تھا۔

اور اسی کی ڈیمانڈ مدحت نے کر دی تھی۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔؟ اس سوچ کے باوجود' صرف مدحت کی خوشی اور خواہش پوری کرنے کے لیے وہ فرحت سے ملا۔ بڑا مشکل کام تھا' جو وہ کرگزرا۔ اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ بھی راضی ہو گئی تھی۔

تب اس رات دونوں کرنل عمیر آفندی کے ڈنر پر آمنے سامنے ایک ہی میز پہ بیٹھے کھانا بھی کھا رہے تھے اور آپس میں گفتگو بھی کر رہے تھے۔

''یہ مدحت کے چاچو ہیں عبدرحمان۔ ہم سب پیار سے اسے عابی کہتے ہیں۔'' فرحت کے اندر کوئی بھی جذبہ تھا۔ خواہ نفرت کا ہی۔ لیکن اس نے کرنل عمیر آفندی سے اس کا تعارف بڑے خوشگوار انداز میں کرایا تھا۔ بظاہر اک بے ساختہ سی مسکراہٹ کے ساتھ۔

اس لمحے عابی بھی حیران تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ مدحت بھی چونکی تھی مگر ساتھ ہی اس کے چہرے پر عجیب سے' بڑے پیارے سے رنگ پھیل گئے تھے اور وہ بلاوجہ ہی ہنس پڑی تھی۔

''پیارے ہیں نا میرے چاچو۔؟''

مدحت کے پوچھنے سے پہلے ہی عمیر آفندی اسے بغور تک رہے تھے۔

''بخدا بالکل زید رحمان۔ وہی قد بت۔ وہی شکل وصورت۔ بس ذرا۔''

اپنی بات پوری کیے بنا کرنل نے تعارف ہونے پر مصافحہ کرنے کے بجائے بازو پھیلا کر عابی کو یوں حلقے میں لے لیا جیسے ایک عرصہ دراز کا بچھڑا ہوا ان کا دوست زید رحمان سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

''بس ذرا کیا۔؟'' مدحت نے بے قراری سے پوچھا۔



''ینگ ہے۔ اسمارٹ ہے۔ اور ہینڈسم بھی زیادہ ہے۔ اور وہ تو بوڑھا ہو گیا تھا۔'' ساتھ ہی عادت کے مطابق دو تین قہقہے لگائے۔ ''شاید تبھی چلا گیا ہے۔'' پھر ایک قہقہہ۔ ''چلو ہمارے پاس یہ تو ہے۔ شکر خدا کا۔''

اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں کو جھپکتے ہوئے کرنل خود جس صوفے پر بیٹھے تھے' عابی کو بھی ساتھ ہی بٹھا لیا۔

''یہ پلاؤ ہے عابی! تمہاری پسند کا۔''

کھانے کی میز پر جب فرحت نے ڈش اس کی طرف بڑھائی تو وہ سچ مچ بوکھلا گیا تھا۔

''کیا ہم بھی چکھ سکتے ہیں۔؟'' کرنل صاحب نے درمیان سے ہی شرارت کے ساتھ فرحت کے ہاتھ سے ڈش تھام لی تو عابی کا بھرم رہ گیا۔

ورنہ فرحت ان مشکل گھڑیوں کو بڑی آسانی سے گزار رہی تھی۔

''لے لیں۔ پر عابی کے لئے تھوڑے سے ضرور چھوڑ دیں۔'' بڑے پراعتماد لہجے میں فرحت نے شرارت کا جواب شرارت سے دیا تھا۔

اور کرنل عمیر آفندی پھر قہقہوں پر قہقہے لگانے لگے تھے۔ ''بہت خوب۔ لگ رہا ہے وہی وقت پھر آ گیا۔''

یوں کرنل کے کہنے کے مطابق واقعی ان کی زندگیوں میں وہی پرانا وقت پھر آ گیا۔ فرحت سے ان کی جان پہچان تو پہلے سے ہی تھی' کچھ اچھی خاصی دوستی مدحت سے بھی تھی مگر اس رات کے ڈنر کے بعد عابی کے اخلاق اور شخصیت نے انہیں کچھ ایسا متاثر کیا کہ وہ جیسے اس گھر کے ہی ہو کر رہ گئے۔

مدحت نے تو صرف اس رات ہی انہیں انوائیٹ کیا تھا لیکن وہ روزانہ ہی چلے آتے نہ دن دیکھتے نہ رات۔ نہ دھوپ دیکھتے نہ بارش۔ گیٹ پر سے ہی مدحت کو پکارتے ہوئے اندر آ جاتے۔

پھر کبھی کھانے پر ان کے گھر سالن نہ ہوتا اور کبھی چائے کے لیے دودھ یا پتی غائب۔ یا پھر سالن ہوتا تو گرما گرم پھلکوں کا قحط پڑ جاتا۔

اور مزے کی بات ہر بار جہاں ان کی ضرورت مختلف ہوتی وہیں ضرورت

بیان کرنے کا انداز بھی مختلف ہوتا۔

''مسز زید رحمان! ایک پیالی چائے کی ملے گی۔؟'' بے تکلفی ہمیشہ نمایاں رہتی۔ ''چلو دو پیالی کر لیں۔''

پھر نظریں اردگرد گھماتے۔ جو اکثر عابی کے کمرے کے دروازے پر ٹک جاتیں۔ ''کہاں ہے ہمارا شہزادہ۔؟''

شروع شروع میں فرحت سمجھ نہ پائی تو حیرت سے وہ انہیں تکنے لگی۔

''ارے وہ آپ کا پیارا سا دیور'' اس کی حیرت کا فوراً جواب دیا تھا۔

''دوسری پیالی اس کے لئے۔ بھئی ہمیں تو اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اس کے بغیر چین ہی نہیں پڑتا''۔

''تبھی وقت بے وقت منہ اٹھائے ادھر بھاگے چلے آتے ہیں۔''

دو تین قہقہے لگائے۔ ''ارے میاں عبدرحمان عرف عابی! نکلو ذرا کمرے سے باہر۔ بلائیں نا اسے۔ چائے کی پیالی کے ساتھ ساتھ اس سے گپ بازی بڑا مزہ دیتی ہے۔''

فرحت عابی سے کیئے ہوئے وعدے کی پابندی بڑی پابندی سے کر رہی تھی

''عابی۔ عابی۔'' پکارتے ہوئے اس کے کمرے کے دروازے پر جا کر دستک دے دیتی۔ ''کرنل صاحب بلا رہے ہیں۔ چائے کا ساتھ چاہتے ہیں۔''

اور کرنل عمیر آفندی عجیب قسم کے انسان تھے۔ بے تکلف۔ ہنسنے ہنسانے والے۔ محبتیں وفائیں لٹانے والے۔ قربانیاں دینے والے۔ یہاں تک کہ بوقت ضرورت جان بھی نثار کر دینے والے۔ کبھی آتے۔ لاؤنج میں فرحت دکھائی نہ دیتی تو سیدھے عابی کے کمرے میں چلے جاتے۔ ''یار! اتنے پیارے موسم میں یہ اندر گھسے بیٹھے کیا کر رہے ہو۔؟''

اس کے ہاتھ میں کتاب ہوتی' قلم ہوتا' فائل ہوتی یا اخبار وغیرہ۔ چھین کر پرے پٹختے۔ ''شہزادے! ذرا اپنی پیاری سی بھابھی سے کہو نا چائے کے ساتھ آج پکوڑے بھی بنا دیں۔ صبح کا صرف ناشتہ کیا ہوا ہے۔''

''کیوں۔؟ دوپہر کو کھانا کیوں نہیں کھایا۔؟'' وہ بیقرار سا ہو جاتا۔ نجانے



ب یہ کرنل عابی کے دل میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ عمیر آفندی اسے بے حد اچھے لگنے لگے تھے۔

''اب گھر کی کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی۔ حالانکہ پچھلے چار سالوں سے یہی خادم کچن سنبھالے ہوئے ہے۔ اب پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔؟'' گھر عورت سے خالی تھا۔ اس محرومی کا اعتراف کیا۔

''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔'' وہ تڑپ کر اٹھ جاتا۔ مدحت کو آواز دے ہوتی۔ ''کالج سے تھکی ہوئی......''

''اب جانے بھی دیں تکلفات۔ مدحو۔ مدحو۔'' عابی مدحت کو پکارتا کمرے سے نکل جاتا تو وہ بھی پیچھے لپکتے۔

''اور ہاں بھئی کہاں ہے ہماری منی سی دوست۔ ہم بھی اس سے ملاقات کر یں۔'' دو تین قہقہے لگاتے ہوئے لاؤنج میں تشریف فرما ہو جاتے۔ ان کی عادت تھی۔ کی بات ہوتی تب بھی قہقہہ لگاتے۔ خوشی کی بات ہوتی تب بھی۔

''دیکھو تو زید رحمان کو۔'' جب بھی ان کے گھر آتے زید رحمان کو ضرور یاد کرتے۔ کسی نہ کسی انداز میں اس مرحوم کا ضرور ذکر کرتے۔ ''بدقسمت کیا کر لیا۔'' مدحو کا بازو میں لپیٹ کر پاس بٹھا لیتے۔ ''اتنی پیاری پیاری ہستیوں سے منہ موڑ کر چل دیا۔''

پھر اک قہقہہ لگاتے۔ ساتھ ہی آنکھیں پونچھتے۔ یہ آج تک کبھی کسی کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ زید رحمان کے ذکر سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے یا کی زیادتی سے۔

''زید ہوتا تو اس لڑکی نے ہمیں کب گھاس ڈالنا تھی۔ اور اب مال غنیمت میں یں بیٹی مل گئی۔'' بولتے بولتے لمحہ بھر کو خاموش ہوتے اور پھر بولنے لگتے۔ ''پٹھہ خود حوروں کے درمیان بیٹھا ہو گا۔ نیک شریف لوگ بہت خود غرض ہوتے ہیں۔ اکیلا چل دیا۔''

نجانے کیا کیا بولتے جاتے۔ عابی نے آج تک اس گھر کا کچن نہیں دیکھا تھا۔ رنل آفندی کی محبتوں نے وہ بھی دکھا دیا۔ کچھ کچن میں کام کرنے کی عادت بھی تھی۔

''ارے لوگو! ہمارا کرنل بھوکا ہے۔'' جلدی سے خود ہی کچن میں جا گھستا۔

"کچھ ان کے کھانے پینے کا سامان کرو۔"

فرحت عابی کو کچن میں جاتے دیکھ کر خود بھی جلدی سے آ جاتی۔ "تم جاؤ ان کے پاس بیٹھو۔ میں اور جیراں ابھی سب کچھ کر لیتی ہیں۔"

"مجھے پکوڑے بنانا آتے ہیں۔ سات سال یہی کچھ تو کیا ہے۔" بھول ہی جاتا اپنے اور فرحت کے ریلیشن کو۔ بھائی اور بھابھی والا تعلق یاد رہ جاتا۔

"بیسن کہاں رکھا ہے۔ نکالیں جلدی سے۔ آج میرے ہاتھ کے پکوڑے کھا کر دیکھیں۔"

فرحت کے منع کرنے کے باوجود چھری پکڑ لیتا۔ پیاز کاٹنے لگتا۔

"وہ اکیلے بیٹھے ہیں۔ تم جاؤ نا ان کے پاس۔" فرحت اس کے ہاتھ سے چھری پیاز وغیرہ چھین کر اسے کچن سے باہر دھکیل دیتی۔ "پھر کبھی سہی۔ کچن تو ہر روز حاضری مانگتا ہے۔ کسی دن میں اور جیراں نہ ہوئیں تو کرنل صاحب کے ساتھ مل کر اسے آباد کر لینا۔"

پھر فرحت پکوڑے بنا بنا کر لا لا کر دیتی جاتی۔ جیراں ساتھ چائے اور دوسری لوازمات رکھتی جاتی۔

"ان دو پیٹوؤں نے تو گھر کا بجٹ خراب کر چھوڑا ہے۔" فرحت ساتھ ساتھ بڑبڑاتی جاتی۔ گھر میں اک ہنگامہ سا جاگ پڑتا۔ زندگی قہقہے لگانے لگتی۔ مدت ان دو پیٹوؤں سے زیادہ ہاتھ مارنے کی کوشش کرتی۔ دونوں خواتین کو رشتوں، رنجشوں وغیرہ کا کوئی خیال نہ رہتا۔ فرحت بھی نہال نہال مسکراتے لب بھینچے اندر باہر پھرتی رہتی۔

یوں گھر کا ماحول بڑا اچھا ہو گیا تھا۔ کوئی کسی کی بات مائنڈ نہ کرتا۔ لگتا سات سال پہلے والا وہی زمانہ واپس آ گیا تھا۔

پکوڑے اور چائے اختتام کو پہنچتی تو کرنل صاحب کھڑے ہو جاتے۔

"شہزادے! چلو گے۔؟" عابی کا بازو تھام لیتے۔

"کہاں۔؟" ان کے حکم پر کھڑا بھی ہو جاتا فٹا فٹ۔ ان کی پرکشش شخصیت کو احترام سے دیکھتا تھا۔



"تھوڑی سی واک کر آئیں۔ وزن بڑھ گیا نا تو فوج سے نکال دیئے جائیں گے۔" حالانکہ نکلے ہوئے تھے فوج سے۔ عابی ہنس پڑتا۔ کرنل مطلب سمجھ کر فوراً صفائی پیش کرنے لگتے۔ "وہ تو ہم خود مستعفی ہوئے تھے۔ کسی غلطی کی وجہ سے نہیں نکالے گئے تھے مجرم بنا کر۔"

"چلو جی خود نکلے ہوں یا نکالے گئے ہوں۔ ہر حال میں ہم شہری آپ کو موسٹ ویلکم کرتے ہیں۔"

عابی بڑی خوش دلی سے ان کی کمر کو اپنے بازو کے حلقے میں لے لیتا۔

"ہونہہ موسٹ ویلکم۔!" فرحت بھی شوخ ہو جاتی۔ کرنل ان کے گھر میں نئی فضائیں لے آئے تھے۔ "اور یہ جو سب مل کر روز روز میرا نقصان کرتے رہتے ہیں۔ یہ کس کھاتے میں جائے گا۔"

"میں حساب رکھ رہا ہوں سارے۔ یہ بھی کسی دن ہم مل کر ہی پورا کر دیں گے انشاء اللہ۔ کیوں شہزادے۔؟"

"بالکل بالکل۔" کرنل کی تائید کے لئے عابی بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کر دیتا۔ پھر اس دن واک کیلئے چلتے چلتے کرنل آفندی لاؤنج کے دروازے تک پہنچ کر یکا یک تھم سے گئے۔

"چلیں آپ کی بھی تھوڑی سی ہوا خوری کرا لائیں۔" مڑ کر فرحت سے کہنے لگے۔ "عابی یار! اپنی بھابھی کو بھی لے چلو۔ ہم تو نامحرم ٹھہرے۔ انکار کرنے کی صورت میں ہاتھ بھی نہیں پکڑ سکتے۔ تم ان کے ساتھ زبردستی کر لو گے۔ چلو پکڑ لو بازو۔ لے آؤ ساتھ۔"

کرنل عمیر آفندی ایسے ہی تھے۔ ہر بات واضح اور کھلی کر دینے والے۔

ان کی بات پر فرحت اور عابی دونوں چونک پڑے۔ یہ انہوں نے کیا کہہ دیا تھا۔ فرحت تو کچھ زیادہ ہی گڑبڑا گئی تھی۔

"زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں۔" خوفزدہ ہو کر جھٹ سے بول پڑی۔ "میں خود ہی ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ تاکہ باہر کی کھلی ہوا سے کچھ میرا تپا ہوا دماغ ٹھنڈا ہو جائے۔ جیراں! سنبھالنا سارا کچھ۔"

جیراں کو حکم دیتے ہوئے اس نے بات بھی سنبھالی اور خود کو بھی سنبھالا دیا۔

''میں مدحت کو بھی بلاتا ہوں۔ اس نے ٹیسٹ کی تیاری کر لی ہو گی۔'' اور عابی نے مدحت کو بلانے کے بہانے خود کو سنبھالا۔

یوں ہر دوسرے تیسرے کرنل کوئی نہ کوئی تقریب بنائے رکھتے۔ جس میں فرحت کی شمولیت جیسے ضروری قرار دے دیتے۔

''اس کا بھی حق ہے زندگی انجوائے کرنے کا۔'' عابی کو اکثر اکیلے میں کہتے۔

''اس نے بیوگی کی چادر اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں اوڑھی۔ یہ تو مشیت ایزدی اپنا وار کر گئی۔ اور اب ہمارا فرض ہے اس کے لیے کچھ تھوڑی سی زندگی کی دلچسپیاں فراہم کریں۔''

''ہاں ہاں۔ ضرور ضرور۔'' عابی اکثر اپ سیٹ ہو کر انہیں تکنے لگتا۔ بہت پریشانی بھری نگاہوں سے۔ کہ آخر وہ کیا کر سکتا تھا۔؟

''کم آن یار! اس میں حیران یا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تمہارے ذہن میں ابھی بچپنا ہے شہزادے۔! سمجھ جاؤ گے کسی دن۔''

پھر وہ اسی طرح قہقہے لگانے لگتے۔ بعض اوقات بلاوجہ ہی۔

''چلو آؤ آج انہیں شاپنگ کرالائیں۔'' وہ اکثر فرحت اور مدحت کے لئے متفکر ہی رہتے۔ اور پھر کچھ نہ کچھ ان کے لئے کرنے کو بے چین۔ ''بندہ اپنی ضروریات کی چیزیں اپنی پسند سے خریدے تو اسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ لگتا ہے تم نے اپنی بھابھی اور بھتیجی کی اس ضرورت کا کبھی خیال ہی نہیں کیا۔''

عابی پریشان ہو کر سر جھکا لیتا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔

''پھر راستے میں انہیں آئس کریم بھی کھلائیں گے۔ خواتین اور بچیاں آئس کریم کھانے کی بڑی شوقین ہوتی ہیں۔ اور گھر کے مردوں کو چاہیے۔ انکے ایسے چھوٹے چھوٹے شوق' ارمان اور خوشیاں خود پورے کریں۔ ان کو وقت دیں۔ ان کا خیال رکھیں۔ پھر خدا کی یہ معصوم سی مخلوق بھٹکتی نہیں۔ غلط راستے نہیں اختیار کرتی۔''

وہ پھر حیران ہو کر کرنل کو تکنے لگتا۔ کچھ سٹپٹایا ہوا سا۔ کچھ گھبرایا ہوا سا۔ ''اس میں اس قدر گھبرانے سٹپٹانے کی کیا بات ہے۔ پھر ہم اپنی بھی چیزیں ان سے پسند کرا لیں گے۔



ان کی چوائس بڑی اچھی ہوتی ہے۔ میں تو ملیحہ کے بعد ڈھنگ کا کھانا پہننا ہی بھول گیا۔''

وہ تین ہولے ہولے سے قہقہے لگائے۔ دکھ کے عالم میں ہوتے تو قہقہے ذرا آہستہ آواز میں لگاتے۔

''سیکھ لو مجھ سے کچھ میرے شہزادے! یہ ساری باتیں تجربے کی ہیں۔ تمہاری ازدواجی زندگی میں بڑے کام آئیں گی۔''

فرحت پاس ہوتی تو اسے بھی اپنی گفتگو میں شامل کر لیتے۔ ''ٹھیک کہہ رہا ہوں نا فرحت بی بی۔؟''

کبھی کبھی بڑی سادگی اور احترام سے فرحت کو نام سے پکار لیتے مسز زید رحمان کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے۔

''یہ سب نوٹ کر لو۔ اپنی منگیتر یا محبوبہ یا پھر بیوی پر یہ نسخہ آزمانا۔ تمہاری شادی شدہ زندگی بہت کامیاب و شادمان گزرے گی۔''

کرنل عمیر آفندی کے آمدورفت سے گھر کے ماحول میں بڑا فرق آ گیا تھا۔ شاید ان کی خاطر ہی' فرحت کا بھی موڈ بڑا خوشگوار رہنے لگا تھا۔ عابی اور فرحت میں پہلے جیسی بے تکلفی قائم ہو گئی تھی۔ اکٹھے ایک میز پر کھانا کھانے لگے تھے۔ کرنل نہ بھی موجود ہوتے تب بھی۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی عابی بلاتکلف فرحت سے کہہ دیتا۔ اور فرحت کو کوئی کام ہوتا تو وہ بھی اسی اپنائیت اور بے تکلفی سے گویا حکم صادر فرما دیتی۔ ''عابی! مدحت کی یہ چند چیزیں یونیورسٹی سے واپسی پر لانا نہ بھولنا۔ ورنہ میری شامت آ جائے گی۔ تم نے اور کرنل نے اسے بہت بگاڑ دیا ہوا ہے۔''

ساتھ ہی اک کاغذ کی چٹ اسے تھما دیتی۔ وہ غور سے پڑھتا۔ ان میں کئی چیزیں ایسی ہوتیں جن کی خریداری کا اسے تجربہ نہ تھا۔

''فی الحال یہ فہرست اپنے پاس ہی رکھیں۔ شام کو آؤں گا ناں تو سب اکٹھے ہی چلیں گے۔ پھر آپ بھی اپنی خریداری کر لیں۔''

بالکل اسی طرح' بے تکلف دوستوں کی مانند رائے دیتا۔ جسے فرحت فوراً مان لیتی۔ پھر اس دن سارا دن اسے یاد رہا۔ شام کو اس لئے واپس بھی جلد آ گیا۔

''جنابہ مدحت صاحبہ! پروگرام ہے شاپنگ کا۔؟'' آتے ہی مدحت نظر آئی

تو اس سے پوچھا۔

''ہاں۔ کیوں نہیں۔'' وہ ایک دم خوش ہو گئی تو عابی کے اندر بھی خوشی کی لہریں سی دوڑ اٹھیں۔ کرنل کے پڑھائے ہوئے سبق کو بھولا نہیں تھا۔ اس کی بھی اب یہی کوشش ہوتی کہ انہیں خوشیاں فراہم کرے۔

''تو پھر تیار ہو جاؤ اور ماما سے بھی کہہ دو۔'' وہ بات کر ہی رہا تھا کہ کال بیل ہوئی۔ وہ کرنل کی کال بیل تھی۔ مخصوص انداز میں کیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کے آنے سے پہلے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ کرنل آ گئے۔

''اب۔؟'' مدحت نے عابی کی طرف دیکھا۔ ''کیا پروگرام کینسل۔؟''

''کینسل کیوں۔ انہیں بھی لے چلیں گے۔''

''اسلام علیکم۔'' اور کرنل پہنچ گئے۔ ''کسے لے چلیں گے اور کہاں لے چلیں گے۔'' ادھوری سی بات کان میں پڑی تھی۔ وضاحت طلب کرنے لگے۔

''آپ کو لے چلیں گے اور شاپنگ کے لیے چلیں گے۔'' مدحت نے فورا جواب دیا۔ ''ہم تو شاپنگ کے لئے نہیں چلیں گے۔''

''کیا مطلب......؟'' عابی نے گھور کر انہیں دیکھا۔ ''خود ہی ایک دن کہہ رہے تھے کہ معصومون کو شاپنگ کیلئے لے جایا کرو۔''

''ہاں وہ بھی کہا تھا۔ اعتراف کرتے ہیں۔''

''تو پھر یہ انکار۔؟''

کرنل نے دو تین بھرپور قہقہے لگائے۔ ''انکار کب کیا ہے۔ میں نے تو کہا تھا آج شاپنگ کیلئے نہیں چلیں گے بلکہ کل چلیں گے۔''

''آج آپ کو کیا ہے۔؟'' مدحت نے تحکمانہ پوچھا۔

''آج ہم نے فائیو اسٹار ہوٹل کی بکنگ کرائی ہوئی ہے' پہلے ڈنر کریں گے اور پھر لیٹ نائٹ اک میوزک کنسرٹ ہے وہاں۔ وہ دیکھیں گے۔''

''کس کس نے جانا ہے۔؟ کیا آپ دونوں مردوں نے۔؟'' مدحت نے عجلت سے پوچھا۔

''ہاں۔ عابی کی بھی بکنگ ہے۔'' کرنل کے جواب پر مدحت چپ سی ہو



گئی۔ اسی لمحے فرحت لاؤنج میں داخل ہوئی۔ ''چلو ہم کل شاپنگ کے لئے چلے جائیں گے۔ کیوں مدحت۔ آج ویسے بھی میری طبیعت......''

''اب برائے مہربانی آپ اپنی طبیعت تو نہ خراب کریں۔ خواتین اکثر یہی کہہ کر مردوں کیلئے قربانیاں دے ڈالتی ہیں۔ لیکن ہمیں آپ کی آج والی قربانی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلئے کہ اس پروگرام میں آپ دونوں خواتین بھی شامل ہیں۔''

''سچ انکل۔؟'' مدحت نے خوشی کی اک طویل سی چیخ مارتے ہوئے کرنل کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ''میں نے کبھی کوئی میوزک کنسرٹ نہیں دیکھا۔ اور ماما نے بھی نہیں۔''

''تبھی تو میں نے یہ پروگرام بنایا ہے۔ کل فرحت بی بی کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے نہ کبھی ڈنر کسی بڑے ہوٹل میں کیا ہے اور نہ کبھی کوئی موسیقی کا لائیو پروگرام دیکھا ہے۔''

''ارے نہیں۔'' فرحت کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ ''میں نے اسلئے تو نہیں ایسا کہا تھا میں تو مدحت کو سمجھا رہی تھی کہ ضروری نہیں بندے کی ہر خواہش پوری ہو۔''

''اگر خواہشات پوری کرنے والے موجود ہوں تو پھر خواہش کو حسرت نہیں بننے دینا چاہیے۔ ہماری مدحو کا اک چاچو ہے۔ اک انکل ہے دوست نما۔ جو کچھ بس میں ہو گا وہ تو تم دونوں کے لئے کریں گے ہی۔ اپنا فرض سمجھ کر۔ کیوں شہزادے۔؟''

''بالکل بالکل۔'' عابی نے سر ہلا کر پرزور تائید کر ڈالی۔ ایسا اسے کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ بڑے شہر میں رہ رہی تھیں۔ میڈیا بہت فاسٹ ہو چکا تھا۔ جہاں جو بھی پروگرام ہوتا' پتہ چل جاتا تھا۔ اخبارات کے ذریعے۔ ٹی۔ وی کے ذریعے۔ پھر کالج میں مدحو کی کلاس فیلو وغیرہ آپس میں ڈسکس بھی کرتی ہوں گی۔ تو بچی کے دل میں حسرت پیدا ہونا لازم تھا۔

''آپ نے بہت اچھا کیا کرنل صاحب! بکنگ ہی کرا ڈالی۔ اس کی پے منٹ میں کروں گا۔''

عابی نے والٹ نکال کر جلدی سے کرنل صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ میری ذمہ داری ہے اور مجھے ہی سنبھالنے دیں۔'' پورے خلوص سے مدحت اور فرحت

کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم پھر کبھی سہی۔ فی الحال تو میں اپنا حساب کتاب برابر کر رہا ہوں۔ کچھ پرانا۔ کچھ نیا۔'' پھر کرنل نے فرحت کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ''میری کل بات مائنڈ تو نہیں کی۔؟ شہزادے کی تسلی کے لئے بولا تھا۔ ورنہ دوستوں سے حساب کتاب کیسا۔ یہ تو میرے اپنے دل کی خوشی ہے۔ ان پیارے پیارے دوستوں کے ساتھ اک شام باہر منانے کو جی چاہا تھا۔ میں اور ملیحہ اکثر۔''

کرنل نے باقی بات ادھوری چھوڑ کر اک قہقہہ لگایا۔ پھر نظریں جھکا کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ عابی ان کی اندرونی کیفیات سمجھ رہا تھا۔ جلدی سے موضوع بدل ڈالا۔

اور وہ شام واقعی ان کی بہت خوبصورت گزری تھی۔ چاروں ایک دوسرے کے کچھ اور بھی قریب آ گئے۔ ہر کسی کے دل میں کسی نہ کسی ناطے ایک دوسرے کا خیال تھا۔

کرنل عمیر آفندی بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ پرت در پرت جتنا کھلتے گئے اتنی ہی ان کی خوبیاں واضح ہوتی گئیں۔ یوں ان سب کی خوشیوں کی خاطر کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کئے ہی رکھتے۔ اور مسرتیں، قہقہے، کھلکھلاہٹیں تقسیم کرتے رہتے

اور عابی اور شاید فرحت نے بھی اب ہی جانا تھا کہ زندگی اس طرح بھی گزاری جا سکتی تھی۔ جو پروردگار نے ان کے نصیب میں لکھ دی تھی۔ اس سے علیحدہ انہیں کچھ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اور وہ اس طرح بھی خوش رہ سکتے تھے۔

یہی بات اس دن عبدرحمان ایمان آفریدی سے کرنا چاہتے تھے۔ اتنے عرصہ سے اس سے ملاقات تھی۔ وہ ان کی بڑی اچھی دوست تھی۔ اس سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ اپنا ہر دکھ سکھ اس سے شیئر کرنا چاہتے تھے۔ مگر۔ کبھی اسے اپنے متعلق یا اپنی فیملی کے متعلق کچھ بھی نہ بتا سکے تھے۔ خائف تھے اس سے کہ سب کچھ معلوم ہونے پر وہ اس کی محبت کھو دیں گے۔ ایمان آفریدی ان سے نفرت کرنے لگے گی۔ جس کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ بھی اب، ان دنوں عابی کو آگاہی ہوئی تھی کہ دلوں میں جو محبتیں جڑ پکڑ لیں وہ صرف حالات کے بدلنے پر مر نہیں جایا کرتیں نہ



ختم ہو جایا کرتی ہیں اور نہ ہی نفرتوں میں بدل جاتی ہیں بلاوجہ ہی۔ کہ یہ اللہ کی طرف سے دلوں میں اترتی ہیں۔ زمین پر بسنے والے لوگوں کے لئے قدرت کا اک بہترین تحفہ ہے۔ عطیہ خداوندی ہے۔ جتنا بانٹو گے اتنا ہی بڑھے گا۔

انہیں ایمان سے محبت تھی۔ پھر اس کا نکاح ہمایوں خان سے ہو گیا۔ اس اطلاع سے، اس واقعہ سے، ان کی محبت میں کوئی کمی تو نہیں ہو گئی تھی۔ عابی نے محسوس کیا تھا کہ وہ بلکہ دن بدن بڑھتی ہی رہی تھی۔ وہ ہر آنے والے دن میں اسے اپنے زیادہ قریب پاتے تھے۔

کرنل عمیر آفندی سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ گھر کے حالات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ دل میں اک سکون، اک اطمینان تھا۔ اجلال کے ہوتے ہوئے ایمان ان کے فلیٹ میں آ جایا کرتی تھی۔ جس سے محبت ہو دل میں تو وہ ہوتا ہی ہے۔ انسان اسے نظروں کے سامنے بھی رکھنا چاہتا ہے۔

مگر ایمان کی یہ جدائی، نگاہوں میں رکھنے والی، انہیں بہت تڑپا رہی تھی۔ مدحت، فرحت اور کرنل آپس میں ہنستے بولتے، کہیں آتے جاتے، شاپنگ کرنے، ہوٹلنگ یا سیر سپاٹے کے لئے تو عابی کو ہر وقت ایمان کا بھی خیال رہتا۔

کرنل عمیر آفندی بڑی پیاری باتیں کرتے تھے۔ عابی کا دل چاہتا۔ ایمان بھی زندگی کے ان خوبصورت لمحات سے فیضیاب ہو۔ ان کے ساتھ مل کر ہنسے بولے۔ قہقہے لگائے۔ ان کے ساتھ شاپنگ کے لئے جائے۔ ان کے ساتھ سیر سپاٹوں میں شامل ہو۔ ماہم بھی چلی گئی تھی۔ وہ اکیلی ہوسٹل میں کیسے ویران اور سنسان دن گزار رہی ہو گی۔ یہ سوچ ہی عابی کو اتنا پریشان کر دیتی تھی تو وہ خود کسی اذیت میں مبتلا ہو گی جو ان لمحات سے گزر رہی تھی۔ ہر وقت یہ احساس ستاتا رہتا۔

عابی کے حالات کی طرح وہ اپنے حالات کے سنوارنے میں اگر بے بس تھی تو اس کی طرح وقت کو خوشگوار انداز میں تو گزار سکتی تھی۔ جیسی آجکل اللہ کی طرف سے اس پر مہربانی ہو گئی تھی۔ عابی کی محبت بے قرار تھی کہ اس پر بھی اللہ کی مہربانی کی بارش ہو جائے۔ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر زندگی انجوائے کرنے لگے۔ یہی سب اسے بتانے سمجھانے کے لیے اس دن عابی اسے ریسٹوران میں لے گیا تھا۔

اس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اپنے ماضی سے آگاہ کر دے گا۔ وہ حالات اور رسم و رواج کی بے مہر زنجیروں میں اگر جکڑی ہوئی تھی تو آزاد وہ بھی نہیں تھا مگر محبت آزاد ہوتی ہے۔ دلوں کے راستوں پر کوئی پہرے نہیں بٹھا سکتا۔ ایمان کی محبت اس کی زندگی تھی' اس کا ایمان تھی' اس کی زندگی کی واحد خوشی اور اطمینان تھی۔ اس کو کوئی بھی نہ ان کے دل سے نکال سکتا تھا اور نہ اس کی جگہ کوئی اور لے سکتا تھا۔ بے شک زمانہ ایسی ہزاروں لاکھوں زنجیریں اور پہنا دے۔

مگر۔ سرآفاق! یہ آج ہی تمہیں اس ریستوران میں آنا تھا۔ نجانے خدا کو کیا منظور تھا۔؟ لیکن کچھ بھی ہو۔ وہ یہ بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ایمان آفریدی کو سب کچھ بتائے بغیر اسے چین نہیں مل سکتا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی۔ اس کے ساتھ ہر قسم کا دکھ سکھ شیئر کرنے کا بھی اسے حق تھا۔ پورا پورا! ''کل سہی' پرسوں سہی۔'' وہ دوسرا کوئی اور موقع تلاش کرنے لگا۔ کہ روز روز ایمان کو ہوسٹل سے کھینچ لانا بھی مناسب نہیں تھا۔ اس دن بھی نجانے کیسے اس نے یہ جرأت کر لی تھی۔

## 43

ہمایوں خاں ہاتھوں میں سر تھامے توفیق کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ شخصیت کی ساری وجاہتیں اجڑی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ ہر دم چوکس اور اسمارٹ رہنے والا بندہ اداس اور ویران تھا۔ جیسے بھری بہار میں خزاں کا موسم اچانک ہی آ جائے کہ سب کچھ لوٹ لے۔ یوں سناٹوں کی زد میں تھا۔ اس کے سامنے میز پر اک کھلا پرچہ پڑا تھا۔ جس پر چند سطریں تحریر تھیں۔ میں ہمیشہ کیلئے جا رہی ہوں۔ کہاں۔؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ لیکن اتنا جانتی ہوں۔ اب ہم اس زندگی میں' اس دنیا میں کبھی نہیں ملیں گے دوبارہ۔ کیونکہ اب میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

کاش! میں تم سے اپنا انتقام لے سکتی۔ ''جینی فر''۔



دو تین بار وہ اس تحریر کو پڑھ چکا تھا۔ یا شاید اس سے بھی کئی بار زیادہ۔ کوئی حساب نہ تھا۔ حساب رکھنے کا ہوش کب رہا تھا۔ اور وہ تحریر جیسے اب اس کے چہرے پر چھپ گئی تھی۔ خزاں رسیدہ سا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

میز کی پرلی طرف بیٹھا توفیق بھی اس پرچے کو پڑھ چکا تھا۔ اور اب اس کا چہرہ پڑھتے ہوئے' اس نے ایکبار پھر وہ پرچہ اٹھا لیا تھا۔

نظریں اس پر جمائے جمائے بڑبڑایا۔ ''کہاں گئی ہو گی۔؟'' کمرے کے سناٹے میں ارتعاش پیدا ہوا۔ ''تمہیں واشنگٹن نہیں جانا چاہیے تھا۔''

''میں ایلس سے وعدہ کر چکا تھا۔'' آواز میں شکستگی تھی۔ لیکن ندامت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

''گولی مارو ایلس کو۔'' توفیق ایلس کے نام سے چڑ کر تلخی کے ساتھ بولا۔ ''وہ تو ہنستے بستے گھروں کو اجاڑنے والی عورت ہے۔''

''چلو مانا وہ اجاڑنے والی عورت ہے۔ اجڑنے والی نے ہی کوئی عقل کر لی ہوتی۔'' ہمایوں خاں ابھی تک جینی کے مقابلے میں ایلس ہی کی طرفداری کئے جا رہا تھا۔ توفیق نے چونک کر اسے دیکھا۔ اگر ہمایوں خاں کی وفاؤں کا یہ عالم ہے تو پھر شاید جینی نے جو کچھ کیا ہے' درست ہی کیا ہے۔

وہ غیر جانبدار ہو کر سوچ رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر سوچوں میں گم رہ کر تفتیش کرنے والے انداز میں ہمایوں سے پوچھنے لگا۔ ''جب تمہیں پتہ چلا کہ جینی پریگنٹ ہے تو تمہارا سلوک اس کے ساتھ کیسا رہا ہے۔؟''

''تھرو آؤٹ' بہت اچھا'' اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ اسے تکنے لگا۔ ''میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔ آخر وہ میری بیوی تھی۔ اور پھر مجھے اس کے ذریعے گرین کارڈ حاصل کرنا تھا۔ مجبوری سے بھی۔ مجھے اس کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھنا تھا۔ بس اک ذرا۔'' پھر وہ اپنی ہی بات کو ہونٹوں میں دبا گیا۔

''کیا بس اک ذرا۔؟'' توفیق نے چونک کر پوچھا۔

''وہ۔ وہ۔'' بتانا نہیں چاہتا تھا۔ ہکلانے لگا۔ ''ذرا اک کوتاہی ہو گئی تھی۔''

''کیا۔؟ وہی پوچھ رہا ہوں۔''

"کچھ فوٹو گرافس تھے میرے بریف کیس میں۔ ہو سکتا ہے وہ دیکھ لئے ہوں۔" "کس قسم کے تھے۔؟" توفیق جرح کیئے جا رہا تھا۔

"میرے اور ایلس کے تھے۔ بیچ پر۔" نظریں جھکا کر ہولے سے بتایا۔ انداز مجرمانہ تھا۔

"تم بھی تو اپنی بدمعاشیوں آوارگیوں سے باز نہیں آتے۔"

"وہ کونسی ستی ساوتری تھی۔" اس کیلئے ہمایوں خان کا انداز کچھ تضحیک آمیز اور لہجہ کچھ طنزیہ ہو گیا تھا۔ سر دائیں بائیں پھیر رہا تھا۔ جس سے مایوسی آشکارا تھی۔

"ویسے مجھے اس سے اتنی بڑی کمینگی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔"

"اسے تم سے ہو گی۔ تبھی یہ انتہائی قدم اٹھا ڈالا۔" توفیق اس کے لیے بہت زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔ "کہیں اپنی جان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ اور اب تو دو جانیں ہیں۔"

"دونوں جانوں کی پرواہ کسے ہے۔ ختم ہو جائیں دونوں ہی' میری بلا سے۔" بہت بے دردی سے بد دعا دی۔ توفیق نے دکھ سے اسے دیکھا۔

"مجھے تو اپنے مال کا خیال آ رہا ہے۔ ہزاروں ڈالرز کا نقصان کر گئی کمینی۔ کتیا۔" غصے اور رنج کے مارے وہ اسے گالیاں دینے لگا۔ "کیسے کیسے جھوٹ بول بول کر والدین سے رقمیں منگواتا رہا ہوں۔"

"چوروں کو مور۔ موروں کو قطائیں۔" توفیق نے محاورہ بولا۔ جانے کب کا سنا ہوا ذہن میں تھا۔

"یہ بات بھی نہیں۔" بدک کر اسے گھورا۔ "میرا خیال ہے یہ انگریز اور امریکی قومیں ہیں ہی ایسی۔ مسلمانوں کی دشمن۔ اللہ نے قرآن میں کہا ہے یہ یہود و نصاریٰ کبھی بھی مسلمانوں کے دوست نہیں بن سکتے۔"

"تو یہ پہلے سوچنا تھا ناں۔ شادی کے وقت۔" توفیق نے گویا اسے آئینہ دکھایا۔ "مگر اس وقت تمہارے پیش نظر تمہاری خود غرضی تھی۔ گرین کارڈ چاہیے تمہیں۔"

"اور وہ بھی ابھی نہیں ملا۔" مایوسی سے بڑبڑایا۔



"اللہ بھی نیتیں دیکھ کر فیصلے کرتا ہے۔ تمہاری نیت آغاز سے ہی بری تھی۔"

"یار توفیق! تم میرے دوست ہو۔ میرے ہم وطن ہو۔ میرے ہم مذہب مگر ہر معاملے میں طرفداری اسی کی کیئے جا رہے ہو۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔" نے شکایت آمیز نظروں سے توفیق کو دیکھا۔ "نقصان میرا ہوا۔ بے گھر میں رات گزارنے کا ٹھکانہ میرے پاس نہ رہا۔ بینک بیلنس میرا زیرو ہو گیا۔"

"وہی تو مجھے دکھ ہے۔ پریشانی ہے۔" توفیق اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو آؤ چل کر سے کچھ پوچھ گچھ تو کریں۔ ایسا اس نے کیوں کیا۔؟" پھر اک سوچ سی دماغ لہرائی تو وہیں رک گیا۔ "ہو سکتا ہے تمہاری بے راہ روی کے خلاف اس نے بطور یہ ڈرامہ کھیلا ہو۔"

"نہیں یار! ان لوگوں کا بے راہ روی کا حساب دوسرا ہے۔ ایسی باتوں کو یہ لائیٹ لیتے ہیں۔ کچھ ایسا قابل گرفت معاملہ نہیں ہے یہ میرا اور ایلس کا۔ تم اسی پیچھے پڑ گئے ہو۔"

"پھر۔؟"

"کوئی اور بات ہو گی۔ اس سے بڑی۔ یہ دوستیاں وغیرہ لگانا' شادی شدہ کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ اور عورت کا کسی دوسرے مرد کے ساتھ اپنا شوہر ان عیسائیوں میں کوئی اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔"

"شاید تبھی ہم مسلمانوں کو یہ حکم ملا ہے کہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ میل رکھو۔ اور اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ رہو۔" توفیق نے جانے کب کی کسی بزرگ قرآن کی بات سنائی تو ہمایوں خاں چڑ سا گیا۔

"خدا کے لئے اس وقت اپنا وعظ اور نصیحتیں بند کرو۔ کسی دوسرے وقت دل رت نکال لینا۔ پلیز! اس وقت میرا دماغ مزید خراب نہ کرو۔"

"کہہ رہا ہوں نا۔ اٹھو۔ چل کر معلوم تو کریں۔" توفیق کو اس پر ترس بھی آ اس وقت اس کے ساتھ جو کچھ ہو گیا تھا وہ بھی بڑا المناک تھا۔

ایسا شاید کبھی بھی نہ کسی کے ساتھ ہوا ہو۔!!

# 44

یہ وہی اس کا اپنا گھر تھا۔ جس میں چند دن پہلے وہ اور جینی رہائش پذیر تھے۔ وہ دونوں یہاں بستے تھے' ساتھ خوشیاں بستی تھیں۔ دونوں میں بے حد محبت تھی جس کے گیت اس گھر کا ذرہ ذرہ گاتا تھا۔ وہ جینی کا فرمانبردار تھا۔ جینی اس کی تابعدار تھی۔ جینی اس گھر کی رونقوں میں اضافہ کرنے والے بچے کی ماں بننے والی تھی اور وہ اس بچے کا باپ تھا۔

تبھی جینی کی خاطر یا اس کی محبتوں اور خدمت گزاریوں کے لئے وہ بھی بہت خوش رہتا تھا۔ ہر وقت اس گھر کو آباد اور شادمان رکھنے کے دونوں مل کر پلان بنا کرتے تھے۔ مگر اس وقت توفیق کے ساتھ وہ اس گھر کے باہر ہی بیگانوں کی طرح کھڑا تھا۔ دل کی کیفیت بڑی ویران سی ہو رہی تھی۔

فرینک کی اجازت کے بغیر وہ اس اپارٹمنٹ کے کھلے دروازے کے اندر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔

یہ کیسا انقلاب تھا۔؟ یہ جینی نے کیا کیا تھا۔؟ کیوں کیا تھا۔؟

مسلسل کچھ سوالات ہمایوں خاں کے ذہن میں ہتھوڑے کی سی ضربیں لگا رہے تھے۔ مگر ان کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اک شدید تکلیف میں وہ مبتلا تھا۔

اور توفیق کسی ماہر سراغ رساں کی طرح فرینک سے مصروف گفتگو تھا۔ ''اس نے جب سب کچھ فروخت کرنے کی بات کی' تو کوئی تو اس کا جواز پیش کیا ہو گا؟''

''ہم خریدار تھے۔ ہمیں یہ اپارٹمنٹ پسند آ گیا تھا۔ پھر ہم کوئی جستجو کیوں کرتے۔ وہ اپنی پراپرٹی اپنی رضا سے سیل کر رہی تھی۔''

''مگر یہ اس کے شوہر ہمایوں خاں نے اسے گفٹ کیا تھا۔ ان کی اجازت کیا ضروری نہ تھی۔؟ اس لئے اس کے شوہر کے متعلق کچھ پوچھا تو ہوتا۔ اس کی واپسی کا انتظار تو کیا ہوتا۔؟''



توفیق کی بات پر فرینک بہت ہنسا تھا۔ ''یہ سب کچھ جینی فر کے نام تھا۔ ہمارے کاغذات میں نے خود دیکھے پرکھے تھے۔ اپنی پوری تسلی کر لی تھی۔ ان میں کوئی فراڈ نہیں تھا۔ پھر کسی نے دی ہوتی۔ یا اس نے خود خریدی ہوتی۔ ہمیں پوچھنے کا کوئی حق نہ تھا۔''

''اوہ۔ ہاں۔'' توفیق نے سر ہلا کر ہمایوں خاں کے افسردہ اور تباہ حال چہرے کی جانب دیکھا۔ ''یہ تو آپ نے درست فرمایا۔ ہر حق اس کے پاس تھا۔'' پھر دل سے اپنی زبان میں بڑبڑایا۔ ''لو۔ تم تو اپنی زندگی انجوائے کر لو۔''

ہمایوں خان نے توفیق کی بڑبڑاہٹ پوری طرح سنی۔ پھر اک درد بھری آہ کھینچ کر اپنے دھواں دھواں چہرے کو نیچے جھکا لیا۔

''سودا ہونے سے پہلے اور بعد میں کوئی ایسی تبدیلی' جو آپ کو جینی میں واضح طور پر محسوس ہوئی ہو۔'' توفیق کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ فرینک سے مخاطب ہوا۔ ''کیا آپ بتانا پسند کریں گے۔؟''

فرینک قدرے چونکا۔ پھر کتنی ہی دیر سر جھکائے کھڑا کچھ سوچتا رہا۔

''ہاں۔ میں نے اس دن یہ بات ضرور محسوس کی تھی۔ جب ہماری ڈیلنگ مکمل ہو گئی۔ ہم دونوں کے دستخط وغیرہ ہو گئے تو گھر کی چابیاں دیتے ہوئے جینی فر رو پڑی تھی۔''

''کیا مطلب۔؟ کیا وہ بلیک میل کی......''

''نہیں نہیں۔'' فرینک نے عجلت سے توفیق کی بات کاٹی۔ ''بلیک میلنگ کا کیس نہیں تھا۔ اس کے اندر کوئی دکھ تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے میرے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ تبھی میں نے اسے بڑی تسلی دی تھی۔''

''کس قسم کی تسلی۔؟''

''کہ اگر کسی مالی مجبوری کے تحت وہ سب کچھ سیل کر رہی ہے تو مجبوری ختم کرنے پر وہ اگر چاہے تو ہم اس کا اپارٹمنٹ اسی قیمت پر اسے دے دیں گے۔''

''کیوں۔؟ آپ نے اتنی بڑی آفر کیوں کر ڈالی تھی۔ ایسا کیا تھا اس کے آنسوؤں میں۔؟''

''کچھ مایوسی تھی۔ عجیب سی مایوسی۔ عجیب سا دکھ۔''
پاس کھڑا ہمایوں خان چونکا۔ ''کس قسم کی مایوسی۔؟ کیسا دکھ۔؟''
''اب مجھے اچھی طرح یاد تو نہیں رہا لیکن اس وقت مجھے اس کے ساتھ بڑا
ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ یکا یک میرا دل چاہا تھا میں اس کے لیے کچھ کروں۔ آؤٹ
آف داوے جا کر بھی۔''
''جس دن میں واشنگٹن گیا ہوں تو اس سے اگلے دن جینی کی ڈیٹ تھی۔''
ہمایوں خاں توفیق کو بتانے لگا۔
''ڈاکٹر سے ملنے کی۔ کیونکہ وہ چند دنوں سے پریگیننس کے معاملے میں کچھ
پیچیدگی محسوس کر رہی تھی۔''
''اور تم پھر بھی واشنگٹن چلے گئے اور پندرہ دن وہاں لگا دیئے۔ بلا وجہ
ہی۔؟'' توفیق اسے ڈانٹنے لگا۔ ''سیر و تفریح میں ہی۔؟ جینی کی طبیعت کی خرابی کا کچھ
احساس نہیں کیا۔؟''
ہمایوں خاں نے توفیق کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے اس کان
سے سنی' دوسرے سے اڑا دی۔ البتہ اپنی پریشانی کا جواب طلب کرنے کیلئے فرینک
سے ضرور مخاطب ہو گیا۔ ''مسٹر فرینک! کیا آپ ہمیں صرف ایک نظر گھر کے اندر
جائزہ لینے کی اجازت دیتے ہیں۔؟ گو یہ ان فیئر ہو گا۔''
''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ آپ ہی کا گھر ہے۔'' وہ بڑی مروت سے بولا۔
''اب کہاں ہمارا۔'' ہمایوں خاں نے پھر اک ٹھنڈی آہ بھری۔ دکھ اور
کرب چہرے سے بھی عیاں تھا۔ شخصیت کی وجاہتیں گہنائی ہوئی تھیں۔ ''ڈیلنگ ہو
چکی۔ ادائیگی بھی ہو گئی۔ اب تو آپ کی ملکیت ہے۔ آپ کا قبضہ ہے۔ مہربانی ہے
آپ کی جو آپ اجازت دے رہے ہیں۔''
فرینک کی اجازت اور اشارے سے توفیق کو ساتھ لئے ہمایوں خاں نے
فرینک کے پیچھے پیچھے اندر قدم بڑھائے۔
توفیق پہلے بھی کئی بار ہمایوں خاں اور جینی فر کے گھر میں آ چکا تھا۔ مگر آج اس
اپارٹمنٹ کے اندر قدم رکھتے ہی اس کا بھی دل بہت دکھا تھا۔ جینی بڑی محبت اور شوق



سے اسے خود ڈنر کیلئے مدعو کیا کرتی تھی۔ مزے مزے کی ڈشیں بنایا کرتی تھی' چھوٹے
چھوٹے شوخ شوخ فقرے اس پر اچھالا کرتی تھی۔ اچھی خاصی حس ظرافت کی مالک
تھی۔ وہ ہنستا رہتا۔ مگر آج جیسے وہ ابھی رو دے گا۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رہا تھا۔
ڈرائنگ' ڈائننگ' بیڈ رومز اور کچن وغیرہ کی ترتیب ویسی ہی تھی۔ وہی فرنیچر
تھا۔ وہی کچن کا سامان تھا۔ لاؤنج میں ایک طرف دیوار کے ساتھ پرام کھڑی تھی۔
اس آنے والے بچے کو گود میں لینے کی منتظر جیسے۔ غرض سب چیزیں ویسی کی ویسی
تھی۔ بس صرف انہیں استعمال کرنے والے انسان بدل گئے تھے۔
جینی کی جگہ مسز فرینک نے لے لی تھی اور ہمایوں خاں کی بجائے مسٹر
فرینک پورے استحقاق کے ساتھ وہاں چل پھر رہے تھے۔
وہ تینوں لاؤنج میں کھڑے تھے جب مسز فرینک کچن میں سے نکلی تھی۔
''ارے! تو یہ تم ہو'' ہمایوں خاں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ
الزبتھ جونز تھی۔ جینی فر کی بہترین دوست۔ ہمایوں لپک کر اس کے قریب چلا
گیا۔ شاید اس سے کچھ معلوم ہو جائے کہ جینی نے یہ حرکت کیوں کی تھی۔؟ ہمایوں
خاں سے ایسا کونسا جرم سرزد ہو گیا تھا کہ اس نے بدلے میں یہ انتہائی قدم اٹھا لیا تھا۔
یہ اپارٹمنٹ' یہ گھر کی ہر چیز' اس نے کس قدر شوق اور ارمانوں سے خریدی
تھی۔ اس کے کس جرم کی سزا اس نے دی تھی اسے۔ سب کچھ فروخت کر کے اور خود
روپوش ہو کر۔ ابھی تو اس نے انہیں اچھی طرح استعمال بھی نہیں کیا تھا۔ باتوں باتوں
میں فرینک سے معلوم ہوا تھا کہ آدھی سے بھی کم قیمت پہ اس نے سب کچھ ان کے
حوالے کر دیا تھا۔
''بھلا کوئی اپنے شوق اور ارمانوں کو اس طرح کسی دوسرے کے حوالے کر
سکتا ہے۔؟ یوں اونے پونے دام لے کر۔ اپنی آرزوؤں اور خوشیوں کی کوئی اس طرح
بھی نیلامی بول سکتا ہے۔ کیا ہو گیا تھا اسے۔؟'' ہمایوں نے بے حد دکھی ہوتے ہوئے
الزبتھ سے یہ سوال کر ڈالا تھا۔
''میں خود آج تک حیران پریشان ہوں۔'' الزبتھ نے آنسو بھری آنکھوں
سے ہمایوں خاں کو بے حد ہمدردی کے ساتھ تکتے ہوئے بتایا۔ ''اسے بہت سمجھاتی رہی

تھی۔ مگر وہ اپنے کئے ہوئے فیصلے کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔''

وہ چاروں اسی کو ڈسکس کرتے ہوئے' ایک ایک کمرہ دیکھتے ہوئے اس بیڈروم میں داخل ہو گئے جس کے اندر وارڈروب میں جینی نے بچے کے بے شمار ملبوسات لٹکائے ہوئے تھے۔

''کیا یہ بھی۔؟'' ہمایوں خاں نے ان کپڑوں کو دیکھ کر چونکتے ہوئے پوچھا۔''ہاں۔'' الزبتھ نے اپنی بھیگی بھیگی آنکھیں صاف کیں۔''اس لئے کہ میں بھی پریگننٹ ہوں۔ اور مجھے یہ ساری خریداری کرنا ہی تھی۔''

''بہت کم قیمت پر وہ یہ سب کچھ بھی دینے کو تیار تھی۔ ہم نہ لیتے تو کوئی اور لے لیتا۔'' فرینک نے افسردگی سے بتایا۔

''نیا تھا سب کچھ۔ میرے ساتھ ہی جا جا کر اس نے یہ سب خریدے تھے۔ کتنی محنتوں سے۔ کتنی اپنی دوسری ضروریات کو پس پشت ڈال کر۔'' الزبتھ کی آنکھیں پھر بھیگ رہی تھیں۔

ہمایوں خاں کو تو چکر سے آ رہے تھے۔ سر تھام کر وہیں اک کرسی پر بیٹھ گیا۔

بچے کے لئے تو خصوصاً وہ کچھ زیادہ ہی پرجوش تھی۔ دیوانگی کی حد تک وہ بچے کی آمد کی منتظر تھی۔ اور اس کی ضروریات کی چیزیں اکٹھا کرنے میں ایسے پاگلوں کی طرح مصروف تھی جیسے اگلے دو چار دنوں میں ہی وہ آ جانے والا تھا۔

اشفاق احمد کے قول کے مطابق مرد کا محبوب عورت ہوتی ہے اور عورت کا محبوب اس کا بچہ ہوتا ہے۔

بچہ ابھی اس کی گود میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے اسے ابھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس کیلئے اس کی محبت عروج پر تھی۔ اور محبوب کی چیزیں یوں سستے داموں اس نے کیوں فروخت کر دی تھی۔ جنہیں وہ دن میں کئی کئی بار دیکھتی تھی۔ اٹھاتی تھی۔ محسوس کرتی تھی۔ چوم چوم کر رکھتی تھی۔ کہاں گئی اس کی محبت۔؟

کیوں اس نے اپنے ساتھ' ہمایوں خاں کے ساتھ اور اپنے اس ننھے سے محبوب کے ساتھ ایسا ظلم کر ڈالا۔

جینی فر ظالم تو نہیں تھی۔ جینی فر سنگدل بھی نہیں تھی۔ وہ تو اک بڑے مہربان



اور ہمدرد دل کی مالک تھی۔

پھر۔؟ آخر یہ معمہ کیا تھا۔؟ کوئی بھی حل نہیں کر پا رہا تھا۔

اور چاروں ہی بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

## 45

''ہائے ماما! آپ اس ڈریس میں کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔''

پتہ ہی نہیں چلا مدحت کب کمرے میں آن داخل ہوئی تھی۔ اور آئینے کے سامنے کھڑی فرحت کو آئینے میں سے ہی تک رہی تھی۔ آنکھوں میں حیرت بھی تھی۔ اک عجیب سی خوشی بھی ہلکورے لے رہی تھی اور ہونٹوں پر گہرا سا تبسم بھی پھیلا ہوا تھا۔

فرحت اسے دیکھ کر' اس کا بولا ہوا جملہ سن کر تھوڑا سا گھبرائی پھر مڑ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

''نیا بنوایا ہے یہ ڈریس۔؟''

مدحت اس کے لباس کی خوبصورتی میں ہی الجھ گئی تھی۔ اس کی گھبراہٹ کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ تبھی فرحت کی گھبراہٹیں سنبھل گئیں۔

''نیا۔؟'' وہ زور سے ہنس دی۔ ''دس سال پرانا ہے۔'' آئینے میں پھر اپنے سراپا کی طرف دیکھا۔

''تو کہاں چھپا رکھا تھا اتنے عرصہ سے۔ پہلے کبھی پہنا ہی نہیں۔''

''چھپانا کیوں تھا۔؟ اس کی خوبصورتی ہی نے دل چڑھا دیا تھا۔'' فرحت نے سچی بات' دل کی بات' بیٹی سے کہہ دی۔ ''کبھی پہننے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔''

اک سایہ سا فرحت کے چہرے پر سے گزرا تھا۔ مدحت اس چھوٹی سی عمر میں ہی بہت حساس ہو چکی تھی۔ ماں کے حالات کو اچھی طرح جانتی سمجھتی تھی۔ اس کے اندر کے دکھ اور سکھ کے موسموں سے بھی پوری طرح آگاہی رکھتی تھی۔ چپ کی چپ ہی رہ گئی۔

اور فرحت کے اندر کے موسم شاید بدل رہے تھے۔ یا بدل گئے تھے۔ لمحہ بھر
بعد وہ مسکرانے لگی تھی۔

"سچ مچ اچھا لگ رہا ہے۔؟" پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ
لینے لگی "ورنہ میں نے تو ایسے ہی نکال کر پہن لیا تھا۔ آٹھ سال پرانا ہو کر بھی نیا لگے
گا یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔"

"ایسے اور بھی ملبوسات ہیں آپ کے پاس۔؟" مدحت نے تعریفی نگاہوں
سے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت سارے۔ کوڑے کی طرح بکسوں میں ڈھیر لگے ہیں۔"

"ارے! تو پھر آپ پہنتی کیوں نہیں۔ کمال کرتی ہیں آپ بھی۔" اس کے
چہرے پر خفگی سی پھیل گئی۔ "میں شرم کے مارے اپنی کسی کالج کی دوست کو گھر نہیں
بلاتی کہ آپ کا اس قدر سادہ اور پرانی سی قسم کا لباس دیکھ کر میری دوست کیا کہیں
گی۔ میری ماما کس پچھلی صدی کی......"

فرحت نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "تو پہلے اپنے خیالات کا اظہار
کرنا تھا نا۔"

ماما کو ہنستا دیکھ کر وہ قدرے حیرت میں ڈوب گئی۔ "کیا آپ میرے
خیالات کو آنر کرتیں۔؟"

"کیا مطلب۔؟"

"میرے کہنے سے یہ ایسے ایسے ملبوسات زیب تن کر لیتیں۔؟"

"ارے کر تو رکھے ہیں۔"

"ایمان سے۔؟" وہ بے یقینی سے فرحت کو گھور رہی تھی۔ تو کیا ماما کے اندر
چپکے سے بہار رت نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ اتنی ساری زندگی جو دکھوں کی خزائیں
ساتھ رہی تھیں، اب انہوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

"تو سچ مچ اب یہ پہنے رہیں گی۔؟"

"پہننے کے لئے ہی پہنے ہیں۔" فرحت ہنسے جا رہی تھی۔

"دیکھو تو لوگو! میری اپنی ہی حقیقی اولاد مجھ پر یقین نہیں رکھتی۔"



اس نے کبھی ماں کو اس انداز میں خوش اور اس طرح مطمئن نہیں دیکھا تھا۔
ہی مشکوک لہجے میں بولی۔ "آپ نے ضرور کہیں جانا ہو گا۔"

"نہیں جانوں! دھوپ دکھانے کیلئے نکالے تھے۔ پھر خیال آیا ایسے جو
ے پرانے ہو رہے ہیں۔ اللہ میاں بھی ناراض ہوں گے کہ کفران نعمت کر رہی
ہوں۔ چلو اپنے اللہ کو ہی راضی کر لوں۔ تب پہن لئے۔"

"اتنے سالوں بعد کفران نعمت اور اللہ کی ناراضگی کا خیال آیا۔" مدحت نے
ل ہی دل میں سوچا۔ پر زبان پر نہ لائی۔ ویسے وہ اچھی بہت لگ رہی تھیں۔

"بہت اچھا کیا جو پہن لئے۔ ایک دم ہی فرسٹ کلاس ہیں۔" تعریف کئے
ارہ نہ سکی۔ "رنگ بھی۔ پرنٹ بھی۔ سلائی بھی۔ کیسی اچھی ہے یہ آپ کے متناسب
م پر ان کی فٹنگ بہت مناسب اور خوبصورت لگ رہی ہے، ان کے مقابلے میں جو
پ اکثر پہنے رہا کرتی ہیں وہ تو بس۔ ایک دم ردی مال۔"

"اگر میری بیٹی کو پسند آئے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ آئندہ سے ایسا ہی
اس پہنا کروں گی۔"

فرحت بڑی خوشی سے اس کی بات مان گئی تھی۔ ورنہ پہلے تو ماما کے چہرے
اکثر ملال رنگ ہی بکھرے رہتے تھے۔ زرد زرد سے۔ دھواں دھواں سے۔ بھینچے
ئے ہونٹ۔ اداس آنکھیں۔ ہر سوچ منفی۔ ہر خیال کے ساتھ اک دکھ بھری آہ۔!

"ماما! زندہ باد۔" وہ بے اختیار ماں کے گلابی مسکراہٹوں والے چہرے پر
ے قربان ہو گئی۔

"میری مدحو بھی زندہ باد۔" فرحت نے اسے دونوں بازوؤں میں بھر کر اس
ا چہرے کے کئی پیار لے لئے۔

مگر۔ ماما میں یہ تبدیلی کیوں ہوئی۔ اس کا کارن کیا تھا؟ ساتھ ہی سوچ کا
ارا چند دن پیچھے چلا گیا۔ کچھ دنوں سے وہ خوش بھی تو بہت رہنے لگی تھیں۔ من
ئی ہوا تھا تو تن کو بھی سجانے کا خیال آ گیا تھا۔

کھانے کا مینیو بھی گھر میں اچھا اچھا بننے لگا تھا۔ ہر کسی کے پسند کی چیز میز
ہوتی تھی۔ جب کرنل صاحب، عابی اور وہ سب اکٹھے ہوتے تو ماما بہت بے تکلفی

سے گفتگو میں حصہ لیتی تھیں۔ ایسے ایسے مزیدار اور شائستہ الفاظ وہ استعمال کرتیں' لیئے ہنسی والے اور ادبی قسم کے جملے بولنے لگی تھیں کہ مدحت اکثر چونک کر انہیں دیکھنے لگتی۔

یکا یک بہت سارے واقعات مدحت کی آنکھوں میں گھوم گئے تو

کیا عابی۔؟ عابی! یہ کرو۔ عابی! وہ کرو۔ عابی! مدحت کی شاپنگ۔ عابی! آج تو آئس کریم کھانے کا موڈ ہے۔

پہلے ماما نے کبھی کوئی فرمائش نہ کی تھی۔ کبھی کوئی چیز کھانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کبھی کسی ضرورت کی چیز کی آرزو نہیں کی تھی۔ اور اب۔ یا اللہ! یہ تیرے کرم کی نوازشیں۔

مدحت خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔

چاچو بھی ماما کا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ چلیں آپ کو سیر کرالائیں۔ اک لمبی ڈرائیو۔ آج میں پکوڑے بناتا ہوں۔ میرے کرنل کو بھوک لگی تھی۔ اس بہانے ذرا ہمارا بھی کمال دیکھیں۔ سموسے بنانا بھی آتے ہیں مجھے۔ آلو ہیں گھر میں۔؟ چلو بچے! ماما کو بلاؤ۔ کیوں کرنل صاحب! فالودہ چلے گا۔؟

چلے گا کیا۔؟ فوراً جواب ملتا۔ دوڑے گا۔ پھسل پھسل پڑے گا۔

کرنل صاحب کی بجائے ماما جب بولی اٹھتیں تو عابی کی آنکھوں میں روشنیاں سی بھر جاتیں۔

''آدھی زندگی میری خراب کر دی دونوں نے۔'' اک دن مدحت نے شکوہ کر دیا۔

''کیوں۔؟ کیا ہوا۔؟''

''ہمیشہ سے اسی طرح صلح سے رہتے آپ دونوں' تو میں بیسیوں بار فالودے کی لذتوں سے محظوظ ہو چکی ہوتی۔''

وہ دونوں ہی ہنس دیئے۔ اکٹھے ہی۔ جواب شکوہ کسی طرف سے بھی نہیں آیا۔ ایسی انڈراسٹینڈنگ دونوں میں ہو گئی تھی۔

یاد آ رہا تھا سب کچھ۔ بہت کچھ۔

''آج صبح عابی جلد آنے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔''

مدحو کی سماعتوں سے یہ جملہ ٹکرایا تو اس نے چونک کر ماما کو دیکھا۔ تو۔ اگا



لئے ماما نے یہ لباس پہنا تھا۔ اچھے والا۔ خوبصورت والا۔ جانتی تھیں بہت سجے گا۔ پیاری لگیں گی اس میں۔

''کیوں۔؟ کوئی خاص بات تھی آج۔؟'' مدحت نے مسکرا کر پوچھا۔

''اک ضروری شاپنگ تھی۔'' وہ ابھی تک آئینے کے سامنے ہی تھیں۔

''بس آپ دونوں نے جانا تھا۔؟''

''جانا تو ہمیں نے تھا۔ لیکن دوسرے لوگوں کو بھی مناعی نہیں ہے۔ تم بھی چلو۔ اور۔''

بات کرتے کرتے اچانک فرحت چونک کر مدحت کی سمت مڑی۔

''کل بھی کرنل صاحب نہیں آئے۔ آج بھی ابھی تک غائب ہیں۔''

''گاؤں سے کوئی مہمان آ گئے ہوں گے۔'' مدحت قدرے لاپرواہی سے بولی۔ ''معلوم کرنا چاہیے تھا۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔'' ماما کیسی سوشل تھیں۔ ہر کسی کا خیال رکھا کرتی ہیں۔ دل کے اندر اک خوشگوار سا احساس جاگا۔ ابھی کچھ عرصہ سے ہی ایسا ہوا ہے۔ ورنہ حالات نے میری ماما کو ساری قدریں اور خوش اخلاقی بھلا دی ہوئی تھی۔ شکر ہے۔ وہ زندگی کو صحیح طرح برتنے لگی ہیں۔

''پھر میں جا کر پتہ کر آؤں۔؟''

''چلو میں بھی چلتی ہوں۔''

اور مدحت کو ماما کی یہ پیشکش بڑی اچھی لگی۔ اب وہ ہر کسی میں پوری طرح دلچسپی بھی لیتی نظر آنے لگی تھیں۔ ورنہ وہ پہلے روز کتنی مشکل سے کرنل عمیر آفندی کے گھر جانے کو راضی ہوئی تھیں۔ راضی بھی کیا بلکہ کھینچ گھسیٹ کر ہی مدحت اسے بزدستی ساتھ لے گئی تھی۔

''چلیں پھر جلدی سے ہو آئیں۔ عابی نے بھی آنا ہے اور مجھے بھی ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔''

''چلو۔'' فرحت نے لمحہ بھر کیلئے رک کر آئینے میں خود کو اچھی طرح دیکھا۔

''ٹھیک لگ رہی ہوں نا۔''

"بالکل۔ بالکل۔" فرحت کا انداز دل میں اتر گیا۔ اب اپنا خیال کرنے لگی تھیں۔ "کاش! یہ موسم سدا کیلئے ٹھہر جائے۔" اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

کرنل عمیر آفندی کے گھر میں بڑی خاموشی تھی۔ دو تین بار بیل کی۔ اس کا بھی جواب نہیں ملا۔

"کہیں انکل سو تو نہیں رہے۔" مدحت نے ماں سے کھسر پھسر کی۔

"یہ وقت تو نہیں ہے سونے کا۔ اکثر ہمارے گھر میں ہی براجمان ہوتے ہیں اس وقت۔"

بیل کا جب کوئی جواب نہیں ملا تو مدحت نے بڑھ کر ذیلی دروازے کو دھکیلا۔ "ارے۔!" وہ آغوش مادر کی طرح کھلتا چلا گیا۔

دونوں حیران حیران ادھر ادھر دیکھتیں اندر داخل ہو گئیں۔ اندر بھی ہر سمت خاموشی ہی خاموشی تھی۔

زینہ چڑھ کر لاؤنج کے دروازے کو دھکیلا تو وہ بھی وا ہو گیا۔

"ماما! کہیں کھل جا سم سم والے دروازے تو نہیں فٹ کر چھوڑے انکل نے۔" مدحت نے شرارت سے سرگوشی کی۔

جس کا جواب اسی شرارتی انداز میں فرحت نے دیا۔ "تم نے بولا کھل جا سم سم؟ میں نے تو نہیں بولا تھا۔"

مدحت ماں کی ظرافت طبع پر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"چپ چپ۔" فرحت نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "کہیں چالیس کے چالیس چور ہی حملہ آور نہ ہو جائیں۔"

"مٹکوں کے منہ کھلے ہوں گے تو حملہ آور ہوں گے نا۔"

"علی بابا کو نیند نہ آ گئی ہو۔"

"یہ وقت سونے کا نہیں۔"

اسی طرح ہنستی ہوئی شوخی سے سرگوشیاں کرتی ہوئی دونوں ماں بیٹی لاؤنج کے اندر داخل ہو گئیں۔

سارا لاؤنج نظروں کے سامنے تھا۔ مگر کرنل کہیں بھی نہیں تھے۔ حتیٰ کہ ا



ہوں صوفے پر بھی نہیں تھے۔

"انکل۔" مدحت نے دبے دبے سے لہجے میں پکارا بھی، مگر جواب میں پھر شی ہی ملی۔ "کہیں نماز تو قائم کر کے نہیں بیٹھے ہوئے۔" اپنے خیال کا اظہار تے ہوئے مدحت ان کے بیڈروم میں گھس گئی۔ فرحت پیچھے پیچھے تھی۔

"ارے! انکل تو خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔" مدحت واپس نکلنے کیلئے پلٹی۔ کیونکہ وہ کمبل اوڑھے پڑے ہوئے تھے۔

فرحت نے اسے روکتے ہوئے متردد لہجے میں ہولے سے کہا۔ "یہ ان کا نے کا وقت نہیں ہے۔ معلوم تو کرو وہ یوں بے وقت کی نیند میں کیوں دھت پڑے ں سارا گھر کھلا چھوڑ کر۔ وہ ایسی بے پرواہ طبیعت کے مالک تو نہیں ہیں۔"

"ارے ہاں۔" ماں کی بات بہت مناسب لگی۔ جلدی سے آگے بڑھ کر ان بیڈ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"انکل! آپ اس وقت کیوں سو رہے ہیں۔؟ کل بھی آپ ادھر ہماری ف نہیں آئے۔ خیر تو ہے نا۔" اب مدحت خاصی بلند آواز میں بولی تھی۔

کرنل پرلی طرف رخ موڑ لیٹے تھے۔ اک دلدوز سی آہ کے ساتھ کمبل تے ہوئے منہ پھیرا۔ "آپ۔ آپ۔؟"

مدحت کے پیچھے فرحت کو دیکھ کر وہ ایک دم ہی اٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ لی آہ اور ہلکی سی ہائے نے مدحت کو چوکنا کر دیا تھا۔ ضرور کوئی پریشانی تھی۔ جلدی جھک کر ان کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے ماما! انکل کو تو بخار ہے۔ بہت تیز بخار۔ آپ لیٹے رہیے انکل"

دحت کی چیخ و پکار سن کر فرحت بھی جلدی سے قریب آ گئی۔ گھبراہٹ میں ھی کچھ اور نہیں سوجھا۔ جلدی سے ان کی پیشانی اور گال چھو کر دیکھنے لگی۔

"کب سے ہے آپ کو بخار۔؟"

"کل سے۔" کرنل نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی مگر اب کی بار فرحت نے کے کندھے تھام کر واپس لٹا دیا۔

"کوئی دوا وغیرہ لی۔؟"

"خادم ابھی تک آیا ہی نہیں۔" بڑی معصومیت بھری مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "خادم آیا نہیں مر گیا تھا کہیں۔ تو کیا ہم لوگ بھی سب کے سب مر گئے تھے۔"

ان کی تکلیف اور اکیلا پن دیکھ کر فرحت تو بوکھلا اٹھی تھی۔ پریشانی کے مارے زبان پر جو کچھ آیا پوری بے تکلفی سے بول دیا۔

"اللہ نہ کرے۔"

"ہمیں کیوں نہیں اطلاع کی۔؟" فرحت کا انداز ڈانٹنے والا تھا۔ جیسے وہ یہ حق رکھتی تھی۔ "پر ہم تو دشمن تھے۔" وہ دشمن، جنہیں پل پل بعد مرنے مارنے کی بددعا دیتے ہیں۔ مریں ہمارے دشمن۔"

"توبہ توبہ۔ استغفار۔ فرحت بی بی! تم سب کو خدا سلامت رکھے۔ تم ہمارے کیوں دشمن ہونے لگے۔ تم ہو گئے تو سارا زمانہ ہو گیا۔ ایسے نہ بولو۔ میں تو آپ سب سجنوں کی سلامتی کی دعائیں ہر وقت مانگتا رہتا ہوں۔"

"پر کس کام کی وہ دعائیں جو قبول ہی نہ ہوں اور کس کام کے وہ سجن جو وقت پر کام ہی نہ آئیں۔" بے اختیار اپنی دعاؤں اور کرنل کے سجنوں کو فرحت نے کوس ڈالا۔ ان کی حالت دیکھ کر خود بے حال سی ہو گئی تھی۔

"کام آ تو گئے ہیں سجن۔" مدحت پر اک بھرپور نظر ڈالی۔ پھر فرحت کے دھواں دھواں چہرے کو تکا۔ "اور ابھی آپ کی دعائیں بھی کام دکھا دیں گی۔ دیکھ لینا۔"

ان کی ہائے ہائے تو ابھی سے ختم ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اک قہقہہ لگایا۔ مگر اس وقت وہ تقریباً بے آواز ہی تھا۔ پھر بولے۔ "اٹھا ہی نہیں گیا۔ کیسے اطلاع کرتا۔؟"

"فون کر دیتے۔" مدحت پاس سے بولی۔

"وہ ترپرسوں اترسوں سے خراب پڑا ہے۔"

"اوئے ہوئے خدا کی مار ان ٹیلی فونوں پر۔" مدحت کو سارے شہر کے ٹیلی فون سسٹم پر غصہ آ گیا۔ انہیں کوسنے لگی۔ "وقت بے وقت خراب ہو جاتے ہیں۔ کتنی تکلیف اٹھانا پڑی میرے انکل کو۔"

"کل بھی سوچا تھا کہ چلو پرانا نسخہ آزمائیں۔"



"پرانا نسخہ۔؟" مدحت نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔

"کمپلینٹ کرنے پر بھی فون ٹھیک نہیں ہوتا تو اپنی فوجی یونیفارم پہن کر ٹیلی فون کے دفتر چلا جاتا ہوں۔ پھر فوراً ٹھیک کر دیا جاتا ہے۔"

ان کی بات پر مدحت تو ہنس پڑی مگر فرحت کی حالت انہیں اس حال میں دیکھ کر بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ ہنس بھی نہ سکی۔

"پر کل یونیفارم والا فارمولا بھی کام نہیں آیا۔"

"وہ کیوں۔؟"

"ابھی ارادہ ہی کیا تھا۔ عملی جامہ نہیں پہنایا تھا کہ پاؤں کو چوٹ لگ گئی۔ اور شاید چوٹ ہی کی وجہ سے بخار ہو گیا۔" انہوں نے اپنی ساری تکالیف بیان کر ڈالیں۔

"بخار کے علاوہ چوٹ بھی لگائے بیٹھے ہیں محترم دکھائیں تو ذرا پاؤں۔"

...ت نے ان کے پاؤں پر سے کمبل ہٹا دیا۔ پھر اک چیخ کے ساتھ فرحت کی جانب ...ا۔ "ہائے ماما! دیکھیں تو انکل کا پاؤں۔ کیسے سوج کر کپا ہو رہا ہے۔"

فرحت کو بھی دکھ کا اک جھٹکا سا لگا۔ "دیکھوں۔؟ ارے۔! اف میرے ..." اور اسے تو ایک دم کرنل صاحب پر ہی غصہ آ گیا۔ "یہ آپ نے کیا کیا۔؟ اتنی ...ف میں پڑے رہے۔ اکیلے۔ اور ہمیں بتایا تک نہیں۔ اپنا سمجھا ہی نہیں۔ فون اگر ...ب تھا تو دوسرا کوئی تو طریقہ ہو سکتا تھا ہمیں بتانے کا۔"

فرحت نے مدحت کا بازو پکڑ لیا۔ "چھوڑو۔ آؤ ہم چلیں۔ ہم ان کے کیا ہیں بھلا۔"

"ارے ارے۔!" کرنل نے ہنس کر بے اختیار فرحت کو ہاتھ تھام لیا۔ "اتنی ...ں مانگ کر ٹیلی پیتھی کے ذریعے آپ لوگوں کو بلوایا ہے۔ اس سے بڑی اپنائیت کیا ہو ...بخیریت اب آپ برتنے لگی ہیں۔ مگر اب میں بھلا آپ کو جانے دوں گا۔" پھر آہستہ ...تھ چھوڑ کر بولے۔ "کوئی دوا دارو کرو نا میرا۔ کوئی چائے وغیرہ پلواؤ۔ کوئی گولیاں کھلاؤ۔ ...ے تو کل کا کھایا بھی کچھ نہیں۔ بس دو بار اس سامنے دھری سٹک کے ساتھ ایک پاؤں ...اچھل کر واش روم تک گیا ہوں۔ کچن تک جا ہی نہیں سکتا تھا۔ بیلیو می۔"

"ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔" مدحو تو مزید کچھ سنے بغیر کچن کی طرف

بھاگ گئی۔ فرحت ان کی تکلیف سے دکھی ہو ہو کر ان کے بے تحاشا سوجے ہوئے
پاؤں کو سہلانے لگی۔

''گھر میں کوئی آیوڈیکس وغیرہ ہے۔ میں اس کی مالش کر دوں۔ شاید تکلیف
میں کچھ افاقہ ہو جائے۔''

ان کی تکلیف اور بے بسی پر فرحت کی آنکھیں نمناک ہو رہی تھیں۔ جتنی
دیر میں مدحت نے چائے بنائی' فرحت نے گرم پانی سے ان کے پاؤں کو ٹکور کر کے
آیوڈیکس کی مالش کر دی۔

کرنل آفندی نہ نہ ہی کرتے رہے۔ ''پلیز فرحت بی بی! آپ میرے
پاؤں کو ہاتھ نہ لگائیں۔ آپ تو میرے لئے بہت محترم ہیں۔ کہاں تو میں آپ کو
آنکھوں پر بٹھانے کا سوچوں اور کہاں آپ میرا پاؤں چھوئیں۔ ارے مجھے اس طرح
گناہگار نہ کریں۔ پلیز فرحت بی بی۔''

وہ دہائیاں دیتے رہے۔ فرحت نے اک نہ سنی۔ مسکراتے ہوئے اپنے کا
میں لگی رہی۔

''اور میں بے شک گناہگار ہو جاؤں۔ مریض کا مرض دور کرنے کی کوشش
نہیں کروں گی تو گناہگار ہی ہوں گی نا۔ بس چپ کر کے لیٹے رہیں۔''

''لیجئے جناب! گرما گرما چائے۔ ساتھ یہ مزیدار سے سینڈوچ۔'' مدحت
ہانکیں لگاتی ہوئی ٹرے اٹھا لائی۔

''ہائے مجھے پتہ ہوتا کہ میرا دوست اس حال میں پڑا ہے تو میں آج کالج
ہی نہیں جاتی۔ سارا دن آپ کے پاس گزارتی۔ کیسے میرے انکل بھوکے پیاسے
پڑے رہے۔ غصہ آ رہا ہے مجھے آپ پر۔''

''تم سے زیادہ مجھے آنا چاہیے۔ میرے لئے شرم کا مقام ہے۔'' دونوں ماں
بیٹی بے شمار محبتوں کا اظہار کر رہی تھیں۔ ''کل شام کی چائے کے وقت آپ نہیں تھے
میں آپ کا سوچتی بھی رہی تھی۔ پھر جب آپ کی غیر موجودگی کا سوچا تھا تو مجھے چاہیے
تھا کہ کسی کو بھیج کر آپ کا پتہ کرا لیتی۔ مجھی سے کوتاہی ہو گئی۔ سارا قصور میرا ہے۔''
اور کرنل عمیر آفندی ان کی محبت بھری گفتگو سن کر نہال ہو رہے تھے



''آپ انکل اکیلے نہ رہا کریں۔'' کل تک کیسے سرخ و سپید چہرے
مالک تھے۔ آج کس قدر زرد زرد ہو رہے تھے۔ بڑا ترس آ رہا تھا مدحت کو ان پر
گزرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ بس پچھتاوے زبان پر اُمڈے آ رہے تھے۔
وہ بھی تو ان سب کو بہت پیار کرتے تھے۔ بہت قرض تھے ان کے ان پر۔
اپنے ہاتھوں سے انہیں دو سینڈوچ کھلا کر مدحت انہیں چائے پلانے لگی۔

''ماما! ساتھ انہیں گولی کونسی دوں۔ بخار کافی ہے۔ کیوں انکل! آپ ہی
بتائیں۔ اپنی طبیعت کے مطابق۔''

''میرا تو خیال ہے اس وقت گھر میں کوئی بھی موجود نہیں ہو گی۔''

''مدحو! تم ایسے کرو۔ یہ چائے کا مگ مجھے پکڑاؤ۔ میں کرنل صاحب کو پلاتی
ہوں۔ تم گھر جاؤ۔ عابی آ گیا ہو گا۔ اسے فوراً ادھر لے کر آؤ۔''

''کیوں ماما؟ عابی کو ادھر کیوں بلا رہی ہیں۔؟''

''کرنل صاحب کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔ چوٹ بھی لگی ہے۔
ار بھی ہے۔ کوئی دوائی تو ضرور دینا ہو گی۔ ڈاکٹر سے مشورہ کر لینا چاہیے۔ کہیں ہڈی
ا فریکچر وغیرہ نہ ہو۔''

''مگر مسز رحمان! میں کیسے جا سکوں گا۔؟''

''عابی لے کر جائے گا آپ کو۔'' فرحت نے کچھ ایسے استحقاق سے کہا کہ
ت نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ ''ماشاء اللہ جوان جہان ہے۔ لے جائے
'' فرحت بے تکلفی سے کہتی چلی گئی۔ ''یا پھر کسی ڈاکٹر کو گھر بلا لائے گا۔ چھوٹے
کی طرح کرنل صاحب اس سے محبت کرتے ہیں۔ شہزادہ کہتے ہیں اسے۔ کیا وہ
کے لئے......''

''ہاں ماما! عابی سب کچھ کر لیں گے۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے۔'' مدحت کے
پر اک خوشگوار سا تاثر پھیل رہا تھا۔ ''یہ لیں۔ چائے کا مگ پکڑیں۔ اور میں جا کر
بلا لاتی ہوں۔'' ماں کو مگ پکڑانے کے بعد مدحت نے پھر جھک کر کرنل صاحب
انی چھوئی۔ ''جلدی سے ٹھیک ہو جائیں انکل! ہماری ماما کا تو آج شاپنگ کے
نے کا پروگرام تھا۔'' اس کا خیال ابھی تک عابی اور ماں کی طرف ہی تھا۔

"تبھی اتنا خوبصورت ڈریس پہنا ہوا ہے اور اتنی چارمنگ لیڈی بنی ہوئی ہیں۔"
مدحت کی بات سنتے ہی کرنل نے نظر بھر کر فرحت کو دیکھا تو اک شوخی بھری شرارت سے بولے۔ گو اس وقت شرارت کے موڈ میں تھے لیکن تعریفی الفاظ صرف زبان پر ہی نہیں تھے بلکہ آنکھوں سے بھی ادا ہو رہے تھے۔

"وہ۔ وہ۔" فرحت شرما کر ہکلانے لگی۔ "یہ پرانے نکال کر پہن لئے تھے۔" اور کچھ نہ سوجھا تو اس لباس کا جواز پیش کرنے لگی۔

"پھر آپ کا وجود ہی ایسا ہے کہ پرانی چیز کو نیا بنا دے۔ پارس پتھر جیسا۔ آپ کو دیکھتے رہنے سے لگتا ہے میرا بخار بھی کم ہو رہا ہے۔"

"میری ماما ایسی ہی ہیں انکل۔! مجھے بھی کبھی سر درد یا بخار وغیرہ ہو تو بس ماما ذرا سا مجھے گود میں بھر کر میرا سر ہلا دیتی ہیں تو میں ٹھیک ہو جاتی ہوں۔"

مدحت اپنی ماما کی کرامات بتاتے ہوئے کرنل کے سرہانے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "او۔ یس۔ میرے عابی آ چکے ہوں گے۔ بس ابھی انہیں لے کر آتی ہوں۔ آپ اتنے میں جلدی سے چائے سے فارغ ہو جائیں۔" چٹکی بجاتے ہوئے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

"ماشاء اللہ بہت نیک بچی ہے۔" اسے جاتے دیکھتے ہوئے کرنل بڑبڑائے۔ "یہ چائے۔" فرحت نے ان کی توجہ چائے کی طرف مبذول کرائی۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔ آپ کا شاپنگ کا پروگرام بیچ میں ہی رہ گیا۔"

"بیچ میں کیوں رہ گیا۔ کل کا بنا لیں گے۔ آپ کو بھی تو ساتھ لے کر جانا تھا۔" پھر فرحت بڑے پیارے انداز میں مسکرائی۔ "یہ پروگرام عابی نے اور میں نے آپ ہی کی خاطر تو بنایا تھا۔"

"میری خاطر۔؟"

"جی حضور۔ پرسوں آپ کی سالگرہ ہے نا۔ اس بار ہم نے سوچا ہے آپ کی سالگرہ خوب دھوم دھام سے۔"

"کیا۔ کیا۔" کرنل آفندی کے چہرے پر بے شمار سرخیاں پھیل اٹھیں۔

"اکیلے رہتے رہتے آپ کتنا بور ہو گئے ہوں گے۔ عابی کو اور مجھے آپ کی تنہائیوں کا



بہت احساس ہے۔"

"میری تنہائی کا آپ کو بہت احساس ہے۔؟" یکا یک ہی کرنل فرحت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگے۔

"ہاں ہے نا۔ تبھی تو کہہ رہی ہوں۔" فرحت ان کے انداز کو سمجھ نہ سکی۔ اسی سادگی سے بولے گئی۔ "بہت ہے۔"

"تو پھر صحیح طریقہ سے میری تنہائیوں کو دور کرو فرحت بی بی۔ یہ سالگرہ ہیں وغیرہ دھوم دھام سے منانے سے تنہائیاں مٹ نہیں جائیں گی۔"

"وہ صحیح طریقہ پھر آپ بتا دیں۔ بخدا ہم آپ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔"

"سوچ لیں۔؟" بڑی عجیب سی مسکراہٹ کرنل کے چہرے پر بکھر اٹھی تھی۔ فرحت نے کچھ چونک کر انہیں دیکھا۔

"سوچ کر ہی کہا ہے۔ آپ ہمیں بہت عزیز ہیں۔ ہم آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

وہ بہت بیمار تھے۔ فرحت نے ان کی بیماری کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ان کا جتنا دل رکھ سکتی تھی، رکھا۔ ویسے بھی بڑی حد تک یہ حقیقت تھی۔ کرنل اپنی پیاری پیاری عادات کی وجہ سے ان سب کو بڑے محبوب تھے۔ اور فرحت کو شاید سب سے زیادہ۔ کہ اس کا ان کے ساتھ اک طویل مدت تک رابطہ اور تعلق رہا تھا۔ وہ اک بے حد نفیس انسان تھے۔

"تو پھر ایسا کریں۔ شہزادے کی شادی کر کے اس کی دلہن گھر میں لے آئیں۔ اور آپ اس گھر میں شفٹ ہو جائیں، ہمیشہ کے لئے۔ میرے گھر میں۔ میری تنہائیاں دور ہو جائیں گی۔"

"کیا۔؟" فرحت اک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی تھی۔

"میں نے وہی کہا ہے جو آپ نے سنا ہے۔ اور میرا مطلب بھی وہی ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔"

"مگر۔ میں۔ میں۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔ کرنل کی

نظریں اک والہانہ سے انداز میں فرحت کے چہرے پر گڑی تھیں۔ وہ چند لمحوں سے زیادہ ان کی تپش برداشت نہ کر سکی۔ ان کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ کرنل عمیری آفندی بہت ہینڈسم تھے۔ بہت اسمارٹ تھے۔ بہت دیانتدار اور سچے کھرے انسان تھے۔ بہت خوش اخلاق اور خوش اطوار تھے۔ ان میں کوئی خامی نہ تھی۔ وہ ہر اچھی سے اچھی اور اس سے کم عمر والی خاتون کے آئیڈیل بن سکتے تھے مگر انہیں فرحت سے ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ خصوصاً فرحت سے۔

فرحت نے انہیں کوئی تیکھا تلخ جواب دینا چاہا۔ کہ انہوں نے ایسی جرأت کی ہی کیوں تھی۔؟ کیا حق رکھتے تھے وہ ایسی بات کرنے کا؟ لیکن۔ یہ کیا۔؟ اک لفظ بھی تو اس کی زبان سے نہ نکل سکا۔ کرنل عمیر آفندی کی کہی ہوئی یہ بات اسے بری لگی ہی نہ تھی۔ وہ اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ ہمیشہ۔ اور اب بھی لگ رہے تھے۔ فرحت کو ابھی ابھی احساس ہوا تھا۔

بہت دنوں سے وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے اندر کے موسم بدل رہے تھے اس کا اچھے اچھے اور خوبصورت کپڑے پہننے کو دل چاہنے لگا تھا۔ شاید تبھی اس نے یہ لباس پہنا تھا۔

گو کئی سال پرانا تھا مگر خوبصورت بہت تھا اور اس کے جسم پر خوب جچ رہا تھا وہ کتنی کتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہنے لگی تھی آج کل۔

''آپ مدحت کی ماں نہیں۔ بہن لگتی ہیں۔''

اس دن کرنل عمیر آفندی نے فرحت کی تعریف میں یہ جملہ بولا تھا۔ کئی ملنے والوں نے پہلے بھی بولا تھا۔ مگر کرنل کی زبان سے جب یہ نکلا تو اس کے معنی ہی بدل گئے تھے۔ ہر وقت اس کے کانوں میں گونجتا رہتا تھا۔

''آپ خوشبو استعمال کرتی ہیں۔؟'' ایک دن شاپنگ کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

''ہمارے قبیلے کا رواج ہے کہ بیوہ عورتیں خوشبو کا استعمال نہیں کرتیں۔'' دزدیدہ نگاہوں سے عابی کی طرف تکتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

''ربش۔ فضول۔'' کرنل عمیر کو یکدم غصہ آ گیا تھا۔ ''آپ جیسی پڑھی لکھی



ان سے مجھے اس فرسودہ رسم کے جواب کی توقع نہیں تھی۔''

''تو کرنل صاحب! میں نے یہ جواب اپنے دل سے تو نہیں گھڑا۔ پوچھ لیں ا سے۔''

''میں یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ نے کچھ غلط کہا ہے اس لئے تصدیق عابی سے وں۔'' وہ کچھ چڑ کر بولے تھے۔ ''بہرحال میں اس فرسودہ رسم کے خلاف احتجاج تا ہوں۔''

''وہ کیسے۔؟'' فرحت ہنس دی تھی۔ ''آپ کو پرفیوم کا تحفہ دے کر۔''

''نہیں نہیں۔''

''شہزادے۔ اس خاتون کے چالے تم نے دیکھے ہیں۔ ہر بات میں نہیں نہیں۔'' عابی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور وہ فوراً ان کے ساتھ شامل بھی ہو جاتا تھا۔

''کرنل صاحب ٹھیک تو کہہ رہے ہیں۔ رسموں کو توڑنا بھی اک عبادت ہے۔''

''چلو سب آج سے عہد کریں۔ ہم ان عبادات کو جاری رکھیں گے۔ لوگوں ے زمانے سے ڈریں گے نہیں۔''

اور کرنل عمیر آفندی نے اک بے حد خوبصورت اور خاصی مہنگی پرفیوم وہیں رید کر وہیں اسے گفٹ بھی کر دی تھی

وہ لینے سے انکار نہیں کر سکی تھی۔ ''لیکن کرنل صاحب......'' کوشش ضرور رنے لگی تھی مگر درمیان میں عابی آن ٹپکا تھا۔

''اتنی محبت اور خلوص سے دے رہے ہیں۔ لے لیں نا۔'' اس نے بھی مرار کیا۔

''بغیر وجہ' بغیر کسی تقریب کے۔؟'' اس کا سوال تھا۔

''یہ تحفے تحائف دینا لینا دل کا معاملہ ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے کسی وجہ یا قریب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس اندر کوئی جذبہ موجود ہونا چاہیے۔''

عابی نے ان کی حمایت میں لمبی لمبی تقریر کر ڈالی تھی۔ پھر اسے وہ پرفیوم لینا ی تھی۔ گھر آ کر اس نے بہت سنبھال کر اسے اپنی الماری میں رکھ لیا تھا۔ اور آج یہ بصورت لباس پہنا تو تھوڑی سی استعمال بھی کی تھی۔ گویا۔ اس گفٹ کی تقریب یا وجہ

بن گئی تھی۔اور۔کرنل عمیر آفندی کی عبادت شروع ہو گئی تھی۔کیا خدا نے قبول بھی کر لی تھی۔؟ سوچوں میں کھوئی کھوئی فرحت نے واپس اپنے گھر جانے کے لئے قدم اٹھائے۔

''میں ایسا سوال نہیں ہوں کہ اپنے سوال سے باز آ جاؤں۔ میں بہت ضرورت مند ہوں فرحت۔ بہت اکیلا ہوں۔ میرے سوال کو رد نہ کرنا۔ اس میں دل کے سارے جذبے بھی شامل ہیں۔'' جاتی جاتی کی سماعتوں سے کرنل کی آواز ٹکرائی۔

## 46

''ڈاکٹر ابصار فاروقی۔''

الزبتھ نے جس ڈاکٹر کے متعلق بتایا تھا اس کے نام کی تختی کو پڑھتے ہوئے ہمایوں خان اور توفیق اکٹھے ہی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''آیئے تشریف رکھیے۔''

وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔بحیثیت پاکستانی کے۔ بحیثیت ہم وطن ہونے کے۔لیکن ڈاکٹر ابصار فاروقی بہت مصروف انسان تھے۔ اسلئے ملنا کم کم ہوتا تھا۔اپنے پیشے کے ساتھ مخلص ہونے کے علاوہ اپنے ملک اور فیملی کے بھی بڑے وفادار تھے۔ گو ان دنوں رہائش امریکہ میں تھی۔ لیکن پاکستان میں والدین تھے اس لئے اکثر ان سے ملنے کے لیے جاتے رہتے تھے۔اور اسی سلسلہ میں پچھلے سال پاکستان گئے تھے تو توفیق نے کچھ گفٹ پیک پاکستان بھجوائے تھے۔

''یہ ہمایوں خان ہیں۔'' توفیق نے ہمایوں کا تعارف کرایا تو وہ مسکرا دیئے۔

''پہلے بھی ایک دو بار ہم مل چکے ہیں۔''

''ہاں۔ وہ تحائف پاکستان بھجوانے کے سلسلے میں۔'' توفیق کی واقفیت زیادہ تھی لیکن میل ملاقات ہمیشہ کچھ کم ہی رہتی تھی۔

''کیا نام تھا اس بچی کا۔؟'' ڈاکٹر ابصار فاروقی نے جیسے اپنی یادداشت کو



فریدا۔'' ایمان آفریدی۔ ہیں نا۔؟ اسی کیلئے گفٹ بھیجے تھے۔؟''

''آپ کو اب تک یاد ہے وہ۔؟'' توفیق ان کی یادداشت پر حیران ہوا تھا۔''اس کا نام ذرا منفرد ہے نا۔ شاید اس لئے۔ ویسے وہ خود بھی منفرد سی تھی۔'' ڈاکٹر ابصار فاروقی اک واضح سے تبسم کے ساتھ گویا ہوئے۔'' وہ حسین بھی تھی اور اک غیر معمولی کشش کی مالک بھی۔ میں نے اپنی وائف کے ساتھ بھی اس کا خصوصی ذکر کیا تھا۔ پاکستان سے واپس آ کر۔''

''وہ اب ہمایوں خان کی بیوی بن چکی ہے۔'' توفیق نے بے خیالی میں تازہ ترین اطلاع دی۔ یہ ذہن میں ہی نہیں آیا کہ وہ اس وقت جس معاملے کے لیے ان سے ملنے آئے تھے' اس لحاظ سے اس وقت ایمان آفریدی کا تعلق بتانا مناسب ہی نہ تھا۔

''اچھا۔ ویری گڈ۔'' ابصار فاروقی نے خوشی کا اظہار کیا۔'' کہاں ہے وہ۔؟ آپ کے ساتھ نہیں آئی۔؟'' اک نمایاں سی دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔

''وہ تو ابھی پاکستان میں ہی ہے۔ فون پر نکاح ہوا تھا۔ رخصتی ابھی باقی ہے۔'' اسی طرح روا روی میں توفیق بات بڑھاتا چلا گیا۔

''پھر کیا شادی پر ہمیں بلائیں گے۔؟'' ہمایوں خاں سے مخاطب ہوئے۔ کیونکہ وہ بہت گم سم سا بیٹھا تھا۔

''ضرور۔ضرور۔'' اس وقت بھی جواب توفیق نے ہی دیا۔

''یار! معاملے کی بات کرو۔ یہ کیسا ذکر لے بیٹھے ہو۔'' ہمایوں خاں نے ذرا الجھتے ہوئے سرگوشی کی تو توفیق کو ہوش آیا۔

''ارے ہاں۔ وہ۔ ڈاکٹر صاحب۔'' وہ اک دم گڑبڑا کر پورے حواس کے ساتھ ان سے مخاطب ہو گیا۔

''الزبتھ فرینک کو آپ جانتے ہیں۔؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ میری وائف کی دوست ہے۔'' ڈاکٹر ابصار بے تکلفی سے مسکرائے۔''اور یہاں کی معاشرت کے حساب سے وائف کی دوست بھی اپنی ہی دوست ہوتی ہے۔ کیوں نہیں۔؟''

''بالکل۔'' توفیق اور ڈاکٹر دونوں ہنسے۔البتہ ہمایوں کے چہرے پر اک ہلکی

سی بھی مسکراہٹ کی رمق نہیں آئی۔ تب ڈاکٹر نے کچھ تحیر سے اسے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں بولے۔

''اور الزبتھ کی کوئی دوست جینی فر پچھلے دنوں آپ کے زیر علاج رہی ہے۔''

''اوہ۔ ہاں۔'' جینی فر کے ذکر سے ڈاکٹر ابصار کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات اتر آئے تھے۔ ''لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔؟''

''جینی فر ہمایوں خان کی بیوی ہے۔''

''کیا۔؟'' ڈاکٹر ابصار فاروقی بہت زور سے چونکے۔ پھر سامنے میز پر پڑے اسٹیتھو سکوپ کو اضطراری سی حالت میں چھیڑنے لگے۔ کئی لمحات اسی عالم میں گزر گئے۔ ''مگر وہ پاکستانی لڑکی۔ کیا بھلا سا نام تھا۔'' ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے اسے بھی اسی کی بیوی کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ ''ہاں۔ ایمان آفریدی۔'' حیرت اور پریشانی کے مارے سارا کچھ ہی ذہن سے نکلا جا رہا تھا۔ ''وہ خوبصورت اور پرکشش سی لڑکی۔ وہ بھی ان کی بیوی ہے۔ یہ۔ یہ کیسے ممکن ہے۔''

''دراصل جینی فر کے ساتھ اس کو گرین کارڈ کی خاطر وقتی طور پر شادی کرنا پڑی تھی۔'' توفیق نے وضاحت کی۔ پھر ساری بیک گراؤنڈ کے متعلق تفصیل سے ڈاکٹر کو بتا دیا۔ ''ہمایوں خاں واشنگٹن گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں جینی نے سارے گھر کا سامان اور اپارٹمنٹ بیچ ڈالا اور خود نجانے کہاں چلی گئی ہے۔''

توفیق ہمایوں خاں کی داستان غم سناتا رہا اور ڈاکٹر ابصار فاروقی سر جھکائے بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا۔

''الزبتھ سے ہی معلوم ہوا ہے کہ جینی فر آپ کے کلینک آتی رہی ہے۔ کیا آپ اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے۔؟ اگر آپ کو کچھ معلوم ہو تو۔''

کچھ بھی تھا ہمایوں خاں توفیق کا دوست تھا۔ اور دوست کی خاطر وہ بھی از حد پریشان تھا۔

''آپ اس کی حالت کے متعلق سوچ سکتے ہیں' کیا رہی ہوگی۔ گھر' بار' بیوی' پیسہ' ایک دم ہی تہی دامن ہو گیا۔ بالکل زیرو۔ اس کی پریشانی علیحدہ۔ جینی کی الگ۔



اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا بیت گیا اس کے ساتھ جو اس نے اتنی بڑی سزا خود کو اور ان کو دے ڈالی۔؟'' توفیق حیرتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ پریشانیوں اور تفکرات کا اظہار بھی کیے جا رہا تھا۔ ''ان دونوں میں تو بہت محبت تھی۔ پھر یہ سب کچھ کیوں ہو گیا۔ الزبتھ کو بھی کچھ معلوم نہیں۔ حالانکہ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ اس معاملے میں جینی نے اسے بھی اعتماد میں نہیں لیا۔ پلیز! آپ ہمیں کوئی راستہ دکھائیں۔''

توفیق بولتا رہا' بتاتا رہا۔ ڈاکٹر ابصار فاروقی کسی مجسمے کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ نہ ہوں' نہ ہاں' نہ تسلی' نہ دلاسہ' نہ کسی مدد کا وعدہ۔ بس اک گھمبیر خاموشی ان پر طاری تھی۔

''آپ کی خاموشی یہ بتا رہی ہے کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔'' آخر میں توفیق نے یہی مطلب اخذ کیا۔ ''مگر شاید آپ کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ یا پھر جینی فر نے آپ کو منع کیا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب! آپ یہ بھی سوچیں ہمایوں خاں پر کتنا بڑا ظلم ہوا ہے۔ اور یہ آپ کا ہم وطن ہے۔ آپ کا ہم مذہب ہے۔ خدارا......''

''بس۔ مزید کچھ مت بولئے گا۔ ظلم ان پر نہیں ہوا۔ ظلم کا شکار تو وہ بیچاری ہوگی۔ اور اگر آپ ہم مذہب اور ہم وطن کے لئے کسی رعایت یا طرفداری کی مجھ سے توقع کرتے ہیں تو اس کے معاملے میں' میں کبھی بھی نہیں کروں گا۔''

ڈاکٹر ابصار فاروقی یکایک پھٹ پڑے تھے۔ ان کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ وہ کھا جانے والی نگاہوں سے ہمایوں خان کو گھور رہے تھے۔

''چچ چچ چچ۔ آہ بیچاری دکھی عورت۔ اس کے پاس اب رہ کیا گیا ہے زندگی گزارنے کو۔ پور فیلو۔''

''کیا۔؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟'' ہمایوں خاں جھکا ہوا سر اٹھا کر حیرت و تعجب بھری نگاہوں سے ڈاکٹر کو تکنے لگا۔ ''جینی کو دکھی عورت اور مظلوم انسان قرار دے رہے ہیں۔ اسے' جو اک انتہائی پرسکون و شادمان زندگی گزار رہی تھی۔ اپارٹمنٹ بیچ کر ہزاروں لاکھوں ڈالرز کی وہ مالک بن گئی ہے۔''

''فضول' بے کار ہے سب کچھ۔ یہ ساری دولتیں اب اس کے کسی کام کی نہیں۔'' ڈاکٹر ابصار کے چہرے پر پھیلے غصے کی جگہ اب عجیب قسم کے دکھ اور کرب نے

لے لی تھی۔

''آپ کو کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے جینی کے متعلق۔ وہ تو پیدا ہونے والے بچے کے لئے بڑے پرجوش انداز میں منتظر' خوشیوں سرمستیوں سے بھرپور وقت گزار رہی تھی۔ اس کا تو اک اک لمحہ آج کل بے انداز اور بے پایاں مسرتوں' راحتوں میں ڈوبا گزر رہا تھا۔ کچھ اس طرح وہ سرمست و بے خود تھی کہ اسے کسی اور کا نہ خیال تھا' نہ پرواہ۔ پھر وہ دکھی کیسے ہو گئی۔ آپ اس کے متعلق اس لہجے اور اس ہمدردی بھرے انداز میں کیوں گفتگو کر رہے ہیں۔ ظالم کو مظلوم کیوں بنائے دے رہے ہیں۔؟''

ہمایوں خاں حیرتوں میں ڈوبا پوچھ رہا تھا۔

''ہاں۔ وہ پہلے خوش تھی بہت۔ یہ بھی جانتا ہوں۔ خود کو خوش قسمت بھی تصور کرتی تھی مگر اب اس جتنا بدقسمت انسان شاید ہی کوئی اور اس دنیا میں ہوگا۔''

''کیوں۔؟ کیا ہو گیا ایسا کہ میرے جانے کے بعد ان چند دنوں میں وہ خوش قسمتی کے آسمان سے گر کر بدقسمتی کی زمین میں دھنس گئی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ میرا تو سر چکرانے لگا ہے۔''

ہمایوں خاں نے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ وہ جو پہلے گھن گرج سے بات کر رہا تھا اب اس کا لہجہ بے حد مدھم تھا۔

''ڈاکٹر پلیز! میرے صبر کو مزید نہ آزمائیں اور مجھے بتائیں اس کے ساتھ کیا ہو گیا اچانک۔ آخر وہ میری بیوی ہے اور میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

''جب آپ گئے ہیں۔ اس کی طبیعت خراب تھی نا۔؟''

''ہاں۔ تھی تو۔ پریگنینسی میں ایسی چھوٹی موٹی پیچیدگیاں تو ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ میں نے سنا ہوا ہے۔''

''آپ نے درست سنا ہوا ہے۔ مگر وہ کوئی چھوٹی موٹی پیچیدگی نہ تھی۔ میرے کلینک میں ہی اس کے سب ٹیسٹ وغیرہ ہوئے ہیں۔''

ڈاکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے دیوار میں لگی الماری میں اک فائل نکال کر ان دونوں کے سامنے پٹخ دی۔

''یہ دیکھئے یہ کیا ہے۔ پاگل ہو گئی بیچاری۔ یہ سب کچھ نہ کرتی تو کیا کرتی۔''

ڈاکٹر ابصار فاروقی بے حد رنجیدہ تھے۔ غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بات کرتے ہوئے زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''اس نے تو منع کیا تھا' کسی کو کچھ بتانے سے۔ یہاں تک کہ آپ کو بھی۔ لیکن میں رہ نہیں سکتا۔ بڑے بڑے گل کھلائے ہیں یہاں آ کر میرے لوگوں نے بھی۔ شرم آتی ہے مجھے ایسا بیان دیتے ہوئے۔ کہ ہم مسلمان ہو کر بھی مسلمان نہیں ہوئے۔ اپنے خدا اور رسول کا کوئی حکم نہیں مانا۔ یہ فائل پڑھو ہمایوں خاں! پڑھو۔ اور دیکھو کیسا ظلم اس کے ساتھ ہو گیا۔''

ڈاکٹر ابصار فاروقی کا گلا رندھا ہوا تھا اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''جینی فر کو ایڈز ہے۔ نہ صرف اسے بلکہ ہونے والا بچہ بھی متاثر ہے۔''

پھر ڈاکٹر نے اس فائل پر کس کس کر دو تین مکے رسید کئے۔ ''اس کے ساتھ میں بھی پاگل ہو رہا ہوں۔ وہ قسمیں کھاتی ہے۔ اس کے کبھی بھی کسی کے ساتھ کوئی تعلقات نہیں رہے۔ سوائے اپنے شوہر کے۔ اور آپ ہمایوں خاں! اپنا چیک اپ کرائیں۔ اسے یقین ہے کہ آپ کی وجہ سے وہ اور اس کا بچہ ایڈز میں مبتلا ہوئے ہیں۔''

''اوہ خدایا۔ یہ کیا ہو گیا۔؟'' توفیق نے دکھ اور کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

اس خبر سے پتہ نہیں ہمایوں خاں کا کیا حال ہوا تھا۔ مگر توفیق جیسے اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ ''اوہ جینی! تمہاری ساری کی ساری خوشیاں' شادمانیاں' ارمان' امنگیں' آرزوئیں' سب کچھ خاک میں مل گیا۔ اور ہمایوں خان! تم زندگی بھر کے لیے انجوائے منٹس سمیٹتے رہو۔ پر وہ اک طویل زندگی کہاں سے لاؤ گے' جس کیلئے تم نے سب سوچا اور کیا۔'' وہ ہمدردی بھری نظروں سے صوفے کی بیک کے ساتھ چپ چاپ آنکھیں میچ کر سر ٹکائے بیٹھے ہمایوں خان کو تکے جا رہا تھا۔

''جینی فر۔ گرین کارڈ۔ ایمان آفریدی۔ فون پر نکاح۔ والدین سے رقموں کا حصول۔ اپارٹمنٹ کی خریداری۔ اپنی ذات کے لئے۔ سب اپنی خوشیوں کے لئے۔ مگر زندگی کا لمحہ لمحہ موت سے کیسے کشید کرو گے۔؟''

توفیق کے پورے کا پورا وجود جیسے اَب برف کا تودہ بن گیا تھا۔ ساکت اور منجمد۔ ہاتھ بازو ہلانے کی اس میں سکت نہ رہی تھی۔

"ہمایوں خان۔ ہمایوں خان۔"

اس نے اسے پکارنا چاہا۔ مگر زبان جیسے پتھر کا ٹکڑا تھا منہ میں دھرا دھرا۔ ہل ہی نہیں رہی تھی۔

ڈاکٹر ابصار فاروقی کا ابھی تک چہرہ نارمل نہیں ہوا تھا۔ نجانے جھک کر ہمایوں خاں کو کیا کہہ رہے تھے۔ توفیق کی سماعتیں بھی جیسے بے کار ہو گئی تھیں۔

اگلے جہاں تو پتہ نہیں کب جانا تھا اور کب زندگی کے ان حسابوں کتابوں سے گزرنا تھا۔ خدا کا عذاب تو اس دنیا میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ توفیق تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خدا کا خوف لرزے کی طرح اس پر طاری تھا۔ ہمایوں خان کیا سوچ رہا ہوگا۔ وہ خدا کے نظام عدل کی کس حد پہ کھڑا ہوگا۔ اور اس کا ذہن و دل کرب و اذیت کی کس منزل پر ہوگا۔

خدایا۔ خدایا۔ خدایا۔

## 47

فرقی خالہ کے گھر کی ہر چیز ہی کتنی خوبصورت تھی۔

ایمان آفریدی جیسے کسی حیرت کدے میں آن داخل ہوئی تھی۔ سب سے پہلا حیرت کا جھٹکا تو اسے خود فرقی خالہ کو دیکھ کر لگا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ جوان، اسمارٹ اور خوبصورت ہو گئی تھیں۔

حالانکہ نانو نے بتایا تھا کہ شوہر کے انتقال کے بعد تو وہ بالکل ہی بدل گئی تھیں۔ پتہ نہیں نانو کے اس "بدلنے" کے معنی کیا تھے۔ وہ بدصورت ہو گئی تھیں۔ وہ بدمزاج اور چڑچڑی ہو گئی تھیں۔ وہ بہت چپ چاپ اور خاموش سی رہنے لگی تھیں۔ ابنارمل انسانوں کی طرح۔ مگر ایمان کی سماعتیں اور بصارتیں تو کچھ اور دیکھ سن رہی تھیں۔

وہ انہیں کو سوچتے ہوئے باہر لان میں نکل آئی۔

اندر سے گھر جیسا خوبصورت تھا۔ ویسا ہی لان خوبصورت اور پر بہار تھا۔

نگ برنگے پھولوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی تھی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے کر اردگرد تکنے تھی۔ اسی لمحے ہارن کی آواز پر مالی نے بھاگ کر گیٹ کھولا۔

سفید گاڑی ہلکی سی رفتار کے ساتھ رن وے پر رینگتی چلی آئی۔

"ارے! عابی کی گاڑی۔؟"

وہ رکی تو ایمان آفریدی زینہ اتر کر پاس آن کھڑی ہوئی۔

کچھ گنگناتا ہوا عابی گاڑی میں سے نکلا تھا۔ بڑی خوبصورتی سے ڈریس اپ تھا۔

"اوہ تم؟ تم کہاں۔؟" ایمان کو سامنے دیکھتے ہی وہ وہیں رک گیا۔

"اور آپ۔؟" وہ مسکرائی۔ "آپ اس گھر میں کس لئے آئے ہیں۔؟"

"میں۔ میں۔؟" عابی سمجھ گیا تھا کہ فی الحال وہ اس گھر کے ساتھ اس کے لق کو نہیں جانتی تھی۔ یکا یک طے نہ کر پایا کہ اس کو کیا بتائے۔؟

"چھوٹے خالو کے دوست ہوں گے۔" عابی کے کچھ بولنے سے پہلے مسکرا رقیاس آرائی کی۔

"چھوٹے خالو۔؟" وہ حیرت زدہ سا اسے تکنے لگا۔ وہ تو اس گھر میں مقیم ی ایسے رشتے والے بندے کو نہیں جانتا تھا۔ جس کا ذکر ایمان کر رہی تھی۔

"یہ میری فرقی خالہ کا گھر ہے۔" اردگرد تکتے ہوئے ایمان نے مدھم سی زمیں اسے رازدارانہ سمجھانے کی کوشش کی۔

"اور فرقی خالہ کا ہزبنڈ میرا خالو ہی ہوا نا۔ ساتھ چھوٹا اس لئے لگاتے ہیں ان کے پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ ان کی ی شادی ہوئی تھی۔" وہ پوری تفصیل اسے بتائے جا رہی تھی۔ "انہیں چھوٹے خالو بات کر رہی ہوں۔ جن سے آپ ملنے آئے ہیں۔ ویسے میں بھی آج پہلی ہی بار ے ملوں گی۔"

عابی کو دیکھ کر جو آنکھوں میں جگمگاہٹیں اتر آئی تھیں۔ انہوں نے اسے بڑی ورتیاں بخش دی تھیں۔ اور عابی کی نگاہیں اس کے دلنشین سراپا پر جمی ہوئی تھیں۔

بہت سارے دنوں بعد اسے یوں اچھی طرح نظر بھر کر دیکھا تھا۔ انہیں دنوں کو نے لگا ہوا تھا۔ کیسے اک اک لمحہ بے قراری میں کاٹا تھا۔ گن گن کر گزارا تھا۔

''ویسے اصل انہیں کالو کہا کرتا تھا۔'' اک خوبصورت سی ہنسی اس کے گداز لبوں پر تھرک اٹھی۔

عابی تو رہے سہے ہوش بھی گنوا بیٹھا۔ پتہ نہیں وہ کیا کیا کہے جا رہی تھی۔

ایمان نے ہنستے ہنستے کچھ سوچا۔ ساتھ ہی اردگرد دیکھا۔ ''یہاں کسی کو میرے متعلق کچھ نہیں بتایئے گا کہ میں آپ کو پیشتر سے جانتی ہوں۔''

دوبارہ سے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ مالی لان کے پرلے کنارے پر کچھ کام کر رہا تھا۔ نانی اور اماں اندر فرتی خالہ کے پاس تھیں۔

''آپ چھوٹے کالو کا انتظار کریں گے یا یہیں سے واپس چلے جائیں گے۔؟'' اس نے اپنے قیاس کو خود ہی یقین کی سرحد پہ لا کھڑا کیا تھا۔ کہ عابی یقیناً فرتی خالہ کے ہزبنڈ کا دوست تھا۔ اس واسطے سے پوچھ رہی تھی۔

اندر ہی اندر دل اک مسرت سی محسوس کر رہا تھا۔ کیسے اچانک ہی عابی سے ملاقات ہو گئی تھی اور اس سے باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ بڑی مبارک وہ ساعت تھی جب وہ فرتی خالہ کا لان دیکھنے باہر نکل آئی تھی۔ بے حد تعریف سنی تھی وہاں لگے رنگا رنگ خوبصورت اور منفرد قسم کے پھولوں کی۔

پر اب وہ پھول وغیرہ دیکھنا بھی بھول گئی تھی۔ عابی سامنے تھے۔ بڑوں کی پہنائی ہوئی زنجیروں کے باوجود دل کی خواہشات اور ارمان آزاد تھے۔ دل چاہ رہا تھا۔ عابی روبرو کھڑے رہیں اور وہ ان سے باتیں کیئے جائے۔

آہ یہ محبت کس قدر ظالم جذبہ ہے۔ کسی سودوزیاں کے پھیر میں نہیں آتا۔ کسی عزت بے عزتی کے چکر میں نہیں پڑتا۔ دل کے پرجوش و گرم جوش تقاضوں کے سامنے کیسے چپکے سے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے سرخم کر دیتا ہے۔

''ویسے عابی! آپکا ذوق کچھ اچھا نہیں رہا۔ بالکل ناپسند۔ ایسے دوست بناتے ہیں بھلا۔؟ کالو جیسے۔''

''کیوں۔؟ کیا ہوا۔؟'' عابی کی گنگ ہوئی زبان کو تجسس نے قوت گویائی دے دی۔

''یہ آپ کے کالو صاحب۔''



''میرے نہیں، تمہارے۔'' بے خیالی میں اس کی تصحیح بھی کر ڈالی۔

''اوہ ہاں۔ سوری۔ میرے کالو۔'' پھر اک مترنم سی ہنسی فضا میں گونجی۔ ''کوئی ذرا سا بھی حسن نظر تو رکھتے ہی نہیں ہیں، میری فرتی خالہ تو آپ نے دیکھی ہوں گی۔ کس قدر پیاری ہیں۔ ہیں نا۔؟''

''ہاں۔'' عابی کے حلق میں جیسے گولا سا اٹکا۔

''لیکن کالو کی بینائی بھی لگتی ہے بہت کمزور ہو گی۔ خالہ کا نہ حسن صورت دکھائی دیا اور نہ حسن سیرت کو پرکھا۔ بیوقوف کہیں کے۔ نہ صرف گھر سے، ملک سے ہی بھاگ نکلے۔ فرتی خالہ سے دور رہنے کے لئے۔ کوئی حد ہوتی ہے حماقت کی۔ پھر پورے چھ سات سال غائب رہے۔ ارے! آپ کو تو سارے حالات کا علم ہو گا۔''

عابی دھواں دھواں سا چہرہ لئے بس اسے تکے جا رہے تھے۔ اور وہ جذبات میں ڈوبی بولے جا رہی تھی۔

''شکر ہے اب کالو صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ دنیا کے دس ممالک پھر کر پتہ چلا کہ کس ہیرے کو ٹھکرا آئے تھے۔''

عابی کو یک دم کھانسی سی اٹھی۔ وہ کھانسنے لگے۔ کھانسی کی وجہ سے آنکھوں میں پانی آ رہا تھا۔

''کیا ہوا۔؟ کھانسی کیوں آ رہی ہے۔؟ کوئی کھٹی چیز کھا لی ہو گی۔ پلیز! اپنا خیال رکھا کریں نا۔ ورنہ میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ ہاں تو میں خالہ اور کالو کی داستان سنا رہی تھی۔ لیکن آپ کو تو سب کچھ معلوم ہی ہو گا۔''

عابی نگاہوں کے سامنے تھے۔ دل چاہ رہا تھا سب کچھ ان کے ساتھ شیئر کرے۔ بڑا اچھا لگتا تھا انسے ہر بات شیئر کرنا۔ کیا پتہ پھر کب ملاقات ہو۔ آج تو یوں اچانک ہی اللہ کی کچھ مہربانی ہو گئی تھی۔

''پورے سات سال بعد دونوں بچھڑے ہوئے مل گئے ہیں۔ شکر ہے ان کی کہانی کا ہیپی اینڈ ہو گیا۔ کالو نے اب خالہ کو بیوی تسلیم کیا ہے۔'' وہ پھر ہنسی۔ ''میرا خیال ہے کالو کی بینائی لوٹ آئی ہے۔ اسی کی مبارکباد دینے ہم یہاں آئے ہیں۔ میں، میری نانی اور اماں۔ مٹھائی اور جوڑے کپڑے لے کر۔ کالو آپ کے دوست ہیں

ان سے ان کا گھر بسنے کی ٹریٹ لینا عابی! اور اس دن مجھے بھی بلا لینا۔'' اب آنکھوں میں شرارت کی جوت تھی۔

''خدا کے لئے چپ ہو جاؤ ایمان۔'' عابی کا دل منتیں التجائیں کئے جا رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے رونما ہو رہے تھے جنہیں وہ بار بار رومال سے پونچھ رہے تھے۔ دل کی حالت بڑی عجیب تھی۔ ابھی اس کی خوبصورتیوں میں کھوئے تھے اب شرمندگی کے مارے دل چاہ رہا تھا' زمین جگہ دے تو وہ اس میں سما جائیں۔ مگر وہ دشمن جان' دشمن ایمان چہرے پر بے حد خوبصورت مسکراہٹیں سجائے' آنکھوں میں شوخی کے رنگ لئے مسلسل بولے جا رہی تھی۔

''ویسے وہ آپ کے کالو سنا ہے کافی ہینڈسم شخصیت کے مالک ہیں لیکن ارسل صحیح پہچان گیا تھا۔ من کے کالے تھے نا۔ تبھی اس بچے کے منہ سے فرشتوں نے کالو نکلوا دیا۔ پر اب تو من کی کالک شاید صاف ہو گئی ہے۔ اللہ کرے ہمیشہ کے لئے اجلے ہو گئے ہوں۔ میری فرتی خالہ کی خزاں رسیدہ زندگی کے چمن میں سدا بہاریں رہیں۔ دعا گو ہوں ان کے لئے۔ عابی آپ بھی دعا کریں۔ دوست کے لئے بھی اور اس کی بیگم کے لئے بھی۔''

عابی کے پسینے کچھ زیادہ ہی چھوٹنے لگے تھے۔ بار بار پیشانی صاف کر رہے تھے۔ ایمان تردد سے انہیں تکنے لگی۔

''کیا بات ہے۔؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔؟ کھانسی بھی آ رہی ہے۔ اور۔ شاید ٹھنڈے پسینے بھی۔ چلیں اندر۔ فرتی خالہ چائے کا انتظام کر رہی تھیں۔ بن گئی ہوگی۔''

ایک بار پھر اندرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ کوئی آ تو نہیں رہا تھا؟ اطمینان ہو گیا کوئی اردگرد نہ تھا۔ تب پھر جلدی سے اس سے مخاطب ہو گئی۔

''مجھے یاد آیا ہے۔ ماھم اور اجلال کا کوئی اتہ پتہ' خیر خبر' خط پتر' فون یا ای میل وغیرہ۔'' بات ابھی پوری نہیں کی تھی گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔

''لیں۔ شاید چھوٹے کالو آ گئے۔'' جھٹ سے رخ پھیرا۔

عابی بھی گڑبڑا کر ادھر ہی متوجہ ہو گئے۔ کھلے گیٹ میں سے مدحت داخل



ہوئی تھی۔ ایمان فوری طور پر پہچان نہیں سکی تھی۔ بڑے غور سے اسے تکنے لگی۔

''ارے چاچو۔!'' مسرت سے لبریز آواز ہونٹوں سے نکالتے ہوئے وہ ان کی سمت لپکی۔

''یہ۔ یہ۔'' ایمان ہکلا ہکلا کر بڑبڑائی۔ ''اس دن والی' وہی لڑکی۔ عابی کی بیوی تھی۔ مگر یہ یہاں کیوں۔؟ کیا عابی! یہ آپکے ساتھ۔''

''اسلام علیکم۔ میں مدحت ہوں۔'' وہ قریب پہنچ کر ایمان سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بڑی سرعت سے عابی کی طرف مڑی۔ پھر ان کے گلے میں باہیں ڈال کر ایڑیاں اٹھاتے ہوئے ہونٹ ان کے کان میں گھسیڑ دیئے۔

''یہ وہی آپ کی اسٹوڈنٹ ہے نا' جو اس دن ملی تھیں۔ جن کا ہاتھ آپ کی جیب......'' مزید پتہ نہیں کیا کچھ کہنے جا رہی تھی' اس لمحے اندرونی دروازے سے ایمان کی نانی نمودار ہوئیں۔

''تم یہاں کھڑی ہو۔ فرتی چائے کیلئے بلا۔'' ایمان سے بات کرتے کرتے وہ عابی پر جا پڑی۔ ''عباد بھی آ گیا ہے۔''

انہیں کبھی اس کا نام یاد نہیں رہتا تھا۔ کبھی عابد پکارتیں۔ کبھی عباد اور کبھی ارے وہ۔ کیا اس کا نام ہے بھلا سا۔ پر اتنا بھلا سا بھی نہیں۔'' اتنا کہہ کر بات بڑھا دیا کرتی تھیں۔

''لو تم تو اپنے خالو سے مل بھی لیں۔'' ایمان سے بات کرنے لگیں۔ ''بڑا شوق تھا تمہیں اس سے ملنے کا۔''

''یہ۔ یہ۔ چھوٹے خالو ہیں۔؟'' ایمان نے ہڑبڑا کر' گڑبڑا کر عابی کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔ یہی تو ہے اپنی فرتی کا شوہر۔'' ایمان کے سوال کا اک اطمینان بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دینے کے بعد بڑھ کر عابی کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''کیسے ہو بیٹا۔؟ تمہارے واپس آ جانے کا سن کر اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اچھا ہوا آ گئے ہو۔ امریکہ اور ولایت میں کیا رکھا ہے۔ جو بات اپنے

ملک' اپنے گھر اور اپنی عورت کی ہوتی ہے وہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔''

پھر نانی اماں شرارت سے مسکرائیں۔ ''اب پھر نہ کہیں بھاگ جانا۔''

مگر نانوں کی شرارت سے محظوظ ہونے کا کسے ہوش تھا۔ ایمان تو جیسے اپنے حواس کھو چکی تھی اور عابی ویسے ہی گم صم سا کھڑا تھا۔ ساری توانائیاں ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔ ہلنے تک کی جسم میں طاقت نہ تھی۔ بس ایک ٹک ایمان کو تکے جا رہے تھے۔ نہ کسی بات کی تائید کر سکتے تھے اور نہ تردید ہی۔

کتنی کوشش کی تھی عابی نے' ایمان کو سب کچھ بتانے کی۔ اپنی گزری زندگی کی حقیقت اس پر واضح کرنے کی۔ مگر موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اور جب کبھی ملا بھی تو ایمان کی محبت ہی اس کی مجبوری بن گئی۔ وہ اسے کچھ بتا ہی نہ سکے۔

وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی محبتوں کے بغیر جینے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ وصل کی بات نہ تھی۔ قربتوں اور فاصلوں کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ان میں ذہنی وابستگی اور دوستی ایسی گہری تھی کہ جسم کے لیے جیسے روح اور زندگی کیلئے جیسے جان ضروری ہوتی ہے اسی طرح وہ ایک دوسرے کے لیے اہم تھے۔ اور اسی طرح وہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور سمجھتے تھے۔ اور عابی خوفزدہ تھا کہیں ان کے تعلقات میں کوئی دراڑ نہ آ جائے' جب ایمان آفریدی کو اس کے ماضی میں ہونے والے فرحت کے واقعہ کا علم ہو۔ وہ اس سے جدا نہ ہو جائے ہمیشہ کے لئے۔ بس یہی خدشات اس راز سے پردہ اٹھانے سے گریز کا باعث بنتے رہے۔

ویسے وہ اب بھی کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھا۔ ہر وقت گلٹی سا بھی محسوس کرتا رہتا تھا۔ اس دن ٹریٹ کا بھی بہانہ بنایا تھا۔ وقت نکالا تھا۔ کہ ایمان کو سارا کچھ بڑے احسن طریقے سے بتا دے گا۔ وہ انداز اور وہ سارے مکالمات بھی سوچ لیے تھے۔ کیا کہے گا۔ کیا بولے گا۔ لہجہ کیسا ہو گا۔ انداز کیا اختیار کرے گا۔؟؟ کچھ ایسے کہ نہ محبتوں کا نقصان ہو اور نہ دل کی دنیا میں کوئی زلزلہ آ کر اسے تہس نہس کر دے۔ ان میں دوستی کے ناطے کا بھی تو اعتماد تھا۔ مگر سر آفاق ولی کا روپ دھار کر ان کے سر پر آن مسلط ہوئے تھے۔ اور آج۔ یہ۔ یہ فرحت کی رشتہ دار۔ یہ اچانک کہاں سے آن ٹپکی تھیں۔ بے موقع ہی۔ کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بات کیسے بنائے۔ کیسے



ہالے۔ کونسا طریقہ یا انداز اختیار کرے۔ چاہنے کے باوجود عقل و ہوش ساتھ ڑے جا رہے تھے۔ پتہ نہیں قدرت کو کیا منظور تھا۔؟

''چلو آؤ اب اندر۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

نانوں کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ تب دونوں ہی چونکے۔ ایک دوسرے ائرانہ سی نظریں ڈالیں اور نانوں کے پیچھے پیچھے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

دونوں ہی کے پاؤں میں چلنے کی سکت نہ تھی۔

پھر بھی دونوں قدم اٹھا رہے تھے۔ اور دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔

نجانے کیا سوچ رہے تھے۔؟ یا پھر

دونوں کے دل کس نقصان پر ماتم کناں تھے کہ آنکھیں بھی بھر بھر آ رہی تھیں۔

## 48

لباس تو ویسا ہی تھا۔ ہر روز جیسا۔ مگر آج وہ کرنل عمیر آفندی کو بہت صورت لگ رہی تھی۔ نجانے کیوں پپوٹے کچھ بھاری بھاری سے ہو رہے تھے۔ جو ی خوبصورت آنکھوں کو مزید حسن بخش رہے تھے۔ شاید تبھی۔ اس کے چہرے کی ل سے وہ نگاہ ہٹا نہیں پا رہے تھے۔

جب سے ان کے پاؤں کو چوٹ لگی تھی۔ فرحت روزانہ اسی وقت آتی تھی۔ بھی تک چھٹی سے واپس نہیں آیا تھا۔ جبکہ اس کی چھٹی ختم بھی ہو چکی تھی۔

یوں کسی کام کرنے والے کے بغیر کرنل کا گھر بڑا بے ترتیب ہو رہا تھا۔ پہلے ی کام کرتی تھی وہ بھی جا چکی تھی۔ اس کے بیٹے کا تبادلہ کسی دوسری جگہ ہو گیا لہذا فرحت اپنے گھر میں کام کرنے والی ماسی کو ساتھ لے آئی تھی۔ جتنی دیر وہ سے گھر کی صفائی کرتی رہتی فرحت کرنل صاحب کے دوسرے چھوٹے موٹے کام رتی۔

مثلاً انہیں ناشتہ کراتی۔ ان کی دوائیاں چیک کرتی۔ انہیں کھلاتی پلاتی۔ بے

شک وہ بستر پر تھے آج کل' مگر ان کی نفاست پسند طبیعت کے بھی کچھ تقاضے تھے جو وہ ضرور پورے کرتے تھے۔ روزانہ لباس تبدیل کرنا۔ وہ فرحت وارڈ روب سے نکال کر' اور استری کر کے رکھ دیتی۔ پھر روزانہ شیمپو کرنے کی انہیں عادت تھی۔ وہ فرحت ماسی کی مدد سے بیڈ پہ بیٹھے بیٹھے ہی انہیں کر دیتی۔ کیونکہ پاؤں پر پلستر چڑھا تھا اور اس کے ساتھ روزانہ شاور لینا آسان نہ تھا۔

ساتھ ساتھ فرحت ان کے کام کرتی رہتی' ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی ہوتا رہتا۔ فرحت کے آنے تک کرنل نے جو اخبار پڑھا ہوتا' اس کی خبروں کے متعلق ڈسکس بھی کرتے۔ کبھی وہ دونوں متفق ہوتے اور کبھی کسی موضوع یا مسئلے پر اختلاف ہو جاتا تو گرما گرم بحث بھی چل نکلتی۔ پھر کچھ دونوں گھروں کے معاملات کے متعلق بھی گفتگو ہو جاتی۔

''فرحت بی بی! یہ آج تمہاری آنکھیں کچھ بدلی بدلی سی ہیں۔ کیوں؟''

کرنل نے بڑے غور سے تکتے ہوئے اچانک ہی پوچھ لیا تو فرحت سٹپٹا سی گئی۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد مسکرائی۔ ''شکر ہے آپ نے نظر بدلی ہوئی نہیں کہا۔''

فرحت عقلمندی سے ٹال گئی تھی۔ انہیں یہ نہ کہہ سکی کہ وہ روتی رہی تھی۔ پھر رونے کا سبب بھی بتانا پڑتا۔ اور اس موضوع پر آج تک عمیر آفندی سے بات نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ زمانے بھر کے موضوعات ان کے زیر بحث آتے تھے۔

''میں نے اک دن اک پرپوزل پیش کیا تھا۔'' نجانے کیوں کرنل نے ان دونوں مسئلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لنک کر لیا تھا۔

فرحت نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا کر ان کی قمیض کے ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکنے لگی۔ مگر اب اس کے ہاتھ کانپنے لگ پڑے تھے۔ فرحت پوری ذمہ داری کے ساتھ ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری کر رہی تھی۔ عابی دوائیاں وغیرہ دیتا۔ ڈاکٹر کی وزٹ کرا دیتا۔ مدحت بھی تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی ایک دو چکر ضرور لگا جاتی۔ دو چار انہیں لطیفے سناتی۔ کچھ ادھر ادھر کی' ہمسایوں پڑوسیوں کی' کالج اور دوستوں اور لیکچررز کی باتیں سنا جاتی۔ آج کل اس کے ایگزامز ہو رہے تھے۔ اس لئے وہ زیادہ وقت نہیں نکال سکتی تھی۔



''میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے۔؟'' کرنل پوچھ رہے تھے۔ وہ اب فرحت سے خاصی بے تکلفی سے بات کر لیتے تھے۔ آپ سے تم تک آ چکے تھے۔ اتنا تو وہ ان کا خیال رکھتی تھی۔ اور اتنا سے بھی زیادہ وہ ان کے خیالوں میں رہتی تھی۔ کوئی بیگانگی آپس میں رہ ہی نہیں گئی تھی۔

''پتہ نہیں پہلے اتنے سال اس گھر کی تنہائیوں میں میں نے کیسے کاٹ لئے۔ اب تو جیسے اک لمحہ بھی کاٹنا دوبھر ہو رہا ہے۔''

فرحت سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہی۔ کمبخت سارے کے سارے ہی بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ اب تک فارغ ہو کر جا چکی ہوتی۔ پھر ان سوالات سے تو بچ جاتی۔ اندر اذیت ہی اتر رہی تھی۔

''میں یقیناً اتنا برا بندہ نہیں ہوں کہ تمہیں میرا پرپوز کرنا برا لگ گیا ہو۔ نہیں لگا ناں؟'' وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کو جھک کر دیکھنے کی کوشش میں تھے کہ ان کے تاثرات کو جان سکیں۔

فرحت نے نفی میں سر ہلا دیا۔ نہ جھوٹ بول سکی۔ نہ ان کا دل توڑ سکی۔ کرنل بے نفس ہونے کے ساتھ ساتھ معصوم بھی تھے۔ اور ان کی اتنی ساری خصوصیات کی وجہ سے اسے عزیز بھی بہت تھے۔

''مجھے یقین ہے ہم دونوں ہی خوش رہیں گے۔'' فرحت کے جواب نے ان کی ہمت بڑھا دی۔ ان کا آسمان ستاروں سے بھرنے لگا۔ ''زندگی نے وفا کی تو ہمارے پاس ابھی کافی وقت ہے۔ میں تمہیں بہت خوشیاں دوں گا۔''

جذبات میں' پیار میں بھیگا ڈوبا ان کا لہجہ بہت متاثر کن تھا۔

''تمہارا تو مجھے یقین ہو گیا ہے۔ ان گزرے دنوں کا عملی تجربہ۔ تم مجھے بہت خوش رکھو گی۔ میں خوش نصیب ہوں گا اگر تمہارا ساتھ مل جائے۔''

فرحت نے پہلو بدلا۔ پھر چہرہ مزید جھکا کر دھاگے کو دانتوں سے کاٹا۔ تاکہ اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ نہ کر سکے۔ عورت کسی عمر میں بھی پہنچ جائے۔ معاملہ جب درپیش ہو تو شرما جاتی ہے۔ اور فرحت اتنی بھی معمر نہیں ہو گئی تھی کہ اس کا دل جذبات سے عاری اور چہرے پر کوئی رنگ نہیں اترا ہو گا۔ اس کی ابھی عمر

ہی کیا تھی۔ زیادہ سے زیادہ پچیس سال لہٰذا اس کی خاموشی کو شرم پر محمول کرتے ہوئے اور بنا دیکھے اس کے رخ زیبا پر بکھرے رنگوں کے تصور میں ڈوبے ہوئے بولتے چلے گئے۔

''مجھے ہمیشہ اک بیٹی کی آرزو رہی ہے۔ اب ہماری عمریں اولاد پیدا کرنے کی تو نہیں ہیں۔ مدحت کو میں ہمیشہ اپنی ہی بیٹی سمجھوں گا۔ بہت پیار کروں گا اسے۔ بلکہ کرتا ہوں اب بھی۔''

کرنل آفندی کے لہجے میں صداقت تھی۔ فرحت ان کی فطرت سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ ان کا ہر عمل ہمیشہ بڑا پرخلوص ہوتا تھا۔

''اوپر والا پورشن جو میں نے عزیز کے لئے بنوایا ہوا ہے۔ وہ اس کے لیے ڈیکوریٹ کر دوں گا۔ اوپر والے بیڈروم کے ساتھ ملحقہ جو بالکونی ہے کبھی وہاں سے باہر کا نظارہ دیکھا ہے تم نے۔؟''

''نہیں۔'' فرحت پوری دلچسپی سے ان کی ہر بات سن رہی تھی۔

''اوہ میرے خدا۔ کمال ہے۔ وہاں سے باہر کا سارا منظر انتہائی خوبصورت دکھائی دیتا ہے کیا کسی مصور کی کوئی پینٹنگ ہو گی۔ جو کسی رئیس کے ڈرائینگ روم کی دیوار پر آویزاں ہو۔ بہت خوش ہو گی ہماری مدحت اس کمرے میں رہائش پذیر ہو کر سارے گھر میں سب سے زیادہ خوبصورت وہی کمرہ ہے۔''

فرحت نے جھکی جھکی نظریں اٹھا کر اک لمحے کے لیے کرنل آفندی کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس گھر کے اتنے بڑے لان کی کیاریوں میں جگمگانے والے سارے کے سارے جگنو کرنل کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔

''ہر عورت کو بیٹے کی بڑی آرزو ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے مستقبل کا مضبوط سہارا ہوتا ہے۔ یقیناً تمہارے بھی دل کے اندر کہیں کبھی اس آرزو نے جنم لیا ہو گا۔ عزیز بڑا نرم خو اور محبت کرنے والا بچہ ہے۔ وہ تمہیں ملتے ہی تم سے محبت کرنے لگے گا۔ مجھے یقین ہے میرے بعد بھی وہ تمہیں حقیقی ماں جیسی عزت اور مقام دے گا اور مدحت کو تو ساری عمر وہ اس طرح بہن کا پیار دے گا کہ کبھی اسے محسوس ہی نہیں ہو گا کہ وہ اس کی حقیقی بہن نہیں ہے۔ میرے بعد بھی۔''



''اونہوں! ایسی باتیں نہیں کریں۔''

''زندگی کے ساتھ موت لازم و ملزوم ہے۔''

''وہ تو ہے۔ لیکن ہم اس کا حصہ اسے دے چکے ہیں۔ آپ نے ملیحہ دی ہے۔ میں نے زید دے دیا۔'' فرحت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''اللہ آپ کو سلامت رکھے۔'' اس نے پورے خلوص اور محبت سے کرنل کو زندگی کی دعا دی۔

کرنل عمیر آفندی کے لبوں پر اک ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔

''تو پھر مجھے کوئی تسلی بخش جواب دو ناں۔ آدھی سے زیادہ زندگی گزر گئی ہے۔ اور باقی زندگی میں زیادہ سے زیادہ بلکہ پوری کی پوری تمہارے سنگ سنگ گزارنا چاہتا ہوں۔''

''کرنل صاحب! ایسا نہیں ہو سکتا۔'' فرحت نے جھکا ہوا سر اٹھا کر مستحکم لہجے میں کہا۔

''کیوں۔؟'' وہ تڑپ ہی تو اٹھے۔ اس قدر کورا جواب۔ ایسا مستحکم لہجہ۔

''میں تو بڑی امید لئے بیٹھا تھا۔ تم نے ایک دم توڑ دی۔'' کرنل کے لبوں پر شکوہ مچل اٹھا۔ ''کیا میں تمہیں بہت برا لگتا ہوں۔؟'' تھوڑی دیر بعد پھر پوچھا۔

''نہیں۔ آپ جیسے انسان کا زندگی بھر کا ساتھ جسے مل جائے وہ بختاور ہے۔'' فرحت کے لہجے کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی بھیگ سی گئیں۔ ''لیکن میں نہیں۔ مجھ سے میرا بخت روٹھا ہوا ہے۔''

''کیوں۔؟ کیا ہوا۔؟'' عمیر بے قراری کے ساتھ پوچھنے لگے۔

''میں اپنے قبیلے کے رسم و رواج کی قید میں ہوں۔''

''کیا مطلب۔؟'' وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔

''زید کے بعد میری دوسری شادی ہو چکی ہے۔''

''دوسری شادی۔؟'' مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

''ہاں۔ نکاح۔'' انہیں آس دلائے رکھنے سے فرحت نے بہتر یہی سمجھا کہ اپنی پہنی ہوئی زنجیریں کرنل کو دکھا دے۔ دل بے شک ٹوٹ جائے گا۔ لیکن صبر و قرار بھی تو آ جائے گا۔

''کس کے ساتھ۔؟'' ان کا دل پتہ نہیں ٹوٹا تھا یا نہیں لیکن آواز اور لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

''عبدرحمان کے ساتھ۔'' فرحت نے دوسری ضرب لگا دی۔

''عبدرحمان۔؟'' اتنی بڑی خبر تھی کہ کرنل عمیر آفندی بولا سے گئے۔فرحت کی بات کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ ''وہ کون۔؟''

''عابی۔''

''عابی۔؟ یہ اپنا شہزادہ۔؟'' یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں۔''

''یہ تمہارا شوہر ہے۔؟''

''شوہر نہ کہئے۔ نکاح ضرور ہوا ہے ہمارا۔ لیکن نہ وہ میرا شوہر ہے اور نہ میں اس کی بیوی ہوں۔ ہمارے درمیان ایسا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔''

''یہ تم مجھے کس قسم کا بہلاوا دے رہی ہو۔'' کرنل صاحب کو طیش آ گیا۔

''بہلاوا نہیں۔حقیقت بیان کر رہی ہوں۔'' وہ زہر خند سے بولی۔ ''زندگی کا دکھ آپ کے ساتھ شیئر کر رہی ہوں۔سکھ کوئی ملا ہی نہیں ورنہ وہ بھی شیئر کرتی۔ پچھلے سات آٹھ سالوں میں کوئی نہیں۔''

اور پھر فرحت نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی اور عابی کی کہانی کرنل کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ اک اک باب۔ اک اک ورق۔ اک اک سطر۔

''یہ ہمارے درمیان جو گفتگو اور رسمی سے مراسم ہیں' چند دن پہلے سے ہی شروع ہوئے ہیں ورنہ ہم میں تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے تک کا بھی تعلق نہ تھا۔''

''تو کیا باقی کی ساری عمر اسی طرح گزرے گی۔؟'' کرنل نے بڑے دکھ سے فرحت کو دیکھا۔

''ہاں۔اسی طرح۔ یہ ہمارے ہاں کی رسم ہے۔''

''رسم۔؟ کیا مطلب۔؟''

''ایک دوسرے کو پسند کریں نہ کریں۔ اکٹھے رہیں نہ رہیں۔ گھر بسائیں نہ بسائیں۔بس ہم دونوں ایک دوسرے کے پابند ہو گئے ساری عمر کے لئے۔''



''اوہ۔!'' کرنل چپ کے چپ رہ گئے۔

فرحت بٹن ٹانک کر اٹھی۔ پھر قمیض استری کی۔ اور اسے وارڈ روب میں لٹکا دیا۔''آج کھانے پر کیا کھانا پسند کریں گے۔؟'' سارے کام ختم کر کے گھر جانے سے پہلے فرحت ان سے ضرور پوچھا کرتی تھی۔

''جو زخم دے چلی ہو' مجھ زخم خوردہ کے لئے وہی کافی ہوں گے۔ اب شاید کئی دن تک میں کچھ بھی نہ کھا سکوں۔''

''بچہ مت بنیں عمیر! یہی زندگی ہے اور یہی زندگی کی حقیقتیں۔''

فرحت نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اور اب بڑے پروقار انداز میں انہیں بھی سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آپ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔میری آنکھیں کیوں بدلی بدلی لگ رہی ہیں۔تو سچ بتاؤں آپ کو۔ میری اکثر راتیں اک بے چینی اور بیقراری کے عالم میں گزرتی ہیں۔ جاگ کر۔ رو کر۔ اپنے مقدر کو سوچ کر۔''

کرنل پہلو بدل کر سیدھے ہو بیٹھے۔ پھر بڑی ہمدردی بھری نظروں سے فرحت کو تکنے لگے۔

''آپ نے تو یہ تنہائی ملیحہ کے بعد' ملیحہ کی محبت اور ملیحہ کی وفاداری میں اپنی مرضی سے لی تھی۔ اور اپنی مرضی سے جو کام کیا جائے اس میں سکون ملتا ہے مگر میں آج تک کچھ بھی اپنی مرضی یا دل کی آزادی سے نہیں کر سکی۔ مجھ پر تو ہمارے معاشرے اور رسم و رواج کے عذاب ہی مسلط رہے۔''فرحت نے اک طویل سی ٹھنڈی آہ بھری۔ ''عابی نے میری وجہ سے گھر چھوڑ دیا۔وطن چھوڑ دیا۔ کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں وہ چھ سات سال میں نے کس کرب اور اذیت میں کاٹے ہوں گے۔ جبکہ دل میں سب سے زیادہ تکلیف دہ احساس یہ جاگزین تھا کہ میری وجہ سے اک ناکردہ گناہ انسان گھر سے بے گھر ہوا۔ اس کا وطن چھوٹا۔ زندگی کی جتنی آسائشیں میسر تھیں ان سے منہ موڑنا پڑا۔ پھر اوپر سے لوگوں کے طعنے اور اٹھی ہوئی انگلیاں میرا مقدر بنیں۔ بلا کسی گناہ کے۔ بلا کسی تقصیر کے۔ نہ ادھر کی رہ گئی تھی۔ نہ ادھر کی۔''

سنبھلی ہوئی فرحت پھر بکھر گئی۔ رخساروں پر بے تحاشا آنسو بہنے لگے۔

''پھر بیٹی جوان ہوگئی۔ اس کا اپنا دل اور دماغ تھا۔ سوچیں تھیں۔ امن
تھے۔ وہ اپنے چاچو سے بھی پیار کرتی تھی اور میں تو تھی اس کی ماں۔ کبھی میری مح
میں عابی کو قصور وار ٹھہراتی اور کبھی عابی کی محبت میں مجھے مجرم گردانتی۔''
آنسو اک تواتر سے بہے جا رہے تھے اور اسی روانی سے وہ اندر کے
اگلے جا رہی تھی۔ شیئر کرنے والا' سننے والا سامنے تھا۔ اس کی نظروں میں اس کے
ہمدردی تھی۔ خلوص تھا اور سب سے بڑھ کر محبت تھی۔
''پھر اس کے علاوہ کرنل صاحب یہ پچھلے چھ سات سال نہ میں نے ڈھ
کا کپڑا پہنا ہے نہ سواد کا کچھ کھایا ہے۔ دل ہی مر گیا ہوا تھا۔ بلکہ لوگوں کی باتوں
خوف سے مار ڈالا تھا زبردستی۔ ہر خواہش' ہر آرزو' ہر تمنا کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ کسی
ملتی جلتی نہیں تھی۔ حویلی کی چار دیواریں تھیں جن کے اندر قید تھی زندگی۔ یہ میر
عین عالم شباب کے دنوں کی کہانی ہے۔''
کچھ خیال آیا۔ اگر کوئی اس لمحے آ جائے تو۔؟ فرحت نے چونک کر جلد
جلدی رخسار پونچھے۔
''مدحت نے میٹرک کر لیا تو ہم حویلی سے نکل کر یہاں آ گئے۔ شہر م
میری زندگی شاید اسی طرح رہتی کہ میں عادی ہو چکی تھی اس قید و بند کی۔ اپنا
مارنے کی۔ مگر مدحت۔ اس کی زندگی کے انداز بدلنے لگی۔ اس کے جذبات
احساسات اس کی نوعمری کے حساب سے مختلف تھے۔ اب اس کی اپنی اک عزت
تھی۔ میں مزید مشکل میں آن پڑی۔''
کرنل بڑے غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں اور بدلتے تاثر
کو تکے جا رہے تھے۔ کبھی خیال ہی خیال میں ہاتھ بڑھا کر اس کے رخساروں پر
ہوئے ان آبدار موتیوں کو چنتے اور کبھی اس کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی تشفی د
سہلانے لگتے۔
''حقیقتاً بڑی مشکل میں پڑ گئی کرنل صاحب! کبھی مدحت کی عزتوں کا
رکھنا اور کبھی میری اپنی انا اور عزت نفس سامنے آن کھڑی ہوتی تھی۔ میں تو ہر ل
مر کر جیتی رہی ہوں۔ اور جی جی کر مرتی رہی ہوں۔ پھر مدحت کی خواہش اور

کے کہنے پر اپنی ناکام و نامراد زندگی کو اک ڈرامہ بنایا۔''
''ڈرامہ۔؟'' کرنل نے حیرت کا اظہار کیا۔
''ہاں۔ جب آپ ڈنر پر ہمارے گھر آئے۔ اسی دن ہم نے ڈرامے کا پہلا
ایکٹ پیش کیا تھا۔ عابی دیور بنا۔ میں اس کی بھابھی بنی۔ دیکھا نہیں ہم دونوں نے کتنی
شاندار ایکٹنگ کی ہے۔ آپ کو بھی ذرا گمان تک نہیں ہوا کہ ہم ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔''
''ہاں۔ کبھی اک لمحے کے لیے بھی نہیں۔'' کرنل نے اعتراف کیا۔
''ہم دونوں نے اتنی کامیاب ایکٹنگ کی کہ ہم دونوں ہی یہ سمجھنے لگے جیسے
بھی اصل زندگی ہے۔ اور ہمارا دیور بھابھی والا تعلق پھر سے بندھ گیا۔ وہی ہنسی مذاق'
ہی گپ شپ۔ اکٹھے شاپنگ کے لئے جانا۔ گھر کے مختلف معاملات میں ایک
دوسرے سے مشورہ کرنا۔ ہم بہت خوش رہنے لگے تھے کہ اک نیا ظلم ہو گیا۔ دیکھیں تو
بھلا ابھی کوئی کسر باقی تھی۔'' پہلے اک زہر خند اس کے خشک لبوں پر پھیلا۔ پھر دوبارہ سے
س کی آنکھیں بھیگیں اور آواز بھرا سی گئی۔ ''کل میرے کچھ رشتہ دار آ گئے۔ بڑی مٹھائیاں
ر جوڑے جامے لے کر آئے تھے۔ کہ عابی کی واپسی ہو گئی ہے اور ہمارا گھر بس گیا ہے۔
ب ہم میاں بیوی کی حیثیت سے اک خوش باش زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ زندگی' جس کا
صور نہ کبھی میں کر سکی ہوں اور نہ عابی۔ دیکھیں ذرا آپ' یہ ہمارے ساتھ کیا کیا ہو رہا
ہے۔'' لہجے میں رقت لئے فرحت ہنسنے لگی۔ ''پھر ان کے سامنے مجھے اس انداز کی ایکٹنگ
کرنا پڑ گئی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اک مسلسل عذاب اک نہ ختم ہونے والی سزا۔ اسی لئے
پچھلی رات میں نے جاگ کر اور رو کر گزاری تھی۔ اور خدا سے دعائیں مانگ کر۔''
''بی بی جی۔'' ماسی کام ختم کر کے آ گئی تھی۔
''تم چلو میں آتی ہوں۔'' فرحت نے اس کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ
جائی۔ ماسی چلی گئی تو پھر سے کرنل کی طرف مڑی۔ اتنی دیر سے ان کے ساتھ باتیں
ر رہی تھی۔ غور سے ان کا چہرہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اپنی ہی داستان کی ادھیڑ بن میں
صروف رہی تھی۔ اور اب جو غور کیا تو وہ روشنیاں بکھیرتا' مسکراہٹیں لٹاتا چہرہ دھواں
واں سا ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر پھیکا پن تھا۔ آنکھوں کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔
''اگر یہ عابی والا رشتہ یعنی تمہارا نکاح نہ ہوا ہوتا۔ تم صرف زید رحمان کی

بیوہ ہوتیں تو کیا میرا پروپوزل منظور کر لیتیں۔؟"

اک امید بھرا سوال کرنل کے پھیکے، بے رنگ لبوں پر آن ٹھہرا۔

"کوئی فائدہ ہی نہیں ہے اس سوال کا اور شاید میں جواب بھی نہ دے پاؤں۔"

"پھر بھی۔؟" نجانے اس کے جواب سے وہ کس جذبے کی تسکین حاصل کرنا چاہتے تھے۔

"میرا خیال ہے کر لیتی۔" فرحت صاف گوئی سے کہہ گئی۔ "آپ اک اچھے انسان ہیں۔ اور میں بھی اک جذبات واحساسات رکھنے والی عورت ہوں جو کہ اک دل بھی رکھتی ہے۔ دماغ بھی۔ جس میں خواب سجتے ہیں۔ خواب بنتے ہیں۔ ان کی اچھی تعبیر پانے کی خواہش بھی جنم لیتی ہے۔"

فرحت نے بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا جیسے اب گھر جانے کو تیار تھی۔

"کیا اب کل نہیں آؤ گی۔؟" کرنل کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

"کیوں نہیں۔ ہم پڑوسی ہیں ایک دوسرے کے۔ کم ظرف بھی نہیں ہیں۔ جب تک آپ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو جاتے، میں اسی طرح آپ کی تیمارداری کے لئے آتی رہوں گی انشاء اللہ۔" بہت خوش اخلاقی سے فرحت بولی۔

"مگر میں سمجھا تھا کہ تمہارا دل۔"

"دل کی بات چھوڑیں کرنل صاحب!" ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فرحت اک مسکراہٹ کے ساتھ بول پڑی تھی۔ "دل کی کون پوچھتا ہے۔ ہم انسان تو اپنے معاشرے اور رسم ورواج کے قیدی ہیں۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

## 49

"اب تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ناں۔"

"ہاں۔ بہت حیران ہوں۔" صفیہ مسکرائیں۔ "خوشی بھی بہت ہوئی۔"



"میں تو اسے دیکھ کر ماشاء اللہ، ماشاء اللہ ہی کہتی رہی۔ خدا میری فرتی کو نظر ِبد سے بچائے۔" نانو کی وہ بھتیجی تھی۔ ایک اکلوتے بھائی کی بیٹی۔ بہت محبت تھی اس ے۔ "اس کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔"

"نہ صرف چہرے سے بلکہ گفتگو کے انداز سے بھی۔ بات بے بات مسکرا ہی تھی۔ گھر کتنا خوبصورت سجا رکھا ہے۔"

"شوہر محبت کرنے والا ہو تو عورت گھر کو بھی سجا سنوار کر رکھتی ہے۔"

"اور خود کو بھی۔ اماں! اس کا لباس دیکھا تھا۔ ابھی گھر میں ہی تھی۔ ہانڈی لھے میں لگی ہوئی تھی۔ پھر بھی۔ میں تو پہلے یہی سمجھی کہیں جانے کا پروگرام تھا۔"

ایمان آفریدی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کان نانوں اور اماں کی باتوں لگے تھے۔ واپسی پہ انہوں نے اسے ہوسٹل میں چھوڑنا تھا۔ بڑا لمبا راستہ تھا۔ شہر کے ب کنارے سے دوسرے کنارے تک۔ پھر کہیں ٹریفک جام ملتی۔ بڑی بڑی دیر رکنا ا۔ اچھا بھلا فرتی خالہ کا موضوع پاس تھا۔ اور اتنا طویل راستہ بھی طے کرنا تھا۔ ں اور اماں مسلسل انہیں ہی ڈسکس کئے جا رہی تھیں۔ حالانکہ ایمان آفریدی اس وع سے بڑی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ تبھی کھڑکی سے باہر ان راستوں کو دیکھے جا رہی ا۔ جن سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اب کونسا اس نے کبھی ان راستوں پر چلنا تھا۔ اس کی تو منزل بھی جدا تھی راستے بھی جدا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ کہیں کوئی آنسو ر پر ڈھلک پڑے۔ ضبط کر کر کے حلق دکھنے لگا تھا۔

"صفیہ! مجھے تو لگتا ہے مدحت کا کوئی بھائی وغیرہ آنے والا ہو گا۔" نانوں اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "فرتی کے چہرے کا رنگ روپ ہی نرالا تھا۔ اور اس کی ں جو شوہر کی طرف اٹھ رہی تھیں۔"

"ہو سکتا ہے آپ کا خیال صحیح ہو۔ لیکن مجھے تو وہ بہت چپ سا لگا تھا۔ سلام کر کے کمرے میں گھسا چلا گیا۔ پھر کتنی بار بلایا تو باہر نکلا۔"

"وہ تو اس کا شرمیلا پن تھا۔ شروع سے ہی طبیعت کا ایسا ہے۔" نانوں اس ف سے صفائی پیش کرنے لگیں۔ "زید کی زندگی میں بھی مہینے دو بعد حویلی کا چکر

ضرور لگایا کرتی تھی۔ بچی یہ نہ سمجھے کہ ماں باپ نہیں ہیں تو کوئی اور پوچھنے والا نہیں۔
تب بھی اس لڑکے کے یہی انداز تھے۔"

"مگر میں نے تو کچھ اور سن رکھا تھا۔" صفیہ کچھ سوچ کر بولیں۔ "کہ چھوٹا
بڑے سے بھی زیادہ مزاج کا اچھا ہے۔ مگر آج......"

"میرا خیال ہے طبیعت وغیرہ خراب ہو گی۔ چلو۔ فرتی کے تو اند
معلوم ہو ہی گیا ناں کہ وہ اب کتنے پانیوں میں ہے۔"

"وہ تو اماں! مدحت کی باتوں سے بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا کہ اب
میں اور بیوی میں کتنی دلچسپی لینے لگا ہے۔ لڑکی بتا رہی تھی نا کہ فلاں جگہ شاپنگ کرنے
گئے اور فلاں چیز خریدی۔ پھر کبھی آئس کریم کھانے چلے جاتے ہیں۔"

ایمان آفریدی نے پہلو بدلا۔ گردن پھیر کر ماں اور نانوں کو دیکھا۔ "تو!
آج آپ کتنی باتیں کر رہی ہیں۔"

"ہماری باتیں تمہیں کیوں گراں گزر رہی ہیں۔ تم بھی ہماری گفتگو میں شامل
ہو جاؤ نا۔"

صفیہ نے اسے دعوت بھی دی مگر وہ پھر نظر پھیر کر کھڑکی سے باہر تکنے لگی۔

"اور تو اور اماں!" ان کی گفتگو کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا' وہیں سے پھر شروع ہو
تھا۔ "مدحت نے بتایا۔ وہ بڑے بڑے ہوٹلوں میں جا کر کھانا بھی کھاتے ہیں۔
آدھی آدھی رات تک موسیقی کے پروگرام بھی سنتے ہیں۔"

"موسیقی کے پروگرام۔؟ وہ کونسے۔؟"

"وہی جن میں لڑکے ناچ ناچ کر گاتے ہیں۔ کوئی پاپ شاپ۔ مجھے تو
سب اچھا نہیں لگتا۔"

"تمہیں نہ لگے۔ فرتی کا شوہر لے کر جاتا ہے تو اسے ضرور جانا چا
ملک ملک پھرا ہے۔ وہ تو ایسی چیزیں پسند کرے گا ہی۔ اور پھر بیوی کو بھی ہر جگہ
لے کر جائے گا۔ میری تو دعا ہے۔ خدا دونوں کو وہ خوشیاں بھی عنایت کر دے
سال روٹھی رہی ہیں۔ اور فرتی بیچاری نے محرومی میں وقت گزارا ہے۔"

"ویسے جوڑی اچھی ہے اماں۔! بس ذرا عمر کا فرق تھوڑا سا محسوس ہوتا ہے"



"کچھ وقت گزر جائے یہ فرق بھی مٹ جائے گا۔ فرتی پہلے سے مختلف ہو
گئی ہے نا۔ شوہر کی محبت اسی طرح ملتی رہی تو اس سے بھی زیادہ جوان ہو جائے گی۔
محبت میں بڑا جادو ہوتا ہے۔"

"یہ تو ہے۔ محبت میں بڑا جادو ہوتا ہے۔"

"اور میری محبت کا جادو۔؟" ایمان آفریدی کے دماغ میں سوچ ابھری مگر
دوسرے لمحے اس نے ہونٹ بھی بھینچ لئے اور کانوں میں بھی انگلیاں دے لیں۔

پھر اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کتنی دیر اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے۔؟ سو گئی ہو۔؟" صفیہ نے اس کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا تو وہ
چونکی۔ "کتنی آوازیں دے ہیں۔ ہوسٹل آ گیا ہے تمہارا۔"

"اچھا۔" وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ "اماں! میرا بیگ۔" اسے
اس کا بیگ پکڑاتے پکڑاتے صفیہ بھی گاڑی سے باہر نکل آئیں۔ پیچھے پیچھے نانی بھی۔

"اپنا خیال رکھنا۔" صفیہ نے اسے گلے لگایا تو وہ رونے لگ پڑی۔

پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہنستی ہنستی ہی جدا ہوا کرتی تھی۔ صفیہ نے
حیرت سے اسے دیکھا۔ رنگ بھی کچھ متغیر سا ہو رہا تھا۔ "کیا بات ہے۔؟ تمہاری
طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟" فرتی کے گھر ہی انہوں نے تبدیلی محسوس کی تھی۔

چائے پہ فرتی نے بہت تکلف کیا تھا۔ بے شمار کھانے کی چیزیں اس نے
اکٹھی کر لی تھیں۔ تقریباً سبھی ایمان کی پسند کی۔ مگر اس نے کچھ چکھنے کو بھی منہ میں نہیں
ڈالا تھا۔ جیسے روزے سے تھی وہ۔ بڑے پیار سے فرتی اصرار کرتی رہی تھی۔ پھر باقی
سب نے بھی باری باری اسے کہا تھا۔ مگر ایمان نے روزہ افطار نہیں کیا۔

"اماں! واپس چلیں میرا ٹیسٹ ہے کل۔"

جبکہ اسی وقت صفیہ کو محسوس ہوا تھا کہ وہ محض بہانہ کر رہی تھی۔ جانے کے
وقت تو اسے ٹیسٹ کا خیال نہیں آیا تھا۔ صفیہ نے جتانا بھی چاہا تھا مگر دوسری باتوں
میں لگ کر دھیان ہی نہ رہا۔

"میرا دل اداس ہو رہا ہے۔" دل کی اداسی کا بہانہ بنا کر وہ ماں کو ٹالنے
میں کامیاب ہو گئی۔ صفیہ کے بعد نانوں سے ملی تو تب بھی روئے گئی۔

"تم تو ایسے رو رہی ہو جیسے کوئی ماتم ہو گیا ہے۔" نانوں نے اسے ٹوکا۔ "چپ کر پگلی! بلاوجہ نہیں رویا کرتے۔"

"ماتم ہی تو ہو گیا ہے۔ آپ کو کیا پتہ۔" اندر سے دل یکلخت پکارا اٹھا۔

"اس سے بڑا ماتم اور کیا ہو گا۔"

ویسے نانوں کی ڈانٹ پر اس نے جلدی سے آنسو صاف کر لئے۔ مگر اتنی دیر سے جس ضبط کا مظاہرہ کرتی رہی تھی وہ اب ساتھ چھوڑے جا رہا تھا۔ تبھی جلدی سے مزید کوئی بات کئے بغیر ہوسٹل کا گیٹ پار کر گئی۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔ کتنا فخر تھا اسے عابی کی محبت پر۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دونوں دریا کے دو کنارے تھے۔ کبھی مل نہیں سکیں گے۔ کہ قدرت نے اسے ہمایوں خان کے نام کی زنجیریں پہنا دی تھیں۔ وہ بچپن سے ہی اس کی منگیتر بنا دی گئی تھی۔ پھر تابوت میں آخری کیل نکاح کا قفل لگا کر ٹھوک دیا گیا۔ لاکھ ماھم اور اجلال نے اسے آزادی دلانے کے وعدے کئے تھے مگر اندر سے وہ خوفزدہ تھی کہ شاید ایسا نہ ہو سکے۔ ان کے ہاں تو طلاق کا نام لینا بھی گناہ کے مترادف تھا۔ ان کی برادری قبیلے کے رواجوں میں اک یہ بھی رواج تھا کہ ایک بار نکاح ہو جائے تو پھر کسی ایک کی موت ہی دوسرے کا پروانہ آزادی بنتا تھا ورنہ جس طرح بھی گزرے' بے شک بری سے بری' دونوں کو زندگی گزارنا پڑتی تھی۔

اور پھر ایمان آفریدی کا معاملہ تو ہمایوں خاں جیسے ہمہ صفت موصوف بندے سے آن پڑا تھا۔ اتنے لائق فائق' ڈگریوں ڈپلوموں کے مالک اور وجیہہ و شکیل شخصیت رکھنے والے ہمایوں خان سے اپنی بیٹی کو آزاد کرا لینے کا تصور تک بھی کوئی والدین نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی طلاق جیسے ناپسندیدہ فعل کے ذریعے۔ ان کا دماغ تو خراب نہیں تھا۔؟ ایمان کیسے سوچ لیتی۔ تاریکی ہی تاریکی تھی۔ دور دور تک۔ اک لامتناہی قید تھی ایمان آفریدی کے لئے۔ زندگی کے آخری لمحے تک نارسائی تھی۔ کہیں دور کوئی امید کی کرن' موہوم سی بھی' چھوٹی سی بھی' نقطے کے برابر بھی' اسے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

لیکن ان سارے حقائق کے باوجود ایمان آفریدی بہت خوش' بہت مسرور



مطمئن تھی۔ اندر باہر سکون ہی سکون تھا۔ کہ اسے عابی کی محبت حاصل تھی۔ اس پر بڑا فخر و غرور اس کے لئے اور کوئی نہ تھا۔ اس کے اندر گلستان مہکتے رہتے۔ دل نگر میں ہمہ وقت چراغاں کا سا سماں رہتا۔ عابی سامنے ہوتے تو نگاہوں میں چاندنیاں سی اتری رہتیں۔ سامنے نہ ہوتے تو خیالوں میں اس کی وجاہتوں بھری شخصیت حواس پر چھائی رہتی' رونقیں ہی رونقیں ہوتیں اردگرد۔ محفل سجی رہتی اک اس کے تصور کے ساتھ۔ وہ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب تصور کرتی تھی۔ لاحاصل کو حاصل سمجھتی تھی۔

مگر۔ مگر۔ مگر۔

آن کی آن میں سب کچھ ہی ڈھے گیا۔ تمام خواب چکنا چور ہو گئے۔ وہ جو حاصل تھا لاحاصل کے مقام پر جا کھڑا ہوا۔ خوش نصیبی کی جگہ بدبختی نے لے لی۔ اک لق و دق صحرا تھا جہاں وہ پیاسی تن تنہا کھڑی تھی۔ دور دور تک تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اجالے کی اک ننھی سی کرن' کسی جگنو کے روپ میں ہی' آس پاس نہ تھی۔ نہ منزل تھی' نہ منزل کا نشان۔

عابی! یہ کیا ہوا۔؟ وہ جسے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ سمجھی تھی وہ سراب ثابت ہوا تھا۔ کس کی محبت۔؟ کونسی محبت۔؟ وہ شخص تو کسی اور کا تھا۔ وہ کن خوش فہمیوں میں مبتلا تھی۔؟ اتنا بڑا دکھ' اتنا بڑا صدمہ ملا تھا کہ دل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ عابی کی محبت مخلص نہ تھی۔ وہ تو صرف ڈرامہ کر رہا تھا۔ محبت کا فریب دے کر اس سے کھیل رہا تھا۔

ٹوٹے دل کی کرچیاں سارے وجود میں بکھر کر اسے زخمی کئے دے رہی تھیں۔ نانوں پوچھتی تھیں۔ "ماتم ہو گیا ہے کیا۔؟" کوئی ایک ماتم تھا۔ اندر تو محشر بپا تھا۔ قیامتیں گزر گئی تھیں۔ جب اسے معلوم ہوا۔ نہ صرف یہ کہ وہ کسی اور کا تھا' بلکہ وہ اس کی خوشیوں مسرتوں سے اپنی زندگی جی رہا تھا۔ اس کی محبتوں چاہتوں کی حقدار کوئی دوسری ہستی تھی اور اس کی رفاقتوں میں وہ بڑی مسرور و مسحور زندگی گزار رہا تھا۔ عابی کی محبتوں کے رنگ اس نے فرتی خالہ کے چہرے پر بکھرے دیکھ لئے تھے۔ اپنی آنکھوں کے ساتھ۔ سنی سنائی بات نہ تھی۔

"عابی! تم نے کچھ بھی نہیں لیا۔ یہ لو نا۔ تمہاری پسند کے گلاب جامن۔"

کیسے محبت بھرے لہجے میں فرتی خالہ بصد اصرار اسے کھانے والی میٹھی میٹھی چیزیں پیش کر رہی تھیں۔ میٹھی میٹھی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے۔ پھر اس دوران فرتی خالہ نے اس کے ساتھ سب کا تعارف کرایا تھا۔ "یہ میری ماں جیسی پھوپھو۔ ان سے تو کئی بار مل چکے ہو۔ مگر صفیہ آپا سے شاید پہلی بار مل رہے ہو۔ یہ جب بھی مجھ سے ملنے آئیں تم ہوسٹل میں ہوتے تھے۔ یاد ہے نا آپا! آپ کو۔"

"ہاں۔ وہ زید جب۔" صفیہ اک دم بات کرتے کرتے چپ سی ہو گئیں۔ یہ موقع نہیں تھا اس وقت زید رحمان کو یاد کرنے کا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی یکلخت بات بدل گئیں۔ "میرا مطلب تھا عبدالرحمان پڑھائی میں ہی اکثر مصروف رہتا تھا۔ جب کبھی سال دو سال بعد جانا ہوتا تھا تو یہ غائب۔ اور ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے کو ملے بغیر رہ نہیں سکتی تھیں۔ ہمارا بچپن اکٹھا گزرا تھا۔"

"ہماری محبت کی تو مثالیں دی جاتی تھیں۔ ہیں نا آپا۔!"

عابی گھبرائے گھبرائے بس ہوں ہاں کیے جا رہے تھے۔ نہ کھل کر صفیہ سے بات کر رہے تھے اور نہ فرحت سے۔

"اور یہ ایمان۔ یہ صفیہ آپا کی بیٹی ہے۔ اس کا بچپن میری گود میں کھیل کر گزرا ہے۔ میں تو مرا کرتی تھی اس پر۔" فرتی خالہ نے پیار بھری نظروں سے اس کو تکتے ہوئے اس کا تعارف کرایا۔

"اور یہ اتنی پیاری بچی تھی کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کیسے ہر کوئی اس پر فدا ہو جایا کرتا تھا۔ تبھی تو میں اکثر اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھتی تھی۔" فرتی خالہ ہنس ہنس کر بتا رہی تھیں۔ "کہ اس کی خوبصورتی دیکھ کر کوئی اسے پیار کرے گا تو میری طرف بھی تو متوجہ ہو گا ہی۔"

صفیہ ہنسنے لگی۔ "یہ بہت شریر ہوا کرتی تھی۔"

"تم خود ہی دیکھ لو عابی! میں کچھ غلط کہتی تھی۔" فرحت نے عابی کو ایمان کی طرف متوجہ کرایا۔ "ہے نا میری ایمان، خوبصورتی کا مکمل نمونہ۔"

عابی فرحت کی بات پر اس قدر سٹپٹائے کہ یکدم ہی اٹھ کر دوسرے کمرے



میں جا گھسے۔ فرحت شرارت سے بات کر کے نانوں کی طرف پلیٹ بڑھانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ عابی کی گھبراہٹ اور پریشانی کو محسوس ہی نہیں کیا۔ اور ایمان کو اندازہ تھا کہ عابی کی حالت اور کیفیت اس وقت کیا ہو سکتی تھی۔ انہوں نے کھایا پیا بھی کچھ نہیں تھا۔ چائے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ فرحت کے کہنے کے باوجود ایمان کی طرف نگاہ تک نہیں اٹھائی تھی۔ کیسے اس کی طرف دیکھتے۔ وہ تو اس کے مجرم تھے۔ اپنے جرم کے احساس سے ہی شرمساریوں میں مبتلا ہو گئے تھے یقیناً۔ لیکن نہیں۔ شرمسار ہونا ہوتا تو یہ اتنا بڑا دھوکا اسے دیتے ہی کیوں۔؟

محبت کے نام پر یوں ایمان کو بیوقوف بناتے ہی کیوں۔؟

ایمان کے ساتھ بھی تو کچھ اسی قسم کا مسئلہ درپیش تھا۔ مگر اس نے عابی سے دل کی گہرائیوں کے ساتھ محبت کی تھی۔ تبھی جب اس کا نکاح ہمایوں خاں سے ہوا تو اس نے اپنا دکھ بھی عابی کے ساتھ ہی شیئر کیا۔ سب سے پہلے عابی ہی کو سب کچھ بتایا۔ روئی، چیخی چلائی، دہائی دی۔ سب عابی کے سامنے ہوا۔ اسی طرح۔ اگر عابی کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔ تو وہ بھی اس کے ساتھ شیئر کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس سے سب کچھ چھپایا کیوں۔؟ کیوں۔؟ کیوں۔؟ ہائے عابی! یہ آپ نے کیا کیا۔؟ اندر لگے ہر زخم سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں بڑی مشکل سے ضبط کیے بیٹھی تھی۔

واپسی پہ سارا راستہ انہیں سوچوں میں کھوئی رہی۔ جبکہ نانوں اور اماں سارا راستہ فرتی خالہ اور عبدالرحمان کو ڈسکس کرتی رہی تھیں۔ وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے کانوں میں زہر اترتا رہا تھا۔

"ایمان! لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تم ہمارے ساتھ گھر چلو۔ وہاں دو تین دن آرام کر لینا۔" روتی ہوئی بیٹی کو صفیہ نے بڑی پریشانی سے دیکھا تھا۔

"آج نہیں اماں! کل یا پرسوں آ جاؤں گی۔"

"اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو ادھر فرتی کی طرف چلی جانا۔" پاس سے نانی نے دوسرا حل پیش کیا۔

"کس رشتے سے، کس تعلق سے جاؤں گی اس شخص کے گھر۔" اندر سے آواز ابھری تھی۔ "اس نے تو میرے اصل ناطے بھی توڑ ڈالے۔"

"ہاں۔ ادھر چلی جانا۔ بلکہ۔" صفیہ ماں کی تائید میں بولیں۔

"سنا ہے تمہارا خالو باہر سے بہت ساری ڈگریاں لے کر آیا ہے۔ تمہاری کچھ مدد ہی کرا دے گا۔ اب تمہارا اس سے تعارف تو ہو ہی گیا ہے۔ تکلف وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔" ماں اور نانی دونوں بہت ساری تاکیدیں کرتی ہوئی چلی گئی تھیں۔

اور وہ روتی ہوئی آنکھیں اور روتا ہوا دل لئے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے کتنا اپنا تھا وہ شخص۔ اور اب ایسا بیگانہ ہوا کہ کچھ بھی اپنا نہ رہا تھا۔ لگتا تھا ساری دنیا ہی بیگانی ہو گئی تھی۔ ہر انسان سے' ہر رشتے سے' یقین اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ایسی بیگانگی' ایسی لاتعلقی کہ زندگی سے ہی منہ موڑ لینے کو جی چاہنے لگا تھا۔ اے موت! تو کہاں ہے۔؟ آ مجھے گلے لگا لے۔ مجھے کسی کی محبت کی بہت ضرورت ہے۔ تہی دامن ہو گئی ہوں۔ دل بھی اک دم خالی ہو گیا ہے۔ تو ہی اپنی پیار بھری باہوں میں مجھے سمیٹ لے۔

روتی روتی بیڈ پر اوندھے منہ گر گئی۔

## 50

"ہیلو! ہیلو!" ماھم کے ہاتھ میں اک خط تھا اور وہ مسکرا مسکرا کر شرارت کے ساتھ اجلال کے چہرے کے سامنے نچا رہی تھی۔

"کس کا ہے۔؟" اجلال نے اک عالم بے قراری میں اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "اماں کا ہے۔؟"

"نہیں۔ بوجھو۔" ماھم نے اپنا ہاتھ پرے کھینچ لیا۔

"منی کا ہو گا۔ وہ بڑے پیارے انداز میں خط لکھتی ہے۔ تمہاری جوشیلی حرکات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" اجلال نے پورے یقین سے کہا۔

ماھم ہنسنے لگی۔ بہت خوش تھی۔ "جس منی کا تم کہہ رہے ہو' اس کا نہیں ہے اس سے بڑی منی کا ہے۔" ماھم کے لہجے سے پیار مترشح تھا۔



"ایمان کا ہو گا یقیناً۔ تمہارا لہجہ اور تمہارے چہرے کے رنگ بتا رہے ہیں۔"

ماھم خجل سی ہو کر ہنسنے لگی۔ "تم بڑے چالاک ہو گئے ہو اجلال۔ اور خصوصاً یہاں آ کر تو اور بھی زیادہ۔"

"سب تمہاری صحبت کا اثر ہے۔" نظروں میں پیار بھرے وہ اسے تکنے لگا۔ نجانے کیا تھا اس لڑکی میں۔ جب سے اس کی زندگی میں آئی تھی' اس کا اپنا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

"مگر میں تو بڑی معصوم ہوں اجلال۔" وہ اس وقت شوخی پر آمادہ تھی۔ زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔

اسے تنگ کرتی تھی' تب بھی اچھی لگتی تھی۔ ماں بہنوں کی جدائی صرف اک اس کا دم تھا جس کی وجہ سے وہ کاٹ رہا تھا۔ ہنستی کھلکھلاتی' شرارتیں کرتی' چھوٹے چھوٹے شوخی بھرے جملے اس پر کستی تو ساری جدائیوں کے زخم دھل جاتے۔

"کیا لکھا ہے ایمان نے۔؟" ماھم کے چہرے پر نظریں جمائے جمائے وہ پوری دلچسپی سے پوچھنے لگا۔ جن محبتوں کے ساتھ ایمان اور عابی نے اس کی شادی میں حصہ لیا تھا' وہ سب اسے یاد آ رہا تھا۔ آہ! کیسے خوبصورت اور سہانے دن تھے اور اک اک لمحہ کتنے مزے سے انہوں نے گزارا تھا اور انجوائے کیا تھا۔

"میں نے ابھی خط پڑھا ہی نہیں۔" ماھم کی اطلاع اسے چونکا گئی۔

"کیوں۔؟" وہ متحیر سا ہو گیا۔ ایمان کا خط اور ماھم اتنا صبر کرے۔ ناممکن۔ ناممکن۔ پھر بے یقینی سے اسے تکنے لگا۔

"وہ۔ فلورا آ گئی تھی۔ اور اس کی پرابلمز کا تمہیں پتہ ہی ہے۔ چار اس کے بوائے فرینڈز ہیں۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شادی کے لئے کس کا انتخاب کرے۔ کیونکہ اسے سب سے ایک جیسی محبت ہے۔"

"ایک جیسی محبت۔" اجلال کی ہنسی چھوٹ گئی۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔"

"ممکن ہے نا۔" ماھم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "سب ینگ ہیں۔ ہینڈسم ہیں۔ دولت پیسے والے ہیں۔ اس لئے سب سے ایک جیسی محبت ہے۔"

اس کی دلیل پر اجلال بڑی دیر ہنستا رہا۔ اس نے ابھی جو اس کے مقابلے

میں بڑی شرارت سے خود کو معصوم کہا تھا۔ تو یہ شرارت نہ تھی۔ اس نے سچ ہی کہا تھا۔ ماھم پر کچھ اور بھی پیار آ گیا۔ ''میں ایمان کے خط کا پوچھ رہا تھا۔ تم فلورا کی چار محبتوں کی کہانی سنانے لگیں۔''

''وہی تو بتا رہی تھی۔ وہ بہت دیر بیٹھی سوچتی رہی اور مجھے بھی سوچنے پر مجبور کرتی رہی۔ اور میں بڑے اطمینان سے یہ خط پڑھنا چاہتی تھی۔''

''پھر۔؟ اب تو اسے یہاں سے گئے بھی دو گھنٹے ہو گئے۔''

''وہ گئی تو ماما کا فون آ گیا۔ ایک گھنٹہ اس میں لگ گیا۔''

''ایک گھنٹہ۔؟'' وہ متحیر سا ہوا تھا۔ ''فارن کی کال اور ایک گھنٹہ۔!''

''شادی شدہ بیٹے سے کچھ شکایات تھیں انہیں۔ وہ اپنی اس پیاری سی عقلمند سی بیٹی سے شیئر کرتی رہیں۔ یار جلی!'' پھر اس سے خدیجہ بی کے پیار والے نام سے مخاطب ہوئی۔ ''یہ بیٹے جب شادی شدہ ہو جاتے ہیں تو ان کے دل کیوں اتنے چھوٹے اور تنگ ہو جاتے ہیں کہ صرف بیوی کی محبت ان میں رہ جاتی ہے باقی ساری کی ساری محبتیں آؤٹ ہو جاتی ہیں۔ کیوں۔؟ کیوں ایسا ہوتا ہے۔؟''

''بات تو سوچنے والی ہے۔ یقیناً میری ماں بھی اپنی بیٹیوں سے یہ دکھ شیئر کرتی ہو گی۔'' اس کے لبوں پر اک ہلکا سا شوخی بھرا تبسم تھا۔

''کیا۔ کیا۔ کیا۔'' ماھم نے اردگرد سے چیزیں اٹھا کر اجلال پر پھینکنا شروع کر دیں۔ ''یہ تم کہہ رہے ہو؟ تمہاری اماں اپنی بیٹیوں سے شیئر کرتی ہوں گی۔؟ اجلال! اس بہتان پر تو میں تمہیں جان سے مار سکتی ہوں۔ شروع شروع میں چند دن ہم سے کوتاہی ضرور ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ کس کس کے ساتھ کیسا سلوک اور رویہ رکھنا ہے۔ مگر پھر اس کے بعد تو آج تک میں نے اماں اور فارعہ اور منی کو ہمیشہ سب سے اہم جانا ہے۔ تم سے بھی......''

''او بابا! میں نے کیا کہا۔'' ہنس ہنس کر وہ اپنا دفاع بھی کیے جا رہا تھا۔ تکیے۔ کشن۔ دو چادریں۔ کمبل۔ سب اس کے اردگرد اور اس کے اوپر ڈھیر ہو چکے تھے۔

''خدا کے لئے اب خط والی بات بھی مکمل کر چکو۔ ایمان خیریت سے تو ہے۔ اور عابی۔''



''وہ دیکھو نا۔ ماما کا فون بند ہوا تو تم آ گئے۔ کھانے کیلئے شور مچاتے ہوئے۔ تمہیں اتنی بھوک کیوں لگتی ہے موٹو۔؟''

''او ظالم! وہ خط دکھا۔ میں سب کی خیریت جاننے کو بیقرار ہو رہا ہوں۔ اپنے ملک کی ہوا بھی ادھر ادھر سے سرسراتی گزر جائے تو اسے بھی روک لینے کو تھام لینے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ اور یہ خط۔ بڑا حوصلہ ہے بھئی تمہارا جو اتنے گھنٹوں سے پڑھے بغیر لئے پھر رہے ہو۔ وہ بھی اپنی ایمان کا خط۔!'' وہ حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ پھر چیزوں کے اس ڈھیر تلے سے نکل کر اجلال نے اچانک ہی جھپٹا مارا اور اس کے ہاتھ سے وہ خط چھین لیا۔

ماھم اس کی بات سننے میں اتنی منہمک تھی کہ خط کی طرف سے تقریباً غافل ہی تھی۔ تبھی اجلال وہ چھیننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''خبردار اجلال! کھولنا نہیں۔'' اسے کھولتے دیکھ کر ماھم چلائی۔ ''ہو سکتا ہے یہ اس کا کوئی پرائیویٹ خط ہو۔''

''لیکن تمہارے اور میرے درمیان کوئی پرائیویسی نہیں ہے۔''

اجلال وہ خط لئے کمرے سے بھاگ نکلا۔ ماھم اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

''نہیں اجلال! پلیز نہیں کھولنا۔ تم میرے بڑے پیارے شوہر ہو۔ پلیز نہیں۔'' اجلال ہنستا ہوا آگے آگے بھاگتا رہا۔ ماھم منتیں کرتی ہوئی اس کے تعاقب میں تھی۔ یوں کئی چکر پورے گھر کے لگا ڈالے۔

اور پھر۔ آخر کار کتنی ہی دیر ماھم کو تنگ کرنے کے بعد اجلال بیڈروم میں گھس کر بیڈ پر ڈھے سا گیا۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

''میں انتہائی غلط بندے سے شادی کر بیٹھی۔'' ماھم نے بھی اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کے پہلو میں گرنے کی ایکٹنگ کی۔ ساتھ ہی لمبے لمبے سانس لینے لگی جیسے بہت تھک گئی تھی اور چڑھے ہوئے سانس ہموار کر رہی تھی۔ ''پلیز! اب نہ بھاگنا۔ ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔''

تب اجلال پتہ نہیں کیا سمجھا۔ جلدی سے کروٹ بدل کر رخ اس کی طرف پھیرا۔ ''کیسی گڑبڑ۔؟'' اک نمایاں سے تجسس کے ساتھ پوچھنے لگا۔

"پہلے خط دو۔ پھر بتاؤں گی۔" ماھم نے فوراً شرط پیش کی۔

"لیجئے جناب حاضر ہے خط۔" اجلال نے لمحے سے بھی پیشتر خط اسے تھما دیا۔ "اب بتاؤ۔"

"پہلے خط پڑھ لوں۔" ماھم نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے خط کھولا۔ اور اجلال کو جیسے اب اس کی ہر شرط منظور تھی۔

وہ خط پڑھتی رہی۔ اجلال اس کے چہرے کو پڑھتا رہا۔ کافی طویل خط تھا۔ تین اوراق پر مشتمل۔ ختم ہوا تو اجلال نے دیکھا کہ ماھم کے چہرے کا رنگ ہی اور ہو چکا تھا۔ بگڑا بگڑا سا۔

"لو پڑھ لو تم بھی۔ اپنے جیسے مردوں کے کرتوت۔" چہرے کا رنگ سرخ سا ہو گیا۔ نجانے کیوں۔؟ اس نے وہ خط اجلال کے منہ پر دے مارا۔ اور پھر خود اپنا چہرہ گھٹنوں میں گھسیڑ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا بھئی۔؟" اجلال نے اٹھ کر عین ماھم کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کا سرخو سرخ چہرہ گھٹنوں سے نکالا۔

"ارے۔!" وہ بے تحاشا گھبرا گیا۔ اس کے سرخ سرخ رخسار بھیگے ہوئے تھے۔ "یہ کیا؟ تم تو سچ مچ رو رہی ہو۔"

"تو اور کیا ہنسوں۔؟ یہ سب کچھ پڑھ کر قہقہے لگاؤں۔؟" خط کے اوراق پکڑ کر اجلال کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔ "دیکھو۔ دیکھو یہ کیا ہے۔؟" آنکھوں میں سے آنسو پھر تیزی سے لڑھکے۔ "میری اتنی پیاری دوست کے ساتھ جو کچھ ہو گیا کوئی ہنسنے کا مقام تو نہیں ہے۔" پھر وہ ساری دنیا کے مردوں کو کوسنے لگی۔ "بے وفا۔ بے ایمان۔ بے درد۔ یہ مرد ذات ہوتی ہی دھوکے باز اور کم ظرف ہے۔ ہائے بیچاری ایمان۔ اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔" بین کرنے کے انداز میں وہ زور زور سے رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔ "دل ٹوٹے تو انسان کیسے ٹوٹتا بکھرتا ہے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔ اور وہ تو ہے ہی بڑی حساس اور نازک سی۔ مر جائے گی وہ۔ نہیں جی سکے گی۔"

اجلال اس کی آہ و بکا سے بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ "اجازت ہو تو خط پڑھ لوں۔؟" نجانے اس میں کیا تحریر تھا جو اتنا شدید ردعمل ہوا تھا۔ غصہ، دکھ، رنج، افسوس۔



ارے جذبے ایک دم ہی اس پر وارد ہو گئے تھے۔ لال چہرہ۔ لال آنکھیں۔ بھیگی پلکیں۔ پھڑ پھڑاتے ہونٹ۔ دیکھنے والی اس کی ہیئت کذائی تھی۔ جبکہ چند منٹ پہلے ں کے سارے نقوش نہ صرف نارمل تھے بلکہ اچھے خاصے حسین لگ رہے تھے۔

"پڑھ لو تم بھی دوست کا اعمالنامہ۔ پھر بات کرتی ہوں تم سے بھی۔ تم بھی ا جنس سے تعلق رکھتے ہو۔ عالی نے جو کچھ کیا کل کلاں کو تم بھی یہی کچھ کرو گے۔ مارے کے سارے ہی مرد ہرجائی ہوتے ہیں۔ ہائے میری پھول سی ایمان۔"

وہ روئے جا رہی تھی۔ بڑبڑائے جا رہی تھی۔ چہرہ جیسے اک دہکتا انگارہ تھا۔ زبان سے بھی انگارے اگل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اجلال پر بھی طعنوں کی بارش ہو رہی تھی حالانکہ ان دونوں میں بڑی محبت تھی۔ جب سے شادی ہوئی تھی ان میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا تھا۔

"یہ عالی۔ الو کا پٹھہ۔ مر جائے اللہ کرے۔"

"بکواس بند کرو۔" اجلال بڑے زور سے دہاڑا۔ پھر اسے ہوش ہی نہ رہا کہ اس نے کیا کیا تھا۔ اک زور کا تھپڑ ماھم کے رخسار پر جمایا۔ "عالی ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔"

ماھم رخسار پر ہاتھ رکھے کئی لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اجلال کو تکتی رہی۔

"تو تم نے اس بے ایمان اور دھوکے باز کی فیور میں مجھے مارا ہے۔ جس کا سارا کچا چٹھا یہ اس خط میں رقم ہے۔ اس کے دھوکے بازی کا منہ بولتا ثبوت۔"

"اس شہر کی ہواؤں فضاؤں میں اب تمہاری ایمان آفریدی کا دم گھٹنے لگا ہے۔" خط میں ایمان کے تحریر کردہ جملے آواز بن کر ماھم کے کانوں میں گونجنے لگے۔ "جلد از جلد ہمایوں خان سے ملو۔ اور اپنے طور پر اصرار کرو کہ جتنی جلد ہو سکے وہ ان سے کہہ کر رخصتی کی تاریخ طے کرا دے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر۔"

ادھر ایمان کے خط کے الفاظ آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ ادھر رخسار پر پڑا اجلال کا تھپڑ تکلیف دے رہا تھا۔ سب عالی کی وجہ سے۔ اس کے اور اجلال کے درمیان تو کبھی زبان زبانی بھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ اتنی محبت اور اتنا سلوک تھا دونوں میں۔

ماھم نے چند لمحے کچھ سوچا۔ پھر آگے بڑھ کر اجلال کا گریبان تھام لیا۔
''یہ تم نے اس انسان کی وجہ سے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے نا جس کی وجہ سے
میری ایمان دکھوں کے سمندر میں ڈوب گئی ہے اور اب میری اور تمہاری زندگی۔''
''وہ ایسا نہیں ہے۔'' اجلال اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا
''اس نے نہ ایمان کی زندگی دکھوں کے سمندر میں ڈبوئی ہے اور نہ میری اور تمہاری
زندگی کو کوئی گزند پہنچانے کے درپے ہے۔'' اس نے اپنا لہجہ نارمل کرتے ہوئے
آہستہ سے ماھم کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑایا۔ ''یہ یقیناً ایمان کو کوئی غلط فہمی ہوئی
ہے۔ اور یہ جو میں نے تمہیں تھپڑ لگایا ہے اس کیلئے میں خود ہی تم سے معافی مانگتا
ہوں۔ دوست کی محبت میں پاگل ہو گیا تھا۔ اور تمہارے منہ سے اس کی شان میں
ایسے نازیبا کلمات سننا گوارا نہ تھا۔ تم خواہ مخواہ گناہگار ہو رہی ہو۔ اسے لعن طعن کر کے
اپنی عاقبت خراب کر رہی ہو۔ مجھے تم سے بھی بہت بہت محبت ہے ماھم! میں تمہیں بھی
کسی پستی میں گرا نہیں دیکھ سکتا۔ عابی بہت نیک' بہت معصوم ہے۔ وہ کسی کے ساتھ
بھی برائی نہیں کر سکتا۔''

اجلال نے ماھم کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ پھر اک گہری سی پیار بھری نظر
سے اسے تکتے ہوئے مسکرایا۔ ''ویسے تم اس تھپڑ کا بدلہ مجھ سے لے سکتی ہو۔'' پھر ہنس
کر اپنا چہرہ اس کے قریب کر دیا۔ ''میں ذرا مائنڈ نہیں کروں گا۔ ہم دونوں میاں بیوی
کے علاوہ دوست بھی تو ہیں۔ اور دوستی میں برابر کے حقوق ہوتے ہیں۔'' وہ مصالحانہ
انداز میں کہہ گیا۔

''میاں بیوی میں برابری نہیں ہوتی کیا۔؟'' ماھم کا لہجہ ناراضگی لئے تھا۔
''اسلام نے مرد کو کچھ زیادہ حقوق دیئے ہیں۔'' اجلال قدرے سنجیدہ ہو
گیا۔ ''ویسے تم عابی کے معاملے میں زیادتی کر رہی تھیں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ بہت
سال ہم نے زندگی اکٹھے گزاری ہے۔ قریب رہ کر۔ دور بھی رہ کر۔ وہ ہمیشہ محبتوں
میں دیانتدار رہا ہے۔''
''تو تمہارا کیا خیال ہے یہ سب ایمان نے جھوٹ لکھا ہے؟ اس نے عابی پر
بہتان طرازی کی ہے۔؟'' ماھم کو ایمان کے سوا اس وقت اور کچھ بھی سوجھ نہیں رہا



تھا۔ اجلال کا تھپڑ بھی معاف کر دیا تھا۔ اس کی تکلیف بھی بھول گئی تھی۔
''جھوٹ بولنے والی وہ بھی نہیں۔ یقیناً ایسا سب کچھ ہوا ہو گا۔ مگر اس کے
پیچھے جذبے کچھ اور رہے ہوں گے۔'' اجلال کسی صورت بھی عابی کو گناہگار ٹھہرانے پر
تیار نہ تھا۔ اسے اپنا اس کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کا اک اک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ وہ
دوسروں کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے والا انسان تھا۔ وہ دوسروں کی محبت اور
خیر خواہی میں اپنی جان سے گزر جانے والا بندہ تھا۔ تب دونوں میں بڑے زور شور
سے عابی کے متعلق بحث ہونے لگی۔

اجلال نے اپنے اُس کی سینکڑوں ہزاروں نیکیاں اور قربانیاں ایک بار پھر
ماھم کو سنا ڈالیں۔
''عابی نے جب بھی کسی سے محبت کی ہے' سچے دل اور خلوص نیت سے کی
ہے۔ وہ بے ایمان یا دھوکے باز قطعی نہیں ہے۔ رہا سوال اس کی فرحت کے ساتھ
شادی کا تو خود ہی تو ایمان نے خط میں سارا واقعہ لکھا ہے۔ پڑھا تو ہے تم نے۔''
اجلال نے اس کے خط کے حوالے سے دلائل دیئے۔ جیسے کسی کورٹ میں
مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ اتنی مستعدی اور جوش سے دونوں کی بحث جاری تھی۔
''وہ پھر گھر سے نکل گیا۔ نہ صرف گھر سے بلکہ اپنا ملک ہی چھوڑ گیا تھا۔ پھر
کونسا دھوکا دیا اس نے ایمان کو۔ بتاؤ نا۔؟''
اجلال کی پوری بات سن کر ماھم سوچوں میں گھر گئی۔ شاید وہ بھی درست ہی
کہہ رہا تھا۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اسے یہ مقدمہ جیتنے کا کلیو مل گیا۔
''آخر اس نے اپنا گھر تو بسا ہی لیا نا۔ اسے کیا کہیں گے۔ محبت کا دعوی
ایمان آفریدی کے ساتھ اور بس رہا ہے فرتی کے ساتھ۔ یہ ایمان کو دھوکا دینا نہ ہوا تو
کیا ہوا۔؟''

''کسی نے اس سے پوچھا۔؟ اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کی۔؟ کیا
معلوم کس کے اور کس انداز کے دباؤ میں آ کر اسے اتنے سالوں کی بھاگ دوڑ کے
بعد چھ سات سال کی ریاضت کے بعد' آخر کار دل کا خون کرنا پڑا ہو۔ اپنے سنبھال
کر رکھے ہوئے جذبات کو قربان کر دینا پڑا ہو۔ اپنی امنگوں اور آرزوؤں کو روند ڈالنا

پڑا ہو۔'' اجلال نے پورے خلوص سے اس کی وکالت کی۔ ''ایمان کو چاہیے تھا۔ اس سے بات تو کی ہوتی۔ اس سے پوچھا تو ہوتا۔ مجھے یقین ہے عابی کو مجبور کیا گیا ہوگا۔ عابی کسی ظلم کا شکار ہوا ہے۔''

ماہم بڑے طنز سے ہنسنے لگی۔ ''مرد ہمیشہ ایسے ہی بہانے بناتا ہے۔''

''مردوں ہی کی بات کئے جا رہی ہو۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ایمان بھی پھر دھوکے باز ہی ثابت ہوئی۔ وہ بھی تو محبت عابی سے کرتی تھی۔ نکاح ہمایوں خان سے کرا لیا۔ یوں ایمان نے کونسی وفا کی''۔

''دیکھو، دیکھو اجلال! کچھ سوچ کر بات کرو۔'' ماہم اجلال کی بات درمیان میں سے کاٹتے ایمان کی حمایت میں تیزی سے بولی۔ ''وہ تو اس کے گھر والوں نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔ ہائے بیچاری۔ کچھ نہ پوچھو اس کی کیا حالت تھی۔ میرے اور عابی کے سامنے وہ کیسے کیسے روئی تڑپی تھی۔ اب بھی اس کی حالت یاد آ جاتی ہے تو مجھے رونا آنے لگتا ہے۔''

''اور بس۔ ہوسکتا ہے اسی کی طرح عابی کے گھر والوں نے بھی اس کے ساتھ کوئی زبردستی کی ہو۔ وہ بھی ظلم کا شکار ہوگیا۔ نجانے کیسے کیسے بیچارے کا دل ٹوٹا بکھرا ہوگا۔'' آخر میں اجلال فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''لہٰذا میرے خیال میں دونوں ہی بے قصور ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ پورے خلوص سے محبت کرتے ہیں۔ کوئی کسی کو دھوکا نہیں دے رہا۔ بس تقدیر دھوکا دے گئی۔''

''ہاں۔'' ماہم بھی اجلال سے متفق ہوگئی تھی۔ ''دونوں ہی بیچارے محبت کی ناکامی کا شکار ہوگئے۔ ساری زندگی کا روگ دونوں کو لگ گیا۔''

وہ دونوں کے لئے افسوس کرنے لگی اور دکھی ہونے لگی۔

''ارے ہاں۔'' پھر جیسے اچانک کچھ یاد آیا۔ ''خط کے آخر میں ایمان نے ہمایوں خان سے ملنے کو لکھا ہے تو پھر ہمیں اس کی خواہش کے مطابق جلد از جلد اسے ملنا چاہیے۔''

''میں نے آخری چند سطور غور سے پڑھی بھی نہیں۔ پریشانی کے مارے چھوڑ دیں۔ تمہیں پتہ ہی ہے ایمان مجھے منی ہی کی طرح عزیز ہے۔ جس انداز میں اس نے



خط لکھا ہوا ہے۔ مجھے تو بس اس پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا۔ کیسے دکھ میں بیچاری ہوگئی۔''

''میرا تو دل پھٹ گیا جب میں نے اس کے خط کی آخری سطور پڑھیں۔'' ہم آنکھوں میں آنسو بھرے بتانے لگی۔ ''اس شہر کی ہواؤں فضاؤں میں اب تمہاری ان آفریدی کا دم گھٹنے لگا ہے۔'' اس کے رخسار پھر بھیگنے لگے۔ ''ہمایوں خاں کا ریس بھی ساتھ بھیجا ہے۔ اور بڑی تاکیدیں کی ہوئی ہیں اسے جلد ملنے کی۔''

''عورتوں کی یہ بڑی بری عادت ہوتی ہے۔ ہر کام میں جلد بازی کی۔''

اجلال بڑبڑایا تو ماہم نے غصے سے اسے دیکھا۔

''اچھا ہے نا۔ یہ معاملہ جلد ہی طے ہو جانا چاہیے۔ یہاں آ جائے گی تو اس کا دل بہل جائے۔ ورنہ یہ صدمہ۔ کہیں اس کی جان ہی نہ لے لے۔''

''واہ خواتین کی نزاکت دیکھو۔'' اجلال نے شرارت سے ماہم کو چڑایا۔ ''یہ مہ کہیں اس کی جان ہی نہ لے لے۔''

''تو غلط ہے کیا۔؟'' ماہم نے اسے گھورا۔

''جان جانا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا جاناں۔!''

''ہائے اجلال کچھ خدا کا خوف کرو۔'' ماہم اس کے مذاق کو سمجھی ہی نہیں۔ ایک ریس ہو کر پھر بلند آواز میں بولنے لگی۔ ''اس کی زندگی کا بھی معاملہ ہے اور عزت کا۔ یہ جو عابی اور ایمان کی محبتوں کے درمیان خالہ آن ٹپکی ہے تو گڑبڑ ہوگئی نا۔ کسی ان میں ان دونوں کے اس تعلق کی بھنک بھی پڑ گئی تو خاندان بھر میں کس قدر بدنامی۔ لہٰذا اس کام میں جلد بازی بہت ضروری ہے۔ فوراً اس کی رخصتی ہو جائے گی اور ملک چلی جائے گی تو سب کچھ بچ جائے گا۔ جان بھی اور عزت بھی۔''

ماہم کی جلالی کیفیت دیکھ کر اجلال فوراً شوخی سے باز آ گیا۔

''بات تو اس نے ٹھیک لکھی ہے۔'' سنجیدہ ہو کر ماہم کی تائید کرنے لگا۔ بھی ہم لوگ ہیں نا۔ یہاں آ جائے گی تو ہم اس کا دل لگا لیں گے۔ یوں بھی ہمایوں خان بڑی صفتوں والا بندہ ہے۔''

''ہاں۔ میں نے اس کی تصویر بھی دیکھی ہوئی ہے اور اس کے متعلق سنا ہوا

بھی بہت کچھ ہے۔ ہینڈسم بھی ہے۔ لائق فائق بھی ہے۔ خوش اخلاق بھی ہے۔''

''تب تو ایمان بہت جلد عابی کو بھول کر ہمایوں خاں سے محبت کرنے لگے گی۔ ہمارے پاکستان میں اسی نوے فیصد شادیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ والدین کی مرضی کی۔ لڑکے لڑکی کی مرضی کے بغیر۔ پھر وہ خوش بھی رہتے ہیں۔''

''اللہ میاں دلوں میں محبتیں ڈال دیا کرتا ہے۔ یہ قرآن میں ہے۔''

''ہاں جیسے تم اور میں۔ میاں بیوی بنے تو پیار کرنے ہی لگے ہیں نا۔''

''تو کیا پہلے ہم دونوں میں دشمنی تھی۔؟''

اجلال نے پیار سے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ''ارے اللہ کی بندی! میں تو پہلے ہی روز' پہلی ہی ملاقات میں' وہ یاد ہے جیولر کی شاپ' وہیں تمہاری محبت کا اسیر ہو گیا تھا۔ ہاں البتہ شادی کے بعد کچھ اور زیادہ۔''

''اچھا اچھا میرے بال تو چھوڑو۔'' ماھم شرما کر مسکرا دی۔ ''اور یہ اپنا بازو بھی ذرا پرے ہٹاؤ۔''

''کیوں بھلا۔؟ بندے کو اپنے مال کی ہر وقت حفاظت کرنی چاہیے۔''

اس نے دوسرا بازو بھی استعمال کرتے ہوئے کسی متاع عزیز کی طرح اسے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ ''خدا کی قسم ماھم! آئی لو یو ٹو مچ۔'' نظریں اس کے تھپڑ زدہ رخسار پر جمی تھیں۔

''اچھا تو وعدہ کرو۔ زندگی میں کبھی عابی کی طرح مجھے دھوکا۔''

''پلیز عابی کی بات نہ کرو۔ اس کے لیے میرا دل بہت دکھی ہے۔ وہ بیچارا شکست خوردہ انسان مقدر بھی ہار گیا۔'' اجلال کی آنکھیں نمناک تھیں۔ ''اور دل بھی۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہ بچا۔ سوائے محرومیوں کے۔''

## 51

''شہزادے! چند دنوں سے تم کچھ بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے ہو۔''



''جی کیا۔؟ کون۔؟ میں۔؟'' عابی نے قدرے چونک کر پھر کچھ سٹپٹا کر اور کچھ گھبرا کر کرنل آفندی کی جانب دیکھا۔ ہاتھ میں پکڑا میگزین لرزنے لگا تھا۔ ''نہیں تو۔ نہیں تو۔'' بھرم ٹوٹنے کا خطرہ تھا۔ گڑبڑا سا گیا۔

اس کرنل کی نگاہ کتنی تیز تھی۔ عقاب سے بھی زیادہ۔ دور رہتا ان کی ان کھوجتی ہوئی نگاہوں سے ان دنوں کہ ادھر ان کی طرف آتا ہی نہیں۔ ان کی نظروں کا سامنا کرنے سے بچ جاتا۔ مگر مصیبت ان کے پاؤں کی چوٹ نے بنا ڈالی تھی۔ کبھی عیادت کے لئے آنا پڑتا تھا اور کبھی محبتوں الفتوں کے لئے۔ چھوٹے بھائی کی سی شفقت اور خلوص سے اسے ٹریٹ کرتے تھے۔ عابی کھنچا چلا آتا آپ ہی آپ۔

وہ تنہا تھے۔ اور عابی کو ان کے اکیلے پن کا بڑا احساس تھا۔ وہ بھی اس عالم میں۔ تبھی ان کے باہر کے کاموں کی ساری ذمہ داری اس نے خود بخود ہی اپنے سر لے لی تھی۔ ان کے کہے بنا ہی۔ خادم آ چکا تھا پھر بھی ان کی ڈیوٹی پر خود کو مامور رکھتا۔

ڈاکٹر کو لانا لے جانا۔ دوائیوں کی اور کچھ دوسری ضروریات کی خریداری وغیرہ اور پھر وہ کام جو فرحت اک عورت کے ناطے نہیں کر سکتی تھی' سب عابی کرتا تھا۔ اپنی خوشی و مسرت سے۔ اور وہ شکر گزار ہوتے رہتے۔ پیار برساتی نظروں سے اسے تکتے رہتے۔ اس پر سے جان نثار کر دینے والے عزائم کی پرورش اندر ہی اندر کرتے رہتے۔

''خدا کے لئے عالی جاہ! اپنی ان تنہائیوں کا کچھ کریں۔ کوئی کاٹنے والی لے آئیں۔'' اک دن انہیں اداس دیکھ کر عابی نے شرارت سے کہا۔

''تو کیا اتنی جلدی تھک گئے جو مجھے اس مصیبت میں پھنسانا چاہتے ہو۔''

عابی کو اس رشتے کے نبھانے کا تجربہ ہی نہیں تھا کہ کبھی اداسیاں دور کرنے کی بجائے یہ مصیبت بھی بن جاتا تھا۔ بوکھلا کر انہیں تکنے لگا۔ ''مصیبت۔؟ یہ بیوی نما ...ن۔؟'' اپنا خیال نجانے کدھر سے کدھر جا نکلا تھا۔

''ہاں بہت بڑی مصیبت۔ اگر بیوی ہم مزاج نہ ملے تو زندگی سمجھو دوزخ کا ...نہ بن گئی۔''

''تو آپ کوئی ہم مزاج ڈھونڈیے گا نا۔'' سوچ میں ایمان تھی۔

"اس عمر میں۔؟" کرنل نے قہقہ لگایا۔ "کیوں میری آخری عمر خوار کر۔ چلے ہو ایسا مشورہ دے کر۔" فرحت والا پروپوزل بھی اب اپنی غلطی لگنے لگا تھا۔ گ اندر سے بے چین ہی رہتے۔

"نہیں کرنل صاحب! ابھی آپ کی بڑی عمر پڑی ہے۔ میں نے کوئی غلا مشورہ نہیں دیا۔ چالیس پینتالیس کے درمیان آپکی عمر ہو گی۔"

"وہی تو کہہ رہا ہوں شہزادے! اس عمر میں مزاج آشنائی ذرا کم ہی ہوا کرتی ہے۔"

"حکم کریں میں آپ کے لئے یونیورسٹی میں تلاش کروں؟"

"کیا۔کیا۔؟" کرنل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زور سے ہنسے

"تو برخودار وہاں پڑھانے کی بجائے ایسے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔"

"آپ کے لئے برادر عزیز! سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" عابی بھی شو ہو گیا۔ "کل سے ٹیچنگ کے ساتھ ساتھ اک پیاری دلاری اور خوش مزاج و خو اخلاق سی بھابھی کی تلاش بھی شروع کر دیتا ہوں۔ یقین ہے یونیورسٹی میں کافی ویرائ مل جائے گی۔ مجھے ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"تو پھر مجھ بوڑھے کے لئے نہیں۔ اپنے لئے کچھ کرو۔"

"اپنے لئے۔؟ یونیورسٹی میں۔؟" کھویا ہوا مدھم سی آواز میں عابی بڑبڑایا۔ فوراً خیال پھر ایمان کی طرف چلا گیا تھا۔

ویسے یہ بے اختیاری حرکت بھی نہیں تھی۔ ہر وقت ہی تو وہ دل و دماغ پ چھائی رہتی تھی۔ اس کی زندگی سے نکل کر بھی ہوش و حواس پر وہی مسلط تھی۔ اور خصوص اس دن سے تو بالکل ہی اس پر کوئی حق اختیار نہ رہا تھا جب وہ فرحت کی بھانجی نکل آئی تھی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔؟

وہ اس کی محبتوں میں تن من سے ڈوبا ہوا تھا مگر اب وہ اپنی سوچ میں بھ اس دعوے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔ لیکن یہ دل کمبخت۔ شکست کے بعد اسے فتح کرنے کے لیے ہی مچلا رہتا۔ اسے پانے کے' اسے حاصل کرنے کے تقاضے ہی کرتا رہتا۔ کوئی راستہ اس کی سمت نہیں جاتا تھا۔ یہ اسے یقین تھا۔

مگر پھر بھی یہ نامراد دل ہر وقت اس کی طرف جانے کی راہیں تلاش کرتا



ہتا۔ بے قرار رہتا۔ مضطرب رہتا۔ سارے جہان کی بے چینیاں اس میں سمائی رہتیں۔

کرنل عمیر آفندی نے یونیورسٹی کی بات کی تو ایمان آفریدی خیالوں سے نکل کر جیسے چھم سے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اپنی تمام تر خوبصورتیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ۔ عابی کے چہرے پر ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ جیسے ابھی کرنل کی عقاب جیسی تیز نظریں اسکے دل کا حال جان لیں گی۔ میگزین اٹھا کر جلدی سے چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔ پھر اس کی اک اک سطر پر یوں نظریں دوڑانے لگا جیسے پوری دلچسپی سے اسے پڑھ رہا تھا۔

کرنل آفندی کتنے ہی ڈھیر سارے لمحات اس کی جانب تکتے رہے۔ میگزین کے پیچھے اس کا چہرہ چھپا تھا مگر جیسے اس کے وجاہتوں بھرے چہرے پر سجی دو اداس آنکھیں انہیں پھر بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جو کہ یونیورسٹی کے ذکر سے مزید اداس ہو گئی تھیں۔ اور شاید ان میں نمی بھی اتر آئی تھی۔

"انکل! وہ اک بڑی پیاری لڑکی ہے۔" مدحت کی آمد اکثر کسی نئی خبر کے ساتھ مزین ہوتی۔ "چاچو کی اسٹوڈنٹ۔"

کرنل کو اچانک اس دن کی گفتگو یاد آ گئی جو مدحو کے اور ان کے درمیان ئی تھی۔ وہ اسے عابی کے متعلق ہی چھیڑ رہے تھے کہ اس نے اک بدمزاج چاچو پایا

"مجھے تو لگتا ہے عابی اس میں انٹرسٹڈ ہیں۔" وہ چاچو کی بدمزاجی کا دفاع کر رہی ی۔ جو کرنل اسے جتا کر پریشان کر رہے تھے۔

"انٹرسٹڈ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بندہ بس چپ کا چپ ہو جائے۔ قت اداس رہنے لگے اور دوسروں کے ساتھ بدمزاجی سے پیش آئے۔ بلکہ میں نے نا ہے۔" وہ اک شوخی بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کے معصوم سے چہرے کو بغور رہے تھے۔ "جب کوئی کسی میں انٹرسٹڈ ہوتا ہے تو اس کے اندر موسم بہاراں ڈیرہ تا ہے۔ پھر وہ ہر وقت پر بہار رہتا ہے۔ ہنستا مسکراتا ہوا۔ مگر تمہارا یہ چاچو۔ کچھ ل نہیں ہے کیا۔؟"

"خواہ مخواہ ہی ابنارمل۔ میرے چاچو جیسا عقل و ہوش والا بندہ شاید ہی کوئی اس دنیا میں ہو گا۔" وہ فوراً ہی عابی کی فیور میں بولنے لگی تھی۔ "دراصل انکل!

آپ ان کی پریشانی کو بدمزاجی کا نام دے رہے ہیں۔ یہ ان فیئر ہے۔ وہ بیچارے تو اس لئے اداس اور پریشان رہتے ہیں کہ ان کی وہ اسٹوڈنٹ پیاری سی' وہ ماما کی رشتہ دار نکل آئی ہیں اور ماما اور عابی۔ اوہ۔''

اپنی ہی رو میں بولے چلی جا رہی تھی کہ اچانک ہی چپ سی ہو گئی اور پھر دوسرے لمحے ہونٹ دانتوں میں دبا لئے۔ ''ارے! یہ سب تو انکل کے سامنے شاید نہیں بولنا تھا۔'' وہ گڑبڑا کر خود کلامی کے انداز میں ہولے سے بڑبڑائی تھی۔

کرنل اسی لمحے سامنے ٹی۔ وی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ بظاہر اسے یہ باور کرانے کے لیے کہ انہوں نے اس کی بڑبڑاہٹ نہیں سنی تھی۔ کہ مدحت کی معصومیتوں کو کسی پشیمانی یا پریشانی کے حوالے بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''ہاں تو کیا کہہ رہی تھی میری مدحو!''

دو تین لمحات بعد نظر اس کی طرف پھیری۔ ''میں ادھر تکنے لگ گیا تھا۔ اک ضروری خبر تھی۔'' پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تو وہ یکلخت ریلیکس ہو کر مسکراتی ہوئی اٹھ گئی تھی۔

''کچھ نہیں۔ وہ دراصل۔ ارے! میری تو ابھی بہت ساری تیاری باقی ہے۔ اور میں آپ کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئی۔''

کرنل آفندی کو صاف محسوس ہو گیا تھا کہ وہ انہیں ٹال گئی تھی۔

''انکل! ماما نے پوچھا تھا کوئی ضرورت ہو تو بتا دیں۔''

''ضرورت۔؟ کیسی ضرورت ہے؟'' وہ اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ اور شوخی پر بھی اتر آئے تھے۔

''ہمیں تو بس کسی ساتھ کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے پاس بیٹھ کر ہم سے گفتگو میں مشغول رہے۔'' انہوں نے اک قہقہہ لگایا تھا۔

''تو بس اپنی ماما سے کہنا۔ ہماری بیٹی' ہماری چہکتی بلبل ہمیں دے دے۔ ہماری ضرورت پوری ہو جائے گی۔''

وہ پہلے چند لمحے ہونقوں کی طرح انہیں تکتی رہی۔ ''چہکتی بلبل۔؟ کچھ سوچا۔ ''اوہ۔'' پھر اک دم اسے سمجھ آ گئی۔ زور زور سے ہنسنے لگی۔



''ایگزامز ختم ہو لیں پھر میں زیادہ وقت آپ کے پاس ہی گزارا کروں گی۔ چاچی۔ خدا حافظ۔ میں چلی۔'' اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی نکلی چلی گئی تھی۔ مبادا ن کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات پھر نہ نکل جائے۔ کرنل سمجھ گئے تھے۔

اور اسی دن سے کرنل عمیر آفندی سوچ رہے تھے۔ یہ عابی کی پیاری سی ٹوڈنٹ والی کیا بات تھی۔ جو وہ خود بھی ان سے چھپا رہا تھا اور مدحت بھی چھپا گئی تھی۔

کرنل کو عابی سے بڑی محبت تھی۔ اور اسی محبت کی وجہ سے وہ اس سے دل گہرائیوں سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ چھبیس ستائیس سال کا یہ عبدرحمان۔ اس وٹی سی عمر میں ہی کیسے کیسے دکھوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کچھ یوں کہ اس کی برادری کی روایات کے مطابق اب اس کی تمام زندگی اسی طرح گزرنا تھی۔ بے مراد۔ نیل و مرام۔ بڑا ترس آتا تھا اس پر۔ پہلے اپنے پر اور اپنی تنہائیوں پر آیا کرتا تھا۔ اپنے سے زیادہ اس کو مظلوم و محروم سمجھنے لگے تھے۔

وہ سوچتے ان کے پاس ملیحہ کی یادیں تھیں۔ جوانی کا کافی حصہ اور سورت اور سہانے جذبات والی عمر انہوں نے ملیحہ کے ساتھ گزاری تھی۔ وہ ی یادوں کا دور ایسا تھا' جب خیال میں آن بستا تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔ کے علاوہ ان کے پاس عزیز تھا۔ کل کو اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اسے واپس اس گھر آ جانا تھا۔ پھر اس کی شادی کرنا تھی۔ اس کے بچے ہونا تھے۔ ان کے دادا والے نئے رشتے کا آغاز ہونا تھا۔ دل اتھل پتھل ہو اٹھتا اس کے متعلق سوچتے ہی۔ نئی زندگی۔ نئی رونقیں۔ نیا گلزار۔ نئے کھلتے پھول۔ ننھے ننھے گل گوتھنے سے م سے بچے۔ خون کے نئے رشتے۔ نئے جذبے۔ نئی بہاریں۔ ان کے ویرانوں ن کی تنہائیوں نے تو مزید خوبصورتیوں کے ساتھ آباد ہو جانا تھا۔

اسی طرح فرحت کے سامنے مدحت کی زندگی تھی۔ زید رحمان کے ساتھ وقت بہت خوبصورت محبتوں اور پیار کی فضاؤں میں اس نے گزارا تھا۔ اور آنے وقت کی آس مدحت کے ساتھ بندھی تھی۔ ماں بیٹی کا ساتھ دنیا کا اک خوبصورت بن ترین رشتہ۔ آپس میں دکھ سکھ شیئر کرتیں۔ ہمدردی کرتیں ایک دوسرے کے ۔ سیر و تفریح کو جاتیں۔ شاپنگ کیلئے نکلتیں تو گھنٹے منٹوں میں گزر جاتے۔ زید

رحمان کی جدائی کے باوجود فرحت کا وقت اپنی بیٹی کی سنگت میں بہت سہانا گزرتا تھا۔

مگر۔عبدرحمان کے پاس کیا تھا۔؟

کرنل عمیر آفندی بڑے انصاف سے اپنے اور فرحت کے دکھوں اور تنہائیوں کے ساتھ عابی کی محرومیوں اور مجبوریوں کا موازنہ کرتے رہتے۔ ماضی سے لے کر حال اور مستقبل تک۔

عابی بیچارے کی زندگی کا آغاز ٹریجیڈی سے ہوا اور وہ انجام تک ٹریجڈی کے ساتھ ہی کھیلتا' روتا' بلکتا رہے گا۔ اس کے پاس تو کوئی آس امید بھی نہیں تھی آنے والے وقت کے لئے۔ مستقبل کی تاریکی میں روشنی کی اک ننھی سی کرن تک نہیں۔ بڑا ترس آتا تھا انہیں عابی پر۔ کاش! وہ اس کیلئے کچھ کر سکتے۔ کاش!

آج کل وہ ہر لمحہ بس اس کے متعلق ہی سوچتے رہتے تھے۔ جب سے فرحت نے اپنی اور اس کی کہانی انہیں سنائی تھی۔ کیا پایا تھا اس نے اس چھبیس ستائیس سال کی زندگی میں۔ کوئی ایک بھی خوشی نہیں۔ اور نہ ہی آنے والی زندگی میں کوئی امید تھی۔ یہ احساس اسے یقیناً ہو گا۔ بہت شدت سے ہو گا۔

اس کے احساس کو سوچتے سوچتے اور اس کے دکھ کو محسوس کرتے کرتے جب ان کا دھیان مدحت کی اس یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ والی بات کی طرف گیا تو ان کے دل میں عابی کے لئے مزید ہمدردی اور دکھ سمٹ آیا۔

''انکل! وہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔'' مدحت کا بیان تھا۔

''اپنے لئے۔؟ یونیورسٹی میں۔؟'' وہ گڑبڑا گیا تھا۔

مدحت اور عابی دونوں کے بولے ہوئے جملے کرنل عمیر آفندی کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

اور وہ چہرے کے سامنے میگزین پھیلائے بیٹھا تھا۔

''ہاں شہزادے! تمہاری ہی بات کر رہا ہوں۔''

مدحت کی اس دن والی بات کی' عابی کے لرزتے کپکپاتے لہجے اور چہرہ میگزین کے پیچھے چھپا لینے والی دانستہ حرکت نے تصدیق کر ڈالی تھی۔ تبھی کرنل عمیر نے بڑے معنی خیز انداز میں بات آگے بڑھائی تھی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا۔ عابی کسی



طرح ان کے سامنے کھل جائے۔ ان کے ساتھ اپنی زندگی کی دکھ بھری داستان کے سارے المناک واقعات شیئر کرے۔ چلو الفاظ کی تسلی ہی سہی' وہ اس کا درد بانٹنا چاہتے تھے۔ کہ بعض اوقات کسی کے پرخلوص اور پرمحبت الفاظ ہی ساعتوں میں اس انداز اور اس قسم کے جادو اثر طریقے سے اتر جاتے ہیں کہ جیسے درد کو درماں مل جائے۔

''میری بات اب رہنے دیں برادر محترم۔'' چہرہ اسی طرح میگزین کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ آواز اور لہجہ نارمل نہیں تھا۔

''کیوں۔؟ تمہاری بات کیوں رہنے دوں۔ تمہارے سامنے تو تمہاری اک طویل عمر پڑی ہے میری نسبت۔''

''کیا پتا۔؟ کیا معلوم۔؟'' وہ بے آس تھا۔

''مایوسی کی بات مت کرو یار! مجھے بتاؤ تمہارے اندر کیا ہے۔؟''

اس سے بات کرتے کرتے خادم کو آواز دے ڈالی۔ ''خادم! اچھی سی چائے بنا کر لاؤ میرے پیارے شہزادے کے لئے۔''

''مجھ سے اتنی محبت کے ساتھ پیش نہ آیا کریں بھائی! میں اس قابل نہیں ہوں۔'' اور آج شاید وہ کچھ زیادہ ہی اداس اور پریشان تھا۔ کرنل سے نظر ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ ان کی عقاب جیسی تیز نگاہ سے خوفزدہ تھا۔ میگزین میں سے کچھ پڑھنے والا ڈرامہ ہی کرتا چلا گیا۔ بہت سارے لمحات یونہی خاموشی میں گزر گئے۔ کرنل اسی کو سوچ رہے تھے۔

''تمہیں شطرنج کھیلنا آتی ہے شہزادے۔؟'' اس کی خاموشی سے اکتا کر آخر کرنل نے پھر زبان کھولی۔ ''سنا ہے اس میں دل بڑا لگتا ہے۔ بندہ کھیلنے بیٹھے تو دنیا کا غم بھول جاتا ہے۔''

''ہر غم۔؟ کونسا غم۔ مجھے تو کوئی غم نہیں ہے۔'' اس نے میگزین پرے ہٹا کر انہیں دیکھا۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھ رہے تھے۔

''میں اپنے غموں کا علاج ڈھونڈ رہا ہوں جان من۔'' انہوں نے کنکھیوں سے اس کے بجھے بجھے' دھواں دھواں چہرے پر زبردستی کی لائی ہوئی مسکراہٹ کی رونق

دیکھی۔ جو بے حد بے رونق تھی۔ دل مزید دکھی ہو گیا۔ کیسا ہینڈسم اور سجیلا سا جواں تھا مگر غم اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کئے جا رہا تھا۔ کتنی خوبیوں والا بندہ تھا اور کس طرح ان پر درد حالات کے ہاتھوں ضائع ہو رہا تھا۔ اس کے قبیلے کے رسم و رواج نے کیسا اسے ظلم کی چکی میں پیس ڈالا تھا۔ اور کیسا اس کا سنگدل باپ تھا' جس نے اپنے اتنے پیارے' لائق اور اتنی بے شمار صفات سے مزین بیٹے کو اس ظلم کی آگ میں اپنے ہاتھوں جھونک دیا تھا۔ ظلم سا ظلم تھا سب۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا کہ کسی کی پوری زندگی کا فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف کر دیا جائے۔ وہ کیا کریں اس کے لئے؟ یا اللہ کوئی راستہ دکھا۔!

''عابی یار! تم شطرنج بھی نہیں کھیلتے۔ باتیں بھی آج کل کچھ کم کرتے ہو۔ پھر کسی دن کوئی پکنک وغیرہ کا ہی پروگرام بنا لیں۔ شہزادے! میں بڑا اداس رہتا ہوں آج کل۔ کوئی اپائے کرو میری اداسی دور کرنے کا۔''

اپنا حوالہ دے کر وہ اس کے روگ کی مسیحائی کرنا چاہ رہے تھے۔

''وہ۔ وہ۔ ارے ہاں یاد آیا۔ مدحت کے امتحانات ہیں۔ ورنہ ضرور پروگرام بناتے۔'' عابی نے فوراً معذوری کا اظہار کر دیا۔ صاف ظاہر تھا جب اندر پت جھڑ کا موسم تھا تو باہر پھول کیسے کھلاتا۔ ''ایگزامز ختم ہو لیں تو پھر کسی پکنک وغیرہ کا پروگرام بناتے ہیں۔'' بچوں کی مانند وہ انہیں ٹال گیا تھا' اک طفل تسلی دے کر۔

لیکن کرنل عمیر ٹلنے والے نہیں تھے۔ ''اتنے دنوں تک تو مجھے ڈاکٹر سے بھی چلنے پھرنے کی اجازت مل جائے گی۔ پھر میں خود ہی اپنے لئے دل لگی کا سامان پیدا کر لوں گا۔''

''اوہ سوری۔ آپ انہیں دنوں کی بات کر رہے ہیں۔'' عابی نے بڑی ہمدردی سے ان کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ جیسے انہیں جتانے کی کوشش میں تھا کہ پاؤں کا یہ حال تھا اور موصوف پکنک مناتے چلے تھے۔

عمیر آفندی مسکرا پڑے تھے۔ ''بچو! آج تو تم سے اپنے روبرو اعتراف کرا کے ہی رہوں گا۔'' دل میں عہد کرتے ہوئے اس کی طرف بغور تکنے لگے۔ ''ہاں انہیں دنوں کی۔ کیونکہ آج کل میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ کچھ کرو میرا دل لگانے کے



لئے۔ ایک کمرے میں بند رہ کر اندر بھی گھٹن سی پیدا ہونے لگی ہے۔''

''تو۔ کیا کر سکتا ہوں آپ کے لئے۔؟'' عابی بظاہر سوچنے لگا۔ لیکن چہرے پر ہنوز وہی غم و اندوہ کی دھندسی پھیلی تھی۔ شادابی نام کو نہ تھی۔ ان کی خاطر بھی چہرے کی کیفیت نہیں بدلی تھی۔

''چلو ایسا کرو۔ تم مجھے اپنی کسی اسٹوڈنٹ کے متعلق کچھ بتاؤ۔'' اس کے چہرے پر نظریں گاڑے گاڑے بولے۔

''اسٹوڈنٹ کے متعلق۔؟'' کچھ تحیر تھا استفسار میں۔

''ہاں۔ ایسا کہ جو ہر لحاظ میں بہت اچھا ہو۔ تعلیم میں' کردار میں' اخلاق میں۔ جس نے کبھی بھی' کسی قدم پر بھی' تمہیں مایوس نہ کیا ہو۔ میں شخصیات کے متعلق کتابیں پڑھنے کا شوقین ہوں۔ اور اس وقت میرے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔''

ان کی بات کرتے کرتے وہ کسی سوچ میں کھو چکا تھا۔

''تمہاری کلاس میں جتنے اسٹوڈنٹس ہیں' سمجھو شخصیات کے بارے میں اتنی کتابیں تمہارے پاس ہیں۔ پڑھنا یا سننا ایک ہی بات ہے۔ میرا دل لگ جائے گا۔ بیٹھے بیٹھے ہی سمجھو میری پکنک ہو جائے گی۔'' اپنے موقف کا اظہار کرنے کے بعد وہ بڑے غور سے اسے تکنے لگے۔ کافی دیر سوچوں میں کھویا رہنے کے بعد کرنل عمیر کو محسوس ہوا اس کا رنگ کچھ بدل رہا تھا۔ چہرے پر پھیلی دھند کچھ چھٹنے لگی تھی۔

''ہاں۔ ایک اسٹوڈنٹ ہے۔'' عابی کے موڈ کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ چہرے پر رونق اور آنکھوں میں روشنی سی اتر آئی تھی۔

''وہ بہت ذہین ہے۔ بہت پر کشش ہے۔ بہت با اخلاق اور با کردار ہے۔ اس جیسا اسٹوڈنٹ پوری یونیورسٹی میں کوئی نہ ہو گا۔'' وہ کھویا کھویا بولے چلا گیا تو کرنل عمیر آفندی کے چہرے پر تبسم گہرا ہوتا گیا۔ سب حقیقتیں ان پر واضح ہو گئی تھیں۔

''کوئی لڑکی ہے۔؟''

کرنل کے سوال نے اسے چونکا دیا۔ ''لڑکی۔؟'' وہ بوکھلا کر انہیں تکنے لگا۔ اس کی مدہوشی کو ہوش آ گیا' جس میں گم تھا۔ ''میں تو آپ کی خواہش کے مطابق وہ۔ وہ۔ ایک اسٹوڈنٹ کے متعلق آپ کو بتا رہا تھا۔'' عابی بری طرح گڑبڑا گیا تھا۔

"یہ آپ بیچ میں لڑکی کونسی لے آئے۔؟ کہاں سے لے آئے۔؟"

"وہ دراصل تم نے اس کی صفات بیان کرتے ہوئے پرکشش اور باکردار کہا ناں تو مجھے لگا کسی لڑکی کی بات کر رہے ہو۔ تمہارے اسٹوڈنٹس میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہی ہوتے ہیں نا۔؟"

"ہاں ہاں۔" عابی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "ارے! مجھے اک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔"

"لیکن شہزادے! وہ اس شخصیت کا بقیہ۔"

"پھر آ کر بتاؤں گا۔" اور وہ مزید کچھ کہے یا سنے بغیر ہی بڑی عجلت اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

"تم بہت معصوم ہو میرے یار! اور زمانے نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ کچھ کرنا پڑے گا مجھے بھی۔ نہیں دیکھ سکتا تمہیں اس زندگی بھر کی محرومیوں کے ساتھ مر مر کر جیتے ہوئے۔ نہیں دیکھ سکتا۔"

کرنل عمیر آفندی جیسے سٹرونگ بندے کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔ وہ جنہوں نے ملیحہ کی وفات پر بھی اک آنسو نہیں بہایا تھا۔ اس وقت ان کا دل بھی رو رہا تھا اور آنکھیں بھی آبدیدہ تھیں۔

## 52

وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس کے بوڑھے سوکھے ہوئے زرد زرد ہاتھ کسی رعشہ کی مریضہ کی طرح مسلسل کانپ رہے تھے۔ اور ان میں پکڑی چھڑی ان سے بھی زیادہ تیزی سے لرز رہی تھی۔

"میں جینیفر کی ماں ہوں۔" اس نے ڈاکٹر ابصار فاروقی سے اپنا تعارف کرایا۔ پھر گھٹنے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہلکا سا دباؤ ڈالا اور اک کراہ کے ساتھ ان کی میز کے بالمقابل سیٹ سنبھال لی۔



"جینی فر کی......؟" ڈاکٹر فاروقی اپنی نشست سے اٹھ کر اس انتہائی سفید سی رنگت والی خاتون کے قریب آن کھڑے ہوئے۔ "وہ خود کہاں ہے۔؟"

ڈاکٹر فاروقی کی بات کا کوئی بھی جواب دیئے بغیر اس نے اپنی بوڑھی چندی بدی آنکھیں زور سے میچیں تو اس کے رخساروں کی جھریوں سے ندیوں کی صورت پانی بہنے لگا۔ تب اس نے فراک کی جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھوں پہ دھر لیا۔

کتنے سارے لمحات اسی طرح گزر گئے۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

"کیا ہوا۔؟" اس کے بے تحاشا بہتے آنسو ڈاکٹر کو پریشان کر رہے تھے۔

"جینیفر کہاں ہے۔؟" پھر جس دروازے سے وہ داخل ہوئی تھی، اک نظر اس کی طرف ڈالی۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید جینی فر بھی اس کے ساتھ ہو۔ اس کے پیچھے پیچھے۔

"کیا اس کی بیماری کا آپ کو علم ہو گیا۔؟" وہ اس کی زار و قطار روتی آنکھوں کا مطلب بھی سمجھے تھے۔

"کیا۔؟ وہ بیمار تھی۔؟" اس کے آنسو تھم سے گئے اور وہ تجسس بھری نظروں سے انہیں تکنے لگی۔

"کیا بیماری تھی اسے۔؟"

"ایڈز تھی۔"

"ایڈز۔؟" اک طویل سی چیخ کے ساتھ وہ پھر رو دی۔ "آہ میرے خدا۔ ی۔ تبھی۔"

"کہاں ہے جینی فر۔؟ کچھ بتائیں بھی تو۔" ڈاکٹر ابصار نے اک بیقراری کے ساتھ دوبارہ جینی فر کے متعلق پوچھا۔

"وہ مر گئی۔ میری ایک ہی اکلوتی بیٹی تھی۔"

"کیا۔؟" ڈاکٹر ابصار فاروقی کھڑے نہ رہ سکے۔ اس کے ساتھ والی دوسری ی پر ڈھے سے گئے۔

"نہیں نہیں۔ اتنی جلد نہیں۔" ڈاکٹر فاروقی نے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"اس نے خودکشی کر لی۔" بڑھیا کی آنکھوں کا سیلاب تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔

"کب۔؟ اوہ خدایا۔"

"ایک مہینہ ہوا۔" اس نے بتایا۔ پھر رومال سے آنکھیں خشک کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔

"وہ مجھے ملنے میرے پاس آئی تھی۔ پورے آٹھ ماہ بعد۔"

ڈاکٹر نے پوچھا بھی نہیں تھا مگر وہ خود ہی تفصیل بتانے لگی۔

"میں بہت خوش تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اک مسلم سے شادی کر لی تھی۔ مگر پھر وہ اسے چھوڑ آئی۔ اس نے وجہ نہیں بتائی کہ کیوں چھوڑ آئی تھی۔ جبکہ وہ اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ اور میری جینی فر کو بچے بڑے پسند تھے۔"

بچے کی بات کرتے کرتے وہ پھر دھاڑیں مارنے لگی۔

"پھر بھی۔ پھر بھی وہ مرگئی۔ اس بچے کو دنیا میں لائے بغیر۔ اسے گود میں لئے بغیر۔ اسے دیکھے بغیر۔ اسے چومے بغیر۔ اس نے اس کو بھی مار ڈالا۔"

بولتے بولتے اس کا گلا خشک ہونے لگا۔ رعشہ زدہ ہاتھ سے چھڑی بھی نیچے گر گئی تھی۔ اور وہ بار بار اپنے نحیف و نزار کپکپاتے لرزتے ہاتھ کے ساتھ سینے پر صلیب کا نشان بنا رہی تھی۔

ڈاکٹر نے خود اٹھ کر پانی کے چند گھونٹ اسے پلائے۔ وہ جینی فر کی ماں کی نسبت بہت توانا اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے مگر جینی فر کی موت کا سن کر ان کی اپنی حالت بھی کچھ اس بوڑھی ماں جیسی ہی ہو رہی تھی۔ چند گھونٹ پانی کے انہوں نے خود بھی پیئے۔

"اس کے پاس اک بڑی رقم موجود تھی۔" پانی کے چند گھونٹوں نے اسے اتنا استوار کر دیا تھا کہ وہ ادھوری بات مکمل کر سکے۔ یا پھر وہ ممتا کی ماری ماں اس کا ذکر کرنا چاہ رہی تھی۔ اپنے دل کے سکوں کی خاطر۔ اسے قرار حاصل ہو رہا تھا اسے یاد کر کے۔ "اس میں سے کچھ رقم اس نے میرے نام بنک میں جمع کرا دی۔ اور اک بڑی رقم کسی بچوں کے ادارے میں خیرات کر دی۔ میں اسے یہ سب کرتے دیکھتی رہی۔ پوچھتی رہی۔ مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ پھر اسی رات۔ اسی رات۔"



اس کے پورے وجود میں لرزش تھی۔ اس نے ڈاکٹر کا بازو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔ "اس نے بہت ساری خواب آور گولیاں کھا لیں۔ وہ مرگئی ڈاکٹر۔ مجھ سے میری بیٹی ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئی۔" اب اس میں جیسے مزید اک لفظ بھی کہنے کی طاقت نہ تھی۔ اپنی پیشانی ڈاکٹر کے بازو پر ٹکا دی۔

اس کے نحیف و نزار وجود کی ناطاقتی محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر ابصار نے اسے بازوؤں میں بھرا اور اٹھا کر سامنے چھوٹے بیڈ پر لٹا دیا۔ جہاں وہ مریضوں کا معائنہ کیا کرتے تھے۔

چند لمبے لمبے سانس لینے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔

"مجھے یقین ہے، میری چھٹی حس کہتی ہے جینی فر نے اپنے شوہر کی وجہ سے موت کو گلے لگایا ہے۔ تم نے بتایا نا ابھی کہ اسے ایڈز تھی۔ وہ اسی کی وجہ سے ہوئی ہو گی۔ ورنہ میری بیٹی بڑی نیک تھی۔ اس کے ظلم کا شکار ہوگئی۔" ڈاکٹر کے بازوؤں کا سہارا لے کر وہ اٹھ بیٹھی۔

"ابھی دس ماہ پہلے تو مجھے ملنے میرے پاس آئی تھی۔ اس وقت وہ بالکل ٹھیک تھی۔ ڈاکٹر! مجھے اس شخص کا ایڈریس چاہیے۔ میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کروں گی۔ وہ قاتل ہے۔ میری جینی کا اور اس کے بچے کا۔ وہ دو انسانوں کا قاتل ہے۔"

"ریلیکس۔ لیڈی ریلیکس۔" ڈاکٹر ابصار فاروقی کے پاس اسے تسلی دینے کو بھی اک لفظ موجود نہ تھا۔ یکا یک ہی کچھ ایسا کال پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی سوچیں بھی مفلس ہوئی جا رہی تھیں۔

"خدا کرے خود اسے ایسی ہی موت آئے، جیسی میری بیٹی۔"

اک طویل سی ہچکی لے کر وہ اکھڑے اکھڑے سے سانس لینے لگی۔ ڈاکٹر نے پریشان ہو کر اک کافی کا مگ تھرماس میں سے بھرا اور اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔ بہت گرم کافی تھی مگر وہ غٹا غٹ چڑھا گئی۔ اندر تک جلی ضرور ہو گی مگر شاید اس دکھ اور کرب سے کچھ کم ہی تکلیف ہوئی ہو گی جس میں وہ اس وقت مبتلا تھی۔ اکلوتی بیٹی کی ناگہانی موت کا دکھ اور پریشانی۔ وہ بہت بے حال تھی۔

"خدا کرے اس کی ماں بھی اسی غم و اندوہ سے گزرے' جس میں سے میں گزر رہی ہوں۔" وہ اب بددعائیں دے رہی تھی۔ "میری طرح وہ بھی اولاد کے بغیر بے آسرا ہو کر رہ جائے۔ ڈاکٹر! مجھے اس کا نام بتاؤ۔ مجھے اس کا ایڈریس بتاؤ۔ میرے پاس اب اتنی رقم ہے کہ میں اپنی جینی کی موت کا انتقام لے سکوں میرا دل چاہتا ہے۔"

اس نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُر درد لہجے میں کہا۔

"میری بیٹی نے جس طرح بھری جوانی میں موت کا سفر اختیار کر لیا ہے اسی طرح وہ اپنی جوانی......"

اور ڈاکٹر ابصار سوچ رہے تھے۔ "اے ممتا کی ماری! تمہیں کیا پتہ وہ تمہاری سوچ سے پہلے ہی موت کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔"

چند دن پہلے اس کے کلینک میں ہی ہمایوں خان کے تمام ٹیسٹ ہوئے تھے۔ جن سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی ایڈز کا مریض تھا۔

"میں اپنی آنکھوں سے اسے اس حالت میں دیکھنا چاہتی ہوں' جیسے آخری بار اپنی بیٹی کو دیکھا تھا۔ ڈاکٹر! مجھے سکون نہیں آ رہا۔"

وہ بے چینی کے مارے تڑپ رہی تھی۔ اور اس کی بے کلی اور بیقراری ڈاکٹر ابصار فاروقی کے اندر اتر رہی تھی۔ وہ بھی بے چین ہوئے جا رہے تھے۔

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔" اس کے لیے تسلی تشفی کے چند الفاظ بڑی مشکل سے سوجھے تو ایسے کہ شاید وہ اپنے ہوش میں ہوتے تو کبھی نہ بولتے۔

"ماں! تم دیکھ لینا۔ جو بھی تمہاری بیٹی کا قاتل ہے۔ مجرم ہے۔ وہ ضرور اپنی سزا کو پہنچے گا۔" وہ اپنے رومال سے اس کے آنسو صاف کر رہے تھے "اس کی ماں بھی تمہاری طرح بلک بلک کر روئے گی۔"

وہ مزید کچھ کہنا چاہ رہے تھے کہ کسی چھناکے کی آواز سے چونک اٹھے۔ یہ آواز کیسی تھی۔؟ جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ پرلے دروازے میں ہمایوں خان کھڑا تھا۔ اور اس کے سامنے فرش پر کسی ٹوٹی ہوئی بوتل کی کرچیاں بکھری تھیں۔



## 53

"عبدالرحمان! یہ سب تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔؟ کیا زندگی کی کسی ایک بھی خوشی یا مسرت میں تمہارا حصہ نہیں ہے۔؟ آخر خدا نے تمہارے ہی مقدر میں یہ سب کیوں لکھ دیا ہے۔؟ کیا گناہ ہے تمہارا۔؟ کیا قصور تم سے سرزد ہو گیا ہے۔؟ جو یہ دکھ۔ یہ محرومیاں۔ یہ پریشانیاں' تمہارے نام لکھ دی گئی ہیں۔ سزا کے طور پر۔"

رات بڑی تاریک تھی۔ عابی کے بخت کی طرح سیاہ۔ اور وہ بڑی دیر سے لان میں ٹہل رہا تھا۔ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا بھی رہا تھا۔ آنکھوں میں آ جانے والا پانی بھی صاف کر رہا تھا۔

اندر کمرے میں جاتا تو عجیب طرح کی گھٹن کا احساس ہوتا۔ کچھ پڑھتا تو الفاظ مختلف قسم کے روپ دھار کر ناچنا شروع ہو جاتے۔ سمجھ میں ہی کچھ نہ آتا۔

ٹی۔ وی آن کیا تو کوئی موسیقی کا پروگرام تھا جو اک شور بن کر سماعتوں میں اترنے لگا۔ گھبرا کر فوراً آف کر دیا۔ کوئی دوسرا چینل بدل لیتا لیکن موڈ سخت آف تھا۔

مدحت کے کمرے میں جھانکا۔ ایگزامز کی وجہ سے وہ اپنی اسٹڈیز میں مصروف تھی۔ اور فرحت کے ساتھ آج کل پھر جیسے سارے ناطے ٹوٹ چکے تھے۔ کوئی بات' کوئی گھریلو ضرورت کا مسئلہ یا پھر شاپنگ وغیرہ کیلئے جانا' تقریباً سب ختم تھا۔

پچھلے دنوں جو ان سب کی زندگیوں میں اک رونقوں بھری ہلچل سی مچ اٹھی تھی اور سبھی جیسے جی اٹھے تھے۔ تو وہ سب کرنل عمیر آفندی کے دم قدم سے تھا۔ پھر ان کے پاؤں کو چوٹ لگ گئی۔ وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر رہ گئے۔ تو یہ سب بھی اپنے اپنے خول میں پھر بند ہو گئے۔

عابی شاید گھر کی اسی پُر رونق فضاؤں اور مسرتوں شادمانیوں بھرے ماحول کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا کہ اس نے مدحت سے اس کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ مگر اس دن' بنک نانو' صفیہ اور ایمان ان کے گھر آ گئیں۔ تب مدحت کے ساتھ کئے ہوئے ما کے تمام عہد و پیمان ٹوٹ گئے۔ پہلے کونسی زندگی کی کوئی انوکھی سہانی خوشی اس کے

پاس تھی جو اس میں مگن رہتا۔ کسی دوسرے کی پرواہ ہی نہ کرتا۔ اک صرف ایمان کی محبت تھی جو اس پابہ زنجیر قیدی کو سرشار رکھے ہوئے تھے۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ مقدر کو وہ بھی راس نہیں آئی۔ اس کے خیال' اس کی سوچ سے جو اندر اجالے بکھر اٹھتے تھے تو وہ بھی تاریکیوں میں ڈوب گئے۔ کہ وہ آج آخری بازی بھی ہار گیا تھا۔

وہ اس کے روبرو کھڑی تھی۔ اور وہ کیسے عجیب سے رشتے میں بندھا اس کے سامنے تھا۔ اوہ خدایا! کیسا بھیانک مذاق اس کے بخت نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ نہ عابی سے اپنی حالت سنبھالی جا رہی تھی اور نہ ایمان کی بگڑتی حالت دیکھی جا رہی تھی۔ کیسی بے بسی اور بے چارگی اس پر طاری تھی۔

''یا اللہ! ایک بار' صرف ایک بار اس سے علیحدگی میں بات کرنے کا موقع دے دے۔'' وہ دل ہی دل میں سارا وقت یہی دعا مانگتا رہا اور اسی تگ و دو میں مصروف بھی رہا۔

اور وہ شاید دانستہ اس سے کترا رہی تھی۔ کچھ ایسے کہ نظر تک ملانے سے گریزاں تھی۔ پھر اسی چھپن چھپائی جیسا کھیل کھیلتے کھیلتے وہ اپنی ماں اور نانی کے ساتھ واپس بھی چلی گئی اور عابی بے مراد دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

وہ رات عبدرحمان پر بڑی بھاری گزری تھی۔ کوئی اک تارا بھی اس کے نصیب کا آسمان پر روشن نہیں تھا۔ ہر سو تاریکی ہی تاریکی تھی۔

اور پھر کئی گھنٹے وہ اپنے اندر اور باہر کی تاریکیوں میں گم' حراساں و پریشان لان کے چکر لگاتا رہا تھا۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ دور افق پر صبح کی پہلی کرن جگمگا تو اسے احساس ہوا کہ رات گزر گئی تھی۔ شاید اسی طرح اس کی تیرہ بختی کی بھی سحر جائے۔

وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ ایمان کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا بہت ضروری تھا۔ اور اس مقصد کے لیے وہ اسے یونیورسٹی میں بھی مل تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اک نئی امنگ کے ساتھ بغیر ناشتہ کیے ہی یونیورسٹی لئے چل دیا تھا۔

مگر۔ وہ ساری امیدیں وہاں پہنچ کر دم توڑ گئیں۔ وہ کہیں بھی دکھ



نہیں دی تھی۔ کلاس روم میں جا کر رول کال لی تو وہاں بھی وہ غیر حاضر تھی۔

پھر بڑی مشکل سے اس نے اپنے لیکچرز ختم کیے۔ اور یہاں سے فارغ ہوتے ہی ماھم کی انٹی والی سفارش کے ساتھ اس کے ہوسٹل جا پہنچا۔ مگر وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ''سر! ایمان بی بی کا کمرہ لاکڈ ہے۔'' ملازم نے اطلاع دی۔

اس کے بعد کئی دن' بہت سارے دن عابی کے اسی طرح گزرے۔ سارا سارا دن نظریں یونیورسٹی کی گراؤنڈز میں اسے تلاش کرتی رہتیں۔ رول کال کے وقت اس کا نام بول کر کئی کئی بار نگاہیں اٹھا کر اس کی سیٹ کی طرف دیکھتا۔ وہ نظر نہ آتی تو پھر بھی اس کی حاضری مارک کر کے اپنی دوستی' محبت' چاہت اور وفا کی اک شمع جلا دیتا۔ اندر دل کی دھڑکنیں نامرادی کے الارم بجاتی رہتیں۔

پھر کلاسز آف ہونے کے بعد ہوسٹل کا چکر لگانا نہ بھولتا۔ مگر وہاں بھی مایوسی ہی سے ٹکراؤ ہوتا۔

''خدایا! ایک بار' صرف ایک بار اس سے ملا دے۔'' روزانہ صبح کی نماز کے بعد دعا مانگتا۔ مگر کہیں بھی' کوئی بھی نہ دعا پوری ہو رہی تھی اور نہ تدبیر۔ اور تقدیر تو شاید ہمیشہ کے لئے روٹھ چکی تھی۔

زندگی کے آغاز سے لے کر زندگی کے انجام تک۔

حیات کی آخری سانسوں' دل کی آخری دھڑکنوں تک۔

## 54

ہمایوں خان نے ڈاکٹر الصار فاروقی اور جینی کی ماں کی بہت ساری باتیں الی تھیں۔ جب اس کے ہاتھ سے بوتل چھوٹ کر گری تو ڈاکٹر صاحب اس کی ف متوجہ ہو گئے تھے۔ البتہ جینی کی ماں کو رونے دھونے سے ہی فرصت نہ تھی۔ وہ مسلسل اسے بددعائیں دیئے جا رہی تھی۔ اسے تو شاید بوتل گر کر ٹوٹنے کی بھی آواز ا سنائی دی تھی۔ اس کے اندر جو بیٹی کی موت سے دل ٹوٹ کر کرچی کرچی

سارے وجود میں بکھر گیا تھا اسی کے دیئے زخموں کو سہلا رہی تھی۔

"میرا جینی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر! مجھے اس ظالم شخص کا ایڈریس چاہیے۔" وہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ بار بار وہی بات دہرائے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر ابصار فاروقی اسے واویلا کرتے چھوڑ کر خود ہمایوں خان کی سمت بڑھ آئے تھے۔ مگر وہ پھر بھی بولے جا رہی تھی۔ "میں اس پر کیس کروں گی۔ وہ قاتل ہے۔ دو انسانوں کا قاتل ہے۔ میں اس ملک کے ہر پیپر میں خبر چھپوادوں گی۔ اسے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔"

"تم کب آئے۔؟" اس کی آہ و بکا اور گریہ وزاری کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی ہمایوں خاں سے پوچھ رہے تھے۔ "کوئی کام تھا مجھ سے۔؟"

"ہوں۔؟ ہاں۔؟" ہمایوں خاں کا دماغ جیسے حاضر نہ تھا۔ "کام ہی تھا۔ اور شاید وہ ہو بھی گیا۔" سوچوں میں کھویا کھویا وہ واپس مڑ گیا۔ تو ڈاکٹر فاروقی نے پیچھے سے اسے پکار لیا۔

"ہمایوں خان سنو۔" اس کا چہرہ معمول سے کہیں زیادہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کو بغور تکتے تکتے پوچھنے لگے۔ "کوئی بات کرنا تھی مجھ سے۔؟"

"راستہ پوچھنا تھا ڈاکٹر! اور وہ مل گیا۔"

"کہاں کا راستہ ہمایوں خان! اور میرے بغیر بتائے ہی مل گیا۔؟" ڈاکٹر ابصار پوچھتے ہی رہ گئے مگر کوئی جواب دیئے بغیر وہ نکلے ہی چلا گیا۔

ڈاکٹر فاروقی کاریڈور تک اس کے پیچھے لپکے تھے۔ "ہمایوں خاں میری بات تو سنو۔" مگر اسکی سماعتوں میں جیسے کوئی آزار تھا۔

"اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔" مگر ڈاکٹر فاروقی کی سماعتوں میں کوئی آزار نہ تھا۔ جینی کی ماں کی رقت بھری آواز صحیح طرح اتر گئی۔

"مل جائے گی۔ مل جائے گی۔" وہیں سے اسے تسلی دیتے ہوئے پھر اس کے قریب چلے آئے۔

وہ بیڈ سے نیچے اتر کر چھڑی کے سہارے کھڑی تو ہو گئی تھی مگر وجود ہنوز کانپ رہا تھا۔ دکھ اور صدمے نے اسے اس قدر نڈھال کیا ہوا تھا کہ ڈاکٹر فاروقی



نے اندازہ لگایا وہ واپسی کے سفر کے قابل نہ تھی۔

"آپ آج رات یہیں رک جائیے۔" ڈاکٹر نے اسے بازو کا سہارا پیش کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

"یہاں۔؟ کلینک میں۔؟" اس نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"کلینک کے ساتھ ہی میری رہائش گاہ ہے۔ وہاں آپ کا انتظام کرائے دیتا ہوں۔" وہ فوراً مان گئی۔ خود وہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس وقت اتنے دور دراز کے سفر کے قابل نہ تھی۔

ڈاکٹر ابصار فاروقی کو حقیقی طور پر اس کے ساتھ بے انتہا ہمدردی تھی۔ وہ اک عیسائی عورت تھی اور ڈاکٹر ابصار کو وہاں کے عیسائی لوگوں کے ساتھ بڑی شکایات تھیں۔ ان کے چال چلن انہیں پسند نہ تھے۔ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہوئے وہاں کی عورت کی بے راہ روی تو انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

مگر اس وقت ان کی ساری کی ساری ہمدردیاں اس بوڑھی ماں کے ساتھ تھیں۔ اس کی بیٹی یقیناً ہمایوں خاں کی وجہ سے مری تھی۔ اور ہمایوں خاں کو جو یہ ایڈز کا مرض لاحق ہوا تھا تو یہ اس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔

ہمایوں خاں نے ایک مسلمان عورت کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اس کے پاس اپنے رسول کے پیغامات تھے۔ اس کے پاس قرآن تھا۔ پھر اس نے کیوں اپنے پیغمبر کی فرمانبرداری نہیں کی تھی۔ کیوں اپنے قرآن کو بھولا رہا۔ اپنے خدا کے دیئے ہوئے احکامات کے مطابق اس نے کیوں اپنی زندگی نہیں گزاری تھی۔؟

ڈاکٹر ابصار فاروقی کو توفیق سے ہمایوں خان کے سارے حالات کا علم ہو گیا تھا۔ جب سے وہ اس ملک میں آیا تھا اس نے ہر وہ حرکت کی تھی جس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا تھا۔ اس نے شراب نوشی بھی کی تھی۔ اس نے قمار بازی بھی کی تھی۔ اس نے عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلقات بھی رکھے تھے۔ اس نے بے شمار جھوٹ بولے تھے۔ مکر و فریب سے اس نے باپ سے پیسہ منگوایا تھا۔ اور عیاشیاں کی تھیں۔ وہ پیسہ جو پاکستان کے کئی غرباء و مساکین کی بھوک ننگ کو مٹا سکتا تھا۔

غرض ہر وہ ناجائز کام ہمایوں خاں نے کیا تھا جس سے قرآن میں منع فرمایا گیا تھا۔ اور ہر وہ کام اس نے نہیں کیا تھا جس کے کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ یوں اپنے ہر غلط طرز عمل کا اس نے حساب تو دینا تھا۔ یہ قانون قدرت تھا۔ اپنی بدکرداریوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا نہیں بچا تھا تو ہمایوں خان کیسے بچ جاتا۔؟؟ اور یہ سب' جو کچھ ڈاکٹر ابصار فاروقی تمام رات سوچتے رہے تھے۔ دکھ اور افسوس کی وجہ سے سو نہیں سکتے تھے' تو یہ سب ہمایوں خاں کے بھی علم میں تھا۔

اگلے دن صبح نو بجے ہی ڈاکٹر ابصار فاروقی کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ہمایوں خاں نے سلیپنگ پلز لے کر خودکشی کر لی ہے۔'' توفیق نے اطلاع دی تھی۔

ڈاکٹر ابصار فاروقی کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ وہ یکا یک بے انتہا غم زدہ ہو گئے۔ ہمایوں خاں ان کا ہم وطن تو تھا۔!

## 55

''السلام علیکم۔''

صفیہ نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ بلا سان وگمان ایمان سامنے کھڑی تھی۔

''یہ۔ یہ تم کیسے آ گئیں۔ اچانک ہی۔؟'' صفیہ کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔

''میں اداس ہو گئی تھی۔'' چھوٹا اٹیچی جو اٹھائے کھڑی تھی۔ نیچے رکھ کر وہ اماں کی سمت لپکی۔ رنگ پیلا سا ہو رہا تھا۔ چہرے پر گھر پہنچنے کا وہ خوشگوار احساس! تاثر بالکل نہ تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ ماں کے قریب پہنچتے پہنچتے کندھے کے ساتھ لٹکا بیگ بھی اتار کر وہیں نیچے قالین پر ٹکا دیا۔ پھر ان کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہی ان کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے رونے لگ پڑی۔

''ارے ارے۔'' صفیہ ہنسنے لگیں۔ ''ابھی کل ہی تو ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ اتنی جلد اداس بھی ہو اٹھیں۔ کل کو سسرال رخصت ہو گئیں تو پھر کیا کرو گی۔؟ اتنی



جلد تو تمہاری سگی پھوپھو بھی تمہیں ماں سے ملنے کی اجازت نہ دے گی۔''

صفیہ اسے بہلانے اور چپ کرانے کی خاطر سسرال کا ذکر شرارت سے لے بیٹھیں۔ مگر وہ پھر بھی روتی رہی۔ کل سے فرحت خالہ کے گھر سے آ کر آج اس وقت تک وہ کتنی ہی بار روئی تھی۔ پھر بھی آنسو کہیں تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''نجانے اماں کیا سوچیں' ان آنسوؤں کے متعلق۔'' یہ سوچ کر بھی وہ ان پر ضبط کے بند نہیں باندھ سکی تھی۔ بے اختیار روتی چلی گئی۔

''بس نا بس۔ اب تو تو میرے پاس ہے۔'' صفیہ نے دوپٹے کے پلو سے اس کا چہرہ پونچھا۔ پھر اس کا سر منہ چومتے ہوئے اس کا خیال بٹانے کو پوچھنے لگیں۔

''کس کے ساتھ آئی ہو۔؟''

''اکیلی آئی ہوں۔ بس سے۔'' اس نے پھر چہرہ ان کے سینے میں گھسا لیا۔

''بس سے۔؟ ہائے ہائے تو کل ہمارے ہی ساتھ کیوں نہ چلی آئیں۔ خواہ مخواہ بسوں کے دھکے کھانے کا تمہیں کچھ زیادہ ہی شوق ہوتا ہے۔''

ہر آسائش موجود ہونے کے باوجود صفیہ کو اس کا یوں رل رل کر آنا پسند نہ آیا۔ عجب خر دماغ لڑکی تھی۔ ہر وقت کسی نہ کسی ایڈونچر کا ہی بھوت سر پر سوار رہتا تھا۔ پھر اپنے خیالات کا اظہار وہ بول بول کر کرنے لگیں۔

''خدا نہ کرے ایسا ایڈونچر کسی کو لاحق ہو۔ کہ اپنا وجود ہی رولتا پھرے۔''

ماں کی کسی بھی بات کا جواب دیئے بغیر ایمان ان کے سینے میں چہرہ چھپائے روتی رہی اور سوچتی رہی۔ جس کام کے لئے وہ رکی تھی' وہ تو انجام کو پہنچ گیا تھا۔ گھر میں ہوتی تو شاید وہ نہ کر سکتی۔ بھلا اماں کے علم میں لائے بغیر وہ ماھم کو خط لکھ سکتی تھی۔؟ اور اگر لکھ بھی لیتی چوری چوری' تو پوسٹ تو کسی دوسرے سے ہی کرانا تھا۔ کسی ملازم سے یا ارسل سے۔ تب تو اماں یہ راتوں رات خط لکھنے کی وجہ ضرور پوچھتیں۔ پھر وہ انہیں کیا بتاتی۔؟

اس نے کبھی اماں سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اک اماں سے ہی کیا۔ کسی سے نہیں۔ جو بات نہ کرنا ہوتی' نہ بتانا ہوتی تو خاموش ہو جاتی۔ مگر جھوٹ کبھی نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ ان سے لپٹی رہی۔

اور یہ اقدام بہت ضروری تھا۔ کیسا کیسا دل رویا تھا۔ تڑپا تھا۔ جب اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کا پروانہ لکھا تھا۔ ہمایوں خان سے شادی کرنا اس کے لیے موت ہی کے مترادف تھا۔ مگر وہ اس نے خود قبول کی تھی۔

آہ! یہ گزرنے والے چند گھنٹے۔ کس قدر اذیت اور پریشانی میں اس نے کاٹے تھے۔ کچھ وہی جانتی تھی۔ اک لمحہ کے لیے اس کی نگاہوں سے خالہ فرتی کا چہرہ نہیں ہٹتا تھا۔ اور عابی۔

اس کی طرف تو وہ دیکھ ہی نہ سکی تھی جب یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ فرتی خالہ کا شوہر تھا۔ دیکھ لیتی تو نجانے کیا ہو جاتا۔ یا تو وہ خود جی نہ رہی ہوتی یا پھر اپنے اندر اٹھتے طوفانوں اور ان کی وجہ سے جو ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی ان سے گھبرا کر انتقاماً عابی کی جان لے چکی ہوتی۔ کبھی کسی محبت کرنے والے نے اپنی محبوبہ کو اتنا بڑا دھوکا نہیں دیا ہوگا جو عابی نے اس کے ساتھ کر ڈالا تھا۔ اپنا دکھ اسے ساری دنیا کے دکھوں سے زیادہ عظیم اور منفرد محسوس ہو رہا تھا۔ اور اسی لئے کسی کل قرار نہیں پا رہی تھی۔ کاش! اسے لمحہ بھر کے لیے ہی اکیلا کہیں مل جاتا۔ اور ایمان کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا۔ وہ اسے زندہ چھوڑتی اور نہ خود کو۔ یہ کوئی جینے کا مقام تھا؟ وہ تو فرتی خالہ کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے جوگی نہ رہی تھی۔

اماں کے لمس میں بڑا سکون تھا۔ مگر اندر جو آتش فشاں پک رہا تھا' وہ اس سکون کو بھی بے سکون کیئے دے رہا تھا۔ بے شمار بے ربط سی سوچوں نے اسے پاگل کیا ہوا تھا۔ جوش جنون میں اسے پتہ ہی نہیں چلا اس نے ماھم کو کیا کچھ لکھ ڈالا تھا۔ ہاں البتہ اسے اپنی آئندہ زندگی کا راستہ ضرور دکھائی دے گیا تھا۔ اس کے والدین نے جس شخص کے ساتھ اسے ہمیشہ کے لئے باندھ دیا تھا' وہی اس کی منزل تھی اور وہیں اس کو پناہ مل سکتی تھی۔

تبھی اس نے ماھم کو خط کے آخر میں یہ تاکید کر دی تھی کہ وہ جلد از جلد ہمایوں خان سے ملکر اس کی رخصتی کی تاریخ طے کر کے ادھر پھوپھو کو اطلاع کرا دے۔ اس وقت تو بہت بہادر بن کر اس نے یہ سب کچھ کر ڈالا تھا۔ خط لکھا۔ خود اپنے ہاتھوں سے پوسٹ کیا۔ کسی دوسرے کا کیا اعتبار۔؟ اور اب اماں کے سینے سے لگی روئے جا



رہی تھی۔ نہ صبر آ رہا تھا نہ قرار۔ اس جینے سے تو اچھا تھا وہ مر گئی ہوتی۔

''روئے جا رہی ہو بچوں کی طرح۔ کچھ عقل کرو۔'' اب صفیہ کو الجھن سی ہونے لگی تھی۔ کتنا بھی اداس ہوتی ان کے بغیر۔ مگر پہلے اس نے ایسے کبھی نہیں کیا تھا۔ اماں کا الجھا ہوا لہجہ اسے چونکا گیا۔ جلدی سے چہرہ اونچا کر کے وہ انہیں تکنے لگی۔ پر اماں کے چہرے پر کچھ ایسا ناگوار تاثر نہ تھا۔ اس کے برعکس وہاں اک ملائم سی مامتا بھری شفقت ہی کا عکس بکھرا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔؟'' اسی محبت بھرے انداز میں صفیہ نے پوچھا تو اس نے جلدی جلدی اپنے آنسو خشک کر لئے۔

''بس کچھ بھاری بھاری سی ہے۔ تبھی چلی آئی۔'' بڑی مشکل سے خود کو نارمل کیا۔ ساتھ ہی اپنے آپ کو اندر ہی اندر کوسا۔ کوئی حد بھی تھی بے عقلی کی۔ خود ہی دل کے راز کھولنے کے درپے تھی۔ پاگل!

''اچھا کیا۔ فضل بی بی! کرمو کو ذرا بلانا۔ کچھ سودا منگوانا ہے۔ اپنی ایمان آئی ہے نا۔'' اتنے دنوں بعد آئی تھی۔ صفیہ ہمیشہ اس کی وی۔ آئی۔ پی کی سی خاطر مدارات کیا کرتی تھیں۔

فضل بی بی ایمان کا نام سن کر کچن میں سے نکل آئی تھی۔ ''صدقے۔ قربان۔ بیٹا آ گئی۔ رونقیں اتر آئیں گھر میں۔'' ایمان کو بہت سارا پیار کر کے' حال احوال پوچھکر وہ کرمو کو بلانے چل دی۔

''اماں! میں ذرا اپنے کمرے میں۔''

''ہاں ہاں جاؤ۔ شاور لو۔ طبیعت درست ہو جائے گی۔''

اپنی چیزیں سنبھالتے ہوئے ایمان کمرے کی جانب چل دی۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ لگ رہا تھا ابھی گری۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

دوپہر کو کھانے پر ارسل سے تو ملاقات ہوگئی البتہ باپ سے نہ ہو سکی۔ اچھا ہی ہوا۔ ان کی نگاہوں میں تو جیسے دوربین فٹ تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں کے ذریعے دلوں کے حال جان جایا کرتے تھے۔ وہ قدرے ریلیکس ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟ کچھ اپ سیٹ سی لگ رہی ہو۔'' ارسل نے پوچھا مگر وہ

ٹال گئی۔ ’’بس میں بڑی بھیڑ تھی اور گرمی بھی۔‘‘

’’بعض وقت سرپرائز دینے کا شوق بھی مروا دیتا ہے۔‘‘ ارسل نے اس کا مذاق اڑایا۔ پھر ہمدردی بھرے پیار سے بولا۔ ’’اک فون کال کھڑکا دینی تھی پگلی! تیرا ارسل دو منٹوں میں پہنچ جاتا۔ یہ لمبی سی گاڑی لئے۔ بالکل نئے ماڈل کی۔‘‘

’’دو گھنٹوں کا راستہ اور دو منٹوں میں پہنچ جاتا۔‘‘ جواب میں اس نے بھی مذاق کر ڈالا۔ دونوں بہن بھائی ہنسنے لگے۔ پھر ہنستے ہنستے ایمان کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ مگر ارسل سمجھ ہی نہ سکا کہ اس کی پیاری بہن کس مصیبت میں پھنسی تھی۔؟ آہ! وہ ہنسنے کی کس انداز میں ایکٹنگ کرے کہ آنکھوں کا پانی سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ اور ایمان نے ہنستے ہنستے دوپٹے کا پلو آنکھوں پہ رکھ لیا۔

’’کیا ہوا۔؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ اماں کے پوچھنے پر اک گہری سی مسکراہٹ کے پیچھے اپنے ہر دکھ، ہر زخم کو چھپاتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی سمت چل دی۔ ’’میں ذرا آرام کروں گی۔‘‘

دو تین گھنٹے اس نے کروٹیں بدلتے گزار دیئے۔ مگر نیند نہیں آئی۔ حالانکہ پچھلی ساری رات کی جاگی ہوئی تھی۔ پھر بھی نہیں آئی۔ چاہنے کے باوجود نہیں آئی۔ آتی بھی کیسے۔؟ دماغ سوچوں سے خالی ہوتا تو آتی نا۔ سر درد کے مارے پھٹ رہا تھا۔ دو ٹیبلٹس بھی لیں۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بس آنکھوں میں سے پانی بہتا رہا۔

یوں کتنے سارے دن کچھ اسی انداز میں گزر گئے۔ صفیہ، ارسل، واصل آفریدی، ہر کسی نے اپنی اپنی محبت نبھانے کے لئے نرمی اور ملائمت سے پوچھا بھی کہ اس کو کیا پریشانی تھی، کیا تکلیف تھی جو وہ اندر ہی اندر گھٹی جا رہی تھی خاموش رہتی تھی۔ پہلے کی طرح سب میں بیٹھ کر ہنستی بولتی نہیں تھی۔

اس کے آنے سے جو گھر کے سناٹے قہقہے لگا اٹھتے تھے اب کی بار وہ چپ تھے۔ سناٹے میں آئے ہوئے تھے۔

مگر کسی کو بھی اس نے تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔

’’کیا آخری سمسٹر میں بیٹھنے کا ارادہ نہیں ہے جو غیر حاضریاں بھی کیئے جا



رہی ہو اور پڑھائی بھی نہیں کر رہیں۔؟‘‘ اک دن ارسل نے پریشان ہو کر اپنے خدشے کا اظہار بھی کر ڈالا تھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

لیکن اس کے اندر، اس کے اپنے دل میں اس سوال کا جواب واضح تھا۔ اس نے کونسی آگے تعلیم جاری رکھنا تھی کہ وہ اپنی حاضریاں پوری کرنے کی کوشش کرتی یا پڑھائی کی طرف توجہ دیتی۔ وہ تو ہمایوں خان کی طرف سے رخصتی کے اصرار کے ساتھ پھوپھو کی فون کال یا خود آنے کے انتظار میں تھی۔

اسے آئے پندرہ بیس دن ہو گئے تھے۔ اور اب تو کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے اس کا انتظار ختم ہونے والا تھا۔ یہ پندرہ بیس دن کیسے پندرہ بیس صدیوں پر محیط گزرے تھے۔ کچھ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ ایسے تکلیف میں تھی جیسے وجود کے ہر اک روئیں کی جگہ اک اک کانٹا اگ آیا تھا اور اس کی چبھن ہر لمحہ اسے اذیت میں مبتلا رکھتی تھی۔ ہمیشہ کھلا کھلا سا رہنے والا چہرہ ایسے مرجھا گیا تھا جیسے صبح کا کھلا پھول شام کو سوکھ کر ٹہنی پہ لٹک جائے۔ یوں کہ نہ تازگی باقی رہے نہ بو باس۔ بس ابھی گرا۔ ابھی ٹوٹ کر گرا۔ آئینے میں خود کو دیکھتی تو ایسے ہی محسوس ہوتا۔ بھلا یہ ٹوٹ کر گر کیوں نہیں جاتا۔؟ سوچتی ضرور۔ دعا بھی کرتی۔ مگر ٹوٹ کر گرنے والا عمل اس کے اپنے اختیار میں نہ تھا۔

ارسل اور واصل آفریدی تو اپنی مصروفیات میں گم تھے۔ نئی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ دونوں صبح سویرے اندھیرے منہ نکل جاتے اور رات گئے واپس آتے۔ ڈیرے پہ بھی حاضری دینا لازم تھا۔ گاؤں والوں کے اور بھی بہت سارے مسائل حل کرنا ہوتے تھے۔ یوں واپسی ہوتے ہوتے کافی دیر ہو جاتی۔

واحد صفیہ تھیں جو بیٹی کے لئے از حد پریشان تھیں اور مزید پریشان ہوتی رہتیں۔ دہائیاں دیتی رہتیں۔ ’’ارے یہ باپ بیٹا کیوں دھیان نہیں دیتے۔ کونسی مصروفیات انہیں چمٹ گئی ہیں جو اپنی لاڈلی کا یہ سوکھا چہرہ اور پھیکا پڑا ہوا رنگ روپ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کسی ڈاکٹر کے پاس ہی لے جائیں۔ خدانخواستہ کوئی بڑا روگ ہی نہ لگ جائے بچی کو۔‘‘

’’نہ نہ۔ ایسے نہ کہیں۔‘‘ فضل بی بی انہیں خاموش کرا دیتی۔ ’’منہ سے اچھی

بات نکالیں۔''

''اس سے بڑا روگ اور کونسا ہوگا اماں جو آپ کی بیٹی کو لگے گا۔ یہ کینسر جیسا مرض انشاء اللہ اپنا کام دکھا کر ہی رہے گا۔'' وہ اپنی حالت اور ماں کی پریشانی سے خاصی محظوظ ہوتی رہتی اور پھر اس بھی اسے اس وقت کا شدت سے انتظار تھا۔ جب پھوپھو خود آئیں یا ان کی فون کال۔

وہ نہیں چاہتی تھی اس کا انجام' اس کو لگے کینسر کا نتیجہ' یہیں ماں باپ کے سامنے ہی نکل آئے۔ ان کا دکھ بھی اس کی برداشت سے باہر تھا۔''ہمایوں خان! تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔؟''

اور پھر اس دن اچانک ہی اس کا انتظار ختم ہوگیا۔

''بڑی بی بی! ایمان بیٹی کے سسرال سے فون ہے۔''

ایمان اپنے کمرے میں تھی جب اس کی سماعتوں میں فضل بی بی کا یہ عجلت بھرا جملہ اترا تھا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے کی چوکھٹ میں آن کھڑی ہوئی۔

سامنے لاؤنج میں اماں ریسیور کان سے لگائے بیٹھی تھیں۔

''کیا۔؟ ہمایوں خاں کا انتقال ہوگیا ہے۔؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟ امریکہ سے اس کی میت۔''

آگے اماں نے پتہ نہیں کیا بولا تھا۔؟ ان کی آواز گھٹی جا رہی تھی اور رخساروں پر آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔ جس ہاتھ میں ریسیور پکڑا تھا وہ بری طرح لرز رہا تھا۔

پھر اس کے بعد ایمان سے نہ کچھ سنا گیا نہ دیکھا گیا۔ وہ بیہوش ہو کر وہیں چوکھٹ میں ہی گر پڑی تھی۔

اک طویل سی چیخ کے ساتھ ساتھ دھڑام کی آواز صفیہ کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ ریسیور ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ پھر جلدی سے رخ موڑ کر دیکھا۔ ایمان کا بیہوش وجود دروازے کے وسط میں پڑا تھا۔ صفیہ کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔



''کہاں ہو سب۔ فضل بی بی۔ کرم داد۔!'' وہ چیخ چیخ کر ملازموں کو ونے لگیں۔ اٹھ کر کھڑا ہونے کی اور اس تک پہنچنے کی سکت نہ تھی۔ بہت کوشش کی ٹانگوں نے جیسے ان کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔

''اماں۔! اماں۔! خدا کیلئے کسی کو بھیجیں۔ ارسل اور اس کے باپ کو یں۔ ارے میری بچی۔ ہائے کوئی اسے دیکھے۔ اٹھائے کوئی اسے فرش پر سے۔ کسی ٹر کو......''

اور پھر صفیہ کی آواز بھی ڈوب گئی۔

## 56

موت تو مقدر ہوگئی ہمایوں خاں۔ اور جب مرنا ہی ٹھہرا تو کیا ایڈز کیا پستول کی گولی اور کیا خواب آور گولیاں۔ بات تو ایک ہی ہے۔

جینی کی ماں کی خواہش ہے کہ وہ ہمایوں خاں کو اپنی بیٹی کی طرح مردہ حالت میں دیکھے۔ جب جینی زندہ نہیں رہی تو پھر ہمایوں خاں کیوں باقی رہے۔ کیا سچ مچ میری ہی وجہ سے جینی نے موت کو گلے لگایا ہے۔؟ ہر کسی کی زبان پر یہی سوال ہے اور ہر کوئی اس سوال کا جواب جاننا چاہتا ہے۔

ہاں۔ یہ سچ ہے۔ میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ اور جینی کی ماں کی خواہش کے مطابق وہی موت اپنے لئے منتخب کرتا ہوں جو جینی کو ملی۔

میں ایڈز کا مریض ہوں۔ اس مرض کے ہاتھوں مرنا چاہوں تو معلوم نہیں مجھے کتنے سال ایڑیاں رگڑنا ہوں گی۔ تب کہیں جا کر خاتمہ ہوگا۔ تب تک جینی کی بوڑھی ماں مجھے اس کی

سی حالت میں دیکھنے کو زندہ رہے گی بھی یا نہیں۔ اس لئے میں
نے اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے ان خواب آور گولیوں
کا انتخاب کیا ہے۔ بالکل جینی فرجیسی موت۔؟

یہ میرے سامنے پوری بیس گولیاں پڑی ہیں۔ وہی
ٹرینکولائیزر' جو سکون بھری نیند کے لئے جینی کبھی کبھار لیا کرتی
تھی۔ اس نے ایک دن مذاق مذاق میں مجھ سے پوچھا تھا۔
''اگر کبھی میں مرنے کیلئے ان گولیوں کا انتخاب کروں تو مجھے یہ
کتنی کھانا پڑیں گی۔؟'' میں نے بھی اسی کے سے انداز میں ہنستے
ہوئے مذاق بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''پوری بیس۔'' اور مجھے
یقین ہے اس نے بیس ہی گولیاں کھائی ہوں گی۔ وہ مجھ سے
محبت بھی بہت کرتی تھی اور میری ہر بات پر یقین بھی فوراً کرلیا
کرتی تھی کہ وہ مجھے اک سچا انسان سمجھتی تھی۔

آہ جینی فر! کاش تم اس وقت میرے سامنے ہوتیں
تو میں تمہیں بتاتا' اپنے جرائم کا اعتراف کرتا' کہ جس شخص کو تم
سب سے زیادہ سچا سمجھتی رہیں' اسی نے زندگی میں سب سے
زیادہ تمہارے ساتھ جھوٹ بولے۔ تمہارے یقین کو توڑا۔
تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ مجھے معاف کردینا جینی فر! مجھے
معاف کردینا۔ لیکن میں بھلا تم سے یہاں' ابھی معافیاں کیوں
مانگ رہا ہوں۔ پہنچ تو رہا ہوں جلد ہی تمہارے پاس۔ تو۔
تمہارے ساتھ معاملے کی ساری بات تو وہیں ہو جائے گی۔ میرا
انتظار کرو۔

ہاں تو۔ اس دنیا کی' زندگی کی بات کر رہا تھا۔ چند
اعترافات تھے کرنے والے۔ میں نے زندگی میں کسی دوسرے
کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کرتا رہا ہوں صرف اپنے لئے۔
اپنی ذات کے لئے۔ اپنی خوشیوں' اپنی خواہشوں اور اپنے



ارمانوں کے لئے۔ سنا ہے جب کوئی انسان کسی دوسرے کے
لئے کچھ کرتا ہے تو اسے بڑا سکون ملتا ہے۔ بڑا مزہ آتا ہے۔
موت کی دہلیز پہ کھڑا ہوں۔ چلو آج یہ مزہ بھی چکھ لوں۔ کوئی
انجوائے منٹ باقی رہ نہ جائے جو میں نے زندگی میں حاصل نہ
کی ہو۔

ہنسی آ رہی ہے اپنے آپ پر۔ اپنی زندگی پر اور۔
اپنے اعمال پر۔ کیا کیا میں نے۔؟ کیا کیا میں نے۔؟
''جس طرح میں رو رہی ہوں آج۔ خدا کرے
ہمایوں خان! تمہاری ماں بھی اسی طرح روئے۔'' جینی کی ماں
کی دوسری خواہش یہ ہے۔ خواہش یا دعا۔؟

اسے کوئی یہ بتادے کہ وہ فکر نہ کرے۔ نہ صرف میری
ماں ہی بلکہ میرا باپ بھی اسی طرح روئے گا۔ ساری عمر کہ میں
ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ان کی کروڑوں کی جائداد کا واحد
وارث۔ اور وہ میرے ہی ذریعے اپنی جائداد و املاک اور
رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ کا مظاہرہ اور نمود و نمائش کرکے خود کو فیملی میں
سب سے بلند اور برتر ثابت کر سکتے تھے۔ تبھی انہوں نے مجھے
اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ جیسے عالی شان ملک میں
بھیج دیا۔ حالانکہ مجھے کسی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں تھی۔ پاکستان
میں ہی میں نے اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری لے لی تھی۔ اس کے باوجود
کہ میرے باپ کے پاس اتنی دولت ہے کہ میں کوئی بڑا بزنس
کروں یا کسی اعلیٰ جاب پر فائز ہوں۔ نہیں ایسا کچھ نہیں اسے
چاہیے تھا۔

میں پاکستان میں ہی تھا جب بری صحبت میں پڑ
گیا تھا۔ شاید میرے والدین کا یہ بھی خیال تھا کہ میں امریکہ
آکر سدھر جاؤں گا۔ مگر اس جیسے آزاد ماحول والے ملک میں آ

کر میرے سدھرنے کے امکانات کتنے ہو سکتے تھے؟ یہ اندازہ کسی نے بھی نہیں لگایا۔ میں جو اک مسلمان عورت کی گود میں پل کر جوان ہوا مگر صحیح مسلمان نہ بن سکا تو ایسے ملک میں آ کر بھلا کس طرح اسلامی شعائر سیکھ لینا تھے؟ اور میں نے کیسے سدھر جانا تھا۔؟ میں نے؟ جسے نہ ماں کی گود سے صحیح تربیت ملی اور نہ کسی سکول' کالج یا یونیورسٹی سے۔ یہ میرے والدین نے سوچا ہی نہیں۔

تب میں نے یہاں آ کر اک اک لمحہ عیاشی میں گزارا۔ انجوائے منٹ ہی انجوائے منٹ۔ پیدا ہوتے ہی جو اذان اک بچے کے کان میں اتری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئی۔ بھول گیا سب کچھ۔ زندگی کا وہ پہلا دن اور وہ پیغام۔! زندگی کے ہر لمحے میں مجھے انجوائے منٹ کی جستجو تھی اور اس کے لیے بے شمار دولت کی ضرورت تھی۔ وہ میرا باپ مجھے مہیا کرتا رہا۔ وہ اک کروڑ پتی انسان ہے۔ میں اس سے بڑی بڑی رقوم منگواتا رہا ہوں۔ اور بے دریغ خرچ کرتا رہا ہوں۔ اس نے اک دن بھی مجھ سے جواب طلبی نہیں کی کہ میں ان رقموں کا کیا کرتا ہوں۔ کہیں غلط راستوں پر تو نہیں چل رہا۔؟

اس نے سوچا ہی نہیں اور میں بے دھڑک شیطان کے نقش قدم پر چلتا چلا گیا۔ بلا کسی روک ٹوک کے۔

نہ مجھے اپنا مذہب یاد رہا اور نہ اپنا مسلمان ہونا۔ میں خدا کے اس پہلے دن والے پیغام کو بالکل ہی بھول گیا۔ اور جس بہاؤ میں یہاں کے لوگ بہہ رہے تھے میں بھی ان کے ساتھ ہی اسی بہاؤ میں بہتا چلا گیا۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ میرا دین' میری معاشرت' سب یہاں سے مختلف ہیں۔ میں لٹ جاؤں گا۔ مٹ جاؤں گا۔ فنا ہو جاؤں گا۔ اور۔ میرے ساتھ ایسا سب کچھ ہو گیا۔



مجھے ایڈز ملی۔ جینی فر کے قتل کا میں مجرم بنا۔ اپنے بچے کی موت کا ذمہ دار میں ٹھہرا۔ اور اب اپنا بھی قاتل میں خود ہوں گا۔ کہ یہ بیس گولیاں میرے سامنے پڑی ہیں اور ساتھ پانی کا گلاس ہے۔

جینی فر کی ماں کو کوئی بتا دے۔

میری ماں ہی نہیں' میرا باپ بھی' اس کی خواہش کے مطابق باقی کی ساری عمر اب آنسو بہاتے رہیں گے۔ میں اگر اپنے ان اعمال کی وجہ سے جہنم کی آگ میں جلوں گا تو بیٹے کی دائمی مفارقت کے غم میں وہ بھی کسی ایسی ہی اندر لگی آگ کا مزہ چکھتے رہیں گے۔ کیونکہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ان میں بہت سارا ان کا بھی حصہ ہے۔ انہیں کے فیصلے تھے۔ انکی خواہشات تھیں۔ خود نمائی تھی۔ خود کو برتر و اعلیٰ ظاہر کرنا تھا۔ دولت' امارت کا غرور تھا۔ تکبر تھا۔ یوں۔ میرے جو شریک گناہ ہیں۔ کیا انہیں کوئی حصہ نہ ملے گا۔؟ ضرور ملنا چاہیے۔ میرے عذابوں کا ساتھی انہیں بھی بننا ہو گا۔

خوشخبری جینی فر کی ماں کے لئے۔ اس کی سب خواہشات پوری ہو گئیں۔ اور دیکھنے سننے والوں کے لئے میں مقام عبرت ہوں۔

بہت پیاس لگ رہی ہے۔ ہمایوں خاں! اٹھا گلاس۔

اور چل روانہ ہوا اپنے آخری سفر پر۔

## 57

ماھم نے وہ چند اوراق پڑھ کر وہیں درمیانی ٹیبل پر ڈال دیئے۔ اس کا رد

روکر برا حال ہو رہا تھا۔ اجلال حیدر کی حالت بھی خاصی دگرگوں تھی۔ مگر ضبط کی ڈور تھامے بیٹھا تھا۔

"ہمایوں خاں کی خودکشی کا واقعہ اسی رات پیش آ گیا تھا۔ جب وہ جینفر کی ماں کی باتیں سن کر گیا تھا۔ اوراس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر یہ کاغذات ملے تھے۔"

ڈاکٹر ابصار فاروقی انہیں بالتفصیل سب کچھ سنا رہے تھے۔

"اسے یا وصیت نامہ سمجھ لیں۔ یا پھر عبرت۔" انہوں نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ نجانے کیا کہنا چاہ رہے تھے جو کہہ نہیں سکے تھے۔

"کیا پھر جینی کی ماں کو ہمایوں خاں کے انجام کا علم ہوا۔؟"

"بالکل ہوا۔ وہ چونکہ فلوریڈا واپس جانے کے قابل نہیں تھی اس لئے میں نے اسے اپنے پاس روک لیا تھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا بھی۔ وہ اپنی بیٹی ہی کی طرح ہمایوں خاں کے لیے روتی رہی تھی۔ اور بیٹی کی محبت میں جو کچھ ہمایوں خاں کے لیے کہتی رہی تھی' اس کیلیے پچھتاتی بھی رہی تھی۔"

"کتنے دن ہو گئے اس واقعہ کو رونما ہوئے۔؟"

"ہمایوں خاں کی موت کے واقعہ کو۔؟"

"جی ہاں۔"

"بہت سارے دن ہو گئے۔ تقریباً ایک مہینہ۔"

"اجلال! ہم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ یہ کیا ہو گیا اجلال۔؟"

روتے روتے بے حال سی ہو کر ماہم کا سر صوفے کی پشت پر جا ٹکا تو اجلال چونک سا پڑا۔

"ماہم۔ ماہم۔ اوہ ڈاکٹر صاحب یہ شاید بیہوش ہو گئی ہے۔"

"جب سے یہاں آئی تھی مسلسل رو تو رہی تھی۔ ستم بالائے ستم صبح سے اس نے کھایا بھی کچھ نہیں تھا۔" ڈاکٹر ابصار جلدی جلدی اسے اٹنڈ کرنے لگے۔ "یہ ہمایوں خان کی کوئی عزیز یا رشتہ دار ہیں۔؟" وہ اجلال سے پوچھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں آزما رہے تھے اور تدابیر کر رہے تھے۔

"ڈائریکٹ تو نہیں۔ مگر جس لڑکی کے ساتھ ہمایوں خان کا نکاح ہوا تھا' اس



کی دوست ہے۔"

"اوہ۔" ڈاکٹر ابصار فاروقی نے بڑی ہمدردی سے اسے دیکھا۔ "ویسے آپ فکر نہ کریں۔ انہیں ابھی ہوش آ جائے گا۔"

ساتھ ہی انہوں نے اجلال کے ہوائیاں اڑے چہرے کو تکتے ہوئے تسلی دی۔ "بعض انسان چھوٹا سا غم بھی برداشت نہیں کر سکتے۔"

"یہ چھوٹا سا غم نہیں ہے۔" اجلال تشویش بھرے لہجے میں بڑبڑایا۔ "آپ اس کے اور اس کے تعلق کو نہیں جانتے۔"

ڈاکٹر ابصار ماہم کی طرف متوجہ تھے۔ اجلال کی بڑبڑاہٹ سن نہیں سکے۔ کیونکہ ماہم کو ہوش آ گیا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے اب۔؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"یہ کافی لیں تھوڑی سی۔" تھرماس میں سے مگ میں نکالتے ہوئے انہوں نے ماہم کی طرف بڑھائی۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" اس کی آواز میں ابھی بھی رقت تھی' وہ اس قدر دلگرفتہ تھی۔

"دو گھونٹ تو لیں پلیز۔!" ڈاکٹر نے اتنی شفقت سے کہا تھا کہ وہ مزید انکار نہ کر سکی۔ لرزتے ہاتھ سے کافی کا مگ تھام لیا۔

"ہائے! ایمان کے ساتھ یہ کیا ہو گیا۔؟" ایک گھونٹ بھرتے ہی آنکھوں کے پیمانے پھر چھلکنے لگے۔ "اب وہ کیا کرے گی۔؟"

پھر ڈاکٹر کے چہرے کو تکتے ہوئے جیسے انہیں مطلع کرنے لگی۔ "میں تو اس کی رخصتی کی تاریخ لینے ہمایوں خان کے پاس آئی تھی۔"

"پلیز ماہم! اب اس ذکر کو چھوڑ دو۔" اجلال نے اسے ٹوکا۔ "کہیں پھر تمہاری طبیعت خراب نہ ہو جائے۔"

"نہیں۔ انہیں روکیں مت۔ انہیں بولنے دیں۔ انہیں باتیں کرنے دیں۔ ہاں تو بی بی! اپنی بات پوری کریں۔ میں سن رہا ہوں۔"

ڈاکٹر ابصار فاروقی کس قدر مشفق و پرخلوص انسان تھے۔ اجلال سوچ رہا

تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے کلینک میں کام کرنے والے لڑکے کو بلا کر چائے لانے کو کہا تو اجلال اور بھی متاثر ہو گیا۔ ''چائے کے ساتھ کچھ کھانے کیلئے بھی لانا۔''

''نہیں نہیں۔ تھینک یو ڈاکٹر صاحب! ہم اس وقت کچھ نہیں لیں گے۔''

''کیوں نہیں۔ اتنی دور سے آپ آئے ہیں۔ اور مجھے دیکھیں ہمایوں خان کی داستان میں لگ کر میزبانی کا سلیقہ فراموش کر بیٹھا۔ آپ کو کچھ پوچھا ہی نہیں۔ جبکہ اپنا کوئی ہم وطن مل جائے تو بے انداز خوش ہوتا ہوں۔ اور ہاں بی بی! آپ اپنی بات جاری رکھیں۔ رخصتی کی کیا بات کر رہی تھیں۔'' وہ یقیناً اس وقت ماھم کو نہ صرف باتوں میں لگانا چاہتے تھے بلکہ ہم وطن ہونے کے ناطے پوری دلچسپی کا بھی اظہار کر رہے تھے۔ ان کا انداز دیکھ کر اجلال بھی قدرے ریلیکس ہو گیا تھا۔

''ہمایوں خاں کا نکاح میری دوست ایمان کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اسی سلسلے میں اس کا اک خط کچھ دن پہلے مجھے ملا تھا۔'' ماھم بتانے لگی۔ ''ایمان کے گھریلو مسائل اچانک ہی کچھ ایسے دگرگوں ہو گئے تھے کہ وہ چاہتی تھی اس کی جلد از جلد رخصتی ہو جائے تاکہ وہ اپنی فیملی اور اپنے ملک سے کچھ عرصہ کیلئے کہیں دور چلی جائے۔''

ماھم کی آنکھیں پھر بھیگ رہی تھیں۔ ڈاکٹر ابصار نے ٹشوز کا ڈبہ اس کے پاس رکھ دیا۔ ''کافی کے سپ بھی لیتی جایئے۔ اور مجھے کچھ اور تفصیل بتائیں۔ وہ ایسا کیوں چاہتی تھیں۔ مجھے ابھی تک اس بچی کی صورت یاد ہے۔ تعلیمی لحاظ سے بھی اتنے اونچے درجے پر تھی۔ ماسٹرز کر رہی تھی یونیورسٹی میں۔ یقیناً ذہین و فطین بھی ہو گی۔ پھر اس کی زندگی ایسی کیوں تنگ ہو گئی کہ وہ اپنی فیملی اور اپنے ملک کو چھوڑنے پر آمادہ ہے۔ کیوں۔؟''

''مقدر ڈاکٹر صاحب! مقدر۔ بیچاری ایمان۔'' ماھم کی بجائے اجلال جوش جذبات میں بولنے لگا۔

''آپ نہیں۔'' ڈاکٹر نے اجلال کو ٹوک کر ماھم کی جانب دیکھا۔ ''آپ بتائیں نا مسز اجلال۔''

اجلال ان کے ٹوک کر خاموش کرنے والے انداز سے سمجھ گیا تھا۔ ''ہاں ماھم! انہیں بتا دو عابی کا سارا قصہ۔'' اس نے اسے بولنے کے لیے موضوع بتایا کہ



کے اندر پکنے والا لاوا پوری طرح بہہ نکلے۔

اور ماھم نے اندر جو دکھ اور کرب تھا۔ کچھ عابی کی وجہ سے اور اب ہمایوں کی موت کا سن کر تو جیسے آتش فشاں پھٹ جائے تو لاوا بہنے لگتا ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت اس کی تھی۔ اسی طرح پورے جوش و خروش سے لاوا بہنے لگا تھا۔ وہ رو رو کر عابی اور ایمان کی داستان محبت ڈاکٹر کے گوش گزار کرنے لگی۔

کلینک میں کام کرنے والا لڑکا چائے لے آیا تھا۔ ساتھ بہت ساری لوازمات تھیں۔ ڈاکٹر کے حکم کے مطابق۔ یہ لوگ ان کے ہم وطن تھے اور پریشانی میں تھے۔

ڈاکٹر فاروقی انسان بھی اچھے تھے اور میزبان اس سے بھی زیادہ اچھے تھے۔ کچھ ان کا انداز بہت مشفقانہ اور مربیانہ تھا۔ اور اجلال کو بھوک بہت لگی تھی۔ خوب بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

ماھم کے بھی آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اور وہ پوری طرح ان کی کہانی میں اپنی محبتوں اور الفتوں کے ساتھ ڈوبی ہوئی تھی' غبار نکل گیا تھا اور اب وہ ایمان کی محبت میں سرشار اس کے لئے کچھ کرنے والے جذبات کے مطالبے پورے کر رہی تھی۔ ''وہ تو لکھتی ہے کہ ایک ہی فیملی کے افراد ہوتے ہوئے وہ اب خود کو خالو والے رشتے کے ناطے نہ عابی اور نہ فرحت کا سامنا کرنے کے قابل پا رہی ہے۔ اس لئے اس نے مجھے بے شمار تاکیدیں کی ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ہمایوں خاں سے کہہ کر اس کی رخصتی کروا دوں۔''

جوش جذبات میں ماھم نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے ایمان کا خط نکالا اور ڈاکٹر ابصار فاروقی کے سامنے ڈال دیا۔ ''یہ دیکھیں آپ خود پڑھ لیں۔ مگر۔ مگر۔ وہ اب کیا کرے گی۔؟ ہمایوں خاں یہ تم نے کیا کیا۔؟ نجانے کیسے اس نے دل کو سمجھایا ہو گا۔ اور اب ایک اور دکھ تم نے اسے دے دیا۔''

ڈاکٹر کو ماھم کے بیان کردہ سارے معاملات کا یقین تھا پورا پورا۔ پھر بھی خط اٹھا کر پڑھنے لگے۔ ایمان کا انداز بیان بہت متاثر کن تھا۔

''ہائے! کیا بنے گا اس بے گناہ' بے قصور اور مقدر کی مار کھائی ہوئی لڑکی کا۔ اری رخصتی سے پہلے بیوہ بھی ہو گئی۔ مزید ستم بالائے ستم۔ پتہ نہیں اس کی فیملی میں

دوسرے تیسرے سال میں ایک اسٹوڈنٹ اعلیٰ تعلیم کے لئے سپانسر کرتا ہوں۔ اس بار کی سپانسر شپ آپ کی ایمان آفریدی کے لئے۔''

''نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب! وہ یہاں آ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا افورڈ کر سک ہے۔ اک بڑے متمول اور رئیس خاندان سے اس کا تعلق ہے۔ یوں بھی وہ بہ خوددار ہے۔ کسی کی مدد حاصل نہیں کرے گی۔''

''لے لیں ڈیئر! رکھ لیں۔ وہ نہیں تو اور جس کو آپ مناسب سمجھیں ا کے لیے ہی سہی۔ میں اپنے مہمانوں' اپنے ہموطنوں کو کوئی تحفہ دے کر رخصت ک چاہتا ہوں۔ بہت دکھ اور پریشانی بھرے لمحات آپ پر گزرے۔''

ہمایوں کی موت کا سوچتے ہوئے ڈاکٹر نے ماھم کی بھیگی بھیگی آنکھوں دیکھا۔ پھر جھک کر میز کی دراز میں سے کچھ پیپرز نکالے۔

''ویسے۔'' اک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان پیپرز پر سائن کر کے سر اٹھایا۔ ''کوئی کتنا بھی مالدار ہو۔ وہاں سے یہاں آنے میں بڑی مشکلات پیش آ ہیں۔ میرا ایک سرٹیفکیٹ آپ کی دوست کے یہاں آنے میں مدومعاون ثابت ہوگا یہ ساتھ ضرور رکھ لیں۔ مجھے وہ بچی آج تک نہیں بھولی۔ اس کے سکھ اور خوشیوں ک لئے میری طرف سے یہ تحفہ سمجھیں۔ چند دنوں کے لیے سیر وتفریح ہی کر لے گی۔''

## 58

وہ ایک دن جو فرحت وہاں گزار کر آئی تھی۔ وہ تو اس کے چہرے کی تما رونق اور وجود کی پوری توانائی چھین لے گیا تھا۔ سوجی سوجی بھری بھری آنکھیں ا بے رونق چہرہ برسوں کا مریض لگ رہا تھا۔

''ہائے بی بی! آپ تو بہت ویران ہو کر آئی ہیں۔ حالت دیکھ رہی ہ اپنی۔'' سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے پورے آئینے کی سمت جیراں نے اشارہ کیا۔

''تم میری حالت کو چھوڑو۔ سر درد کی کوئی گولیاں ہیں تو پہلے مجھے پانی ک



اک گلاس کے ساتھ وہ لا کر دو۔''

''جی اچھا۔ ابھی لائی۔'' سائیڈ ٹیبل پر چائے کی پیالی' جو پکڑے کھڑی تھی' رکھ کر وہ گولیاں اور پانی لانے کے لیے کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد فرحت سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ مگر وہاں اسے اپنا آپ تو دکھائی نہیں دیا۔ البتہ وہ سارا منظر کسی فلم کی طرح پھر نگاہوں میں گھومنے لگا۔

ہمایوں خاں کی موت ان کی فیملی میں ہونے والا اتنا بڑا سانحہ تھا کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ قیامت صغریٰ بپا ہو گئی تھی۔ کہرام مچا ہوا تھا۔ گھر عورتوں مردوں سے بھرا پڑا تھا۔

ایمان آفریدی ساکت بیٹھی اک اک کو تک رہی تھی۔ نگاہوں میں حیرت تھی۔۔ وحشت تھی۔ ہزاروں سوالات تھے۔ مگر اک آنسو نہ تھا۔

''اسے سکتہ ہو گیا ہے۔'' نانو فرحت کو بتا رہی تھیں۔ ''صبح سے ایسی ہی حالت ہے۔ بہت کوشش کر رہے ہیں۔ رلانے کی مگر کوئی آنسو نہیں بہا۔''

''کھایا پیا بھی کچھ نہیں۔'' پاس سے اک دوسری عورت نے آنسو بہاتے ہوئے نانو کی اطلاع مکمل کی۔ ''رنگین لباس پہنے تھی۔ وہ بدلوا کر سفید پہنا دیا تو تب بھی خاموش رہی۔ بس اسی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہی ہے۔''

''ارے! اس کی چوڑیاں تو اتروائی ہی نہیں۔'' نانو کی عمر کی اک اور عورت ہڑبڑا کر بول پڑی۔ ''ہا ہائے۔ چوڑیاں تو سہاگنوں کا روپ ہوتی ہیں۔ اور یہ بیوہ کے بازو۔'' فرحت کی نگاہ ایمان کے بازوؤں پر جا ٹکی۔ سیاہ اور سرخ رنگ کی چوڑیوں نے ایمان کے مرمریں بازوؤں کو انوکھی سی خوبصورتی سے سجا رکھا تھا۔

ایک تیسری عورت نے بڑھ کر ایمان کی کلائی پکڑ لی۔ پھر فرحت کے روکتے روکتے ہی وہ اس کی چوڑیاں توڑنے لگی۔

''نہ نہ۔ یہ ظلم نہ کریں۔'' فرحت نے بے ساختہ اس عورت کے ہاتھ تھام لئے۔ ''ظلم تو اس کے ساتھ تقدیر نے کر ڈالا'' اس جواب کے ساتھ اس نے ساری کی ساری چوڑیاں ایک ہی ضرب سے چکنا چور کر ڈالیں۔

ایمان نے تب بھی کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا۔ جبکہ فرحت اور نانو چیخیں مار مار کر رونے لگ پڑی تھیں۔ اور صفیہ تو اس وقت بے ہوش ہو کر ڈھے گئی تھیں۔

''ماما! یہ آپ کیوں رو رہی ہیں۔؟'' پتہ نہیں مدحت کب کمرے میں آئی تھی اور اس کے پاس بیٹھی رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو تک رہی تھی اور پوچھ رہی تھی۔

فرحت چونک کر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''کیا تمہیں نہیں معلوم۔؟''

''ایمان کے لئے ہی نا۔ تو بس کریں اب۔ بہت رو لیا۔ اتنا تو وہ بھی نہیں روئی ہو گی۔''

مدحت کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔ روکھا سا۔ کچھ لاپرواہ سا۔ کچھ اکتایا ہوا سا۔

''اتنا بڑا صدمہ اس پر آن پڑا۔ اور یہ تم کس انداز میں اس کے لیے بات کر رہی ہو۔ وہ کزن ہے تمہاری۔ میری بہن کی بیٹی۔ اور میں نے اسے گودیوں میں کھلایا ہوا ہے۔'' فرحت اس کے اس قدر لاپرواہ انداز پر برا مناتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ وہ تو شادی کے بعد ہم مل نہیں سکے۔ میں تمہارے پاپا کے ساتھ بیشتر اوقات مختلف چھاؤنیوں میں رہی۔ پھر زید کی وفات کے بعد میں نے خود ہی خاندان میں موو کرنا ترک کر دیا تو ہم میں اتنی دوری آ گئی ورنہ دل سے صفیہ آپا اور ایمان ہر وقت میرے قریب ہی ہوتی تھیں۔''

فرحت کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ اب اس نے انہیں صاف نہیں کیا۔ وہ بہتے رہے اور وہ بولتی رہی۔ ''ہمارے قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق خواہ بیٹی بغیر رخصتی کے بھی بیوہ ہو جائے تب بھی اس کی شادی نہیں کرتے دوبارہ سے۔''

''آپ کی تو ہو گئی تھی دوبارہ سے۔'' مدحت تنک کر بولی۔ انداز میں جیسے طنز بھی چھپا تھا۔ فرحت نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایمان کے لئے کوئی دکھ، کوئی ملال نہ تھا۔

''میری بھی تو رسم و رواج ہی نبھانے کے لیے ہوئی تھی۔ دیور موجود تھا۔ گھر کی عزت گھر میں رکھنا مقصود تھا۔ نہ عمر دیکھی نہ مزاج۔ کچھ ملتا بھی ہے یا نہیں۔'' بڑے کڑوے اور ترش سے لہجے میں فرحت نے تفصیل اسے بتا دی۔ ''روایات کی



خاطر سولی پر چڑھا دیا۔ دونوں ہی کو۔ زندگیاں ہی ختم کر دیں دونوں کی۔ کوئی دیور جیٹھ موجود نہ ہوتا تو میں بھی سفید لباس اور ننگی کلائیوں کے ساتھ منحوس کہلاتے ہوئے میکے کے گھر میں زندگی گزار رہی ہوتی۔ اس طرح بھی زندگی عورت کی فنا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کا یہی مقام ہے اور یہی عزت قدر۔ اور یہی قیمت۔''

''اچھا اب آپ یہ اپنے آنسو تو روکیں۔ آنکھیں پہلے ہی سوج رہی ہیں اور سر میں بھی درد ہے۔ ارے! گولیاں تو آپ نے لی ہی نہیں اور چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی۔ جیراں! یہ ذرا چائے گرم کر لانا۔'' جیراں کو چائے گرم کرنے کا کہہ کر مدحت نے گولیاں اور پانی کا گلاس فرحت کی طرف بڑھا دیا۔ ''میں تو چاہتی ہوں کسی دن پھر صفیہ آپا کے گھر کا چکر لگا آؤں۔'' گولیاں نگل کر پانی کا پورا گلاس پی کر فرحت پھر گویا ہوئی۔ ''اور اب کی بار تم اور عابی بھی چلنا۔ رشتہ داری بھی دور کی نہیں ہے اور یوں بھی ایمان کا دل ذرا بہل جائے گا۔''

''عابی تو نہیں جائیں گے۔'' فرحت سے نظریں چراتے ہوئے مدحت نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ''کبھی بھی نہیں۔''

''کیوں۔؟'' فرحت نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہی تھی۔؟ ساتھ ہی وہ نظریں چرا گئی تھی۔ کیا معاملہ تھا آخر۔؟

''وہ۔ وہ۔ کچھ نہیں۔'' مدحت بوکھلا بوکھلا کر ادھر ادھر تکنے لگی۔ تھی تو بچی ہی۔ ماں سے جو چھپانا چاہ رہی تھی وہ سارا منظر نگاہوں میں گھوم کر اسے بوکھلائے دے رہا تھا۔ ایمان عابی کے ساتھ تھی۔ چہرے پر رونقیں تھیں۔ مسکراہٹیں تھیں۔ ہاتھ عابی کی جیب میں تھا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ایسی بات ضرور تھی۔ مدحت کی چھٹی حس کہہ رہی تھی۔ تبھی وہ ماں سے چھپا گئی تھی۔ عابی کی عزت کی خاطر۔ اسے اپنے عابی سے بے پناہ محبت تھی۔

مدحت سولہ سترہ سال کی ہو گئی تھی۔ بہت باشعور۔ بہت عقیل و فہیم۔ اب وہ ہر قسم کی نظر بھی پہچاننے لگی تھی۔ پھر اس نے دو چار بار اس لڑکی کا حوالہ دے کر چاچو کو چھیڑا بھی تھا۔ پھر چاچو کے چہرے پر جو رنگ اترے تھے وہ بھی اس سے مخفی نہ رہ سکے تھے۔ جذبوں کو اچھی طرح جاننے سمجھنے لگی تھی۔ پھر کچھ دن پہلے وہی عابی کی اسٹوڈنٹ

ایمان کے روپ میں ان کے گھر آ گئی تھی۔ صفیہ خالہ اور نانو کے ہمراہ۔ تب بھی اس کی عابی پر اٹھنے والی خفا خفا' ناراض ناراض نگاہیں ایسی ہی کوئی کہانی سنا رہی تھیں۔ شاید اس کے لیے بھی دونوں کے درمیان یہ رشتہ داری نکل آنے والا واقعہ بہت اندوہناک اور روح فرسا تھا۔ اس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اور وہ اپنی ماں اور نانی سے جلد واپسی کا مطالبہ کرنے لگی تھی۔

مدحت سب کچھ دیکھتی رہی تھی' غور کرتی رہی تھی اور بہت کچھ سوچتی رہی تھی' اور اب بھی وہ ایسی ہی سوچوں میں کھوئی تھی۔

فرحت نے خاموش بیٹھی' اس سے نظریں چراتی مدحت کا ہاتھ تھام لیا تو وہ چونک کر اسے تکنے لگی۔

''میں نے زندگی میں سب سے زیادہ جو سیکھا ہے' جانتی ہو کیا ہے وہ۔؟''

''کیا ماما۔؟'' وہ سٹپٹائی۔

''تمہارا چہرہ پڑھنا۔''

''کیا ہے میرے چہرے پر۔؟'' وہ گھبرا گھبرا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''جو کچھ ہے وہ یوں گھبرا گھبرا کر ہاتھ پھیرنے سے مٹ نہیں جائے گا۔''

فرحت کی بات پر وہ زور سے ہنس پڑی۔ ''چلیں پھر آپ بتا دیں کہ آپ نے کیا پڑھا ہے۔؟'' وہ کھسیانی سی ہو گئی تھی۔

''نہیں۔ میں نہیں۔ وہ تم مجھے بتاؤ گی۔ ایمان کے متعلق کچھ ہے نا۔؟''

''کیا۔؟'' مدحت کے حلق سے سچ مچ اک چیخ نکل گئی۔ ''یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا۔؟''

فرحت کی نگاہیں اس کے چہرے پر کچھ ایسے جمی تھیں کہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے کچھ چھپا نہ سکی۔ سوال کا جواب بھی ابھی اسے نہیں ملا تھا کہ وہ بے اختیار سب کچھ عیاں کر گئی۔ چہرے کی بدلتی رنگت سے۔ آنکھوں میں اترتی پریشانی کی پرچھائیوں سے۔

''میں نے ایمان کو عابی کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس دن۔ داخلے والے دن۔

...ں اکٹھے شاپنگ کر رہے تھے۔ بہت خوش تھے۔ ہنس رہے تھے۔ پھر اس دن جب ...صفیہ خالہ اور نانو کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں۔ دونوں باہر گاڑی کے پاس ...رے باتیں کر رہے تھے۔ میں دوست کی سالگرہ سے واپس آئی تو دونوں خاموش ...گئے تھے۔ ایمان چاچو کی اسٹوڈنٹ ہیں اور۔''

''اور کیا۔؟ چپ کیوں ہو گئی ہو۔؟'' اس نے ہونٹ بھینچ لئے تھے تبھی ...ت یکدم پوچھ بیٹھی۔

''آپ کے اور عابی کے اور ایمان کے درمیان جو رشتے کی ڈور بندھی ہے ...کا نہ عابی کو علم تھا اور نہ ایمان کو۔'' پھر یکایک مدحت نے فرحت کے دونوں ہاتھ ...م لئے۔ ''ماما! میں آپ کو کچھ بھی بتا کر دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ ان دنوں آپ ...خوش تھیں اک طویل عرصے بعد میں نے اپنے گھر میں خوشی و مسرت کے قہقہے ...بجتے سنے تھے اور آپ کے چہرے پر سجی رونقیں اور آپ کے وجود پر خوبصورت ...ی چمک دمک دیکھی تھی۔ اس لئے میں نے اپنی زبان۔''

''تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو مدحو۔!'' فرحت اس کی بات قطع کر کے ہولے ...بڑبڑائی۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔ مدحو اس کے بدلتے مزاج کو عابی کے ...منسلک کر رہی تھی۔

''کس غلط فہمی میں۔؟'' مدحت نے پوچھا۔

''وہ۔ وہ۔'' اور پھر فرحت خود بھی چور سی بن گئی۔ نظریں نیچے جھکا کر مدھم ...لہجے میں بڑبڑائی۔ ''تمہیں عابی اور ایمان کے متعلق مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔''

''کیوں۔؟'' مدحت تنک کر بولی۔ ''کیوں بتا دیتی۔؟ مجھے بھی اپنے گھر کو ...ں سے مہکانے کا حق ہے۔ مجھے بھی اپنے گھر میں قہقہے گونجتے اچھے لگتے ہیں۔''

''تمہارا حق کوئی بھی غصب نہیں کر رہا۔ تم خوشیوں کی تمنا کر سکتی ہو۔ ...کر سکتی ہو۔''

''عابی اور ایمان کو اکٹھے دیکھ کر بھی۔ کیا آپ خوش رہ سکتیں۔؟''

''میری خوشیوں کا ان دونوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔'' ''عابی کے ساتھ ...ں۔؟''

"ہاں۔ اس کے ساتھ بھی نہیں۔"

"ماما! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔؟" حیرت کے مارے مدحت کی آواز لڑکھڑا سی گئی۔

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں درست کہہ رہی ہوں۔ میرا عابی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

فرحت نے مدحو کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے صاف سچ بول دیا۔ بے شک سامنے بیٹھی اپنی بیٹی تھی۔

"جس طرح عابی نے مجھے نکاح کے باوجود قبول نہیں کیا تھا اسی طرح میں نے بھی ہمیشہ اسے اسی بچے کی طرح سمجھا جو سسرال کے گھر میں میرا پلو تھامے میرے پیچھے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ اور وہی ننھے سے دیور والا رشتہ لئے وہ ہمیشہ میرے ذہن و دل میں رہا۔ اک معصوم سے بیٹے کی طرح' اک پیارے سے بھائی کی مانند۔"

مدحت حیرتوں میں ڈوبی فرحت کی بات سنے جا رہی تھی۔ ادھ کھلے ہونٹ کچھ کہنے کو لرز رہے تھے مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"تم جو سمجھ رہی ہو اس انداز میں میری خوشیوں کا محور وہ کبھی نہیں بنا۔"

"تو پھر۔؟" بڑی مشکل سے گھٹی گھٹی سی آواز اس کے حلق سے نکلی۔

"یہاں شہر آ کر' اکٹھے اک گھر میں رہنے سے آپ جو اتنا بدل گئیں تو اس کی وجہ۔؟"

وہ جھجک کر پھر ہونٹ دانتوں میں دبا گئی۔

"کہا نا۔ اس کی وجہ عابی نہیں ہے۔" فرحت مسکرائی۔ آنکھوں میں روشنیاں سی جھلملانے لگیں۔ "چلو چھوڑو اس ذکر کو۔ وہ بات پھر کروں گی۔ تمہیں سے کروں گی۔ کیونکہ تم صرف میری بیٹی ہی نہیں ہو' دوست بھی ہو میری۔"

فرحت نے اسے بازوؤں میں بھر کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پھر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور پیار برساتی نظروں سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم عابی اور ایمان کے متعلق جو کچھ بتا رہی تھیں کیا وہ سب سچ ہے یا صرف تمہارا خیال ہی ہے۔؟"

"آنکھوں دیکھی بتا رہی ہوں۔ اور اس کا ثبوت بھی پیش کر سکتی ہوں۔"



"ثبوت۔؟"

"ہاں۔ میں نے ایک دن عابی کے کمرے کی تلاشی لی تھی۔" مجرموں کی طرح سر جھکا کر وہ جلدی جلدی بولتی چلی گئی۔ "محض آپ کی خاطر میں نے یہ جرم کیا تھا۔ دانستہ نہیں۔" ساتھ ہی خود اپنی صفائی بھی پیش کر دی۔

"تلاشی میں کیا نکلا تھا۔؟" فرحت نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ایک کیسٹ تھی ان کے دوست کی شادی کی۔ اس میں عابی اور ایمان بھی تھے۔"

"وہ مجھے دکھا سکتی ہو۔؟"

"کیوں ماما۔؟ آپ کیوں دیکھنا چاہتی ہیں۔؟ پلیز ماما! اگر عابی کو معلوم ہو گیا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔؟ مجھے ان سے بہت پیار ہے ماما۔! اور آپ سے بھی مجھے بہت محبت ہے۔" مدحت رونے لگی۔ "مجھے معلوم ہے یہ میں نے بہت غلط کام کیا ہے۔ مگر۔ یقین کریں ماما! آپ دونوں کی محبت میں یہ سب کچھ ہوا۔ مجھے ایمان ذرا اچھی نہیں لگتی۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔"

"ارے ارے۔" فرحت ہنس پڑی۔ "پاگل لڑکی۔" پھر اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو صاف کیے۔ "تمہیں ایمان سے نفرت کرنے کی ذرا بھی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ تمہیں چاہیے اس سے محبت کرو۔ وہ تمہارے عابی کی پسند ہے۔"

"کیا مطلب۔؟"

"میری وجہ سے عابی کی زندگی کے بہت سارے سال بے حد تباہ حالی میں گزرے ہیں۔ چھ سات سال جلاوطنی میں گزارے ہیں اس نے۔ نجانے کیسی کیسی ٹھوکریں کھا کر اس کا وہ تمام وقت گزرا ہو گا۔ اور میں نے حویلی کی آسائشوں میں ہر لمحہ کاٹا ہے۔ ظلم نہیں ہوا اس کے ساتھ۔؟"

"کوئی تھوڑا سا؟ تبھی تو مجھے اکثر اوقات دادا پر بھی غصہ آتا رہتا ہے۔ روایات کی پابندیاں ہمارے خاندان کو لے ڈوبیں۔ کسی نے بھی زندگی کا صحیح سکھ نہ دیکھا۔"

"بس وہی سارے قرضے میں اتارنا چاہتی ہوں۔ بہت مقروض ہوں عابی

کی بہت شرمسار ہوں اس سے۔''

''تو کیا کریں گی۔؟''

''تم دیکھنا تو سہی میں کیا کرتی ہوں۔ بہت مضبوط ہو چکی ہوں اب۔''

''مضبوط۔؟ وہ کیسے۔؟''

''بس تم دیکھتی جانا۔ مجھے آج تم نے اک بہت بڑی خوشی دی ہے۔ میں عابی کی باقی ساری زندگی خوشیوں سے بھر دوں گی۔ کفارہ ادا کروں گی۔''

''پتہ نہیں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔؟''

''ایک دن سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔''

ابھی کچھ دیر پہلے فرحت رو رہی تھی۔ چہرے پر ویرانی تھی۔ غم اور دکھ کی پیلاہٹیں تھیں۔ مگر اب ایک دم سے ہی رونقیں اتر آئی تھیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے جگمگاہٹیں تھیں۔

اور مدحت بڑے غور سے ماں کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

## 59

وہ چھڑی کے سہارے لان میں ٹہل رہے تھے۔ قریب ہی تھوڑے فاصلے پر مالی پودوں میں کچھ کام کر رہا تھا۔ نئے لگانے کی تیاری تھی اس لئے جو خراب ہو چکے تھے انہیں اکھاڑ کر زمین کی سطح ہموار کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ رک کر اس سے بھی کوئی بات کر لیتے۔ ان کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے فرحت نے بھی اس مالی کا انتظام کیا تھا۔

''یہ آپ نے لان کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ اس قدر اجڑا ہوا۔ میں کل اپنا مالی بھیجوں گا۔ وہ اب ادھر کا بھی کام کرے گا۔''

''حکم ہے۔؟'' کرنل عمیر آفندی مسکرائے تھے۔ ''تو پھر سر آنکھوں پر۔''

ان کی مسکراہٹ کے جواب میں فرحت بھی مسکرا دی تھی۔ ''حکم تو نہیں۔ اس گھر کی ذمہ داریوں کو البتہ شیئر کرنے والا معاملہ ہے۔''

''اس انداز میں۔؟''

''کسی دوسرے انداز پر اختیار جو نہیں۔'' وہ جیسے صاف اپنی مجبوری اور بے ... ہ کا اعتراف کر گئی تھی۔ اسی طرح ذو معنی سا جواب دیا تھا۔ ''لیکن دل چاہتا ہے کہ آپ سدا خوش اور پرسکون رہیں۔ پھول پودے اچھے ساتھی ہوتے ہیں۔'' پھر اس نے بڑے خلوص اور محبت سے انہیں بغور دیکھا تھا۔ ''اور یہ جو مالی ہے یہ بھی تنہائی کو اچھی طرح شیئر کرنے والا بندہ ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ صبح کے وقت اخبار بینی اس کا بہترین مشغلہ ہے۔ پھر سارا دن سیاست اور ملکی و قومی حالات کے متعلق گاہے بگاہے اچھی گفتگو کرتا رہتا ہے۔''

''اپنی تنہائیوں کو کاٹنے والے علاج معالجے مجھ پر بھی آزما رہی ہو۔؟''

''اور کیا کر سکتی ہوں پھر۔''

تب دونوں اکٹھے ہی ہنس پڑے تھے اور بہت دیر ہنستے رہے تھے۔

کچھ دنوں سے ڈاکٹر نے کرنل عمیر آفندی کو چلنے پھرنے کی پابندی سے آزاد کر دیا ہوا تھا۔ مگر وہ ابھی اچھی طرح چل پھر نہیں سکتے تھے۔ البتہ جب مالی کام شروع کرتا وہ چھڑی کے سہارے ہولے ہولے چلتے ہوئے لان میں نکل آتے۔

مالی کی چند دنوں کی رفاقت سے ہی انہیں محسوس ہو گیا تھا کہ فرحت نے اس کے متعلق ٹھیک ہی کیا تھا۔ واقعی وہ بڑی اچھی گفتگو کرتا تھا۔ کوئی چبھتی ہوئی بات کوئی طنزیہ جملہ بھی ہنس کر مسکرا کر کچھ یوں ملائمت سے بول دیتا کہ ذرا برا نہ محسوس ہوتا۔

مالی کی کسی ایسی ہی بات پر ہنستے ہوئے گیٹ کھلنے کی آواز پر کرنل نے مڑ کر دیکھا تھا۔

''اسلام علیکم۔ آ سکتی ہوں۔؟ آپ دونوں کی محفل میں مخل تو نہیں ہوئی۔؟''

فرحت کے چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹیں بکھری تھیں۔

کرنل کی جو ہنسی فرحت کو دیکھ کر تھمی تھی اضافے کے ساتھ لان میں چاروں اطراف بکھر گئی۔ اور انہوں نے فرحت کے سوال کا جواب دیئے بنا صرف ''وعلیکم السلام'' کہتے ہوئے رخ اندر لاؤنج کی جانب موڑ لیا۔

''آپ آمد تیمم برخاست۔'' فرحت قریب آئی تو بڑبڑا دیئے۔

اس کی سماعتیں بڑی تیز تھیں۔ بے اختیار ہنس پڑی پھر یکایک سنجیدہ ہو گئی۔ ''اک بہت ضروری بات تھی۔''

''اللہ کرے روز ہی کوئی ضروری بات ہو جایا کرے۔''

''پلیز عمیر۔! آپ......''

''اچھا اچھا۔ چلو اندر۔'' وہ رک گئی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے قدم بڑھا دیئے۔ ''خادم۔ او خادم میاں۔!'' کرنل کی آواز پر ملازم کچن سے نکل آیا۔

اچھی سی، بہت ہی اچھی سی چائے بنانے کی اسے تاکید کرتے ہوئے فرحت کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی اس کے سامنے والے صوفے پر ٹک گئے۔

''اب تو آپ کی چال بہت ٹھیک ہو گئی ہے۔''

''بس ذرا چلن میں کچھ ڈسٹربنس ہے۔ دعا کرو وہ بھی درست ہو جائے۔''

فرحت مسکرا دی۔ ''لگتا ہے وہ کبھی درست نہیں ہو گا۔'' شوخی آنکھوں میں لہرائی۔

''درست کرنے والا استاد ہی غیر حاضر رہتا ہے۔ پھر بھلا کیسے درست ہو۔''

ان کی ذومعنی بات کا مطلب فرحت اچھی طرح سمجھتی تھی مگر اس وقت نہ سمجھنے والا تاثر خود پر طاری کرتے ہوئے جلدی سے بات کا موضوع بدل دیا۔

''عابی آپ کے پاس اکثر آتا رہتا ہے نا۔؟''

''ہاں۔ تو۔؟ کیا اس کی گرفتاری کا وارنٹ لے کر آئی ہو۔''

''بس۔ کچھ ایسا ہی سمجھئے۔'' پھر وہ مسکرائی۔ ''میں اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہائیں۔'' کرنل چونکے۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔؟'' پھر اچنبھے سے فرحت کو دیکھا۔ ''کوئی تک کی بات کرو بی بی۔! میں نے کبھی کسی خاتون کو بقلم خود اپنے اوپر سوت لا کر بٹھاتے نہیں دیکھا۔''

''دیکھئے کرنل۔! مذاق سے ہٹ کر ذرا سنجیدہ ہو جائیں اور میری بات سنیں۔''

''ہاں ہاں۔ سناؤ۔'' کرنل اس کی سنجیدہ صورت دیکھتے ہی خود بھی سنجیدہ ہو گئے۔



''عابی اک لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ وہ اس کی اسٹوڈنٹ ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ اس سے شادی کر لے۔''

''چاہتی ہو تو اسے کہہ دو۔ مجھے بیچ میں کیوں لا رہی ہو۔ اک غیر شخص کو۔''

''آپ غیر ہیں کیا۔؟'' فرحت نے ان کا بولا ہوا جملہ مائنڈ کر لیا۔ ''پھر ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔ اک غیر کے ساتھ دکھ سکھ شیئر نہیں کیے جا سکتے۔''

''اوہ سوری! نہیں نہیں۔'' کرنل عمیر نے گھبرا کر سنٹر ٹیبل پر سے فرحت کا بیگ دونوں ہاتھوں میں تھام کر گود میں سمیٹ لیا۔ ان کی اس بے ساختہ حرکت پر بے اختیار فرحت کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی مگر وہ جلدی سے دبا گئی۔

''میں اس کے بغیر بھی جا سکتی ہوں۔ مگر جاؤں گی نہیں۔''

''وہ۔ دراصل۔'' خفیف سے ہو کر وہ سر کو کھجلانے لگے تو دونوں ہی ہنس پڑے۔ ''دیکھیں عمیر! میری مجبوری کو طعنہ بنا کر بار بار میرے منہ پر مت مارا کریں۔ میرے پاؤں میں جو روایات کی زنجیریں پڑی ہیں پھر وہ مجھے چبھنے لگتی ہیں۔ احساس شدید ہو جائے تو تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔'' فرحت کی آنکھوں میں نمی سی دیکھ کر کرنل عمیر آفندی کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ کاش! وہ اس کی ان زنجیروں کو توڑنے کی خود میں قدرت رکھتے۔ بے بسی نے ان کی زبان گنگ سی کر دی۔ ''میرے اور آپ کے درمیان جو دوستی کا خلوص بھرا تعلق ہے وہ زندگی کے آخری سانس تک قائم رہے گا انشاء اللہ۔ یہ بات آپ اپنے ذہن میں رکھیں۔''

''ایک بار پھر سوری۔!'' فرحت کے جواب میں وہ بس اتنا ہی کہہ سکے۔ البتہ لہجہ بڑا التجائیہ سا ہو گیا تھا۔ تبھی وہ مسکرا پڑی۔

''بات دراصل یہ ہے کہ عابی کے ساتھ یہ جو میرے نکاح والی زیادتی ہوئی ہے اس کا مجھے شدت سے احساس ہے۔ اور اب میں خود ہی اس کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن مجھ سے کیا چاہتی ہو۔؟''

''آپ اسے اس بات پر منائیں کہ وہ ایمان سے شادی کر لے۔ ہمارے طبقے کی روایات میں دوسری شادی منع نہیں ہے۔ پہلی عورت کی موجودگی میں۔''

پھر فرحت نے ایمان کے ساتھ اپنے رشتے کے متعلق تفصیل سے سب بتا دیا۔ ''وہ نہیں جانتی تھی کہ عابی کون ہے اور عابی بھی نہیں جانتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ انوالو ہو گئے۔ میں نے سنا ہے بہت محبت کرتے ہیں ایک دوسرے سے اور میری وجہ سے دو محبت کرنے والے بچھڑ جائیں۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔ آپ اس کو فورس کریں۔ ہم دونوں کوئی سگی خالہ بھانجی نہیں ہیں۔ وہ میری کزن کی بیٹی ہے۔ اس طرح عابی کا اس کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ اور مجھے یقین ہے عابی صرف آپ کی بات مانے گا۔ وہ آپ کی بہت عزت اور احترام کرتا ہے۔ آپ اسے منائیں۔ میرے سکون اور خوشی کی خاطر۔''

''اور ایمان کے والدین اور ایمان۔؟ کیا انہیں یہ قابل قبول ہو گا؟ اور وہ بھی ان حالات میں کہ ان کے ہاں بیوہ کی دوسری شادی نہیں کرتے۔''

''کام مشکل تو بہت ہے مگر مجھے یقین ہے میں انہیں منالوں گی۔ صفیہ آپا اور واصل بھائی مجھ سے بہت محبت کیا کرتے تھے۔ اور ایمان کی زندگی کے ابتدائی چار پانچ سال میری ہی گود میں گزرے تھے۔ سب اسے میری ہی کہا کرتے تھے۔ حق شفقہ استعمال کروں گی۔ بس آپ عابی کو کسی طرح رضا مند کر لیں۔'' فرحت کا لہجہ اس قدر منت بھرا تھا کہ کرنل عمیر آفندی کچھ بھی نہ بول سکے۔ نہ اس کی تائید میں نہ تردید میں۔ ''میرے لئے اگر آپ کے دل میں ذرا سی بھی جگہ ہے تو عمیر! میرا یہ کام آپ کو ضرور بالضرور کرنا ہو گا۔ تبھی میں سمجھوں گی۔''

''ذرا سی جگہ۔؟'' کرنل بڑبڑائے۔ ''واہ فرحت بی بی اچھی کہی۔''

پھر اک گہرا سا سانس خارج کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی گہری نگاہوں سے تکتے چلے گئے۔ فرحت نے گڑبڑا کر نظریں چرا لیں۔

''آپ مجھے کتنے عزیز ہیں اور میں آپ کو کتنی کرنل عمیر آفندی! یہ بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' زبان پر مزید کچھ لائے بغیر فرحت دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ ''تبھی تو اتنی بے تکلفی کے ساتھ دل کی باتیں آپ کے گوش گزار کرنے لگی ہوں۔''

خادم چائے لے آیا تو دونوں اپنی اپنی سوچوں سے باہر نکل آئے۔ خادم بھی شاید ان کے دلی معاملات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ خصوصاً جب فرحت گھر میں آ داخل



ہوتی تو وہ چائے کے ساتھ خاصا تردد کر ڈالتا۔ اور عمیر آفندی اس کی اس سمجھداری پر بے انداز خوش ہو اٹھتے۔ پھر ان کا بلند و بالا قد فرحت کے سامنے کچھ اور بلند ہو جاتا۔

''یہ لو فرحت! یہ کھاؤ۔ خادم اسپیشلی تمہارے لئے لایا ہے۔''

''اے بی بی! ذرا اس کیک کو ٹیسٹ کرنا۔ صرف تمہارے لئے خادم صاحب نے بنایا ہے۔''

اور وہ خادم ہی کا نام لے لے کر اس کی تواضع کرنے لگتے۔ ایک ایک چیز اس کے حضور بڑے پیار، بڑی محبت سے پیش کرتے جاتے۔

''اور عمیر آفندی! ستم بالائے ستم ہمارے ہاں بیوہ کی دوسری شادی بھی نہیں کرتے سوائے مجھ ایسا کوئی مسئلہ ہو جائے تو سسرال والے اپنی عزت کو سنبھالنے کی خاطر یا پھر اولاد کی ذمہ داری نبھانے کی خاطر، نہ بڑا دیکھتے ہیں نہ چھوٹا۔ نہ رضا مندی نہ نارضا مندی۔ نہ پسند نہ ناپسند۔ بس پنچایت کا جو فیصلہ ہو اور قبیلے برادری کا جو دستور و رواج ہو۔ بس۔ عورت کی بھلائی یا اس کی زندگی بھر کیلئے اک مضبوط سہارے والی بہتری بھی پیش نظر نہیں ہوتی۔'' بات کرتے کرتے فرحت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''اور کبھی آپ ایمان کو ملیں۔ ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔ صورت کے لحاظ سے بھی اور سیرت کے لحاظ سے بھی۔ مگر۔ واہ رے نصیب۔ اب اس کی ساری زندگی اسی طرح کٹے گی۔ سفید کپڑوں میں ننگی کلائیوں کے ساتھ۔ کسی خوشی کے فنکشن میں خوشی اور اہتمام کے ساتھ شریک نہیں ہو سکے گی۔ بغیر کسی قصور کے، بغیر کسی گناہ کے، اسے سزا مل جائے گی۔''

''پھر۔؟ پھر اس کے ساتھ عابی کی شادی کا کیسے سوچ لیا۔؟ کیسے طے ہو گا یہ معاملہ۔؟'' فرحت سے بھی کچھ زیادہ ہی وہ پریشان ہو رہے تھے۔ اتنا کٹھن مسئلہ اور فرحت بی بی ان کی محبتوں کا امتحان لے رہی تھی۔

''میں نے کہا نا عابی کو آپ منالیں باقی ساری ذمہ داری میری۔'' بات کرتے کرتے اس نے چائے کی پیالی خالی کر کے رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''دونوں کو زندگی کی خوشیاں مل جائیں۔ یہ میرا مشن ہے آج سے۔ زید رحمان کے بعد میں ایک دم ویران اور خالی ہو گئی تھی۔ وہ زندگی سے کیا نکل گیا جیسے میرے پاس کچھ ہی نہ رہا

تھا۔ اوپر سے یہ عابی والا معاملہ ہوگیا۔ سماج نے مجھے رسم و رواج کی سولی پر چڑھا دیا۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔ نہ اپنے حق کے لئے۔ نہ اس کے حق کے لئے۔''

کرنل آفندی اس کے منہ سے نکلا اک اک لفظ بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ ''کھڑی کیوں ہوگئی ہو۔؟ بیٹھو نا۔''

''جلدی جانا تھا۔''

''تو گویا اب ہمارے لئے وقت بھی نہیں۔''

عمیر آفندی کا معصوم سا شکوہ سماعتوں میں اترا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

''وقت ہی کیا نہیں آپ کے لئے تو بلکہ بہت سارے جذبات بھی ہیں۔''

وہ پھر سے بیٹھ گئی۔ ''وہی تو ذکر کر رہی تھی۔ زید رحمان کے جانے کے بعد جو اعتماد اور یقین اپنی ذات کا کھو بیٹھی تھی وہ آپ کے وجود آپ کی چاہت اور آپ کے پروپوزل نے پھر سے بحال کر دیا ہے۔''

کرنل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑے خوبصورت سے رنگ بکھرے تھے۔

''ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میری ہستی کا اعتماد جیسے لوٹ آیا ہے۔ میں بہت مضبوط اور مستحکم ہوگئی ہوں جیسے۔ آپ نے مجھے اپنی محبتوں کے قابل سمجھا تو میں خود کو کسی قابل سمجھنے لگی ہوں۔'' کرنل عمیر آفندی کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ مسرت کی لہریں تھیں۔ ''میرے ساتھ جو بیت گیا وہ بیت گیا۔ مگر اب میں ایمان کے ساتھ کچھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ان رسم و رواج کے ہاتھوں اس کی تمام زندگی تباہ و برباد نہیں ہونے دوں گی۔ اور عابی بھی مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ چھوٹا سا بچہ جو میرا پلو تھامے سارا سارا دن میرے پیچھے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ زندگی کے بہت سارے سال اس کے بھی میری وجہ سے ویرانی اور تباہ حالی کی نذر ہوگئے۔''

ایمان اور عابی کا ذکر کرتے کرتے فرحت کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔

''اب میں اس کی باقی زندگی ان محرومیوں سے بچانے کی حتی الوسع کوشش کروں گی۔ آپ کی توجہ اور محبت نے میرا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے اس کی وجہ سے میں آواز اٹھانے کے قابل ہوگئی ہوں۔ مجھ میں جو مضبوطی پیدا



ہوئی ہے اس کے سہارے میں ان کے چھنے ہوئے حقوق واپس دلواؤں گی۔ میرے اندر اک نیا عزم' نیا ارادہ اور نئی قوت آ گئی ہے۔ اور مجھے یقین ہے آپ میرا ساتھ دیں گے۔'' اس نے اپنی آنکھوں کی نمی دوپٹے کے پلو میں جذب کی۔ ''یہ محبتیں' یہ جذبے انسانوں کے دلوں میں اللہ میاں اتارتا ہے۔ کبھی کسی کی فلاح کے لئے اور کبھی کسی کی اصلاح کے لئے۔ یہ ضروری نہیں کہ صرف شادی ہی کے لئے یہ ہمارے دلوں میں اترے ہیں۔ ان سے میری اصلاح ہوئی ہے اور عابی اور ایمان کے لئے یہ فلاح بنیں گے۔ آئیں ہم دونوں مل کر۔'' پھر وہ نظریں جھکا کر کچھ شرم آ گئیں سے لہجے میں بولی۔ ''نہ سہی زندگی کا اکٹھے رہنے والا ساتھ' اس طرح تو آپ میرا ساتھ دیں گے ہی۔ میری مضبوطی بنیں گے ہی کہ عورت بہرحال کمزور ہوتی ہے۔ ہم دونوں مل کر روایات کی ان زنجیروں کو توڑ دیں جو پتہ نہیں کتنے انسانوں کو توڑ چکی ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں انسانوں کو۔ میرا تو جی چاہتا ہے کرنل! ہم آل پاکستان لیول پر اک تحریک چلائیں۔ جو ان صدیوں پرانے رسم و رواج کا خاتمہ کر دے۔''

''بالکل بالکل۔ کریں گے ایسا۔'' وہ فرحت کے پرجوش انداز کی تائید کر رہے تھے۔ اس کے چہرے پر عزم و ارادے کی سنہری روشنی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ نگاہ ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''لیکن پہلے ان دونوں کا مسئلہ حل کر لیں۔ وعدہ کرتے ہیں نا کہ میرا ساتھ دیں گے۔''

''وعدہ کرتا ہوں۔'' انہوں نے اس معاملے کی سنگینی پر غور کئے بنا فرحت سے وعدہ کر لیا۔

وہ خوش خوش اٹھی۔ بیگ کندھے پر لٹکایا۔ دو قدم چلنے کے بعد پھر رکی۔ ''یاد رہے پہلا کام عابی کو منانا ہے۔ جو میں نہیں کر سکتی۔ وہ آپ کے ذمہ ہے۔ جتنی جلد ہو سکے وہ آپ کو کرنا ہوگا۔ پھر آگے میں سنبھال لوں گی۔''

وہ انہیں تاکیدیں کرتے ہوئے چل پڑی۔ اور کرنل عمیر آفندی اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

''یہ میں نے کس بنا پر اس سے وعدہ کر لیا ہے۔؟'' وہ سوچنے لگے۔ ''اپنے

جذبات کے احترام میں یا اس کے جذبوں کو نبھانے کی خاطر۔'' اک بڑا سا سوالیہ نشان نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔

''مقصد کچھ بھی رہا ہو۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ان کے دل نے فیصلہ دے دیا تو وہ مطمئن سے ہو گئے۔

## 60

وہ پھر اپنے اسی معمول کے سے انداز میں ان کے سامنے تشریف فرما تھا۔ چہرہ اخبار کے پیچھے چھپا تھا۔ اور کرنل جانتے تھے۔ اخبار بینی کا ٹائم جب ختم ہو گا تو وہ کوئی نہ کوئی میگزین اٹھا لے گا۔

کچھ ہی دنوں سے اس نے یہ انداز اپنایا تھا۔ جو کرنل کو ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ شوخ سا عابی کہاں کھو گیا تھا؟ وہ اتنی خوبصورت باتیں کرنے والا ان کا شہزادہ اس طرح چپ چاپ کیوں رہنے لگا تھا۔؟

بہت سوچنے پر بھی انہیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ پھر آخر کل خود بخود ہی فرحت کی باتوں سے اس راز پر سے پردہ اٹھ گیا تھا۔

''یار شہزادے! یہ ذرا چہرے کے سامنے سے اخبار تو ہٹاؤ۔'' فرحت سے کیئے ہوئے وعدے کے مطابق انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کیا۔

''ایک بہت ضروری خبر ہے'' اخبار کے پیچھے سے جواب ملا۔

''تو پھر مجھے بھی سناؤ۔''

''کیا آپ نے آج کا اخبار نہیں پڑھا۔؟'' اسی انداز میں پھر جواب آیا۔

''میں نے تو سنا ہے تم بھی روزانہ ناشتہ اخبار کے ساتھ ہی کرتے ہو۔'' کرنل عمیر کے لبوں پر شوخی بھری مسکراہٹ تھی۔

''آج ناشتہ نہیں کیا تھا۔'' موڈ ہنوز ویسا ہی تھا مگر ذہانت پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔



''شہزادے! مانا کہ بہت ذہین ہو۔ ہر بات کا جواب تمہارے پاس ہے۔ مگر اخبار کے اس پار ذرا دیکھو۔ ادھر تمہارا بڑا بھائی موجود ہے۔'' کرنل نے ہاتھ بڑھا کر اخبار پرے ہٹا دیا۔ عابی نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ محسوس ہوا۔ آج وہاں صحت کی سرخی کی بجائے غصے کی لالی بھڑک رہی تھی۔ جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا۔

''کیا سچ مچ غصے کے عالم میں ہیں۔؟''

''ہاں۔ یقیناً۔ یہ تم نے کیا دستور بنا لیا ہوا ہے۔ آتے ہوئے بیٹھ کر اخبار یا کوئی میگزین پڑھتے رہتے ہو اور پھر اٹھ کر چلے جاتے ہو۔ نہ کوئی بات نہ شرارت۔ آخر ہوا کیا ہے تمہیں۔؟ ایمان کی جدائی کا بدلہ ہم سے کیوں لے رہے ہو۔؟''

عابی نے اک دم چونک کر اور سٹپٹا کر کرنل عمیر آفندی کی سمت دیکھا۔

''یہ نام۔؟'' ادھورا سا سوال لبوں پر کپکپایا۔

''ہاں۔ یہی نام ہے نا تمہاری اس اسٹوڈنٹ کا' جس کے اعلیٰ کردار اور اخلاق۔''

''پلیز کرنل۔'' عابی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''کرنل کیا ہوا۔؟ سیدھی طرح بھائی یا عالیجاہ بولو' اسی طرح پیار سے' جیسے ہمیشہ بولا کرتے ہو۔''

''اوہ سوری۔'' عابی خجل سا ہو گیا۔ عمیر آفندی کے تیور بڑے خطرناک تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اس وقت بڑے جلال میں تھے۔ اور بڑے ہونے کے ناطے اس سے سب کچھ اگلوا کر چھوڑیں گے۔ ''بھائی! رحم کریں۔ یہ آپ کی جلالی نگاہیں مجھ سے برداشت نہیں ہو رہیں۔'' پھر ان کے رعب و جلال کو محبت و پیار میں بدلنے کی خاطر مسکرا پڑا۔ ''آپ کو پتہ ہے میں آپ سے شدید محبت کرنے لگا ہوں۔''

''میں روز اول سے ہی تم سے محبت کر رہا ہوں۔ پہلی ہی نگاہ میں تمہیں دل دے بیٹھا تھا۔''

''تو پھر اب تک پروپوز کیوں نہیں کیا مجھے۔؟ کس بات کا انتظار تھا۔؟''

عابی کے اس شوخی بھرے جملے پر اپنا تمام لطف و جلال' جو چہرے پر طاری کر رکھا تھا' فراموش کرتے ہوئے اک زور دار قہقہہ لگا اٹھے۔

''آج وہی کرنے جا رہا ہوں ڈیئر۔''

''رئیلی۔؟'' عابی کسی باحیا دوشیزہ کے سے انداز میں شرما دیا تو کرنل پھر ہنسنے لگے۔ بہت موڈ میں تھے اس وقت۔

اور عابی بھی موڈ میں آ گیا۔ کچھ انہیں اس موضوع سے ہٹانا مقصود تھا جو وہ چھیڑ بیٹھے تھے۔ ''ہنسے جا رہے ہیں۔ پھر پروپوز کریں نا۔'' ساتھ ہی چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔

''ایمان بن کر کروں گی۔ اور جب کوئی خوبصورت اور پسندیدہ لڑکی' لڑکے کو پروپوز کرتی ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ پس و پیش کرے اور نہ منع کرے بلکہ عورت کا احترام اور عزت ملحوظ رکھتے ہوئے فوراً اپنی رضامندی دے دے۔''

''عالی جاہ! یہ مذاق نہ کریں۔'' وہ رحم طلب نظروں سے انہیں تکتے ہوئے گڑگڑایا۔

''کیوں۔؟ کیا تم اس نام کی اپنی اک اسٹوڈنٹ میں انٹرسٹڈ نہیں ہو۔؟''

''تو گویا آپ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولا۔

''ہاں۔ اور میں بڑا بھائی ہونے کے ناطے اپنا حق استعمال کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیسے۔؟'' چہرے پر اداسی تھی۔

''کہ تم دونوں کی شادی کرا دوں۔''

عابی جواب میں کچھ بھی نہ بولا۔ بھائی کے رشتے کا حق انہوں نے جتایا تھا۔ اور اس رشتے کا احترام اس پر لازم تھا۔

''اب چپ کیوں ہو۔؟''

''ایسا ہو نہیں سکتا۔ اور میں آپ کے روبرو کورا جواب دینے کی گستاخی بھی نہیں کر سکتا۔''

اس کے چہرے پر مایوسی کے ساتھ ساتھ عجیب ویرانی سی پھیل رہی تھی۔

''کورا جواب کیوں۔؟ تمہیں اس سے محبت نہیں ہے۔؟''

جب سب کچھ وہ جان ہی چکے تھے تو پھر سچ سے گریز کیوں کرتا۔ ''ہاں



ہے۔'' وہ صاف اعتراف کر گیا۔

''وہی تو پوچھ رہا ہوں بندہ خدا۔ جب اس سے محبت کرتے ہو تو پھر کورا جواب کیوں دو گے۔؟''

''جہاں آپ ایمان کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں' وہیں پھر آپ کو یقیناً میرے باقی حالات کا بھی علم ہو گا۔؟''

''ہاں۔ ہے تو۔ لیکن۔ پھر اس سے محبت کیوں کی تھی میری جان۔؟''

''عشق نہ پچھے ذات۔'' عابی ہولے سے بڑبڑایا تھا۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں۔ مگر کرنل نے سن لیا تھا۔

''ہوں۔ تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے۔''

''یہاں وہاں کا کیا سوال۔ بندے کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں کیوں ایسا سب کچھ ہو گیا۔ بے اختیاریوں نے گرفت میں لے لیا۔'' اس کے چہرے پر ایسی بے بسی کا ایسا کرب تھا کہ عمیر آفندی کو اس پر ترس آنے لگا۔ ''کبھی میں بھی یہی سمجھا کرتا تھا کہ سب کچھ انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ مگر نہیں۔ یہ میری بھول تھی۔'' اس کی آنکھیں بھیگ سی گئی تھیں۔ وہ غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب چکا تھا۔

''میں بے بس ہو گیا۔'' وہ رقت بھری آواز میں عمیر آفندی کے سامنے اپنا دکھ واضح کرتا چلا گیا۔ ''اس کی محبت نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔ یہ بھی کہ میں رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اک انسان ہوں۔ یہ بھی کہ بچپن سے اس کی نسبت طے ہو چکی ہے۔ پھر اس کا نکاح بھی ہو گیا۔ لیکن میں اس کی محبت کو دل سے نہ نکال سکا۔''

''تو کون کہتا ہے نکال دو۔ یہ تو تم سن ہی چکے ہو گے کہ جس کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا وہ انتقال کر گیا ہے۔''

''ہاں سن چکا ہوں۔ اور مجھے بہت دکھ ہے۔''

''پھر ایک دوسرے کے دکھ بانٹ لو ناں۔''

''اور جو میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہیں۔''

''مرد دوسری شادی کر سکتا ہے۔''

''مگر میں یہ بے انصافی نہیں کروں گا۔''

"اس میں بے انصافی کی کیا بات ہے۔؟"

"دوسرے فریق کو باندھے رکھوں اور خود عیش کرتا رہوں۔ اپنی من چاہی سے شادی رچا بیٹھوں اتنا بھی ذلیل کمینہ نہیں ہوں۔ واہ بھائی واہ! آپ نے مجھے ایسا کیوں سمجھ لیا۔؟" شکوہ بھری نگاہ سے عابی نے عمیر آفندی کو دیکھا۔

"اور اگر فرحت کی خوشی اسی میں ہو۔؟"

"میری شادی میں۔؟"

"ہاں۔ وہ یہی چاہتی ہے۔"

"تب بھی نہیں۔"

"کیوں۔؟"

"میرا خیال ہے ظلم دونوں پر ہوا ہے۔ بھگتے وہ اکیلی کیوں۔؟"

"تو اسے آزاد کر دو۔"

"آپ کو پتہ ہے اگر میں نکاح نامے پر دستخط نہ کرتا تو میرے باپ نے اپنے آپکو گولی مار لینا تھی۔ مجھے مار دینے کی دھمکی دیتے تو میں مر بھی جاتا۔ ایسی زندگی کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔" پھر اک زہر بھری مسکراہٹ اس کے بھرے بھرے لبوں پر تڑپی۔ "مجھے تو انہوں نے ہر طرح باندھ کر مارا ہے۔ مگر میں یہ کیسے گوارا کرتا کہ وہ خود کو میری وجہ سے گولی کا نشانہ بنا لیتے۔" کرنل آفندی حیرتوں میں ڈوبے اسے دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے۔ "پھر آپ کے کہنے کے مطابق فرحت کو آزاد کرنا بھی میرے لئے مشکل نہ تھا۔ جب اپنی حویلی اور اپنا ملک چھوڑ گیا تھا تو وہیں سے اس کی آزادی کا پروانہ بھجوا سکتا تھا مگر ایک تو مدحت کی خاطر اور دوسرے میرا باپ جو خود قانون ساز تھا۔ اس کی اولاد قانون شکنی کرتی۔ تو یہ اک انا پرست باپ کے لئے مزید باعث تذلیل تھا۔ تبھی میں ایسا کچھ نہ کر سکا۔ اور نہ آخری سانس تک کروں گا۔ ہاں البتہ اگر بابا جان خود کہیں گے تو پھر دوسری بات ہے۔"

"کیا مطلب۔؟"

"جو زنجیریں انہوں نے خود پہنائی ہیں' ان کے قفل وہ خود اپنے ہاتھوں سے کھولیں گے تو کھلیں گے ورنہ میں اپنی پوری زندگی اسی طرح گزار دوں گا۔"



عابی کا سنگ و آہن جیسا لہجہ کرنل عمیر آفندی کو چونکا گیا۔ "اوہ خدایا۔!" ہوں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "اور فرحت کا مشن' فرحت کا عزم' فرحت ی خوشی۔" وہ سوچوں میں کھو گئے۔ "اس نے تو زندگی میں پہلی بار مجھ سے کوئی مانگ ی ہے۔ کسی استحقاق کے ساتھ کچھ طلب کیا ہے۔ اس کی یہ خواہش ضرور پوری ہونا ہیے تھی۔ اور یہ لڑکا عبدالرحمان! یہ بھی آہنی عزم رکھنے والا ہے۔ اصولوں والا ہے۔ صاف والا ہے۔"

"کیوا ہوا؟ آپ نے ایسے سر کیوں تھام رکھا ہے۔؟ آپ تو کبھی بھی یسے کسی مسئلے سے دو چار نہیں ہوئے۔ آپ کی تو کوئی محبت بھی داؤ پر نہیں لگی۔ پھر پ اس قدر پریشانی میں کیوں گھر سے بیٹھے ہیں۔؟؟"

عابی کے استفسار پر ان کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"ایک ہمیں دیکھیں۔ زندگی کا آغاز ہی جذبوں کی ٹوٹ پھوٹ سے ہوا۔ زخم ہوں پر پھر بھی ہنستا مسکراتا جی رہا ہوں۔ کبھی یوں سر تھام کر نہیں بیٹھا۔ آپ کی ح عالیجاہ۔!"

"طنز کر رہے ہو برخوردار۔؟"

"نہیں نہیں۔ خدا نہ کرے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تمہیں حق دیا طنز کرنے کا بھی۔ خوشی سے برداشت کروں نس کر سہوں گا۔ پر یہ سر تھامنا۔ اس کی وجہ میری اپنی کوئی پریشانی یا دکھ یا شکست ہے۔"

"پھر۔؟ کیا اپنے شہزادے سے شیئر نہیں کریں گے۔؟"

اسی لمحے خادم چائے لے آیا تو کرنل نے اک طویل سا اطمینان کا سانس ہ عابی کے اس سوال کا جواب دینے سے بچ گئے تھے۔ "آؤ پہلے چائے کی گرما سے تو محظوظ ہو لیں۔"

پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔؟ طبیعت میں کچھ گرانی سی تھی۔ رحمان علی خان اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما تھے۔ ملازم نے چائے کی پیالی ان کے پاس چھوٹی تپائی پر لا رکھی تھی۔ان کے حکم کے مطابق۔ ساتھ ہاضمے کی گولیاں بھی تھیں۔ لیکن وہ سب کچھ بھولے ہوئے تھے۔

نگاہیں سامنے زید رحمان اور عبد رحمان کی تصویروں پر جمی تھیں۔ جب ماضی کی سوچیں بہت زیادہ پریشان کرتیں تو اکثر ان کا معدہ خراب ہو جایا کرتا تھا۔شکر کیا ان دنوں بستی کے کسی گھر میں کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے پنچایت بھی نہیں بیٹھی تھی اور وہ فارغ تھے۔ لہذا انہیں آرام کرنے کا وقت مل گیا تھا۔

بہت دن ہو گئے تھے فرحت اور مدحت سے ملے ہوئے۔ دو تین مہینوں سے نہ تو وہ ویک اینڈ پہ آ سکی تھیں اور نہ ہی مختلف قسم کی مصروفیات کی وجہ سے رحمان علی خان خود شہر کا چکر لگا سکے تھے۔ یوں طبیعت بڑی اداس ہو رہی تھی۔ فون پر بات ہو جایا کرتی تھی پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے سے وہ بھی خراب پڑا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے لائنوں میں کچھ ایسی خرابی ہو گئی تھی کہ ٹھیک ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں بستیوں کے ساتھ یہی تو ٹریجیڈی ہوتی ہے۔ ان میں بسنے والے انسانوں کو نمبر دو کی حیثیت دی جاتی ہے۔ خواہ وہ امارت ریاست یا تقویٰ پرہیزگاری میں اول نمبر ہوں۔

دل ہی دل میں شکوہ کناں تھے۔ کبھی کبھی اک غصیلی، ترچھی، تیکھی نگاہ ٹیلیفون پر بھی ڈال لیتے۔ پھر بآواز بلند اس کی شان میں گستاخی بھی کر جاتے۔ بہت بے بسی محسوس کر رہے تھے۔

پھر یکایک خیال آیا۔ آج فارغ تو تھے ہی۔ بچوں کے پاس شہر ہی چلے جاتے۔ فون پر بھی بات کر کے کونسی تسلی ہو جاتی تھی۔ باپ تھے۔ نگاہوں کے تقاضے علیحدہ سے دل میں رکھتے تھے۔ عبدرحمان نظر آ جاتا تھا۔ بصارتوں کی سیری ہو جاتی تھی۔ آنکھوں میں روشنیاں سی اتر آتی تھیں۔ مدحت سینے سے آن لپٹتی تھی تو زید رحمان کے لمس اور محبت کی بھوک مٹ جاتی تھی۔

''خان جی! یہ کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

ملازم نے آ کر اطلاع دی۔ ساتھ ہی اک وزیٹنگ کارڈ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''کرنل عمیر آفندی۔'' وزیٹنگ کارڈ پر چھپا نام انہوں نے بآواز بلند پڑھا۔

''مگر ہم تو اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتے۔'' خود کلامی کے انداز میں رحمان علی خان بڑبڑائے۔ پھر سر اٹھا کر ملازم کو دیکھا۔ چند لمحے کچھ سوچتے رہے۔ کسی سے بھی ملنے کا اس وقت موڈ نہیں تھا۔

''اچھا۔ بلا لو یہیں۔'' آخر ملنے کی ٹھان لی۔

اس حویلی کا یہی دستور تھا۔ آنے والے کو نامراد نہیں لوٹایا جاتا تھا۔ طبیعت کیسی بھی ہو۔ موڈ کیسا بھی ہو۔ ہر وقت' ہر کسی کے لئے یہاں کے دروازے کھلے ہی رہتے تھے۔

''اسلام علیکم۔'' آنے والے نے دروازے میں ہی کھڑے کھڑے سلام کیا تھا۔ رحمان علی خان نے چونکتے ہوئے نظریں اٹھائیں۔ ''وعلیکم اسلام۔''

سلام کا جواب سنتے ہی آنے والا معمول سے قدرے سست قدم اٹھاتا' ان کی سمت بڑھ آیا۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ہاتھ میں اسٹک تھی اور اسکے سہارے وہ اک پاؤں قدرے دبا دبا کر قدم اٹھا رہا تھا۔ نیوی بلیو پتلون کے ساتھ ہلکے آسمانی رنگ کی شرٹ پہنے تھا۔ اور یہ لباس اس کے بلند و بالا قد اور وجیہ چہرے کی وجاہت کو مزید نکھار بخش رہا تھا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر پھیلی مسکراہٹ میں عجیب طرح کی کشش تھی۔ رحمان علی خان ایک ٹک تکے جا رہے تھے۔

''ہم شاید آپ کو نہیں جانتے۔'' وہ قریب آ کر رکا تو رحمان علی خاں اسے تکتے تکتے بولے۔ نگاہیں پھر بھی اس پر جمی رہیں۔

کرنل عمیر آفندی نے اسٹک بلند کر کے زید رحمان کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تصویر زید رحمان کی ہے نا۔؟'' رحمان علی خان نے چونک کر اثبات میں سر ہلایا۔ زبان سے کچھ نہیں بولے۔ نجانے اس کی ہستی میں کونسا سحر تھا۔ وہ اس کی طرف

سے نگاہیں ہٹا ہی نہ سکے۔ "یہ تصویر ابھی ہمارے درمیان تعارف بن جائے گی۔
پھر آپ مجھے بہت اچھی طرح جان جائیں گے۔ بیٹھ سکتا ہوں کیا۔؟"

بہت ساری مسکراہٹیں نچھاور کر کے قدرے بے تکلفی سے پوچھا گیا تو رحمان علی خان سٹپٹا کر بول پڑے۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تشریف رکھئے۔" ساتھ ہی قریبی صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"زید رحمان اور میں پورے دو سال ایک ہی یونٹ میں تعینات رہے تھے۔ اس کے علاوہ ہم ایک دوسرے کے پڑوسی بھی تھے۔" کرنل عمیر آفندی بیٹھتے ہی اپنا تعارف کرانے لگے۔ "اور اتفاق دیکھئے کتنے سارے سالوں بعد ہم ایک بار پھر پڑوسی بن گئے۔ اس وقت مدحت اتنی سی تھی۔"

دونوں ہاتھوں کے ساتھ کرنل نے اس کا ناپ بتایا تو رحمان علی خان مسکرا پڑے۔ اس کے انداز بڑے دلچسپ تھے۔ ان کی نگاہیں اسی طرح اس پر جمی تھیں۔

"اور اب اتنی ہے۔" پھر اپنے کندھے تک اشارہ کیا۔ وہ پھر مسکرائے۔

"میری بیٹی والی کمی وہی پوری کر رہی ہے آج کل۔ بڑی دوستی ہے ہم میں۔ اور یہ عبد رحمان۔" پھر کرنل نے اسی سٹک سے عبدرحمان کی تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

"زید رحمان ہوتا تو جس طرح عبدرحمان سے محبت کرتا' بالکل اسی طرح مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ بہت پیارا بچہ ہے۔ کیا اب آپ مجھے جان گئے ہیں۔؟ سمجھئے میں آپ کا زید رحمان ہوں۔ تو پھر کیا میں بھی آپ کو بابا جان کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں۔؟"

اس کا بات کرنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔ رحمان علی خان اتھل پتھل ہو اٹھے۔ پہلے نگاہوں میں بسا تھا' اب دل میں آن بیٹھا۔ "ضرور بیٹے! ضرور۔" پھر اردگرد نظریں دوڑائیں۔ "صابر۔ او فضلے۔!" وہ ایک دم سے ملازمین کو پکارنے لگے۔

"جی خاں جی۔" آگے پیچھے دو ملازم بھاگتے ہوئے چلے آئے۔

"ہاجراں بی بی سے کہو فوراً چائے کا انتظام کرے۔ خاص مہمان آئے



ہیں۔"

"میں ناشتہ کر کے آیا ہوں بابا جان! ادھر سے گزرا تھا تو قدم بوسی کے لئے رک گیا۔ مدحت اور عابی کی زبان سے آپ کی بڑی تعریفیں سنتا رہتا ہوں۔"

ہونٹوں کی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں کی شوخی بھری چمک ان پر عجیب سا جادو کر رہی تھی۔ وہ بات کرتا تو رحمان علی خان اس کی طرف دیکھتے ہی چلے جاتے۔ نجانے کیوں وہ اتنا اچھا لگ رہا تھا۔

"کہتے ہیں۔ والدین کو محبت سے دیکھنے پر بھی عبادت کا درجہ مل جاتا ہے۔ ود تو میں بچپن سے ہی اس نعمت سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ عبادت نصیب ہی نہ ہوئی۔"
نکھوں کی چمک مزید بڑھی۔ رحمان علی خان کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ "آپ بھی باپ جیسے ہی ہیں۔ آپ سے بھی ملنے پر کچھ دعائیں' کچھ ثواب تو حاصل ہو گا ہی۔ س مل لیا آپ کو۔ دیکھ لیا۔ عبادت ہو گئی۔ چائے وغیرہ رہنے دیں۔ اب میں چلوں
۔"

"واہ ہمارا زید رحمان آئے۔ ہماری مدحت کا دوست آئے۔ ہمارے ید رحمان کا بڑا بھائی آئے تو کیا ہم ایسے ہی اسے چلے جانے دیں گے۔ سوکھے منہ۔ ودار! یہ تم نے سوچا ہی کیوں۔؟" پھر گردن موڑ کر ملازموں کو ڈانٹا۔ "تم ابھی تک ں ہوا احمقو! چلو فوراً۔ گرینڈ سی چائے کا انتظام......"

"میں نے کہا ناں میں ناشتہ کر کے چلا تھا۔" رحمان علی خان کو کرنل عمیر نے ت کے بیچ ہی ٹوکا تو وہ مصنوعی سی ملامت بھری نظروں سے اسے تکنے لگے۔

"اونہوں بڑوں کی بات کاٹا نہیں کرتے۔" پھر نگاہوں کی مصنوعی ملامت کی حبت سمو کر تکتے ہوئے ڈانٹ دیا۔ "اور بڑوں کے سامنے بولا بھی نہیں کرتے۔"

"یس سر۔!" محبت بھری ڈانٹ میٹھے گھونٹ کی طرح پی کر کرنل نے سر جھکا
۔"

"اور تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔" پھر وہ ملازموں کو سچ مچ ڈانٹنے لگے۔

"ست۔ کاہل۔ جا کر دیکھو ہاجراں نے کیا کیا بنا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ میں سے جو تازہ اور اچھی چیز ملے۔"

ملازموں کے لئے مزید حکم نامے جاری کرتے ہوئے انہیں وہاں سے بھگایا اور یوں فارغ ہو کر پھر کرنل کی طرف رجوع کیا تو وہ کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کمرے کی ترتیب' ڈیکوریشن اور دیواروں پہ لگی پینٹنگز وغیرہ دیکھنے کے بعد رحمان علی خان نے دیکھا وہ ان تینوں باپ بیٹوں کی تصویروں کو بڑے غور سے تک رہا تھا۔

کچھ دیر وہ اس کو اپنے شغل میں مشغول دیکھتے رہے۔ پھر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہولے سے کھنکارے۔

''برخودار! ان تصویروں کو چھوڑو اور ہم زندہ لوگوں کی طرف توجہ دو۔''

اتنی تھوڑی سی دیر میں ہی وہ اس روشن روشن چہرے والے کے مزاج سے کافی آشنائی حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے اسی کے سے ہلکے پھلکے اور مزاحیہ انداز میں اک نمایاں سی بے تکلفی کے ساتھ محو گفتگو تھے۔

''یہ تو نہ بات کرتی ہیں' نہ دل لگاتی ہیں۔''

''یہی تو میں بھی کہنے جا رہا تھا کہ آپ ان سے دل لگائے بیٹھے ہیں۔ بہتر ہوتا آپ نے ان تصویروں والوں سے لگایا ہوتا۔''

''لگایا ہے۔ ہر وقت انہیں کا خیال رہتا ہے۔ تبھی تو شاید تم ہمارے سامنے ہو۔''

''میں۔؟ آپ کے سامنے۔؟''

''ہاں۔ زید رحمان تمہارا روپ بھر کر یہ ہمارے سامنے تو ہے۔ اس دل لگانے کا اعجاز۔''

''واہ! کیا خوبصورت بات کی ہے۔ یعنی کہ جیسا سنا تھا ویسا پایا۔ میری عبادت قبول ہوئی۔''

کرنل عمیر صوفے سے اتر کر نیچے قالین پر ان کے قدموں میں آن بیٹھا فرحت سے وعدہ کیا تھا' اس کا کام تو کرنا تھا۔ کچھ خوشامد' کچھ چاپلوسی' اور کچھ ویسے بھی ان کی بزرگی کا احترام۔

''بالکل میرے بابا جیسی آپ بھی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بھی ہر کسی سے بہت محبت کیا کرتے تھے۔ میں تو مرید ہو گیا آپ کا۔''



''نہ نہ۔ مرید بہت ہیں ہمیں تو بس اک بیٹے کی ضرورت ہے۔ تم جیسے ہنسنے ہنسانے والے بیٹے کی۔ ترس گئے تھے کان بابا جان لفظ سننے کو۔''

وہ انتہائی بے تکلفی سے پاس آن کر بیٹھا تو رحمان علی خان نے بھی بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ یوں بھی اس کے انداز دل موہ لینے والے تھے۔ اک دلی سا لگاؤ اس کے ساتھ محسوس ہو رہا تھا۔

''اپنا عابی تو ہے نا بابا جان کہنے والا۔ اللہ اسے سلامت رکھے۔ بڑا پیارا انسان ہے۔ میں اسے شہزادہ کہا کرتا ہوں۔''

''تمہارا شہزادہ آج کل ہم سے کچھ روٹھا ہوا ہے۔'' دل کا درد زبان پر آ گیا۔ اور کرنل عمیر آفندی بھی تو یہی چاہتے تھے۔

''آپ سے۔؟ آپ سے بھلا کون روٹھ سکتا ہے۔؟'' سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن گئے۔ ''آپ جیسے محبتیں شفقتیں لٹانے والے انسان سے وہ کیوں روٹھ گیا۔ پاگل۔ دیوانہ۔ احمق۔'' وہ اسے غائبانہ ہی لتاڑتے چلے گئے۔ ''واپس آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اس کے کان کھینچوں گا بڑے زور زور سے۔'' پھر اپنے کان کھینچ کر نمونہ بھی پیش کیا۔ ''یوں۔ ایسے۔'' بڑا معصوم سا انداز تھا۔

رحمان علی خان کو کرنل کی یہ ادا بھی بھا گئی۔ زور زور سے ہنسنے لگے۔ ''ہاں زور سے کھینچنا۔'' وہ پوری طرح اس ساحر کے سحر میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ''پر یہ بھی تو بتا اس پر جرم کونسا عائد کروں؟'' فوراً ہی پینترا بدلا۔ استفہامیہ انداز میں انہیں تکنے لگے۔

''نافرمانی کا۔؟ بدتمیزی کا۔؟ زبان چلائی تھی آپ کے سامنے۔؟ کوئی گستاخی کی تھی۔؟''

''ہوں۔؟ کیا کیا تھا اس نے۔؟'' وہ اپنے آپ سے جیسے پوچھ رہے تھے۔ ''اس نے یا ہم نے۔؟ ہم نے کیوں۔؟ اس نے۔ اس نے جرم کیا اور وہی روٹھ بھی گیا۔'' پھر بلند آواز میں کرنل کو بتایا۔ ''سات سال ہو گئے ہیں۔ گھر چھوڑ گیا ہوا ہے۔ اکیلے رہ گئے بالکل۔''

ان کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ کرنل نے دانستہ نظریں چرا لیں۔

''سات سال سے۔؟'' اچنبھے کا اظہار کیا۔ ''بہت بری حرکت کی۔'' جبکہ بڑا بھائی بھی

گزر چکا تھا۔ اسے تو آپ کا سایہ بن جانا چاہیے تھا۔ بیٹے تو بازو ہوتے ہیں باپ کے۔ جوان ہو کر سہارے بنتے ہیں اور وہ آپ کو اکیلا چھوڑ گیا۔ سمجھاؤں گا اسے۔ معافی منگواؤں گا اس سے۔ آپ جیسے باپ......"

ملازم چائے وغیرہ لگانے لگے تو گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ رحمان علی خان اسے کھانے کی چیزیں پیش کرنے لگے۔ کرنل عمیر آفندی کو ذرا اشتہا نہیں تھی۔ مگر رحمان علی خان کا اصرار اور محبت۔

"یہ لو۔ چکھ کر تو دیکھو۔ بڑے مزے کا حلوا ہے۔" جیسے بہت چھوٹے بچے کو ماں نوالہ نوالہ زبردستی کھلائے۔ اپنے ہاتھ سے۔ کچھ ایسا ہی انداز تھا ان کا۔

"ہاجراں بی بی ہر چیز بڑے مزے کی بناتی ہے۔"

وہ اس وقت اسی ٹرانس میں تھے' جیسے زید رحمان ایک عرصہ دراز بعد ان کے پاس آیا بیٹھا تھا۔ اس کے بھی انداز کچھ ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔ خصوصاً ان کے پاس نیچے قالین پر بیٹھنے والی حرکت!

چائے ختم کر کے ملازموں کو دوپہر کا کھانا تیار کرنے کا حکم دیا تو کرنل نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "نہیں نہیں بابا جان! میں اتنی دیر نہیں رک سکتا۔" بے اختیار احتجاج کر بیٹھے۔ ایسی پذیرائی کی تو توقع بھی نہیں تھی۔ کرنل آفندی خود حیران پریشان ہو رہے تھے۔

"بابا جان بھی کہتے ہو اور کہنا بھی نہیں مانتے۔ بس کہہ دیا نا یہ میرا حکم ہے۔"

"حکم ہے تو پھر ادھر بھی سر تسلیم خم ہے۔ اپنے تو مزے ہو گئے۔ بابا جان کو مل گئے اور کیا چاہیے مجھے۔" بڑی خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ "لگتا ہے فرحت بی بی تمہارا کام آج ہی ہو جائے گا۔" دل کو بہلا کر اک مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔

"ہاں تو سلسلہ گفتگو جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے شروع کیا جائے۔"

"ہاں وہیں سے شروع کیا جائے۔" بہت عرصہ بعد آج دل لگا تھا۔ اس محفل سے۔ اس سامنے بیٹھے بندے سے۔ اس کی گفتگو سے۔

"ذکر عابی کا تھا۔ تو اس نے گھر سے چلے جانے والی حرکت کیوں کی؟"



تب رحمان علی خان نے سارا واقعہ سنا ڈالا۔ اتنے مانوس ہو گئے تھے کرنل کے ساتھ۔ ویسے بھی اک مدت بعد کوئی اتنی محبتوں کے ساتھ دکھ شیئر کرنے والا ملا تھا۔

زید رحمان کی موت کے متعلق بتاتے ہوئے آنسو بھی بہائے۔ جنہیں کرنل اپنے رومال سے پونچھتے رہے۔ "مجھے آپ نے زید رحمان کہا ہے۔ پھر یہ آنسو کیسے؟ میں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کے پاس ہوں۔"

دکھ سے ان کی آواز بھرا جاتی تو کوئی نہ کوئی ہنسی مذاق والا جملہ بول دیتے۔ تب وہ بھی ہنس پڑتے۔ اسی طرح سارا قصہ سنا۔ عابی اور فرحت کے نکاح کی تفصیل تک گوش گزار کر دی۔

"آپ نے پستول دکھا دیا کہ نکاح نامے پر دستخط نہ کیے تو گولی مار دیں گے۔؟" بہت زیادہ حیرت کا اظہار کیا۔ کچھ سوالات بھی ساتھ ساتھ داغتے رہے۔ جیسے پہلے سے کسی بات کا علم ہی نہ تھا۔

"اسے نہیں۔ گولی خود کو مارنے کی دھمکی تھی۔ ویسے ہم پٹھان لوگ صرف دھمکی ہی نہیں دیا کرتے۔ کر گزرا کرتے ہیں۔ اور یہ وہ جانتا تھا۔"

"پھر۔؟" حیرت کی زیاتی کا اظہار کرنے کو آنکھیں مزید پھیلا لیں۔

"پھر اس نے کر دیئے۔ اور۔" قصے کا آخری جملہ رحمان علی خان نے اک اذیت ناک کراہ کے ساتھ ادا کیا۔ "وہ گھر سے چلا گیا۔ روٹھ گیا ہم سے۔"

"یہاں آپ سے غلطی ہو گئی بابا جان۔"

"غلطی۔؟ اور ہم سے۔؟" انہوں نے چونک کر قدرے حیرت سے کرنل کے چہرے کو گھورا۔ وہ بھلا کوئی غلطی کر سکتے تھے۔؟ وہ اسی زعم میں تھے۔ یہ کرنل کہیں مذاق تو نہیں کر رہا تھا۔؟ دوبارہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات یہی بتا رہے تھے کہ وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

"ہاں غلطی۔ آپ سے ہوئی۔"

"کونسی۔؟"

"اس پر زبردستی نہیں کرنا تھی۔"

''پھر ہم کیا کرتے۔؟''

''وہی جو وہ چاہتا تھا۔''

''وہ تو یہ چاہتا ہی نہیں تھا۔''

''تو پھر نہ کرتے نا۔''

''مگر قبیلے کے رسم و رواج۔؟ کیا ہم وہ توڑ دیتے۔؟''

''ہاں وہ توڑ دیتے۔'' بلا جھجک کرنل عمیر بولے۔

''کیسی بات کر رہے ہو برخوردار!'' قدرے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔

''قرآن پاک میں کہیں بھی کسی پر سختی کرنے کا حکم نہیں ہے۔''

''کیا مطلب۔؟''

''آپ نے قرآن تو پڑھا ہوگا۔؟''

''الحمد للہ مسلمان ہیں ہم۔ نماز پڑھتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں۔ حج بھی کیا ہے۔'' وہ اک تفاخر کے ساتھ بولے۔

''پھر بھی آپ نے ایسا کیا۔؟''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔؟'' جھنجلاہٹ تھی ان کے لہجے میں۔

''یقیناً آپ نے قرآن صرف عربی میں پڑھا ہوگا۔ اور آپ کی زبان عربی نہیں ہے۔ اردو ترجمہ بھی ساتھ پڑھا ہوتا تو آپ کو ساری سمجھ آ جاتی۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ کوئی کسی پر زبردستی نہ کرے۔''

رحمان علی خان چپ سے ہو گئے۔

''اللہ کا حکم ہے یہ کہ مرد تو مرد عورت کا بھی نکاح اس کی رضامندی سے کرنا چاہیے۔ آپ نے دونوں ہی کی مرضی کے خلاف کیا۔'' بڑی نرمی و ملائمت کے ساتھ وہ ان کی غلطی سے انہیں آگاہ کر رہا تھا۔

''مگر یہ ہمارے قبیلے کا رواج ہے۔ ہمارے بڑے یہی کرتے آئے ہیں اور ان کی تقلید کرنا ہمارا فرض ہے۔''

''جو کچھ بڑے کرتے آئے ہیں۔ ان کا حکم بجالانا ان کی فرمانبرداری کرنا اگر فرض ہے تو بڑوں کے جو بڑے ہیں کیا ان کے احکامات کی فرمانبرداری فرض



نہیں۔؟''

''بڑوں کے بڑے کون سے۔؟'' وہ کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔

''ہمارا خدا۔ ہمارا پیغمبر۔ دونوں جہانوں کے بڑے اور ان کی دی ہوئی کتاب یعنی قرآن اٹھا کر دیکھ لیں۔ پڑھیں اس میں سے۔'' رحمان علی خان گھبرا سے گئے۔ عجب خائف سا انداز تھا۔ پھیلی پھیلی سہمی سہمی سی نظروں سے کرنل کو تکے جا رہے تھے۔ ''جو روجبر والا ہمار مذہب نہیں ہے۔ بڑی نرمی ہے' بڑی آسانیاں ہیں اس میں۔''

کرنل کا لہجہ حد درجہ پر اثر تھا۔ رحمان علی خان کی پوری ذات کھو گئی تھی۔ وہ کہاں بیٹھے تھے۔ کیا کر رہے تھے۔ کوئی ہوش نہ تھا۔ سارا وجود مکمل کا مکمل اک سماعت بنا تھا جس میں کرنل کی نرم و ملائم آواز کا رس ٹپک رہا تھا۔

قرآن کی کئی آیتوں کا ترجمہ کرنل عمیر آفندی نے سنا دیا تھا۔ جو اسی زبردستی والے موضوع سے متعلق تھیں۔

''بابا جان! عالی کا دل نہیں مانتا ہوگا۔ تبھی اس نے ایسا کیا۔ روٹھ کر گھر' ملک' سب کچھ چھوڑ گیا۔ سب کی محبتوں سے اس نے خود کو محروم کر لیا۔ کتنا ظلم ہوا اس کے ساتھ۔ اور آپ ظالم بن گئے۔ نادانستگی میں ہی۔ قبیلے کے رسم و رواج ہی پورے کرتے کرتے آپ گناہگار ہو گئے۔ خوامخواہ میں ہی۔ جوان بیٹے کا ساتھ چھوٹ گیا۔ ارے۔!'' پھر یکایک کچھ خیال آیا۔ کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ''میں نے تو اک دوست کو وقت دے رکھا تھا۔ آپ کی محبت بھری محفل میں وہ بھی بھول گیا۔ چلتا ہوں اب۔ پھر آؤں گا۔''

بڑی عجلت میں' بڑی تیزی سے اٹھے۔ رحمان علی خان روکنے کا ارادہ ہی کرتے رہ گئے۔ کرنل عمیر خدا حافظ کہہ کر نکل بھی گیا۔ اور ان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر دبا دیا تھا۔ وہ کیوں اتنی جلد چلا گیا تھا۔ اداسی ان کے پورے وجود میں پھیلنے لگی۔

# 62

''صفیہ آپا! میں اتنی بار آئی ہوں مگر ایمان مجھ سے نہیں ملی۔ وہ کیوں مجھے نظرانداز کر رہی ہے۔؟ آخر میں نے کونسا گناہ۔''

''نہیں نہیں۔'' صفیہ نے سٹپٹا کر فرحت کی بات کاٹ دی۔ ''ایسی بات مت کہو۔ تمہارا کوئی گناہ نہیں۔ وہ تو کسی سے بھی نہیں ملتی۔ اک تمہارا ہی معاملہ نہیں ہے۔'' وہ بیٹی کی طرف سے صفائی پیش کرنے لگیں۔ ''اگر سچ پوچھو تو ہم گھر والوں سے بھی اس نے تمام ناطے توڑ رکھے ہیں۔'' آنسو صفیہ کی آنکھوں کے فرش گیلے کرنے لگے۔ ''ویسے بیچاری نے ناطے بھی کیا توڑنے ہیں۔ خود اپنا آپ ہی سب سے چھپاتی پھرتی ہے۔''

''کیوں۔؟ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔؟''

''لوگ تعزیت کرنے آتے رہتے ہیں اور تمہیں معلوم ہی ہے۔ اس بستی کی زیادہ تر عورتیں تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ اور ہمارے قبیلے برادری کی بھی کب تعلیم یافتہ ہیں۔ پھر جہالت میں ہی کوئی نہ کوئی بات' کسی نہ کسی کے منہ سے نکل جاتی ہے۔ جس کا مفہوم صاف یہی نکلتا ہے کہ وہ سیاہ بخت ہے۔ وہ منحوس ہے۔'' بات کرتے کرتے صفیہ کی آنکھوں میں ساون بھادوں اتر آئے۔ ''کبھی تم اس کی حالت تو دیکھو۔ ان چند دنوں میں ہی کیا سے کیا ہوگئی ہے۔''

''تو آپ اسے یونیورسٹی کیوں نہیں بھیجتیں۔ تعلیم مکمل کرے اپنی۔ جان چھوٹ جائے گی ایسی ویسی باتوں سے۔''

''جان چھوٹ جائے گی یا پہلے سے بھی زیادہ نکو بن جائے گی۔ تمہیں تو معلوم ہے ہمارے ہاں اک بیوہ کا کیا مقام ہوتا ہے اور کیا حیثیت۔ اسے کب گھر سے نکلنے دیا جاتا ہے اور کب یوں یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لئے بھیجا جاتا ہے۔''

''پلیز آپا! آپ تو ایسی بات نہ کہیں۔ پڑھی لکھی ہو کر یہ جاہلوں والی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔''

''پھر بھی فرحی! رسم و رواج کے مطابق تو بندے کو چلنا ہوتا ہے۔ اس میں



تعلیم یا جہالت کی کوئی بات نہیں ہوتی۔''

''کیا مطلب۔؟'' فرحت کی آنکھیں کچھ حیرت سے کچھ دکھ سے پھیل گئیں۔ ''کیا اب اس کا کہیں آنا جانا بھی بند ہو جائے گا۔ اس کی تعلیم بھی نامکمل رہ جائے گی۔؟ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

صفیہ روتے روتے بڑبڑائیں۔ ''تمہارے اور میرے سوچنے سے کیا ہو گا۔؟''

''کیسے نہیں ہو گا۔ میں تو پرزور احتجاج کروں گی۔'' فرحت بپھر کر بولی۔ ''عدت کا تو اس کا مسئلہ ہی نہیں ہے کہ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ پھر اسے گھر میں کیوں بند کر چھوڑا ہے۔''

''آہستہ بولو کوئی سن نہ لے۔''

''کیوں آہستہ بولوں۔ کوئی گناہ کی بات کر رہی ہوں۔؟''

''بہرحال یونیورسٹی تو وہ اب نہیں جائے گی۔''

''اور میرا خیال ہے اب اسے پہلے کی نسبت تعلیم مکمل کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔''

''نہ نہ۔ کس چیز کی کمی ہے اسے اس گھر میں۔'' صفیہ اس کی ماں تھیں مگر ان کی سوچ بھی رسم و رواج کے مطابق ڈھلی ہوئی تھی۔ ''مزید تعلیم کے بغیر بھی اس کی عمر ٹھیک طرح سے گزر جائے گی۔ روٹی کپڑا ملتا رہے گا۔''

''کیا مطلب۔؟ اب صرف روٹی کپڑے ہی کی بات رہ گئی ہے۔؟''

''مطلب تو تم بھی جانتی ہو فرحی!'' صفیہ نے صرف اشارہ دیا تھا۔ مزید وضاحت نہیں کی۔ ساتھ ہی اک درد میں ڈوبی آہ بھری۔ ''میرا تو سارا دن اسی طرح گزر جاتا ہے۔ انہیں سوچوں میں۔ انہیں فکروں میں۔'' ضبط کے باوجود رخسار بھیگتے چلے جا رہے تھے۔ ''اتنے نازونعم سے' کیا اسی انجام کے لئے پالا تھا۔ بیٹی کی جوانی دیکھتی ہوں تو دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ کیسے برے نصیب لے کر میری بچی اس دنیا میں آئی۔''

''برے نصیب کیوں کہتی ہیں۔ اللہ کے کاموں میں ہمیشہ بہتری ہی ہوتی

ہے۔'' فرحت نے پھر سمجھایا۔ بہن کا رونا دھونا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایمان کے متعلق ایسی سوچیں، ایسے خیالات اسے پریشان کر رہے تھے۔

''یہ بہتری ہے۔؟'' صفیہ اپنے ہی واویلے میں مصروف رہیں۔ ''ہمایوں خان مر گیا اور اب ساری عمر اس کی بیوہ بن کر میری بچی زندگی گزار دے گی۔ نہ کوئی سہاگ کا سکھ دیکھا نہ اولاد کی خوشی۔ بیوگی کا دکھ مل گیا خالی گود کے ساتھ۔ نہ پھلی نہ پھولی۔''

''یہ سب اللہ کی طرف سے اس کے نیک بندوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ ایمان بڑی اچھی ہے آپا اور آپ بھی نیک لوگ۔ کیا پتہ کس کی آزمائش ہے۔''

''ہم نے اتنی زندگی گزار لی۔ پتہ نہیں کیا کیا ہم سے کوتاہیاں ہوئیں مگر یہ بچی۔ ابھی سے عتاب میں آ گئی۔'' صفیہ روئے جا رہی تھیں مسلسل۔ فرحت کی سنے بنا بولے جا رہی تھیں۔ ''ہائے میری بیٹی۔ بھلا اس نے اس اتنی سی عمر میں کیا گناہ کر دیئے ہوں گے جو ایسی سزائیں مل رہی ہیں۔''

''اگر اک لحاظ سے دیکھیں اور سوچیں تو اسے سزا نہیں بلکہ نیک نیتی کی جزا مل رہی ہے۔''

''جزا۔؟'' صفیہ نے چونک کر فرحت کی طرف دیکھا۔ ''یہ جزا ہے۔؟''

''ہاں تو۔'' فرحت نے اردگرد تکتے ہوئے ذرا آواز دبا کر کہا۔ ''میں نے تو سنا ہے ہمایوں اچھے کردار کا بندہ نہیں تھا۔ پھر اسے ایڈز بھی تھی۔ کیا خدا کی طرف سے اچھا نہیں ہوا کہ۔''

فرحت نے بات نامکمل چھوڑ دی اور صفیہ نے جیسے پوری سن لی تھی اور سمجھ بھی گئی تھیں۔ نظریں جھکا کر چپ سی ہو گئیں۔

''میں نے سنا ہے وہاں اس نے شادی بھی کی ہوئی تھی کسی گوری سے۔ گویا ایمان کے لیے پہلے وہاں سوت موجود تھی۔ چھوڑیئے اب یہ سارے رونے دھونے اور اللہ کی بہتریوں کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی بچی کا مستقبل سنوارنے کی کوشش کریں۔ خدا نے موقع دیا ہے۔''

''یہ موقع۔؟ ایسا موقع۔؟ تمہیں تو اپنے ہاں کے رسم و رواج کا پتہ ہے۔ کیسے اس کا مستقبل سنواریں۔''

''کسی اور اچھی جگہ اس کی شادی کر کے، اسے زندگی کی خوشیاں اور مسرتیں عطا کریں اور اپنی آزمائش میں پورا اتریں۔'' صفیہ فرحت کے منہ سے ایمان کی دوسری شادی کی بات کچھ اچنبھے اور کچھ خوفزدہ سی ہو کر سن رہی تھیں۔ ''اور یہی بات میں خود واصل بھائی سے کرنا چاہتی تھی۔ کب تک وہ لوگوں سے منہ چھپاتی رہے گی اور یوں کمرے میں بند رہے گی۔ کچھ اس پر رحم کریں۔ آپ اس کے ماں باپ ہیں آپ اس کی زندگی کی تاریکیوں کو دور کرنے کی بات کریں۔ آپ اسے آنے والے وقت کی روشن صبحوں اور رنگین شاموں کی تصویر دکھائیں۔ خوشخبری دیں۔ اسے بتائیں کہ اللہ بڑا مہربان ہے۔''

''لیکن فرتی! ہم اپنے قبیلے کے رسم و رواج کے خلاف بھی تو۔''

''کچھ خلاف نہیں ہے۔ وہ تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اور تعلیم یافتہ لوگوں کی اولاد ہے۔ ہم اپنی بیٹی سے زندگی کی رعنائیاں نہیں چھینیں گے۔ گناہ والی بھی کوئی بات نہیں کریں گے۔ اور کسی کی زندگی تباہ کر کے رسم و رواج نبھانا گناہ کی بات ہے۔''

فرحت کی باتیں حیات بخش تھیں اور صفیہ اس کی ماں تھی جس سے زندگی چھنی جا رہی تھی۔ اسی لئے صفیہ کا دل اس کی باتوں سے متاثر ہو رہا تھا اور ممتا موم کی طرح پگھل رہی تھی۔

ایمان کی زندگی کے اندھیرے چھٹ سکتے تھے اگر کوئی ان فرسودہ رسم و رواج کی ردا کو ان کے اوپر سے اتار پھینکتا تو ان کی بچی کی زندگی خوشیوں سے منور و معمور ہو سکتی تھی۔

صفیہ کو سوچوں میں کھویا پا کر فرحت دلیر ہو گئی تھی۔ گرم لوہے پر ضربیں لگاتی چلی گئی۔ ''آپا! ایمان کے لئے اک بڑا اچھا رشتہ ہے۔ آپ ذرا خود بھی اس غم سے نکلیں اور ایمان کے لیے بھی آگے کے راستے صاف کریں۔ اور اس کے لیے کانٹے نہیں پھول بچھائیں اس کی زندگی کی راہوں میں۔ وہ خود ہی اٹریکٹ ہو کر ان پر پاؤں دھر دے گی۔ آپ نے اگر اپنی ایسی حالت بنائے رکھی تو وہ بھی اسی طرح گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔''

صفیہ کے آنسو خشک ہو رہے تھے۔ اتنے دنوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ خیر

اور بھلائی کی باتیں ان کے کانوں میں اتری تھیں۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ ''بڑا اچھا رشتہ ہے آپا۔ جیسی ہماری ایمان ہے صورت سیرت کے لحاظ سے۔ ایسا ہی وہ لڑکا ہے۔ آپ اگر حامی بھریں تو میں بات چلاؤں۔؟'' فرحت نے دوبارہ سے اس رشتے کا ذکر کیا۔ وہ سچ مچ ایمان کے لئے بڑی متفکر تھی۔ ''ہمیں زیادہ وقت ایمان کو اس غم اور افسردگی بھرے ماحول میں غرق نہیں رہنے دینا چاہیے۔ بیمار نہ پڑ جائے۔ کوئی بڑا روگ نہ لگ جائے اسے۔''

''لیکن تمہارے بھائی۔ وہ کیا مان جائیں گے۔؟ وہ تو ایسے معاملوں میں بڑے سخت ہیں۔ بہت بااصول روایات کی پابندی کرنے والے۔''

''ان سے میں خود بات کر لوں گی۔ بس آپ ایمان کو اس حجرے سے نکالیں۔ اسے سمجھائیں۔ اس کا ماحول بدلیں۔ بلکہ اگر مناسب سمجھیں تو کچھ دن اسے میرے پاس شہر بھیج دیں۔ میں اس کا دل بہلا لوں گی۔ شاپنگ وغیرہ کے لئے اسے لے جایا کروں گی اور بھی بہت ساری تفریحات شہروں میں ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ بہت جلد خود کو سنبھال لے گی۔''

صفیہ بڑی تشکرانہ نظروں سے فرحت کو تک رہی تھیں۔

''تم نے تو میرے اندر کی گھٹن کو ختم کر ڈالا فرتی! تم کتنی اچھی، کتنی ہمدرد ہو۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ تم نے تو جیسے مجھے مرتی مرتی کو حیات نو کی نوید دے دی ہے۔ ورنہ میں تو ہر ہر سانس کے ساتھ مر مر رہی تھی۔''

## 63

کرنل عمیر آفندی اس دن پھر سردار رحمان علی خان کے سامنے ان کے قدموں میں بیٹھے ان کی خیر خیریت پوچھ رہے تھے۔

''بس کچھ نہ پوچھو کیا ہو گیا ہے ہمارے ساتھ۔''

''کیوں کیوں۔ کیا ہو گیا ہے۔؟''

''ہم ساری زندگی یہی سمجھتے رہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں بہت درست' بہت صحیح کر رہے ہیں۔''

''ہاں تو پھر۔؟''

''پھر ایک دن اچانک ایک فرشتہ صفت انسان ہماری زندگی میں چلا آیا۔ اس نے ہماری کچھ غلطیوں کی نشان دہی کی۔ جن کی وجہ سے ہماری اپنی ہی اولاد کی زندگی برباد ہو چکی ہے۔ ہمارے والد صاحب کے بعد آج تک ہم ہی اس بستی کے سرپنچ رہے ہیں۔ اور اک عابی ہی کا مسئلہ نہیں' اس دس ہزار نفوس والی آبادی میں بے شمار مختلف قسم کے مسائل پیش آتے رہے اور ہم فیصلے کرتے رہے ہیں۔'' وہ کرنل عمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے انہیں بغور تک رہے تھے۔ ''اور۔ اب تو ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ہمارے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں کہ انہیں غلطیوں' کوتاہیوں اور گناہوں کا ازالہ ہی کر سکیں۔''

''نہیں سر! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' کرنل بری طرح گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئے تھے۔

''بیٹے! آپ نے کہا تھا کہ عابی کے معاملے میں ہم سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ ہم نے جو اپنا فیصلہ اس پر تھوپا وہ سراسر قرآن وسنت کے خلاف تھا۔''

اک بڑی رنجورسی' مجروح سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل رہی تھی۔ ''آپ نے بڑے احترام سے کہا تھا۔ کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ آپ گھبرا کیوں رہے ہیں۔؟ ساتھ ہی آپ نے ہمیں سمجھایا تھا کہ ہم اپنے بڑوں کے بنائے ہوئے رسم و رواج پر قائم رہے مگر جو بڑوں کے بھی بڑے تھے ان کے احکامات اور فرمانوں کو پس پشت ڈال دیا۔ جو کہ سراسر نامناسب تھا۔ گناہ تھا۔'' عجیب سا ان کا موڈ ہو رہا تھا۔ پہلی ملاقات سے بالکل مختلف۔ کچھ ملول اور افسردہ سا۔ کچھ دلگیر اور رنجیدہ سا۔

''اوہ سوری۔'' کرنل نے کچھ مزید کہنا چاہا مگر انہوں نے ٹوک دیا۔

''اونہوں۔ سوری مت کہو۔ ٹھیک کہا تھا آپ نے۔ بلکہ آپ نے تو ہمیں صراط مستقیم دکھا دیا۔ بہت نیکی کی ہمارے ساتھ۔''

کرنل عمیر آفندی نے دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ان کی

سفید داڑھی کو بھگونے لگے تھے۔ کرنل نے ان کے گھٹنے تھام لئے۔

''آپ پریشان ہو گئے۔؟ بخدا میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا ہرگز نہ تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا۔''

رحمان علی خاں نے کرنل کی پوری بات سنی ہی نہیں۔

''آپ نے کچھ بھی چاہا ہو مگر ہم نے کہا نا' ہمیں روشنی مل گئی۔ میرے بیٹے! آپ کے جانے کے بعد اگلے ہی دن ہم نے شہر کی جامعہ مسجد سے مفتی خدا بخش صاحب' مولانا علاؤ الدین صاحب اور حاجی مصطفیٰ دہلوی صاحب سے درس لئے۔ آہ!''

وہ خاصی بلند آواز میں ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔

''پھر جو جو انکشافات ہوئے۔ کیا بتائیں۔؟ ہم اپنا روسیاہ کسی کو دکھانے کے بھی قابل نہیں رہے۔ اور سوچ رہے ہیں۔ انسانوں کو دکھانے کے قابل نہیں تو آگے جا کر اپنے رب کو کیسے دکھائیں گے۔؟''

پھر انہوں نے اپنے قریب ہی تپائی پر رکھے کاغذات کا پلندہ اٹھا کر کرنل عمیر آفندی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''یہ دیکھو تمام احکامات و فرائض درج ہیں اس میں۔ اک انسان کی زندگی کے لئے جو خدا نے ہم پر عائد کئے ہیں اور بذریعہ وحی رسول پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی صورت میں اتارے ہیں۔''

وہ روتے جاتے تھے اور بولتے جاتے تھے۔

''ہم نے تو ان احکامات کے مطابق کبھی بھی کسی متنازعہ مسئلہ کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ہم تو ہمیشہ وہی فیصلہ صادر کر دیتے تھے جو ہمارے بڑوں نے' باپ دادا نے رسم و رواج وضع کر چھوڑے تھے۔ ہاں! یہ ہم نے کیا کیا۔؟ اتنے سارے گناہ ہم سے سرزد ہوئے۔ کیسے ان کا کفارہ ادا کریں گے۔ کیسے ان گناہوں کو دھوئیں گے۔ اپنے ناتواں کندھوں پر اتنے بوجھ اٹھا لئے۔ ہر فریاد لے کر آنے والے پر رسم و رواج کے مطابق فیصلہ مسلط کر دیتے تھے۔ بغیر کوئی تحقیق کئے۔ کیسے کیسے مظالم ڈھائے ہم نے۔ کہ پھر مجبور کر کے عمل کراتے تھے اپنے فیصلوں پر زبرستی سے۔ اف توبہ! کتنا

کرتے تھے۔ بچوں کی طرح انہوں نے اپنا بازو آنکھوں پر رگڑ کر آنسو پونچھے۔

''یہ دیکھو وراثت کے قوانین۔ باپ کے ترکے میں بیٹا بیٹی دونوں حقدار ہیں۔ وہ دوسری بات ہے کسی مصلحت کی بنا پر بیٹی کو بیٹے سے آدھا حصہ ملے گا۔ یہ قرآن کی رو سے ہے۔ اور ہمارے قبیلے میں پتہ نہیں کب سے' کئی نسلوں سے یہ رائج ہے کہ باپ کے ترکے میں سے بیٹی کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ زمینیں' جائدادیں' مال ڈنگر گھر کا ساز و سامان سب بیٹوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ آج تک ایسے ہزاروں فیصلے ہم نے خود سنا ڈالے۔ اور ان پر عمل بھی کرایا گیا۔ پھر یہ دیکھو۔ عائلی والا مسئلہ۔ ہم نے اپنے دونوں پر مسلط کیا۔ اور قرآن میں ہے۔ نہ بالغ عورت پر نہ مرد پر کوئی جور و جبر ہے۔ کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہیے۔ پر ہمارے ہاں پنچایت کرتی رہی۔ دس بیس نہیں سینکڑوں کیس ایسے ہوئے۔ کوئی بسے یا برباد ہو۔ ہم اپنے غلط فیصلوں پر قائم رہے۔ کتنے ظالم تھے۔ یہ دیکھو۔''

وہ اک اک ورق کو الٹ الٹ کر کرنل عمیر آفندی کو دکھاتے رہے۔ ''یہ قتل یہ قاتل کی سزا' یہ خون بہا' یہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان' یہ قرآن و سنت کے مطابق فیصلے۔ کہیں گواہیاں شہادتیں' کہیں معافی' کہیں بدلہ۔ پر ہم نے تو کچھ بھی درست نہیں کیا۔ جو کچھ کیا قرآن کے خلاف کیا۔ رسم و رواج کے مطابق کیا۔''

وہ مسلسل ان تھک بولے جا رہے تھے اور کرنل ان کے جوش میں سرخ ہوتے چہرے کو ایک ٹک تک رہے تھے۔

''یہ بچوں کے حقوق و فرائض' یہ والدین' بوڑھے والدین کی مجبوریاں ریاں اور اولاد کی بے اعتنائیاں جبکہ ہر دو چار صفحات میں ایک آدھ بار والدین سان کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اللہ اور رسول کے بعد والدین کا درجہ رکھا گیا پھر بھی والدین نے تربیت ہی صحیح نہیں کی اس لئے کہ مدرسے ان کے لئے گئے اور نہ ایسی مساجد تعمیر کی گئیں جن میں درس و تدریس کے ذریعے ہی کچھ سکھایا جاتا۔ یہ ہم کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے۔؟ صرف رسم و رواج اور ہی نبھائیں۔ ہمارے پرکھوں نے جو قوانین بنا چھوڑے تھے انہیں ہی دین

ایمان بنا لیا۔"

ان کے آنسو، پشیمانی کے، پریشانی کے، پچھتاووں کے، تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ "یہ کیا ہو گیا ہم سے۔؟ آخرت میں ہزاروں ہاتھ ہمارے گریبان کی طرف بڑھیں گے۔ ہم کیسے منصف تھے۔؟" پھر انہوں نے کرنل عمیر کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "تم ہمارا ایک کام کرو گے۔؟"

"جی فرمایئے۔ حکم کیجئے۔"

"ہمارے خلاف پنچایت بلاؤ۔ اگر قاضی مجرم ہو تو اسے بھی کٹہرے میں ایک دن کھڑا ہونا چاہیے۔ ہم اسی قابل ہیں۔ بہت سارے جرائم کے سزاوار ہیں ہم۔ بولو۔ جنہیں انصاف نہیں ملا ان کے لئے انصاف طلب کرو گے۔؟"

ملازمین چائے اور لوازمات کی ٹرالی ان کے قریب کھڑی کر گئے تھے۔ کرنل نے دو پیالیوں میں گرما گرم چائے انڈیلی۔

"پہلے یہ چائے پئیں۔ پھر آگے بات کرتے ہیں۔" ساتھ ہی پلیٹ میں پکوڑے اور گاجر کا حلوا ڈال کر ان کے سامنے دھر دیا۔ "یہ لیں۔ یہ بھی کچھ تھوڑا سا کھائیں۔ پھر آپ جو کچھ کہیں گے، سب کچھ کروں گا۔"

جیسے وہ میزبان تھے اور رحمان علی خاں ان کے معزز ترین مہمان۔ "نہیں بیٹے! اس وقت ہم سے کچھ بھی نہیں کھایا جائے گا۔"

"کیسے نہیں کھایا جائے گا۔ اپنے بیٹے کے ہاتھ سے تو ضرور کھائیں گے۔ اور اگر آپ کچھ نہیں لیں گے تو میں بھی نہیں لوں گا۔ حالانکہ یہ خوش رنگ حلوا کھانے کو میرا بہت دل چاہ رہا ہے۔"

کرنل نے اتنے پیارے انداز میں اصرار کیا تھا کہ رحمان علی خان نے مسکرا کر پلیٹ اٹھا لی۔ پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے کی خاطر کچھ کھایا۔ چائے پی۔ دھیان بٹنے سے آنسو بھی تھم گئے تھے اور وہ سوگواری کی فضا جو ان کے موڈ پر طاری تھی، کچھ بدل گئی تھی۔ کرنل کے سلوک اور مسکراہٹوں نے انہیں کچھ بحال کر دیا تھا۔

"ہاں تو آپ کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کروں۔ اور میرا خیال ہے آپ سے جو کچھ غلط ہوا وہ آپ نے دانستہ نہیں کیا۔ اپنے



بڑوں کی روایات کو قائم رکھا ہے۔"

"تم جانبداری سے کام لے رہے ہو۔ کیونکہ ہم نے بڑوں کے جو بڑے تھے ان کی نافرمانی کی ہے۔ اور یہ قابل معافی نہیں۔ کسی صورت بھی۔"

"اک صورت ہے۔ اب آپ کو پتہ چل گیا ہے کہ یہ سارے قوانین شرع و سنت کے مطابق نہیں تو آپ اپنی غلطیوں کی تلافی یوں بھی کر سکتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کو رسم و رواج کی ان بدعات سے نجات دلا دیں۔ آپ سردار ہیں قبیلے کے۔ نیا منشور بنائیں۔ پنچایت میں بیٹھنے والے سب افراد کو قرآن کی تعلیم دلائیں اور پھر اس کی رو سے آئندہ سب فیصلے کیا کریں۔ یوں اللہ کی کتاب سے سب کو فیض پہنچائیں اور دعائیں لیں سب کی۔ آپ کے کندھوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

کرنل کی تسلیوں دلداریوں سے ان کا مزاج بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔

"اب اجازت۔؟" اچانک ہی کرنل عمیر گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو رحمان علی خان کے چہرے پر اداسی سی پھیل گئی۔

"اتنی جلد۔؟ ابھی بیٹھو۔ مجھے کچھ اور مشورے کرنا تھے۔"

ان کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ بہانہ صرف کرنل کی معیت میں کچھ دیر اور گزارنے کو بنایا گیا تھا۔

"جلد ہی پھر آؤں گا۔ اس وقت مجھے عابی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔"

آتے ہوئے دل میں عہد کر کے کرنل عمیر آئے تھے کہ رحمان علی خان کو عابی کے بخار کا قطعی نہیں بتائیں گے مگر اچانک ہی زبان پھسل گئی۔ بات کرتے کرتے یاد ہی نہ رہا کہ وہ باپ تھے پریشان ہو جائیں گے۔

"کیوں۔؟ عابی کو کیوں ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔؟" رحمان علی خان نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تین چار دن سے بخار تھا۔ اور وہ کوئی دوا نہیں لے رہا تھا۔ جب آپ کا فون آیا ہے تو مدحت یہی مجھے کہنے آئی ہوئی تھی کہ وہ میری بہت مانتا ہے اس لئے میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔"

"پھر۔؟ نہیں لے کر گئے۔؟" وہ تشویش سے بولے۔

"آپ کا حکم تھا کہ ابھی پہنچوں۔ لہذا میں ادھر چلا آیا۔ اب جاتے ہی یہی کام کروں گا۔ مگر آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے اسے بخار کیوں ہے۔؟"
اک گہری سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے رازدارانہ انداز میں کرنل نے بتایا۔

"اس کا یہ بخار کوئی بیماری والا نہیں ہے بلکہ یہ تپ عشق ہے۔"

"کیا مطلب۔؟" وہ کچھ چونکے۔ کچھ گڑبڑائے۔

"شہزادے کو اپنی اک اسٹوڈنٹ پسند آ گئی ہوئی ہے۔ بس وہی روگ جی کو لگایا ہوا ہے۔ میں نے تو کہا تھا تم کونسی فرحت والی شادی نبھاہ رہے ہو۔ بربادی ہی بربادی ہے وہ۔ اب صحیح معنوں میں آباد ہو جاؤ۔"

"وہ کیسے۔؟"

"اس لڑکی سے شادی کر کے۔" عابی کی بات بتانے کو کرنل دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گئے۔

"ٹھیک ہے نا بابا جان! مرد تو دوسری شادی کر سکتا ہے۔ اور پھر جب ایسی صورت ہو۔ وہ اس شادی کو بھی تسلیم نہیں کرتا تو اپنی پسند کی لڑکی سے کر لے۔ کیوں زندگی برباد کر رہا ہے مزید۔ سات سال پہلے ہی کس قدر دکھ اور کرب میں گزار دیئے۔" رحمان علی خان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ بھلا آپ کے خاندان میں دو شادیاں کبھی کسی مرد نے نہیں کیں۔؟ بتایئے نا۔؟"

"کئی ہوئی ہیں۔" مجرمانہ انداز اور دبے دبے لہجے میں جواب دیا۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ دماغ میں کوئی سوچ تھی۔

"دوسری شادی کئی خانوں نے کی ہے نا۔ مگر وہ مانتا ہی نہیں۔ اور اپنی زندگی کے پیچھے پڑا ہے۔" کرنل کا لہجہ دکھ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ "یہ محبت کا روگ اسے لے جائے گا زید رحمان کے پاس۔ میری تو وہ نہیں مانتا۔ کہتا ہے۔ بڑے بھائی ہو۔ حکم کرو۔ گردن بھی کٹوا دوں گا مگر یہ بے انصافی کبھی نہیں کروں گا۔ دونوں کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی میں اپنی پسند کی لا کر عیش کروں، زندگی کے مزے لوٹوں۔ اور وہ اس ظلم میں بندھی رہے۔"

"کیا مطلب۔ کیا وہ فرحت کو طلاق دینا چاہتا ہے۔"



"نہیں۔ طلاق بھی نہیں دیتا۔ آپ کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے اسی عمر نامرادی میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتا ہے۔ مدحت سے پیار ہے۔ اس کی محبت میں ڈٹا ہوا ہے ورنہ جیسے پہلے چھ سال ملک سے باہر گزارے تھے اسی طرح باقی زندگی بھی وہیں کہیں گزار دیتا۔"

کرنل عمیر رحمان علی خاں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اگر اس کی زندگی چاہتے ہیں تو اس مسئلے کے لئے آپ ہی کو کچھ کرنا ہوگا۔ وہ صرف آپ کی بات مانے گا۔ یہ مجھے یقین ہے۔"

گاڑی کی چابی نیچے قالین پر پڑی تھی۔ اپنی مختلف جیبوں پر ہاتھ مار مار کر ٹٹولا پھر جھک کر چابی اٹھا لی۔ جس کو پہلے سے گرا ہوا دیکھ چکے تھے۔ اس تمام عرصے میں نظریں رحمان علی خان کے چہرے پر ہی جمائے رکھیں۔ "اب یقیناً فرحت کا کام ہو جائے گا۔" ان کے چہرے کے اضطراب کو بھانپ گئے تھے تبھی دل نے اک یقین کے ساتھ گواہی دی تھی۔

"اچھا جی، جلد ہی پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔"

بڑی تیزی سے ان سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

## 64

"آپ دیکھ رہے ہیں یہ ایمان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔"

سر پہ دوپٹہ جمائے اور نیچے نظریں جھکائے فرحت واصل آفریدی کے سامنے بیٹھی تھی۔ "کیا یہ سب کچھ مناسب ہے؟ درست ہے۔؟" اس کی آنکھیں ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھیں۔

"آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔؟" اور اب وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑی دلیری کے ساتھ استفسار کر رہی تھی۔ "مجھے اس سے محبت ہے اور اس کی زندگی یوں ہر خوشی سے محروم کر دی جائے، جیتے جاگتے، یہ مجھ

سے برداشت بھی نہیں ہو رہا۔"

فرحت جس طرح اس کی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ جس طرح اس کے دکھ میں تڑپ رہی تھی اس کا انہیں احساس تھا۔ کیسے بتاتے کہ وہ تو اس کی صرف خالہ تھی' وہ بھی حقیقی نہیں اور صرف پانچ سال کی عمر تک اس کے ساتھ رہی تھی مگر واصل آفریدی تو اس کے باپ تھے۔ اور پیدا ہونے والے دن سے لے کر آج تک وہ انہیں کی زیرنگرانی اور زیرسرپرستی پرورش پاتی رہی تھی۔ جس دن وہ انہیں اپنے آنگن میں کھیلتی دکھائی نہ دیتی' اپنے کندھوں پر' اپنی گود میں اس کے لمس سے دل طمانیت حاصل نہ کرتا انکی صبح نہ ہوتی' ان کی شام نہ ہوتی۔ اس کے بولنے کھلکھلانے کی آواز ان کی سماعتوں میں نہ اترتی انہیں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا یقین نہ آتا۔ اللہ دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کی ہستی اور اس کی قدرتوں پر ایمان' پختہ اور مستحکم اسی وقت ہوا تھا جب ایمان کا ننھا سا وجود پہلی بار ان کے بازوؤں میں مچلا تھا۔

انہوں نے تبھی تو اس کا نام ایمان رکھا تھا۔

جس دن ہمایوں خاں کی موت کا انہوں نے سنا تھا تو ان کے اندر کیسی ٹوٹ پھوٹ مچی تھی اور کیسی قیامت بپا ہوا اٹھی تھی۔ یہ تو کچھ وہی جانتے تھے۔ ان کے اندر جو ایمان کی محبت کے الاؤ جل رہے تھے وہ کیسے کیسے بھڑک بھڑک کر ان کی ہستی کو جلا گئے تھے۔ وہ راتوں کو صفیہ سے بھی چھپا چھپا کر آنسو بہاتے تھے اور انکی آنکھ سے نکلنے والا ہر آنسو اپنی بیٹی کی زندگی کی بربادی پر ماتم کناں تھا۔ اس دن سے لے کر آج تک وہ چین کی نیند نہیں سو سکے تھے۔ کھانے پینے پہننے پر سے ان کا جی اٹھ گیا تھا۔ بڑے شوقین مزاج انسان تھے مگر اب سامنے پڑا اپنی پسند کا کھانا بھی رغبت سے نہیں کھاتے تھے۔ اب ان کا لباس کے لیے وہ اہتمام نہیں ہوتا تھا جیسے پہلے روزانہ کلف دار شلوار سوٹ اور اوپر میچ کرتی واسکٹ پہن کر نکلتے تھے۔ زمینوں پر بھی جاتے تھے تو ان کی چھب دیکھنے کے قابل ہوتی تھی اور اب تو دو دن پہلے کا پہنا ہوا ملگجی سا لباس بھی پہن کر نکل جاتے۔ کسی چیز میں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی انہیں۔

"بیٹے! محبت تو مجھے بھی اس سے بہت ہے۔ اتنی کہ شاید بیان نہ سکوں۔"

"تو پھر آپ اسے اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔ اسے



ہوسٹل بھیج دیں۔ تعلیم کو رسم کیوں بناتے ہیں۔ یہ تو ہمارے نبی پاک کا حکم ہے کہ علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے۔"

"اپنے رسول کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن اتنا پڑھ کر وہ کیا کرے گی۔ نوکری تو اب۔"

"نوکری کی بات نہیں۔ اس کا اپنا دل بہل جائے گا۔ آپ نے دیکھی ہے اس کی حالت۔؟ اگر چند دن اور اس کا یہی حال رہا تو وہ مر جائے گی۔"

"خدا نہ کرے۔" پاس بیٹھی صفیہ نے سہم کر فرحت کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اللہ اسے میری بھی عمر لگا دے۔" واصل آفریدی کی آنکھیں بھی بے اختیار بہہ نکلیں۔ "میں اپنی زندگی بھی اسے دینے کو تیار ہوں۔"

"ایسی زندگی۔؟ کیا کرے گی وہ ایسی روکھی پھیکی اور بے رنگ زندگی کو۔ ں آپ اسے یونیورسٹی بھیجیں اور پھر اس کا کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کر کے......"

"نہیں نہیں۔" رشتے کی بات پر وہ چونک پڑے۔

"کیا نہیں نہیں۔؟" فرحت کو جیسے پتنگے سے لگ گئے۔ "ساتھ زندگی کی دعا یتے ہیں اور ساتھ سانس لینے کو آکسیجن بھی فراہم نہیں کرتے۔ کیسی آپ کی محبت ہے۔؟" فرحت بے خوفی سے بولی۔ "آپ کو کس بات کا ڈر ہے۔؟ برادری سے رج کر دیئے جائیں گے۔؟"

وہ فرحت جو واصل آفریدی کے سامنے ہاں یا نہیں سے زیادہ کبھی بولا نہیں تی تھی۔ آج انتہائی دلیری سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایمان کے حق ے آواز بلند کر رہی تھی۔

"تو ہو جائیں برادری سے خارج۔ ہمیں اپنی ایمان کی زندگی اور وں سے زیادہ کوئی برادری یا سسٹم عزیز نہیں۔ یا پھر آپ کو اس کی پھوپھو کا خیال کہ ان کے بیٹے کی بیوہ ہے اور اسی کے نام پر ساری زندگی بیٹھی رہے۔ ورنہ کہیں راض نہ ہو جائیں۔ روٹھ نہ جائیں۔ روٹھتی ہیں تو روٹھ جائیں۔ آپ سے ملنا جلنا کرتی ہیں تو کر دیں۔ ہم خود ان سے کوئی راہ رسم رکھنے کو تیار نہیں۔" وہ صاف

گوئی پر آمادہ تھی۔ ایمان کی طرفداری میں بہن اور بہنوئی سے بھی لڑائی جھگڑا کرنے سے کوئی گریز نہ تھا۔

"وہ میری اکلوتی بہن ہے۔ ایسے نہ کہو فرحت۔" لہجہ بڑا مدھم تھا۔

"تو اکلوتی بہن کی خاطر اکلوتی بیٹی کی زندگی تباہ کر دیں گے۔؟" فرحت نے طعنہ دیا۔ "بہن نے تو اپنی زندگی خوشیوں مسرتوں سے گزار لی۔ ساری زندگی بہت کچھ دیکھا برتا ہے۔ ہر خوشی' ہر سکھ۔"

"پر یہ اکلوتے بیٹے کا غم جو اسے مل گیا۔ اور اوپر سے ہم ظلم کی انتہا کر دیں' ایمان کا کہیں اور رشتہ کر کے۔ نہیں بیٹا۔!"

"کیوں واصل بھائی! ہر کسی کو اپنی اولاد کی زندگی سنوارنے کا حق ہے جس طرح پھوپھو نے سارے خاندان میں سے بہترین لڑکی کا انتخاب اپنے بیٹے کے لئے کیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ ہمایوں اس کے قابل تھا بھی یا نہیں۔ بیمار پڑ کر نکاح بھی کر دیا۔ اپنے بیٹے کی بھلائی کے لئے۔ آپ سچ بتائیں کیا آپ کو نہیں پتہ تھا یہ سب۔"

واصل آفریدی زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکے البتہ نظریں جھکا کر اپنے تمام قصوروں کا اعتراف ضرور کر گئے۔ محض رسم و رواج کے پابند رہنے کے لئے وہ سب کچھ نظر انداز کر گئے تھے۔ اندر ہی اندر ضمیر نے فرحت کا ساتھ دیا۔

"اگر آپ اس وقت کسی مصلحت کی بنا پر نہیں بولے تو پھوپھی ہی بھتیجی کا خیال کر لیتی۔ اور اب سب کی خود غرضیاں' قصور اور غلطیاں ایمان کی زندگی کی روشنیاں چھین کر اسے تاریکیوں میں دھکیل دیں گی۔ مگر میں یہ سب نہیں ہونے دوں گی۔ نہیں ہونے دوں گی۔"

وہ اتنی محبت' اتنے خلوص اور اتنے جذبے سے ایمان کے لئے بول رہی تھی۔ کہ واصل آفریدی چپ کے چپ رہ گئے۔ گم صم سے۔ سوچوں میں کھوئے ہوئے۔ کیا یہ سب کچھ انہیں نہیں اس کے لیے کرنا چاہیے تھا۔؟ اس سوچ کے ساتھ ہی انہوں نے سر اٹھایا۔ بڑی تحسین آمیز نگاہوں سے فرحت کو دیکھا۔ اس نے ان کی اولاد کی ذمہ داریوں کا احساس دلا دیا تھا۔ اپنے جذبات کا پرجوش اظہار کر کے ان کے مصلحتوں میں چھپے جذبوں کو ابھار دیا تھا۔



"صفیہ! ایمان کو کل ہی یونیورسٹی بھیج دو۔ تاکہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے۔"

ایمان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ماسٹرز کرنا تھی۔ انہیں معلوم تھا۔ اور اب جبکہ اس کی زندگی میں کوئی لطف' کوئی انجوائے منٹ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ تو اس کی یہ خواہش ہی پوری کر دیتے۔

اسی سوچ کے تحت انہوں نے اجازت دے دی۔

## 65

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہاں کا سب کچھ بدل گیا تھا۔

پہلے خزاں کے موسم میں بھی یہاں ہر طرف بہار ہی بہار نظر آتی تھی۔ اور اب کھلے ہوئے رنگ برنگے' پھول' پھوٹتی کونپلیں' ہرے ہرے خوش رنگ پتے دیکھتی تو وہ بھی خزاں ہی کا کوئی روپ لگتا۔ اپنے اندر کے موسم کا عکس جیسے ہر چہار سو پھیلا تھا۔ ان رنگوں بہاروں میں بھی کوئی رونق ہی نہ تھی۔ ہاں البتہ اتنا ضرور تھا یہاں اس گھٹن اور اس ویرانی کا احساس کافی کم تھا جو وہاں اپنے گھر میں' اپنے کمرے میں اسے ان دنوں محسوس ہونے لگا تھا۔

اور یہ فرتی خالہ کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ وہ اس ماحول سے نکل آئی تھی۔ انہوں نے ہی تو اماں اور بابا سے ماسٹرز مکمل کرنے کی اسے اجازت دلوائی تھی۔ وہ ان کی بے حد مشکور تھی۔

مگر دل میں رکھے ہوئے ان سب جذبوں کے باوجود وہ ابھی بھی ان کے روبرو جانے کی ہمت خود میں نہیں پاتی تھی۔ اور شاید ساری عمر ہی وہ یہ جرأت نہ کر سکے۔ اندر کے چور نے اسے ان کی نظروں میں خاک سے بھی کم تر کر دیا تھا۔

"عابی! یہ تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

زندگی کی ساری قدریں ہی بدل گئی تھیں۔ حالانکہ کس کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مگر اس کا اپنا ہی دل اندر سے کچھ یوں خالی ہو گیا تھا کہ لگتا سب کی نظریں بدل گئی

تھیں۔ اور اس کے اندر سناٹوں کا راج ہو گیا تھا۔ نہ کسی سے بولنے کو جی چاہتا تھا نہ کسی کی سننے کو۔

ایمان کی ساری کلاس فیلوز اسے بڑی اچھی طرح ملی تھیں۔ اتنے عرصہ بعد اسے اپنے درمیان دیکھ کر سب نے بے حد خوشی و مسرت کا اظہار کیا تھا۔

''بہت بیمار رہی ہوں۔ تبھی اتنی چھٹیاں ہو گئیں۔'' سب کے استفسار پر اس نے یہی بتایا تھا۔

''چہرے سے ہی لگ رہا ہے۔'' فرزین نے اس کی تائید کی تھی۔

''مگر شکر کرو تمہاری خوبصورتی متاثر نہیں ہوئی۔'' ماھم کے بعد نازیہ اس کے سب سے زیادہ قریب تھی۔

''اماں تو ابھی بھی آنے نہیں دے رہی تھیں۔'' ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی غیر حاضری ہی کا جواز پیش کیے جا رہی تھی۔ اس نے ہمایوں خان کے متعلق کبھی بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ نہ کبھی منگنی کا۔ پھر نہ اس کے ساتھ ہونے والے نکاح کے متعلق کچھ اور نہ اب اس کے انتقال کے باعث بیوہ ہو جانے والے سانحہ کا۔ کیا کچھ اس پر سے گزر گیا تھا ان چھٹیوں میں۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ ''میں ہی ضد کر کے آ گئی۔ حاضریاں نہ اتنی کم ہو جائیں کہیں کہ میں اگلے سمسٹر میں ایگزامز کے لئے بیٹھ ہی نہ سکوں۔''

اور پھر پتہ نہیں کیوں اس کی حاضریوں والی بات پر سب بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔ وہ بہت حیرت زدہ سی انہیں تکنے لگی تھی۔

''تمہیں بھلا حاضریوں کی کیا فکر۔؟'' گل مہر نے عجیب معنی خیز سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں۔ مجھے فکر کیوں نہ ہو گا۔؟'' وہ بڑی معصومیت سے اسے تکنے لگی تھی۔ بھلا اس نے ایسا کیوں کہا تھا۔؟ حیران سی ہو رہی تھی۔

''تمہاری فکریں کرنے کو کوئی اور جو موجود ہے۔'' گل مہر کی بجائے فرزین بولی تھی۔ ساتھ ہی اک قہقہہ پڑا۔

ایمان نے چونک کر ان سب کو دیکھا۔ سبھی کے چہرے کھلکھلا رہے تھے۔



''کیا مطلب۔؟'' انتہائی سادگی اور بھولپن تھا اس کے چہرے پر۔ کوئی ریاکاری یا مکاری نہ تھی۔

''حاضری کا رجسٹر دیکھ لینا۔ سب سمجھ جاؤ گی۔''

''تم ہی بتا دو۔'' وہ بہت پریشانی میں مبتلا ہو گئی تھی۔

''کیوں اسے تنگ کر رہی ہو۔ پہلے ہی بیچاری اتنا بیمار رہی ہے۔'' نازیہ کو اس پر بے تحاشا ترس آ گیا۔ کیسے ساری کی ساری ہی ہنس رہی تھیں۔ ''دراصل سر عبدالرحمان نے تمہاری ساری حاضریاں مارک کر دی ہوئی ہیں۔''

''لہذا تم مہینے دو مہینے کی چھٹیاں اور کر سکتی ہو۔'' فرزین پھر شوخی سے کہہ اٹھی۔ تو سبھی بے اختیار قہقہہ لگا اٹھیں۔ ایمان چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

تین دن ہو گئے تھے اسے آئے ہوئے۔ سر عبد کا ہی پیریڈ تھا اور سب باہر لان میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ پورے کا پورا گروپ موجود تھا۔

یونیورسٹی آتے ہوئے ایمان اندر ہی اندر بے حد خائف تھی۔ سر عبدالرحمان کا سامنا کیسے کرے گی۔؟ ویسے اس نے دل میں سوچ لیا ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو جائے۔ بے شک حاضریاں کم ہو جائیں مگر وہ ان کا پیریڈ اٹینڈ نہیں کرے گی۔ کہ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود بھی وہ انہیں معاف نہیں کر سکی تھی۔

بھلا یوں بھی کسی کے جذبات کے ساتھ کوئی کھیلتا ہو گا جس طرح سر عبدالرحمان جیسا اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان' اتنا بڑا اسکالر ٹائپ بندہ' اس جیسی سادہ اور معصوم سی لڑکی کے ساتھ کھیل گیا تھا۔ وہ تو اپنی ہی نگاہوں میں آپ ذلیل ہو کر رہ گئی تھی۔ کاش! مر سکتی۔

''ایمان کو کسی نے بتایا نہیں کہ جب یہ غیر حاضر تھی تو سر عبد کس طرح ایک ایک سے اس کے متعلق پوچھتے پھرتے تھے۔'' یہ ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا اس کے لیے۔

''ہاں۔؟'' وہ پھیلی پھیلی آنکھوں سے اک اک کا چہرہ تکنے لگی۔

''اور اپنے پوچھنے کا جواز انہوں نے یہ بتایا تھا کہ وہ تمہارے رشتہ دار ہیں۔''

"رشتہ دار۔؟" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"لو۔ اسے شاید اس رشتہ داری کا پتہ ہی نہیں' جو وہ اس کے ساتھ بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہائے بیچارے۔!" سب پھر بہت زور سے ہنسی تھیں۔ اور ان کے قہقہوں کی گونج پورے لان میں دور دور تک بکھر گئی تھی۔

اور ایمان بے حد شرمندہ اور بے حد پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ فرتی خالہ کا شوہر تھا وہ۔ یہ بھید کھل جانے کے بعد بھی کیا وہ اسے ڈھونڈتا رہا تھا۔؟ "شرم آنی چاہیے عابی تمہیں۔ اور بے ایمان انسان! کیا اسی رشتہ داری کا اعلان کرتے رہے تھے سب کے سامنے۔ ڈوب مرنا چاہیے تمہیں مسٹر عبدالرحمان۔!"

"اور اب دیکھو بخت ان کا۔ کیسا سیاہ نکلا۔ اس وقت ڈھونڈتے رہے اور آج جب ایمان آ گئی ہے تو خود کتنے ہی دنوں سے غائب ہیں۔ پور فیلو۔!" گل مہر کی شریر چمکتی آنکھوں میں شوخی بھرے ستارے ناچ رہے تھے۔

"چچ چچ چچ۔" سب نے بیک زبان اظہار افسوس کیا۔

"سنا ہے لمبی رخصت پر ہیں۔" فرزین نے مزید معلومات بہم پہنچائیں۔

"موصوف شادی وادی کے چکر میں تو نہیں۔؟" ثوبیہ نے کنکھیوں سے ایمان کے چہرے کو تکتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ ایمان کو ڈھونڈے بغیر ہی بھلا شادی کیسے کر سکتے ہیں۔"

"ہاں تو۔ ویسے جوڑی اے ون ہو گی۔"

"بس کرو بھئی۔ بہت چھیڑ لیا بیچاری کو۔" نازیہ اس کی ڈھال بنی۔ پھر متجسس لہجے میں پوچھنے لگی۔ "آخر سر عبد نے لمبی چھٹی کیوں لی ہے۔؟"

"بیمار ہیں شاید۔" فرزین نے بتایا۔

"کیا ایمان کی جدائی میں ہو گئے۔؟" پھر قہقہہ پڑا۔

اور اب ایمان کی برداشت جواب دے گئی۔ کسی کو تو کچھ کہہ نہ سکتی تھی خود ہی اٹھ کر وہاں سے چل دی۔

"کدھر ڈارلنگ! کدھر؟ ہمیں نہ جاؤ چھوڑ کر دل ابھی بھرا نہیں۔" سب مل کر قوالی کے انداز میں گانے لگیں۔ "ہاں۔ ہاں۔" کانوں پہ ہاتھ دھر دھر کر اور بازو



لمبے کر کے۔

وہاں سے اٹھی تو سیدھی ہوسٹل اپنے کمرے میں آ گئی۔ کوئی اور پیریڈ بھی اٹینڈ نہیں کیا۔ دوپہر انہیں سوچوں خیالوں میں غلطاں رہی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ بھوک ہی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

عابی کو بھی سوچنے کا دل نہ تھا مگر لحہ لحہ خیال بھی اسی کی طرف لگا رہا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ اس نے بیماری کی وجہ سے چھٹی لی تھی دل کا چین قرار لٹ گیا۔ یہاں تک کہ کھانا نہیں کھایا گیا تو آرام کرنے جا لیٹی' تب اک لمحے کے لیے پلک بھی نہ جھپک سکی۔ پھر اٹھ کر کتابیں لے بیٹھی تو اک حرف پڑھا بھی نہ گیا۔

"کیا مصیبت ہے۔؟" بیڈ کے بیچوں بیچ چہرہ گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گئی۔

"اسے جب پتہ چل گیا تھا کہ میں فرتی خالہ کی بھانجی ہوں تو پھر وہ کیوں مجھے ڈھونڈتا رہا۔ فراڈیا۔ دھوکے باز۔ بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا تھی نا۔" خیال بھی اسی کا آتا رہا اور کوستی بھی اسی کو رہی۔

اسی عالم میں بیٹھی تھی۔ یکایک بڑے زور سے دروازے پر دستک ہوئی۔ تب سر کو جھٹک کر اس نے پھر سوچ سے چھٹکارا حاصل کیا۔ "کوئی لڑکی ہو گی۔ دائیں بائیں کسی کمرے والی۔ کچھ مانگ رہی ہو گی۔" اٹھ کر دروازہ کھولا۔

"ارے!" بے اختیار اک طویل سی چیخ ہونٹوں سے برآمد ہوئی۔ سامنے ماہم کھڑی تھی۔ پھر دوسرے لمحے دونوں ایک دوسری سے لپٹی ہوئی تھیں۔

"تم کب آئیں۔؟ اور یوں اچانک بغیر اطلاع دیئے۔؟" ایمان شکوہ کرتے ہی ساتھ رونے لگ پڑی۔ "ویسے آج کل تو میں تمہیں بہت ہی مس کر رہی ہوں۔"

"بس بس آنسو نہیں۔ میں تمہیں رلانے نہیں آئی۔ اور آئی بھی صرف تمہارے لئے ہوں۔ تمہیں ہنسانے کے لیے۔ اور یہ اپنی حالت کیا بنائی ہوئی ہے تم نے۔؟" وہ اسے سامنے کھڑا کر کے سر سے پاؤں تک بڑے پیار اور بڑے غور سے تکنے لگی تھی۔ "پر ظالم! خوبصورت بھی زیادہ ہو گئی ہو۔ یہ سوجے سوجے بھاری بھاری پپوٹے یہ بھیگی بھیگی پلکیں۔ یہ زرد زرد رخسار۔"

"اچھا اچھا آؤ بیٹھو تو۔" اک شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایمان نے اس کا بازو پکڑ کر اندر کی طرف کھینچا۔

"نہ نہ۔ بیٹھنا نہیں۔ بس میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں۔؟"

"لمبی ڈرائیو پر۔ ساتھ باتیں کریں گی۔ ساتھ راستے میں کسی اسپاٹ سے ڈرنک وغیرہ لے لیں گی۔ یہاں تو کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے کوئی نہ کوئی آ کر ہمیں ڈسٹرب کرتا رہے گا۔ اور میں اس وقت تمہارے اور اپنے علاوہ کسی تیسرے کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ مکمل پرائیوسی میری جان۔"

اسے چیلنج بھی نہیں کرنے دیا اسی طرح کھینچ کر لے گئی۔

## 66

کتنے ہی دنوں سے عابی کو بخار تھا اور وہ کسی بھی ڈاکٹر یا حکیم کی دوا سے اتر نہیں رہا تھا۔ فرحت کے خیال میں یہ اس کی محبت کا روگ تھا جو بخار کی صورت نمودار ہوا تھا۔ اور اس کا واحد علاج ان دو بچھڑے ہوؤں کا ملاپ تھا۔ جس کے لئے وہ پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ "میں ایک بار پھر صورت سوال آپ کے سامنے ہوں۔"

فرحت واصل آفریدی اور صفیہ سے مخاطب تھی۔ سوچ رکھا تھا۔ جان کی بازی بھی لگانا پڑی تو لگا دے گی۔

"صورت سوال۔؟" واصل آفریدی مسکرائے۔ فرحت کی بات سمجھ نہیں سکے تھے۔

"بہنیں سوال نہیں کیا کرتیں۔ بس جو ضرورت ہو جو چاہیئے اس پر قبضہ کر لیا کرتی ہیں۔"

"تو پھر آپ کی طرف سے ہاں سمجھوں۔؟"

"کیا مطلب۔؟" وہ اب چونکے تھے۔

"میں نے صفیہ آپا کو بتایا تھا۔ ایمان کے لئے اک رشتہ ہے۔ ایسا کوئی دوسرا ہمیں نہیں مل سکے گا۔"

واصل آفریدی توجہ سے سن رہے تھے۔ فرحت تفصیل بتانے لگی۔

"بہت وجیہہ و شکیل ہے۔ بہت لائق ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ بے شمار مربعوں زمینوں کا واحد مالک ہے۔ ہماری ایمان وہاں بہت خوش رہے گی۔ جتنے بیچاری نے اس چھوٹی سی عمر میں دکھ بھگت چکی ہے۔ اس رشتے سے سب کا ازالہ ہو جائے گا۔"

"کون لوگ ہیں وہ۔؟" صفیہ کی ممتا مچل اٹھی۔ مسکراہٹوں نے ہونٹوں کا گھیراؤ کر لیا۔ فرحت نے کبھی کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔

واصل آفریدی نے ابھی ہاں بھی نہیں کی تھی۔ صفیہ کی سوچ کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ماں تھیں نا۔ خاندان برادری کی روایات کے ہاتھوں بندھا ہونے کے باوجود بیٹی کا اچھی سے اچھی جگہ گھر بسانے کے خواب دیکھنے لگی۔

"اپنا ہی خاندان ہے۔ اپنا ہی قبیلہ برادری۔"

"کوئی نام پتہ تو ہو گا اس کا۔" وہ جاننے کو بے قرار تھیں۔

"کہاناں۔ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔" فرحت نے مبہم سا جواب دیا۔ اندر ہی اندر سے کھول کر بتاتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچا بھی رہی تھی۔ اگر انکار ہو گیا تو۔؟

"اس کا نام۔ باپ کا نام۔ کس علاقے سے اس کے باپ دادا کا تعلق ہے۔ کچھ بتاؤ تو۔" صفیہ کی دلچسپی دیکھ کر واصل آفریدی کا تجسس بھی جاگا۔ انداز یہ بتا رہا تھا جیسے فرحت نے مزید اصرار کیا تو وہ راضی ہو جائیں گے۔ کچھ بھی تھا ایمان ان کی اولاد تھی۔ اور اولاد کے لئے والدین کے سینوں میں ہمیشہ اک علیحدہ سا گوشہ ہوتا ہے۔ نرم و گرم۔ محبتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ ذرا کوئی دکھ سکھ ہو اس میں طوفان اٹھ جاتے ہیں۔ ایسے کہ رسم و رواج اور قانون، اصول بھی بعض اوقات اپنے ساتھ بہا لے جاتے ہیں اور پیچھے باقی صرف اک ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت رہ جاتی ہے۔

اور اس وقت اسی مقام تک واصل آفریدی اور صفیہ پہنچ چکے تھے۔ انہیں اپنی بیٹی سے ایسی ہی محبت تھی جو سارے خاندان میں مثال بنی ہوئی تھی۔ تبھی تو۔ ایمان قبیلے کی واحد لڑکی تھی جو یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ جو گھر سے دور شہر جا کر ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ یہ والدین کی اتھاہ محبت کا نتیجہ تھا اور وہ اس کے

لئے کسی بڑی سے بڑی چٹان سے بھی ٹکرا سکتے تھے۔

”ہوسکتا ہے ہم کچھ سوچ ہی لیں۔“ صفیہ کی آنکھوں میں آس کے دیئے جل اٹھے تھے۔

تب فرحت انہیں دیکھتے ہی دیکھتے بولی۔

”رحمان علی خاں کا بیٹا عبدرحمان۔“

ساتھ ہی اس نے بہنوئی کے چہرے کو بنظر غور دیکھا۔

”کیا۔؟“ واصل آفریدی گڑبڑا سے گئے۔ ”کیا نام بتایا ہے۔؟“ انہوں نے سوچا تھا شاید وہ صحیح طرح سن نہیں سکے تھے۔

”عبدرحمان۔ اور باپ کا نام رحمان علی خان۔“

”اے فرتی! رحمان علی خان تو تمہارے سسر کا بھی نام ہے۔“ صفیہ بھی چونکیں۔

”ہاں۔ انہیں کے بیٹے کی بات کر رہی ہوں۔“

”ان کا بیٹا کونسا۔؟ ایک تو زید تھا بڑے والا۔ اللہ اسے بخشے۔ اور دوسرا عبدرحمان تمہارا شوہر۔ تیسرا تو کوئی نہیں تھا۔“ صفیہ نے نام کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

”تو میں نے کب کہا‘ کوئی تیسرا بھی ہے۔“ فرحت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر اپنی صفیہ آپا کی آنکھوں میں اک گہری سی نگاہ ڈالی۔

”میں عبدرحمان ہی کے رشتے کی بات کر رہی ہوں۔“

”ایمان کے ساتھ۔؟“

”ہاں۔“

”اپنے شوہر کے رشتے کی بات۔؟“

”ہاں ہاں۔ وہ اک بہت نفیس انسان ہے۔“

”پاگل ہوئی ہو کیا۔؟“ صفیہ یکا یک بگڑ اٹھیں۔ ”اگر وہ اک نفیس انسان ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ دنیا کی دوسری لڑکیوں کا بھی اسے شوہر بنا دیا جائے۔ خبردار! ایسا مذاق پھر کبھی نہ کرنا۔“



”مذاق تو نہیں کر رہی۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ دل سے کہہ رہی ہوں۔“

”کیا سچ کہہ رہی ہوں۔؟“ صفیہ کا لہجہ بے حد خفگی بھرا تھا۔ ”شوہر کی دوسری شادی کرو گی۔ بھانجی کو سوت بناؤ گی۔؟“

”ہاں۔ بہت خوش رکھوں گی اسے۔“

”عقل کے ناخن لو بی بی۔ تم سے تو مجھے ایسی بے عقلی کی بات کی قطعی توقع نہ تھی۔ کبھی بھی۔“ وہ بری طرح ناراض ہونے لگیں۔ غصے میں اسے بہت کچھ سنا ڈالا۔

”لیکن آپا! میری سنیں بھی تو۔ عبدرحمان میرا شوہر نہیں ہے۔“

”پھر کون ہے تمہارا شوہر۔“

”کوئی نہیں ہے۔ میں بس زید رحمان کی بیوہ ہوں۔“

”کیا بات ہے۔؟ کوئی جھگڑا ہے تم دونوں میں۔؟“ واصل آفریدی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں واصل بھائی! ہم میں کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو پھر جھگڑا کیسا۔؟ یہ شادی تو رسم و رواج کا اک طوق تھا جو ہمیں پہنا دیا گیا ہے۔ سات سال ہوئے۔“

”کیا مطلب۔؟“

فرحت نے پوری تفصیل کے ساتھ اس زبردستی کی شادی اور اس کے انجام کا احوال انہیں سنا ڈالا۔

”ہم دونوں نے ہی یہ نکاح قبول نہیں کیا تھا۔ اور یوں ہم دونوں ہی اپنے اپنے گلے میں یہ طوق ڈالے پھر رہے ہیں۔ دنیا والوں کی نگاہوں میں ہم دونوں میاں بیوی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ آپ یقین کریں اگر ہوتا تو عبد گھر‘ جائداد اور زمینیں چھوڑ ملک سے باہر کیوں چلا گیا ہوتا۔ دنیا بھر کی آسائشوں پر فاقوں اور دربدری کو ترجیح کیوں دیتا۔؟“

”پھر بھی۔؟“ واصل آفریدی کے چہرے پر کئی فکر انگیز لکیریں ابھر آئیں۔

”میری پوری بات تو سنیں پلیز۔!“ فرحت التجا آمیز لہجے میں بولی۔

”میری تو زندگی مکمل ہے۔ مدحت کے ساتھ۔ مجھے اس کے لیے جینا ہے۔ اس کے لیے سکھ‘ خوشیاں‘ مسرتیں مہیا کرنی ہیں۔ مگر عبد کے پاس محرومیوں کے سوا کچھ نہیں

ہے۔ نہ آنے والی زندگی میں کوئی آس کی ننھی سی کرن تک۔ وہ کس امید کے سہارے باقی کی زندگی گزارے گا۔؟'' فرحت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ 'وہ بھی اک انسان ہے۔ سینے میں گوشت پوست کا دل رکھنے والا۔ اور اس کے دل میں بھی اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے کئی ارمان ہوں گے۔ کئی خواہشیں ہوں گی۔ کیا یہ اس کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا۔ کہ ساری زندگی کے لئے اسے رسم و رواج کے بندھن میں یوں جکڑ کر ڈال دیا جائے۔ کیوں آپا۔؟ کیوں واصل بھائی۔؟''

وہ انہیں سے رقت بھری آواز میں پوچھ رہی تھی۔ جواب میں دونوں خاموش تھے۔ اک لفظ بھی کہنے جوگے نہ رہے تھے۔

''اسی لئے میں چاہتی ہوں جیسا وہ اچھا اور پیارا سا انسان ہے ویسی ہی کوئی لڑکی ڈھونڈ کر میں خود اس کا گھر بسا دوں۔ اور اس کے لئے ایمان سے بہتر مجھے کوئی اور لڑکی دکھائی نہیں دے رہی۔ آپ اسے کبھی مل کر تو دیکھیں۔ وہ اک آئیڈیل انسان ہے۔''

پھر فرحت سمجھانے والے انداز میں نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''جس صورت میں ایمان کی پوزیشن بھی اب بدل چکی ہے۔ بیوہ ہو کر تو بیچاری اپنی ہستی کے تمام مارکس کھو بیٹھی ہے۔ اور اب اپنی برادری کا کوئی بھی اچھا رشتہ اس کے نام نہیں نکلے گا۔''

صفیہ اور واصل آفریدی چپ بیٹھے تھے۔ لیکن دونوں کے دل اس کے بولے ہوئے ایک ایک لفظ کے ساتھ متفق تھے۔

''میں ایمان کی ساری زندگی کی خوشیوں کی ضامن بنتی ہوں۔ مہیا بھی کروں گی اور اس کے لیے دعائیں بھی کروں گی۔ اللہ بہتری کرنے والا ہے۔ وہ ضرور کرے گا۔''

واصل آفریدی چپ چاپ ہونٹ بھینچے بیٹھے تھے۔ اور فرحت گڑگڑا رہی تھی۔ ''ایمان کی بھی بھلائی اسی میں ہے۔''

کتنی ہی دیر کمرے میں مکمل سکوت چھایا رہا۔ صفیہ بھی جیسے سانس روکے بیٹھی تھیں۔ واصل آفریدی صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے چھت کو گھور رہے تھے۔

فرحت اگر ان کی بیٹی کے لئے اتنی بڑی قربانی دے رہی تھی تو کیا انہیں بلا کچھ سوچے سمجھے وہ قبول کر لینی چاہیے تھی۔ ان کا اپنا ضمیر ہی ان سے سوال کر رہا تھا۔ نکاح تو ہوا تھا۔ اور زندگی میں کبھی' شاید دونوں کے دل مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔ دلوں میں جذبے تو اللہ کی طرف سے اترتے ہیں۔ اور وہ وقت کبھی بھی آ سکتا تھا۔ فرحت کی زندگی میں آنے والی امید کی اس روشن کرن کو وہ بجھا دیں۔ کیا یہ مناسب تھا۔؟ اس کی قربانی کو قبول کر کے وہ اس کی پوری زندگی میں سدا کے لئے تاریکی اتار دیں۔ کیا نیکی کا بدلہ اس طرح بھی دیا جا سکتا تھا؟

''واصل بھائی! آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کیا سوچ رہے ہیں۔؟'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد فرحت نے پھر جرأت کی۔

''ایک بیٹی کی زندگی کے سکھوں اور خوشیوں کے لئے دوسری کو برباد کر ڈالوں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔؟'' واصل آفریدی نے فرحت کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''یہ سچ ہے مجھے ایمان دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔ اس کی خوشی اور سکھ کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ مگر ایسے نہیں کہ کسی دوسرے کو دکھوں میں مبتلا کر کے اسے سکھ دینے کی کوشش کروں۔ ایمان کی زندگی میں روشنیاں بھرنے کے لیے تمہاری زندگی کو تاریک کر دوں۔ تم بھی میری اپنی ہو۔ میری بہن۔ میری بیٹی۔ بالکل ایمان جیسی۔''

''میں نے کہا نا کہ اس رشتے سے میری زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ آپ اگر مان جائیں تو مجھے بے انداز خوشی ملے گی۔ آپا! انہیں بتائیے نا۔ یہ نیکی کا کام ہے۔ مجھے عبدالرحمان کی زندگی بچانا ہے۔ میری خوشی اور سکون کے لئے آپ دل مجھ پر یہ احسان کر دیں۔ ایمان مجھے دے دیں۔''

منت سماجت کے بعد فرحت نے اپنے ہاتھ ان کے روبرو جوڑ دیئے۔

''اچھا اچھا'' انہوں نے گڑبڑا کر فرحت کا سر تھپتھپایا۔ پھر اس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔

''یہ زندگی بھر کے فیصلے منٹوں میں تو نہیں ہو جایا کرتے۔ میں ایمان کے تمہارے اس پروپوزل کو نگاہ میں رکھوں گا۔ فی الحال اسے تعلیم تو مکمل کر لینے دو۔

یہ اس کی سب سے بڑی خواہش ہے۔"

اس کو بڑی خوش اسلوبی سے جواب دیتے ہوئے واصل آفریدی ایک دم گردن موڑ کر صفیہ سے مخاطب ہو گئے۔

"کوئی چائے پانی بھی پلایا میری بہن کو۔؟"

فرحت جانتی تھی۔ یہ وقتی طور پر واصل بھائی نے اسے ٹالا تھا۔ مگر وہ ایسا کبھی بھی نہیں کرنے والے تھے۔ ان کے انداز بتا رہے تھے۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ اسے یقین تھا۔ کامل یقین۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ آخری بات اس سے نظر ملا کر نہیں کی تھی۔ جس کا مطلب تھا وہ جو کچھ کہہ گئے تھے' زبانی زبانی تھا۔ عملاً کریں گے نہیں۔ یہ ان کی عادت تھی ہمیشہ سے۔

فرحت مایوس ہو گئی۔ تو کیا عابی اسی طرح بیمار رہے گا۔؟ اس کا بخار بڑھتا جائے گا۔؟ اور پھر آخر میں محبت کا روگ گلے سے لگائے لگائے وہ جان سے گزر جائے گا۔؟

"اور۔ اس سارے المیے کی وجہ میرا وجود بنے گا۔؟"

"نہیں نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں اب وہ کمزور فرحت نہیں رہی۔ میں اک مضبوط ارادوں والی عورت ہوں۔ جو سوچا ہے وہ کر کے دکھاؤں گی انشاء اللہ۔"

ہمایوں خاں کی موت نے ایمان کے پاؤں میں پڑی نکاح کی بیڑیوں کو کاٹ ڈالا ہے۔ اسی طرح اگر فرحت عبدرحمان کی زندگی سے نکل جائے تو وہ بھی اپنے پاؤں میں پڑی زنجیروں سے آزاد ہو سکتا ہے۔ پھر تو واصل آفریدی کو کوئی انکار نہیں ہو گا۔

"تو کیا۔ میں مر جاؤں۔؟ خودکشی کر لوں۔؟ نہیں۔ یہ گناہ ہے۔ یہ بزدلی ہے۔"

طلاق سے بھی تو زنجیریں کٹ سکتی ہیں۔ عبدرحمان آزاد ہو سکتا ہے۔ مگر۔ بابا جان کبھی نہیں مانیں گے۔ منتیں التجائیں کروں۔ ہاتھ جوڑوں۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ لیکن میرا حق۔ اک عورت کا جائز حق۔ کورٹ میں خلع کی اک درخواست۔ ہاں۔ میں



اپنا حق کورٹ سے حاصل کر سکتی ہوں۔ نہ مانیں بابا جان۔ اور وہ میں حاصل کر کے رہوں گی۔

## 67

ملا کی دوڑ مسجد تک۔

اور وہ پھر کرنل عمیر آفندی کے آستانے پر حاضری دے رہی تھی۔

انکے سوا اور کون تھا' اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا پالن کرنے والا۔ دل پر حکومت کرتے تھے لیکن مزاج میں فرمانبرداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

"عمیر! ایک کام تھا آپ سے۔"

"بندہ جی کس لئے رہا ہے۔؟" کرنل عمیر آفندی مسکراتے ہوئے بڑے فدویانہ سے انداز میں بولے تھے۔ "فرمایئے۔ حکم کیجئے۔!"

ان کے بازو سینے پر باندھ کر جھکنے والے انداز نے فرحت کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیر دیں۔ "آپ بھی حد کرتے ہیں۔"

"کیا کیا ہے میں نے۔؟ یہی نا۔ ہاتھ باندھا غلام سامنے ہوں۔ حکم۔"

"پھر وہی شرارت بھرا لہجہ اور شوخی بھرا انداز۔ اتنی ضروری بات کرنا تھی۔"

"تو کہو نا۔" وہ یکا یک سنجیدہ ہو گئے۔

"شہر کا کوئی اچھا سا وکیل چاہیے۔ جو بہت قابل ہو۔"

آفندی چونک پڑے۔ "کیا ہم سے کوئی جرم سرزد ہو گیا۔؟"

"آپ سے ہو گا تو وکیل نہیں بلاؤں گی۔ کیس بھی خود کروں گی۔ فیصلہ بھی خود۔"

"زہے نصیب۔ زہے نصیب۔!!"

"پلیز عمیر! تھوڑی دیر کے لئے سنجیدہ ہو جائیں۔" وہ ملتجی سے لہجے میں بولی "اوہ سوری۔" کوئی بہت سیریس مسئلہ تھا شاید۔ فرحت کے چہرے کے رنگ

دیکھتے ہوئے انہوں نے سنجیدگی کی ردا تان لی۔ ''خیر تو ہے ناں۔؟''

''میں کورٹ میں خلع کا دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں۔ عابی کے خلاف۔''

''ارے۔!'' بڑے آرام سے صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک لگائے ریلیکس موڈ میں تشریف فرما تھے۔ ایک دم چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔ ''وہ کیوں۔؟''

''جب تک میرا وجود اس فیملی سے کٹ نہیں جائے گا' اس گھر میں کوئی خوشی قدم نہیں رکھ سکتی۔'' وہ کچھ آزردہ سی ہو گئی۔ ''آپ نے بھی تو کچھ نہیں کیا۔''

''کر رہا ہوں بھئی۔ کر رہا ہوں۔'' کتنے چکر وہ ان کی حویلی کے لگا چکے تھے۔ کتنی ملاقاتیں رحمان علی خاں سے کر چکے تھے۔ سب کچھ اسی مقصد کے لئے تو تھا۔ مگر انہوں نے ابھی فرحت کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کیا پتہ نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلے۔ اور انہیں فرحت کے روبرو شرمندہ ہونا پڑے۔

''کب کریں گے۔ جب وہ بیمار رہ کر......'' مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو آن جمع ہوئے۔ آج کل اس کے لئے بے شمار ہمدردیاں دل میں تھیں۔

''ریلیکس فرحت! پلیز ریلیکس۔'' وہ بھی افسردہ اور دکھی سے ہو گئے۔

عابی کے بخار پر کوئی بھی دوا کارگر نہیں ثابت ہو رہی تھی۔ اور وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

''مسئلہ بھی تو ایسا الجھا ہوا ہے کہ سلجھتے سلجھتے ہی سلجھے گا۔ ادھر عابی کی ضد اور ہٹ دھرمی۔ ادھر بابا جان کی انا اور خودداری۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔''

''میں فکر نہیں کروں گی اور کون کرے گا۔ کیونکہ اس معاملے میں' میں خود کو مجرم سمجھتی ہوں۔ اور میرے خیال میں اس کا بہترین حل یہی ہے کہ میں کورٹ کے ذریعے خلع حاصل کر لوں۔''

پھر فرحت نے واصل آفریدی والی ناکام ملاقات کا سارا قصہ بالتفصیل آفندی کے گوش گزار کیا۔

''میں چاہتی تھی عابی ایمان سے شادی کر لے۔ میں اسے اجازت دے رہی تھی نا ادھر آپ کوشش کرتے۔ مگر ادھر واصل بھائی بھی اڑے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی



نہیں مانیں گے۔ صرف میری وجہ سے۔ لہٰذا بس۔ کوئی قابل سا وکیل ملا دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔''

''ویسے کچھ سال پہلے تمہیں یہ کام کر لینا چاہیے تھا۔'' شوخی پھر ان کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔ ''دو بیچاروں کا بھلا ہو جاتا۔ پہلے ہی۔ اتنے دکھ کے دن نہ کاٹتے۔''

''دو بیچارے۔؟'' وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

''عابی اور عمیر۔؟''

''میری جان پر بنی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہے ہیں۔''

''مذاق۔؟ محترمہ! سب سے بڑا سچ ہے یہ۔ محبت محبت۔ کچھ عرصہ تک ادھر بھی بخار آن براجمان ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے۔''

''توبہ توبہ۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔؟''

فرحت نے انہیں اس موضوع سے ہٹانے کے لئے میز پر سے میگزین اٹھا لیا پھر اس کے اوراق الٹنے پلٹنے لگی۔ ''کیا بات ہے آج خادم غائب ہے۔ چائے بھی کسی نے نہیں پوچھی۔؟''

''وہ ذرا بازار تک گیا ہے۔ ابھی آتا ہے۔''

''میں بنا دوں۔؟'' شکر کیا کہ موضوع بدل گیا تھا۔

''پتی ختم تھی۔ وہی لینے گیا ہے۔ تمہیں آتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا۔ پچھلی طرف سے بھاگ نکلا۔'' کرنل عمیر ہنسنے لگے۔ ''میرے جیسا ہی دیوانہ ہے۔''

آخری جملہ سنا ان سنا کرتے ہوئے فرحت نے اچانک پوچھ لیا۔ ''کیا آپ کو میری یہ تجویز بری لگی۔؟ آپ نہیں چاہتے کہ میں کورٹ میں جاؤں۔؟''

''کیوں نہیں۔ ہر انسان کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حقوق کے لئے ہر قسم کی جنگ لڑ سکے۔''

''اب ہو گئی ہوں نا۔ پہلے نہیں تھی۔'' مدھم لہجے میں جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ بولی تھی۔ ''آپ میری زندگی میں نہ آتے تو شاید ابھی تک نہ ہو پاتی۔'' نظریں اٹھا کر ان کی آنکھوں میں تکتے ہوئے پوری سچائی کے ساتھ کہہ گئی تھی۔

"یہ جذبات بھی اللہ نے......" نجانے کیا ہوا بات بھی نامکمل چھوڑ دی۔

"ایمان اور عابی کی محبت کا تو مجھے ابھی' کچھ ہی دن پہلے علم ہوا ہے۔ ان کی آنے والی زندگی کی خوشیوں مسرتوں اور سکون واطمینان کی خاطر میں یہ سب کر گزروں گی۔ کورٹ کچہریاں وغیرہ۔"

وہ انہیں اپنے پرعزم ہونے کا یقین دلانے لگی تھی۔ حالانکہ انہوں نے کسی شک شبہے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"اور بابا جان۔؟" کرنل نے قدرے تردد کے ساتھ پوچھا۔ "ان کے قبیلے کی روایات' رسم ورواج اور ان کی اپنی عزت غیرت۔"

"ہاں تو دو انسانوں کی خوشیوں اور زندگی کی قیمت پر قبیلے کی روایات اور عزت وغیرہ قائم رکھنا ہے نا۔" فرحت کے لہجے میں دکھ اور کرب سمٹ آیا۔ "پر کس کام کی ایسی عزتیں غیرتیں کہ اولاد ہی باقی نہ رہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا کر کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "پھر کب وکیل سے ملاقات کرا رہے ہیں۔ مجھے بہت جلدی ہے۔ سچ کہہ رہی ہوں عمیر! عابی کی بیماری بڑھتی جا رہی ہے اور میں بہت پریشان رہتی ہوں۔"

"بیرسٹر سالک میر میرے بہت عزیز دوست ہیں۔ کہو تو اس جمعہ کو ہی۔"

"ہاں ہاں۔ میں تو کہتی ہوں۔ اس سے بھی جلد ہو سکے تو۔ کہاں ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ آپ کے گھر۔؟ ہمارے گھر۔؟ یا پھر ان کے دفتر میں۔؟"

"جہاں تم ایزی فیل کرو۔ ویسے میرا خیال ہے دفتر کی بجائے کوئی سا گھر بہتر رہے گا۔" کرنل عمیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"میرا یا آپ کا۔؟"

"دونوں ہی تمہارے ہیں۔" کرنل نے جذبات سے پر لہجے میں کہا۔

"پھر وہی مذاق۔" فرحت نے انہیں گھورا۔

"اچھا اچھا سوری۔" وہ مسکرا کر سر کو کھجانے لگے۔ ذرا ذرا دیر بعد جو چہرے پر افسردگی طاری کر لیتی تھی اس کی بجائے شرما کر سرخ ہوتی ہوئی زیادہ اچھی لگتی تھی۔

"بات یہ ہے کہ کھانے یا گرینڈ سی چائے وغیرہ کا انتظام کرنا ہو گا۔ سالک



کھانے پینے کا بڑا شوقین ہے۔ اور ادھر اس کے شوق کو سنبھالنا خادم کے بس میں نہ ہو گا۔ ادھر تو تم سارا انتظام کر لو گی۔ جیراں ساتھ ہو گی۔ مدحت بھی۔ سب مل جل کر۔" بات کرتے کرتے تھم سے گئے۔ پھر لمحہ بھر کی سوچ کے بعد بولے۔ "لیکن نہیں۔ تمہاری طرف عابی ہو گا۔ وہ آج کل گھر میں ہی ہوتا ہے۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے۔ میں عابی سے کچھ چھپا کر رہی ہوں۔؟ نہیں۔ اس سے کچھ چھپایا نہیں جائے گا۔"

"کیا بابا جان اور عابی تمہاری اس حرکت سے ناراض نہیں ہو جائیں گے۔؟"

"عابی تو نہیں۔ کیونکہ اس کے اپنے اصول ایسے ہی ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے فیصلے خود کرے اور اپنے حقوق جس طرح حاصل کر سکتا ہے' ضرور کرے۔ البتہ بابا جان کی طرف سے مجھے ڈر ہے۔ وہ کافی شور مچائیں گے۔ عزتوں غیرتوں کا معاملہ بنا لیں گے۔ ہو سکتا ہے مجھے گولی ہی مار دیں۔" فرحت زور سے ہنس دی تھی۔ "ان کی رگوں میں پٹھان خون رواں دواں ہے۔ اور پٹھان لوگ ذرا سا غصہ آنے پر بندوق اٹھا لیا کرتے ہیں۔"

"تو پھر سوچ لو۔" کرنل نے گہری سنجیدگی کے ساتھ اسے مشورہ دیا۔

"وہ تو اب طے ہو چکا۔ عابی کی خاطر مجھے یہ قدم اٹھانا ہی ہو گا۔"

## 68

بغیر کوئی اطلاع دیئے' بلا سان وگمان رحمان علی خاں اچانک ہی چلے آئے تھے۔ فرحت کچن میں جیراں کے ساتھ کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ آج بیرسٹر مالک میر ڈنر پر ان کے ہاں مدعو تھے۔

فرحت خلع کا کیس دائر کرنے والی تھی۔ لہذا اسی سلسلے میں کچھ بہت ضروری فتگو آپس میں کرنا تھی۔ وکالت نامے پر دستخط ہونا تھے اور ساتھ ہی فیس وغیرہ کا نالمہ بھی طے ہونا تھا۔

''آپ۔؟ بابا جان! آپ کیسے آ گئے۔؟ اچانک ہی۔'' زبان میں ہکلاہٹ سی آ گئی تھی انہیں دیکھ کر۔ ''یہ بھلا آج کیوں آ گئے۔؟ کل نہیں آ سکتے تھے کیا۔؟'' وہ سوچ رہی تھی۔

''بس اداس ہو گئے تھے بچوں کے بغیر۔'' وہ فرحت سے نظر ملا کر بات نہیں کر رہے تھے۔ ''مدحت کہاں ہے۔؟'' انداز کچھ بدلا بدلا سا تھا۔

''وہ ادھر عابی کے پاس ہو گی۔ بلاؤں اسے۔؟''

''سنا ہے عبدالرحمان کچھ بیمار ہے۔؟'' مدحت کو بلانے کے بجائے وہ عابی کا پوچھنے لگے۔ لہجے میں فکر و تردد نمایاں تھا۔

''کچھ۔؟ بہت بابا جان۔ بہت۔ پتہ نہیں کیوں بخار ہی نہیں اتر رہا۔''

''تو ہمیں بتایا کیوں نہیں۔؟ فون ہی کر دیا ہوتا۔''

''میں نے تو کہا تھا۔ پر عابی نے منع کر دیا۔''

''وہ کیوں۔؟''

''آپ پریشان ہو جائیں گے۔''

''پریشان تو ہم پچھلے سات سالوں سے ہیں'' وہ قدرے بلند آواز میں بڑبڑائے۔ فرحت حیرت سے انہیں تکنے لگی۔ پہلے کبھی انہوں نے اس طرح کی بات نہیں کی تھی۔ کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر حیراں چائے لے کر آ گئی اور وہ ان کے لیے چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔

''تم بیٹی! خوش ہو اپنی زندگی سے۔؟''

ایسا سوال پہلے انہوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ کتنی ساری چائے چھلک گئی۔ وہ نگاہوں میں حیرانگی کا تاثر لئے انہیں دیکھنے لگی۔

''تم نے ہماری بات کا جواب نہیں دیا۔؟''

''یہ سوال آپ نے آج کیوں کیا ہے۔؟'' چائے کی پیالی اس نے ان کی طرف بڑھائی۔ ''سات سالوں سے آپ پریشان ہیں۔اور زندگی کی خوشی کا سوال آج کر رہے ہیں؟ کیوں۔؟''

پلیٹ میں کتنی ساری چیزیں نکال کر اس نے ان کے سامنے رکھیں۔ ''اس



لئے کہ ہم تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''ہمارے قبیلے میں عورت کے جذبات و احساسات کی کبھی کسی نے پرواہ کی ہے۔؟ اور خوشی پرواہ کے بعد ملتی ہے۔ مدحو! بیٹے دادا جان آئے ہیں۔''

اس موضوع کو بدلنے کی خاطر فرحت نے وہیں بیٹھے بیٹھے مدحت کو پکار لیا۔ سامنے ہی تو عابی کا کمرہ تھا۔ مدحت ماں کی آواز سنتے ہی چلی آئی۔

دادا کو ملی۔ ڈھیر سارے گلے شکوے کئے۔ ان کی پلیٹ میں سے اپنی پسند کی چیزیں اٹھا اٹھا کر کھائیں۔ دادا جان کے آ جانے سے چہرے پر جگمگاہٹیں بکھر رہی تھیں۔ ''عابی کو بھی چائے دے آؤ'' ماما کا حکم ملا۔

''انکل کو نہ دوں۔؟'' اس نے شوخی سے مسکرا کر کرنل کی موجودگی کا اعلان کیا۔ ''وہ آئے ہوئے ہیں کیا۔؟'' فرحت نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔ کب کے۔ عابی کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں اور مسلسل ہار رہے ہیں۔''

''انکل کون۔؟'' رحمان علی خاں نے تجسس بھری نگاہ سے اسے دیکھا۔

''کرنل عمیر آفندی ہمارے ہمسائے ہیں۔ پہلے پاپا کے دوست تھے اور اب میرے ہیں۔'' پھر دادا کے پوچھے بنا خود بخود تفصیل بتا دی۔ ''عابی کا دل لگانے کی کوشش میں بار بار ہار رہے ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔''

''جو ہارے وہ کیا اچھا ہوتا ہے۔؟ چلو پھر ہم بھی ہارتے ہیں۔''

ساتھ ہی رحمان علی خان اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرحت نے چونک کر انہیں دیکھا۔ کچھ عجیب سی باتیں کر رہے تھے۔ خلاف معمول۔

''فرحت بیٹے! آپ بھی آؤ۔'' پھر جھک کر بریف کیس اٹھا لیا۔ ''ضروری بات ہے۔''

''بابا جان! کہاں جا رہے ہیں۔؟'' مدحت پریشان سی ہو گئی۔ ''ابھی تو آئے ہیں۔اب جا بھی رہے ہیں۔''

''بیمار کا حال احوال تو پوچھیں۔ وہ والا کمرہ ہے نا اس کا۔؟''

دونوں ماں بیٹی کو حیرتوں میں غرق چھوڑ کر وہ عابی کے کمرے میں داخل ہو

گئے۔ پچھلے سات سالوں میں انہوں نے کب عابی کو اتنی لفٹ کرائی تھی کبھی۔ اور یہ آج۔ حیرت ہی کا مقام تھا ناں۔!

"تم ذرا کچن میں جاؤ جیراں کے پاس۔ اور میں سب کے لیے چائے وہیں کمرے میں لے جاتی ہوں۔"

فرحت ٹرالی دھکیلتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی تو مدحت مزید حیران ہوگئی۔ ماما بھی تو کبھی عابی کے کمرے میں نہیں جایا کرتی تھیں ان کی موجودگی میں اور آج دادا اور ماما دونوں ہی کچھ عجیب سا رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

ماما کسی دعوت کی تیاری میں مصروف تھیں۔ اور مدحت کے کئی بار استفسار پر کچھ نہیں بتایا تھا کہ کس کی دعوت تھی اور کون آ رہا تھا۔؟

پھر اچانک ہی دادا بھی چلے آئے۔ کیا ان کی دعوت تھی۔؟ نہیں۔ ان کی گفتگو سے ایسا تو کوئی اظہار نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ بھی معمول سے کچھ مختلف انداز کی باتیں کر رہے تھے۔ اور مختلف انداز کی حرکات بھی۔ اب یہ بھلا عابی کے کمرے میں وہ کیوں گئے تھے۔ وہ دونوں تو اک عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے ساتھ ترک تعلق کئے بیٹھے تھے۔ پھر۔؟ یہ کس نئے تعلق کا آغاز ہونے والا تھا؟

جیراں کو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ سب کچھ خود ہی کر سکتی تھی۔ اس لئے۔ مدحت نے سوچا۔ اسے عابی کے کمرے میں جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔؟ جیراں کے پاس کچن میں جانے کے بجائے وہ عابی کے کمرے کی سمت چل دی۔ مگر کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ کتنے ڈھیر سارے لمحات وہ گم سم سی کھڑی رہی۔ پھر سوچا۔ دستک دے کر دروازہ کھلوا لے۔ مگر دوسرے لمحے خیال آیا۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔ کھلنا ہوتا تو مقفل نہ ہوتا۔ عجیب سا اضطراب اس کے رگ و پے میں پھیل گیا۔ اس سے تو آج تک کبھی کوئی بات چھپائی نہیں گئی تھی۔

تجسس نے اسے بے چین سا کر دیا۔ دبے دبے پاؤں چلتے ہوئے وہ عابی کے کمرے کی لان میں کھلنے والی کھڑکی کے باہر جا کھڑی ہوئی۔ شکر کیا۔ پردہ ادھر ادھر سے کچھ ہٹا ہوا تھا۔ اور باہر اندر کی نسبت کافی اندھیرا تھا۔ بڑے اطمینان سے وہ



اندر کے حالات و واقعات کا نظارہ کرنے لگی۔

عابی اور کرنل عمیر کو وہ جس طرح بیڈ پر بیٹھے چھوڑ کر کمرے سے نکل کر دادا کے پاس گئی تھی۔ اب بھی وہ تقریباً اسی طرح بیٹھے تھے۔ درمیان میں تاش کے پتے بڑی بے ترتیبی سے بکھرے تھے۔

"ہم ایسا کبھی نہ کرتے۔ بہت نادم ہیں۔ بہت پریشان ہیں۔"

دادا کی آواز مدحت کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے جلدی سے نظریں گھما کر بیڈ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹکے صوفے کی طرف دیکھا۔ دادا اور اس کی ماما دونوں اسی صوفے پر موجود تھے۔

"ہم نے اپنے مرحوم بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی بیٹی کو ہمیشہ سکھ اور خوشیاں دیں گے مگر باوجود پوری کوشش کے ہم اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔" دادا کا ہاتھ ماما کے سر پر تھا اور وہ انتہائی رقت بھری آواز میں بول رہے تھے۔ حالانکہ دادا کی آواز میں ہمیشہ بڑی گھن گرج ہوا کرتی تھی۔ "ہمیں معاف کر دو بیٹی۔"

مدحت کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ کس بات کی معافی مانگ رہے تھے؟

"تم پر اور عابی پر ہمارے ہاتھوں بہت ظلم ہو گیا۔ دونوں ہی کی زندگی ہم نے برباد کر ڈالی۔ تم بھی عبدرحمان! ہمیں معاف کر دو۔" دادا کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ "ہم آج قرآن پاک میں سے سورۃ الاحزاب کی تفسیر پڑھ رہے تھے۔ اس میں حضرت زید اور حضرت زینب کا قصہ درج ہے۔ وہ دونوں شادی کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر سکے تھے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ دیا تھا۔ اللہ کے نزدیک طلاق افعال میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ فعل ہے مگر ان دونوں کی زندگیوں کو آباد کرنے کے لیے یہی بہتر سمجھا گیا تھا کہ حضرت زید حضرت زینب کو طلاق دے دیں۔"

بولتے بولتے رک کر دادا نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھاما اور شدت سے گریہ میں مصروف ہو گئے۔ کمرے میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔ بس صرف دادا کے رونے کی آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس سکوت کو توڑ رہی تھی۔ مدحت کا دل چاہا وہ بھی زور زور سے' بالکل دادا کی طرح رونے لگے۔

"ہمارے ہاں طلاق کا رواج نہیں ہے۔ کوئی آباد ہو یا برباد۔ جب دو فریق ایک دوسرے کے ساتھ نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں تو بس موت ہی انہیں علیحدہ کر سکتی ہے۔" اب وہ ساتھ ساتھ اپنے آنسو صاف کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ بول رہے تھے۔ "مگر سورۃ الاحزاب کی اس آیت کو پڑھ کر ہم نے یہی سوچا ہے کہ ایک دن جو بندھن عبدرحمان اور فرحت کے درمیان بصورت نکاح ہم نے اپنے ہاتھوں سے باندھا تھا وہ اب خود ہی توڑ دیں۔ اللہ اور رسول کے دیئے ہوئے پیغام کا احترام اور فرمانبرداری کی ریت نبھاتے ہوئے۔"

اپنی بات مکمل کیئے بنا وہ کرنل عمیر کی طرف دیکھنے لگے۔ "عمیر بیٹے! آپ نے کہا تھا نا کہ ہمارے گناہوں کا بوجھ اس طرح ہلکا ہو سکتا ہے کہ ہم پرانے رسم و رواج کی پیروی کرنا چھوڑ کر اللہ کی کتاب میں جو قوانین ہمارے لئے وضع کیئے گئے ہیں' آئندہ سے ان پر عمل کریں۔ خود بھی۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے پنچایت کے فیصلوں میں انہیں کے مطابق ترامیم کر کے ان پر کار بند رہنے کی ہدایت کر دیں۔" انہوں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے کچھ کاغذات نکالے۔ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ان میں سے ایک کاغذ نکال کر کرنل عمیر آفندی کی طرف بڑھایا۔ "یہ طلاق نامہ ہے۔ اس پر عبدرحمان کے دستخط کرا دو۔ اور گواہ رہنا ہم نے اپنی خواہشات اور اپنی انا اور خودداری کے خلاف چلتے ہوئے خدا کے احکامات کو رسم و رواج پر ترجیح دے دی ہے۔" پھر انہوں نے فرحت کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "اور شاید ہم تم پر ظلم کر گئے ہیں یہ فیصلہ دے کر۔ ہم بہت برے ہیں۔ ہمیں معاف کر دو بیٹی! تم کر دو گی تو شاید اللہ بھی کر دے۔"

"نہیں نہیں بابا جان! اللہ کے فیصلوں کو ظلم نہیں سمجھتے۔ میں خود یہی چاہتی تھی۔"

ماما کی آواز سنتے ہی مدحت نے چونک کر عابی کی جانب نگاہیں موڑیں۔ کرنل عمیر وہ پرچہ اور قلم عابی کی طرف بڑھا رہے تھے۔

"یہ لو دستخط کر دو۔ بابا جان کا حکم ہے۔"

عابی نے چپکے سے دستخط کر دیئے۔ اک لفظ بھی بولے بغیر۔ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ دکھ کا نہ خوشی کا۔



اور اس لمحے' جانے کہاں سے' بہت سارے آنسو آ کر مدحت کی آنکھوں میں ٹھہر گئے پھر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس نے اپنی پیشانی کھڑکی کی چوکھٹ کے ساتھ ٹیک دی۔ کتنی ہی دیر وہ یونہی کھڑی آنسو بہاتی رہی۔

اسی اثنا اندر کمرے میں ایک قہقہہ گونجا تھا۔ پتہ نہیں بات کیا ہوئی تھی۔؟ مدحت اپنے آنسوؤں میں غرق تھی اس لئے سن نہیں سکی تھی۔ جلدی سے چہرہ اٹھا کر پھر اندر جھانکا۔

کمرے میں موجود چاروں افراد ہنس رہے تھے۔ سبھی خوش تھے۔ ہنستے' ہنستے فرحت نے جیراں کو آواز دے ڈالی۔

"جیراں! یہ ٹرالی لے جاؤ اور اس میں گرم گرم چائے لے آؤ۔ بالکل تازہ اور گرم۔"

دروازہ کھلا تھا اور ٹرالی ماما نے باہر دھکیل دی تھی۔ ہنسی کے ساتھ ساتھ فرحت کے چہرے پر عجیب سا اطمینان بھی تھا۔ ایسا' جو اس نے ساری زندگی ماں کے چہرے پر نہ دیکھا تھا۔ کبھی اک پل کے لئے نہیں۔ وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ مدحت انہیں ایک ٹک دیکھتی چلی گئی۔ اور ان کے چہرے کا اطمینان اور سکون آہستہ آہستہ مدحت کے اندر اترنے لگا۔

اگر ماما خوش تھیں تو اسے بھی خوش ہونا چاہیے تھا۔ تب ان کی خوشی میں شریک ہونے کے لئے جلدی جلدی اپنا چہرہ صاف کر کے اس نے اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

## 69

اس شخص کے لیے ماھم کے دل میں نفرتیں ہی نفرتیں تھیں۔ ایمان کا حال وہ دیکھ آئی تھی۔ نفرت نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔؟

کتنی آسیں امیدیں اس نے اس کے ساتھ لگائی ہوئی تھیں۔ بچپن کی منگنی اور نکاح کے باوجود اسے یقین تھا کہ اک دن اس کے پاؤں میں پڑی تمام زنجیریں وہ

کاٹ ڈالے گا اور سماج کے اس قفس سے رہائی دلا کر کھلے آسمان تلے لمبی پرواز کے لئے لے اڑے گا۔ اپنے ساتھ ساتھ۔ اپنے تمام عزائم اور ہمتوں کو بروئے کار لا کر وہ سب کچھ کر گزرے گا۔

ماھم نے بھی تو اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے یہی یقین دلایا تھا۔ پر نتیجہ کیا نکلا۔؟ وہ خود رس بس رہا تھا اور ایمان بیچاری زندگی کا ہر دکھ پیشانی پر سجائے نحوست کا سمبل بنی جینے پر مجبور تھی۔ اکیلی۔ تن تنہا۔ آنے والی زندگی کے لئے روشنی کی اک کرن تک اس کے آس پاس نہ تھی کہ راستہ ہی پالیتی۔ مگر اب تو صرف ٹھوکریں ہی ٹھوکریں تھیں۔

''اس سے تو اچھا تھا عابی تم اس کی زندگی میں ہی نہ آئے ہوتے۔''

اس سفید بنگلے پر عبدالرحمان کے نام کی تختی لگی دیکھتے ہوئے ماھم نے گاڑی کا ہارن دیا۔ مالی نے بڑا گیٹ کھول کر اس کی گاڑی کو اندر داخل ہونے کا اشارہ دیا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے ساتھ والی سیٹ سے بیگ اٹھا باہر نکلی تو سامنے برآمدے میں اک ملازمہ کھڑی تھی۔

''سر عبدالرحمان گھر پر ہیں۔؟''

''جی۔ آیئے۔''

اس کی رہنمائی میں ماھم نے قدم بڑھائے۔ وہ شاید لاؤنج کا دروازہ تھا جسے کھول کر اس نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا۔

اور ماھم کا اک قدم آگے اور اک قدم پیچھے دروازے کے وسط میں ہی تھا کہ نگاہ اٹھ گئی۔ ایک ہی صوفے پر وہ دونوں بیٹھے تھے۔ عابی اور شاید اس کی بیوی۔ دونوں کے چہروں پر رنگ تھے۔ روشنیاں تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں تھیں۔ جتنی نفرتیں دل میں بھرے وہ آئی تھی۔ یکدم ہی انہیں اس عالم اس کی کیفیت میں دیکھ کر دو چند سہ چند ہوگئیں۔ اس لمحے اس کا دل یہی چاہا تھا کہ انہیں قدموں سے واپس لوٹ جائے۔ مگر ہاتھ میں جو بیگ تھا اس کی موجودگی میں وہ ایسا نہ کر سکی۔

''یہ عابی کے لئے کچھ تحائف ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اسے دینا۔'' اجلال نے اسے پاکستان آتے ہوئے تاکید کی تھی۔ ''میں اس کا بہت مقروض ہوں۔ دیکھو ایمان کی وجہ سے تمہارے دل میں جو اس کیلئے نفرت ہے پلیز! میرے تعلق کی وجہ سے



اسے اندر کہیں چھپا لینا۔ مجھ پر اس کے بے شمار احسانات ہیں۔ اور میری بیوی کی حیثیت سے تمہیں چاہیے کہ میرے ساتھ مل کر میرے فرائض اور ذمہ داریاں نبھاؤ اور میرے کندھوں پر سے میرے قرضوں کا بوجھ اتارو۔''

''ارے! یہ تو اپنی ماھم آ گئی۔'' عابی کی خوشی و مسرت میں ڈوبی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اسے ہوش آ گیا۔ خیال کی دنیا سے نکل کر سامنے دیکھا۔ عابی لپک کر اس کے قریب آ چکا تھا۔ ''کب آئیں پاکستان اور میرا یار کہاں ہے اور کیسا ہے۔؟'' اس کے اک اک عضو سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور اس کی خوشی کا بھرپور تاثر لئے چہرہ جو رونقیں اور لالیاں لٹا رہا تھا وہ ماھم کے دل کو مزید رلا گیا۔

''کمبخت پہلے سے بھی زیادہ شاندار لگ رہا ہے۔'' ماھم کی طبیعت خاصی مکدر ہوگئی۔ تبھی وہ اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکی تھی۔

''آؤ۔ آؤ نا۔ مدحو! یہ میری صرف اسٹوڈنٹ ہی نہیں......''

''جی مجھے پتہ ہے۔ یہ ماھم آپا ہیں۔'' مدحت نے چاچو کی بات پوری ہونے سے پہلے اچک لی۔ ''میں انہیں پہچان گئی ہوں۔'' سامنے والے صوفے سے اٹھ کر وہ بولتی بولتی قریب چلی آئی۔ ''آپ تصویر سے بہت زیادہ اچھی ہیں۔ عابی آپ کی بڑی تعریفیں کرتے تھے اور چچا اجلال کی بھی۔'' پھر وہ عابی کے ساتھ بیٹھی خاتون سے مخاطب ہوگئی۔ ''ماما! آپ نے انہیں نہیں پہچانا۔؟''

''ماھم۔؟'' فرحت کچھ سوچ کر بولی تھی۔

''ہاں ہاں۔'' مدحت نے زور زور سے سر ہلایا۔ ''دیکھ لیں ماما نے بھی آپ کو پہچان لیا ہے۔''

''ارے بچے! انہیں بیٹھنے بھی تو دو۔ یہاں آ جاؤ ماھم! میرے پاس۔'' عابی اسے بازو کے گھیرے میں لئے لئے آگے بڑھ کر اک صوفے پر بیٹھ گئے۔

''عالی جاہ! یہ لڑکی جو ہے اس کے ساتھ میرے ایک ساتھ تین رشتے بنے ہوئے ہیں اور چوتھا بننے جا رہا ہے۔'' مدحت جس صوفے پر بیٹھی تھی اس پر براجمان اک خوش رو ڈیسنٹ سے ادھیڑ عمر کے بندے سے وہ مخاطب ہوا تھا۔ ''یہ میری اسٹوڈنٹ بھی ہے۔ بہن بھی ہے۔ بھابھی بھی ہے اور۔''

''اور چوتھا سمجھ گیا ہوں شہزادے! آدھے گھر والی بنا کر ہی دم لو گے۔ ہمیں معلوم ہے۔'' وہ بڑے خوشگوار لہجے میں بولے تھے۔

''یہ کرنل عمیر آفندی ہیں۔ فوج سے بھاگے ہوئے۔ بھگوڑے۔ میرے بڑے بھائی۔ اتنے نفیس انسان ہیں کہ مجھے ڈر ہے تم ان سے مل کر مجھے ایک رشتے سے ریٹائر نہ کر دو۔ میں ایسی پیاری سی دوسری بہن پھر کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ بھائی! اللہ کا واسطہ۔ جس طرح میری بیٹی چھینی ہے اس طرح اب بہن نہ چھین لینا۔''

کرنل نے جہاں عابی کی بات پر اک طویل قہقہہ لگایا تھا' وہیں فرحت اور مدحت بھی ہنس پڑی تھیں۔ یہ ماحول' یہ قہقہے' یہ چہروں کی شگفتگی' اور ادھر ایمان' پژمردگی کی بولتی تصویر' جھکی جھکی' بھیگی بھیگی پلکوں اور زرد زرد رخساروں والی ہمہ وقت گم سم اور کھوئی کھوئی سی رہنے والی مریضہ نما شخصیت۔ کتنا تضاد تھا ان میں اور اس میں۔ دل کٹ کر رہ گیا۔ آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''میرے پاس وقت نہیں تھا۔ لیکن یہ آپ کی امانت۔'' ماھم جلد از جلد یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔

''امانت۔؟ کیسی امانت۔؟'' عابی نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اجلال نے آپ کے لیے کچھ تحائف بھیجے ہیں۔'' اس نے بیگ عابی کے سامنے دھر دیا۔ پھر اسے کھولا۔

''اتنا تکلف۔؟'' بہت ساری قیمتی قیمتی چیزیں تھیں۔ عابی تو بوکھلا سا گیا۔

''عابی! اجلال چچا آپ کے دوست ہیں اتنے پیارے' پھر آپ ان تحائف کو تکلف کیوں کہہ رہے ہیں؟ یہ تو محبت ہے ان کی۔ تکلف مت کہیں۔''

اس چھوٹی سی لڑکی نے کتنی اچھی بات کی تھی۔ ماھم نے پہلی بار اسے نظر بھر کر دیکھا۔ بڑی پیاری لگی۔ پر کشش بھی بہت تھی۔ دل چاہا اسے دیکھتی جائے۔

''آپ کا نام۔؟'' بہت پیار سے اس سے پوچھا۔

''مدحت۔'' اک خوبصورت سے تبسم کے ساتھ اس نے بتایا۔

''پڑھتی ہیں۔؟''

''جی۔ فسٹ ائیر میں ہوں۔''



''ماشاء اللہ۔'' ماھم نے بڑی محبت سے اسے تھپکی دیتے ہوئے دعا دی۔ ''اللہ آپ کو زندگی میں بہت کامیابیاں عطا کرے۔''

''آمین۔'' عابی بڑے خشوع و خضوع سے بولے تو مدحت زور سے ہنس پڑی۔

''بالکل کسی مولوی کی طرح جذبے بولے ہیں۔ کھلا دوں گی حلوا۔''

ماھم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''چائے تو ابھی تک بنائی نہیں۔'' عابی نے گلہ کیا۔ ''ہماری ماھم اتنی دور سے آئی ہے۔ کیا سوچے گی۔؟ اس گھر میں میزبانی کرنا کسی کو نہیں آتا کیا۔؟''

''جو نزدیک سے آیا ہے کیا اسے چائے نہیں ملے گی۔؟'' کرنل عمیر نے بڑی معصومیت سے پوچھا تھا۔ سبھی ہنس پڑے۔ ماھم بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

''یہ ہمارے پڑوسی بھی ہیں۔'' عابی نے وضاحت سے ان کا تعارف کرایا۔ ''تمہاری طرح انکے ساتھ بھی میرے کئی رشتے بنتے ہیں۔''

ماھم انہیں بڑے غور سے دیکھنے لگی تھی۔ اور مدحت کی نظریں ماھم پر گڑی تھیں۔ ''ماھم جی! آپ انکل کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہیں۔؟''

مدحت کے لبوں پر شوخی بھری مسکراہٹ لہرائی۔ ''کوئی غلطی ہے ان میں۔؟'' ماھم نے جھینپ کر نظریں پھیر لیں۔ بڑی شریر لڑکی تھی۔ کچھ اور بھی زیادہ پیاری لگ گئی۔ مگر۔ اسے تو ان سب سے نفرت تھی۔ اور نفرت ہی کرنا تھی۔

''میں اب چلتی ہوں۔'' وہ یکا یک اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب ایسے تو نہیں جانے دوں گی اپنی مہمان کو۔'' فرحت نے اٹھ کر اسے بازوؤں میں بھرا اور واپس بٹھا دیا۔ بہت دھیمے' نرم اور پیار بھرے لہجے میں وہ بات کر رہی تھیں۔ ''اور مہمان بھی وہ جو میری ایمان کی دوست ہے۔'' فرحت کا مسکراتا چہرہ اک عجیب سی کشش لئے تھا۔ ماھم دیکھتی رہ گئی۔ وہ بے حد اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ پلک تک نہ جھپک سکی۔

''آپ ماھم بیٹے! بڑے اچھے وقت پر آئی ہیں۔ اس وقت مجھے آپ کی بہت ضرورت تھی۔'' وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"میری ضرورت۔؟" ماھم چونکی۔ "وہ بھی آپ کو۔؟"

"ایمان کی دوست کے ناطے۔" بات کرتے کرتے فرحت نے عابی کی سمت دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو نجانے کیا کہا۔ عابی نے مسکرا کر' شرما کر سرہلا دیا۔

اور یہ نظارہ ماھم کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس نے ایمان کے ساتھ اس کی محبتوں کے رنگ بھی دیکھے ہوئے تھے۔ ایمان اور عابی کے پیار اور محبت کی گواہی دیتی ہوئی وہ کیسٹ اسے بھی اس کے پاس موجود تھی۔ ماھم کے تن بدن میں شعلے سے دہکنے لگے تھے۔ "یہ مرد کس قدر بے شرم اور بے ایمان ہوتے ہیں۔ دھوکے باز اور فراڈیئے بھی ہوتے ہیں۔ اور اجلال کہتا تھا۔ عابی ایسا نہیں ہوسکتا۔ اور عابی ہی سب سے بڑھ کر کمینہ نکلا۔ اب تو میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا۔ کاش! میں یہاں نہ آئی ہوتی۔

اسی لمحے جیراں چائے کی ٹرالی لئے آ گئی۔ چائے کے ساتھ بیشمار چیزیں تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب ماھم عابی سے مصروف گفتگو تھی تو فرحت نے جیراں کو بلا کر چائے کے متعلق ہدایات دی تھیں۔

"نزدیک والے کیا ٹرالی کے قریب آنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔؟"

کرنل نے خوشگوار لہجے میں پوچھا تو پھر سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ماھم بھی مسکرا پڑی تھی۔ مدحت اٹھ کر جلدی جلدی چائے سرو کرنے لگی۔

"پہلے کرنل صاحب کو دو۔" ماھم کو اس نے لوازمات پیش کیں تو اس نے کرنل کی طرف اشارہ کر دیا۔ "یوں بھی مجھے کسی چیز کی بھی حاجت نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی۔ کچھ نہ کچھ تو اب تمہیں لینا ہی پڑے گا۔ یہ مٹھائی۔ منہ تو میٹھا کرو۔" ساتھ ہی فرحت نے پھر عابی کو اشارہ کیا۔

ماھم پھر دیکھ رہی تھی۔ اب تو اس کا ضبط ساتھ چھوڑ گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں اب چلوں گی۔"

"ماما! اِک گلاب جامن زبردستی ماھم جی کے منہ میں ٹھونس دیں۔"

"زبردستی کیوں۔ یہ خود لیں گی۔" فرحت نے مٹھائی کی پلیٹ ماھم کی



جانب بڑھائی۔ "یہ لو ماھم! منہ میٹھا کرو۔ کل ایمان کی منگنی ہے۔ عابی کے ساتھ۔"

"کیا۔؟" اک حیرت بھری چیخ کے ساتھ ماھم جلدی سے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ پھر گھبرا کر عابی کی طرف دیکھا۔ بے یقین نگاہیں چہرے پر جمی کی جمی رہ گئیں۔

"بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" عابی نے تائید کی۔ چہرہ مسکراہٹوں' جگمگاہٹوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ "یہ ابھی ابھی تمہارے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے طے کر کے آئی ہیں۔"

"اور ہم بیٹھے یہی پروگرام بنا رہے تھے کہ آپ آ گئیں۔" مدحت نے بھی گواہی دی۔

"بہت وقت پر آئی ہو۔" فرحت مٹھائی کی پلیٹ اسے پکڑا کر بتانے لگی۔

"ایمان کو ابھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اور یہ کام ہم تمہارے ذمہ ڈالنے والے ہیں۔ اسے یہاں لے کر آنا ہے۔"

"صفیہ آپا وغیرہ بھی آ جائیں گی۔ رسم یہیں ہو گی۔ اس لئے کہ برادری میں ابھی یہ بات پھیلائی نہیں جائے گی۔"

"لیکن یہ سب ہوا کیسے۔؟ ایمان نے تو مجھ کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"وہ خود بے خبر ہے ہر بات سے۔ تمہیں کیا بتاتی۔؟"

پھر فرحت نے مختصراً اسے سب کچھ بتا دیا۔ پاس بیٹھے عابی صاحب مسکراتے اور شرماتے رہے۔ چہرے پر عجب لازوال سی رونقیں بکھری تھیں۔ آنکھوں کی اداسی غائب تھی اور وہاں ستاروں بھرا آسمان اترا ہوا تھا۔

ماھم کا موڈ بدل چکا تھا۔ واپسی کی بھی اب کوئی جلدی نہ تھی۔ اتنی بڑی مٹھائی کی پلیٹ اٹھائے بیٹھی تھی۔ ساتھ ساتھ فرحت کو سن رہی تھی۔ ساتھ ساتھ مٹھائی کھا رہی تھی۔ مسلسل کھائے جا رہی تھی۔

"میں نے تو سنا ہے کہ امریکہ میں رہنے والی خواتین ہمیشہ اپنی ڈائیٹ پر کنٹرول رکھتی ہیں۔" کرنل آفندی نے ماھم کی مٹھائی کھانے والی اسپیڈ کے متعلق ریمارکس پاس کئے تو وہ چونکی۔ پھر تھوڑی سی شرمندہ ہوئی۔

"میں فرتی خالہ کی باتوں میں ایسی مگن ہوئی کہ پتہ ہی نہیں چلا کیا کر رہی

ہوں۔'' پھر جلدی سے پلیٹ کرنل کی طرف بڑھادی۔ ''آپ بھی تو منہ میٹھا کریں۔ آپ بھی خالہ۔ مدحو تم بھی۔ اور سر کا تو میں خود کراتی ہوں۔'' اک بڑا سا گلاب جامن لے کر عابی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ ''یہ سالی آدھے گھر والی کی طرف سے۔''

سب ہنس رہے تھے۔ خود کھا رہے تھے ایک دوسرے کو کھلا رہے تھے۔ ایکدم ہی خوشیاں' رونقیں' قہقہے چاروں اطراف بکھر اٹھے تھے۔

''سنئے صاحبان! اس فدوی کے لئے اب کیا حکم ہے؟'' اپنی چائے ختم کر کے خالی پیالی رکھتے ہوئے کرنل نے عابی اور فرحت کو مخاطب کیا۔

''وہی جو پہلے تھا۔ شاپنگ کیلئے بہت ضروری جانا ہے۔ اور اب ماھم بھی ہمارے ساتھ چلے گی۔'' فرحت نے پروگرام بتایا۔

''میں کیوں۔؟''

''ایمان کی دوست ہو۔ اس کی چوائس کا تمہیں بہتر علم ہوگا۔''

''کیا خریدنا ہے۔؟''

''دو چار سوٹ' جیولری' میک اپ کا سامان۔''

''تو اسے ہی کیوں نہ ساتھ لے لیں۔ مزہ رہے گا۔''

''وقت ہی نہیں ہے اسے ساتھ لینے کا۔ شام ہو رہی ہے۔ کل نہیں وقت ملے گا۔ اور اسے ابھی بتانا منانا ہے۔ لہٰذا اس وقت اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔''

''ماما آپ چل کر لباس تو تبدیل کریں۔ آج کل آپ کو کپڑے بدلنے میں کافی دیر لگ جاتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔؟''

''سبھی خواتین کی یہی مجبوری ہے۔'' کرنل عمیر نے قہقہہ لگایا۔ ''آپ بھی ذرا اپنا معائنہ کرلیں مدحو بیٹے۔!''

''میں تو جا ہی نہیں رہی۔''

''کیوں۔؟''

''تھوڑا سا ہوم ورک تھا۔ وہ نمٹاؤں گی۔'' پھر مدحت مسکرائی۔ ''رات کو ڈھولک کا بھی تو پروگرام ہے۔ کچھ فرینڈز کو مدعو کیا ہوا ہے۔ اور ماھم جی! آپ بھی آج رات یہیں رہیں گی۔''



''بالکل رہوں گی۔'' ماھم فوراً راضی ہوگئی۔ مدحت بے اختیار تالی بجا اٹھی۔ پھر اپنا سارا پروگرام ماھم کے گوش گزار کرنے لگی۔ کل میں کالج سے چھٹی کروں گی۔ بے شک منگنی کی رسم پچھلے پہر چار پانچ بجے ہوگی مگر میں اور میری سہیلیوں نے صبح کے پہر بھی یہاں موجود رہنا ہے۔'' مدحت نے اردگرد دیکھا۔ کوئی سن تو نہیں رہا تھا۔؟ ماما ڈریس چینج کرنے گئی ہوئی تھیں۔ کرنل عابی کے ساتھ شاید کوئی اہم بات کر رہے تھے۔ آواز بڑی دھیمی سی تھی۔ پھر مدحت نے رازدارانہ بتایا۔ ''جب ایمان آپا آئیں گی تو ہم سب ان کے راستے میں پھول بچھائیں گی اور ان پر سے پھول نچھاور کریں گی۔ پھولوں اور پتیوں کا آرڈر ماما اور عابی سے چوری چوری ہم نے دے بھی دیا ہے۔ انکل عمیر ہمارے ساتھ ہیں۔''

''تو مجھے بھی اپنے ساتھ سمجھو۔'' ماھم مدحت کے انداز میں بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو گال نفرت اور غصے سے شعلے اگل رہے تھے اب خوشی کے مارے گلاب کے پھولوں جیسی سرخیاں لٹا رہے تھے۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔

''ابھی شاپنگ کرنے جاتے ہیں نا تو میں کل کے لیے کوئی اچھا سا ڈریس بھی گھر سے لے آؤں گی۔ اور۔ اور۔'' پھر اسے یکایک خیال آیا۔ اٹھ کر عابی کے پاس جا بیٹھی۔

''کل ایمان کو یونیورسٹی سے کون لے کر آئے گا۔؟''

''ماھم۔'' عابی نے فوراً اس کا نام لے دیا۔

''نہیں۔ وہ میرے ساتھ نہیں آئے گی۔''

''پھر۔؟''

''آپ لے کر آئیں گے۔''

''میں۔؟ مگر میں تو ڈیفالٹر ہوں۔'' عابی نے گھبرا کر کہا۔

''مانتے ہیں نا کہ آپ ڈیفالٹر ہیں۔''

''اس کی نگاہ میں۔''

''بس پھر۔ آپ کا فرض بنتا ہے۔ اسے منائیں اور لے کر آئیں۔''

''ماھم ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' کرنل عمیر نے ماھم کی بات کو سراہا۔

''مگر۔ یہ ممکن نہیں۔ وہ کبھی نہیں مانے گی۔''

"مانے گی نہیں تو منگنی کیسے کرانے کو تیار ہو گئے ہو شہزادے!"
"ہاں۔ پھر تو منگنی بھی نہیں ہو گی۔" ماھم نے کرنل عمیر کی تائید کی۔
فرحت تیار ہو کر ان کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔ سن رہی تھی سب کچھ۔
"ٹھیک ہے۔ عابی اسے لے آئے اور منگنی کرا لے ورنہ پھر چھٹی کرے۔"
فرحت نے فیصلہ کر دیا۔ "ہم تیاری کر چھوڑیں گے۔ چلو اٹھو ماھم۔! چلیں کرنل۔"

## 70

اتنا شوق تھا اسے ماسٹرز کرنے کا۔ مگر پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اب پڑھائی میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ کلاسز اٹینڈ کرنے میں کوئی مزہ نہیں رہا تھا۔

پوئٹری بڑی پسند تھی۔ سر ابرار پورا لیکچر دے کر رخصت ہو جاتے' اسے اک لفظ کی سمجھ نہ آتی۔ سر عبدرحمان چھٹی پر چھٹی کیے جا رہے تھے۔ ان کا پیریڈ سر توقیر احمد کبھی کبھار آ کر لے لیتے۔

"ایمان! بھئی آج پھر تمہارے رشتہ دار غائب ہیں۔ یار! معلوم تو کرو وہ کیوں اتنی چھٹیاں کر رہے ہیں۔ کچھ ہمارا خیال کریں۔"

تقریباً روز ہی گروپ کی کوئی نہ کوئی لڑکی ان کے متعلق استفسار کرتی۔

"دعا کرو ہمارے سر عبدرحمان صحت یاب ہو جائیں۔" اس دن گل مہر کہہ رہی تھی۔ جب سر ابرار لیکچر دے کر کلاس روم سے نکل کر چلے گئے تو۔

"سر عبد جیسا کوئی اور نہیں پڑھاتا۔"

"یہ تو سچ ہے۔" نازیہ اس کی تائید میں بولی۔ "آؤ سب ان کے لیے دعا کریں۔"

اور ایمان نہ دعا کر سکتی نہ بددعا۔ ان کے لیے اندر جتنے جذبے تھے تمام کے تمام مر چکے تھے۔ مگر کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا کہ کچھ جذبے ایسے ہوتے ہیں جو مر کر بھی کبھی نہیں مرتے۔

نماز کے بعد اکثر دعا مانگتے ہوئے خود بخود ہی عابی کے لئے دعا اس کے دل سے نکل جاتی۔ "کیا لگتا ہے تمہارا وہ الو کی پٹھی۔!" اپنے آپ کو کوس کر' گالیاں دے کر بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کرنے لگ جاتی۔

اس دن وہ بڑی بے چین تھی۔ ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔ جاگتی رہی تھی اور پچھلی زندگی کی فلم دیکھتی رہی تھی۔ طبیعت بڑی کسلمند سی تھی۔ تبھی ہوسٹل سے ہی نکلتے نکلتے اسے دیر ہو گئی۔ یونیورسٹی پہنچی تو دو پیریڈ مس کر چکی تھی۔ تیسرے کو شروع ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے۔ یہ بھی نہیں یاد تھا کہ یہ والا کس کا پیریڈ تھا۔ وہ تو بس جھکے سر کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چل کر اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھی تھی۔ پھر سانس ہموار کرتے ہوئے سامنے دیکھا تو سر عبدرحمان لیکچر دے رہے تھے۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

کتنے سارے دنوں بعد آئے تھے۔ تمام طلباء اور طالبات ان سے ان کی بیماری کے متعلق ہی سوالات کرتے جا رہے تھے۔ یوں لیکچر میں تسلسل ہی قائم نہیں ہو رہا تھا۔ آج ان کا موڈ بڑا اچھا تھا۔ ہمیشہ سے بھی کہیں زیادہ۔ چہرے پر مسکراہٹیں تھیں اور روشنیاں لٹاتی آنکھیں ادھر ادھر گھما رہے تھے۔ آواز میں اک خاص لوچ تھا اور سرور کی سی کیفیت تھی۔ لیکچر کے دوران کئی بار ایمان سے نظر بھی ملی۔ بلکہ اسے شک گزرا کہ جان بوجھ کر ملائی گئی تھی۔ پھر انتہائی بے تکلفی اور ڈھٹائی سے مسکرا بھی پڑے تھے۔ جبکہ ایمان نے گڑبڑا کر نظر جھکا لی تھی۔

"بیماری کے بعد بدتمیز اور بے حیا بھی ہو گئے ہیں۔" اسی لمحے اس نے سوچا تھا۔ اور اس کے باوجود دل بھی دھڑکا تھا۔ اندر اتنا شور ہو گیا تھا کہ باقی سارا وقت وہ ان کے لیکچر کا اک لفظ نہیں سن سکی تھی۔ ویسے وہ سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ صرف مر جانا چاہتی تھی۔

لیکچر ختم ہوا۔ اپنی بھیگی بھیگی آنکھیں چپکے چپکے صاف کرتے ہوئے وہ لڑکیوں کے ساتھ دروازے کی سمت چل پڑی۔

سر عبدرحمان میز پر جھکے اپنی چیزیں اکٹھی کر رہے تھے۔ وہ نزدیک سے گزری تو انہوں نے جلدی سے انتہائی بے تکلفی کے ساتھ اسے آواز دے ڈالی۔

''مس ایمان آفریدی! آپ پلیز میری بات سنئے گا۔''

مگر وہ ان سنی کر کے آگے بڑھ گئی۔ باقی لڑکیاں وہیں رک گئی تھیں۔

''ایمان! سر کچھ کہہ رہے ہیں۔'' ثوبیہ یہی سمجھی تھی کہ اس نے سنا ہی نہیں۔

وہ پھر بھی آگے بڑھتی چلی گئی۔ تب سر عبدرحمان تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اس سے پہلے دروازے کے آگے راستہ روک کر جا کھڑے ہوئے۔ عجیب سی پوزیشن ہو گئی تھی۔

وہ دروازے میں راستہ روکے کھڑے تھے اور سامنے لڑکیوں کا پورے کا پورا گروپ موجود تھا۔ پچھلی نشستوں سے اٹھ کر سارے طلباء بھی اسی دروازے سے نکلنے کے لیے لڑکیوں کے گروپ کے پیچھے آن کھڑے ہوئے تھے۔

''پلیز! آپ مس ایمان آفریدی سے کہئے کہ میری بات سنیں۔'' سرعبد نے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ میں نہیں سننا چاہتی۔'' بڑی مشکل سے اپنے سارے حواس اور ہمتیں مجتمع کر کے وہ بول سکی تھی۔

''لیکن کیوں نہیں۔'' سرعبد کی بجائے گروپ کی لڑکیوں نے اس سے پوچھا۔

''بس۔ میں نہیں چاہتی۔'' پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

''میں نے بتایا تھا نا کہ یہ میری رشتہ دار ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولے تھے۔

''ہونہہ! رشتہ دار۔'' وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔ ''شرم بھی نہیں آتی اس قسم کی رشتہ داری کا اعلان کرتے ہوئے۔ بے حیا۔ بے شرم۔ فضول انسان۔''

''چلو میرے ساتھ۔'' سرعبد نے اس کا بازو پکڑنا چاہا۔ وہ بری طرح بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

تب وہ پھر گروپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''پوچھ لیجئے ان سے۔ کیا یہ میری رشتہ دار نہیں ہیں۔؟''

نہ اقرار کرتے بن رہی تھی نہ انکار کرتے۔ پسینوں میں غرق سر جھکائے کھڑی تھی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔ بس تھر تھر کانپے جا رہی تھی۔ اور وہ سامنے کیسے



تماشہ لگائے کھڑا تھا۔ مداری کہیں کا۔!

''یہ تو کچھ بتاتی نہیں۔ آپ ہی بتا دیجئے مس آفریدی سے آپ کا کیا تعلق ہے اور کیا رشتہ داری ہے۔؟'' لڑکیاں مسکرا مسکرا کر پوچھ رہی تھیں۔

''یہ میری دوست ہے۔''

''کیا۔؟'' ساری طالبات اور اب کے طلباء نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

''پوچھ لیجئے ان سے۔ نہ صرف میری دوست ہیں بلکہ منگیتر بھی ہیں۔''

وہ جھوٹ کیوں بولنے لگے۔ سب طلباء اور طالبات کو ان پر پورا یقین تھا۔ اور وہ مزید حیرتوں میں ڈوب گئی تھی۔ یہ انہوں نے اتنی بڑی بات کہہ دینے کی جرأت کیسے کی تھی۔؟ ایمان کے سارے وجود کا خون جیسے نچڑ گیا تھا۔ اک لفظ بھی بولنے کی اس میں طاقت نہ رہی تھی۔ اس قدر دیدہ دلیری سے عابی نے جھوٹ بولا تھا۔

''کس قدر کمینگی والی حرکت کی ہے عابی تم نے۔'' لبوں پر بہت ساری گالیاں کوسنے آ آ کر تھم گئے تھے۔ اس کا اعتبار کس نے کرنا تھا۔؟ سارے اعتبار اور یقین تو سرعبدرحمان کے پاس تھے۔

سب اسٹوڈنٹس کے بڑے بے تکلفی بھرے دوستانہ مراسم تھے سرعبد کے ساتھ سب انہیں اک سچا کھرا انسان گردانتے ہوئے بہت احترام بھی کرتے تھے۔ اپنے دکھ سکھ بھی شیئر کرتے تھے ان سے۔

اور ایمان آفریدی کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا ان کے مقابلے میں۔ اس کا بولا ہوا سچ بھی جھوٹ بن جاتا تھا۔ تبھی بڑی مشکل سے اس نے سبھی کچھ ضبط کیا اور برداشت کیا۔ چہرے کا رنگ پیلا پھٹک ہو رہا تھا۔ جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔

سارے کلاس فیلوز کی مسکراہٹوں بھری نظریں اس پر جمی تھیں۔ ایمان کے جھکے ہوئے سر کو بھی شرم پر محمول کر رہے تھے۔

''مس ایمان آفریدی! ہم آپس میں کلاس فیلوز ہیں۔ ہمارا ایک دوسرے پر بہت حق ہے۔ بھلا اس اتنے پیارے اور محترم رشتے کو چھپانے کیا ضرورت تھی اور شرمانے کا کیا تک۔ ہم تو سب ایک ہیں۔ بہت خوشی ہوئی یہ نیوز سن کر۔''

''مبارک ہو آپ دونوں کو بہت بہت۔''

"جاؤنا سر کی بات سنو۔" لڑکیوں کے ٹھوکے اور مسکراہٹیں علیحدہ اسے پریشانی میں مبتلا کیے دے رہی تھیں۔

"سر! آپ ایمان سے کہاں بات کرنا چاہتے ہیں؟ یہاں کلاس روم میں یا آفس میں۔؟" ثوبیہ شرارت سے پوچھنے لگی۔

"یا پھر کسی ریسٹورنٹ وغیرہ میں؟" گل مہر نے ہانک لگائی۔ سب ہنسنے لگیں۔ سر عبد کھڑے مسکرائے جا رہے تھے۔ اور یوں مسکراتے ہوئے بڑے عالیشان لگ رہے تھے۔

"سر! آپ نے جواب نہیں دیا۔؟"

"کیا آپ کو اتنا بھی علم نہیں کہ ہم کہاں جانا چاہیں گے۔؟"

"کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔؟"

"میکڈانلڈ چلے جائیں۔"

"ضیافت بھی اچھا رہے گا۔"

"ونیج بھی جا سکتے ہیں۔"

ہر کوئی اپنی اپنی سوچ اور پسند کے مطابق بولے جا رہا تھا۔

"اسے اچھی اچھی چیزیں کھلائیے گا۔ اور ڈھیر ساری بھی۔ یہ آج کل بہت ویک ہو رہی ہے۔"

"چلو ایمان جاؤ ان کے ساتھ۔"

مگر وہ اک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ اک اک پاؤں من من بھر کا ہو رہا تھا۔ اور وجود جیسے پتھر کا۔ وہ اپنے قدموں پر جمی رہی تو لڑکیاں اسے کھینچتے ہوئے کلاس روم سے باہر لے چلیں۔ سر عبد جو راستہ روکے کھڑے تھے' ان کے عزائم اور مقاصد دیکھ کر جلدی سے پرے ہٹ گئے۔

"سر! پارکنگ میں آپ کی گاڑی تو کھڑی ہوگی۔؟"

"صاف ظاہر ہے۔" سر عبد ہنسے۔

یوں لڑکیاں چیختی چلاتی ایمان کو گھسیٹتے ہوئے کار پارک کی طرف چل دیں۔

طالبات کا غول بیابانی ہٹا کر لڑکوں نے سر عبد کو گھیرے میں لے لیا۔



"یہ فائلیں رجسٹر ادھر ہمارے حوالے کریں۔ ہم آفس میں رکھ دیں گے۔" صائم نے ان کے ہاتھوں سے سب چیزیں لے لیں۔ "آپ اتنے دن غیر حاضر رہے تو یہی چکر تھا کیا۔ رازداری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

"مس ایمان آفریدی بہت اچھی لڑکی ہے سر! آپ خوش قسمت ہیں۔"

مختلف زبانیں مختلف بولیاں بول رہی تھیں۔ سر عبد مسکرائے جا رہے تھے۔ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے وہ بھی جتھے کا جتھہ کار پارکنگ کے ایریا میں پہنچ گئے تھے۔

ثاقب نے ان کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ پھر جھک کر دوسری سمت والا لاک بھی کھولا۔ لڑکیاں ایمان کو لئے ادھر کھڑی تھیں۔ جونہی دروازہ کھلا اسے اندر دھکیل دیا۔ بلکہ پھینک دیا۔ اور پھر کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔

"سر! اک گرینڈ سی ٹریٹ آپ پر ڈیو ہوگئی ہے۔"

"ٹریٹ۔ ٹریٹ۔" ادھر سے لڑکوں نے بھی شور مچا دیا۔

سر عبد رحمان اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ بے حد خوش تھے۔ بے تحاشا انجوائے کر رہے تھے۔ سارا وجود کھلکھلا رہا تھا۔ آنکھوں میں روشنیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ گاڑی کے اندر بیٹھنے سے پہلے جیب میں سے والٹ نکالا۔ پھر اسے کھولا۔ یہ سب اسٹوڈنٹس کا ہی کمال تھا کہ اس وقت ایمان آفریدی ان کی گاڑی میں تشریف فرما تھی۔

لہٰذا وہ سب ٹریٹ کے حقدار تھے۔ بلکہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے انہیں ان کا حق ملنا چاہیے تھا۔ اک بے حد خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے والٹ میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر انگلیوں میں تھام لیا۔

"یہ نہیں۔ ہم بڑے والا لیں گے۔ جتنی بڑی خوشخبری ہے اتنی بڑی ٹریٹ ہونی چاہیے۔" لڑکوں کی طرف سے احتجاج ہوا۔ اور وہ اس احتجاج سے بہت محظوظ ہوئے۔ پسندیدگی کی نگاہ سے سب کو دیکھتے ہوئے وہ نوٹ واپس والٹ میں رکھ کر ہزار والا نکال لیا۔

"یہ چلے گا۔؟" اس وقت بڑی ترنگ میں تھے۔ بچے بھی مچلے ہوئے تھے۔

"چلے گا۔ چلے گا۔"

"انجوائے یور ٹریٹ۔" جو سب سے قریب تھا اس کی طرف بڑھا دیا۔

"سر! ہم علیحدہ لیں گے۔ ورنہ یہ ہمارے پلے کچھ نہیں پڑنے دیں گے۔"

لڑکیوں کا مطالبہ درست تھا۔ اصل کام تو انہوں نے ہی کیا تھا۔ اپنے آپ ہی انصاف سے سوچا۔ گاڑی میں ایمان آفریدی بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ اس سے بڑی خوشی زندگی میں اور کیا مل سکتی تھی۔؟ ایک اور ہزار کا نوٹ نکالکر گل مہر اور ثوبیہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس وقت پاس قارون کا خزانہ ہوتا تو وہ بھی لٹا دیتے۔

"تھینک یو۔ تھینک یو۔ وش یو گڈ لک۔" سبھی تالیاں بجا بجا کر انہیں وش کرنے لگے۔

اور ہنستے کھلکھلاتے ہوئے سر عبدرحمان گاڑی میں بیٹھ گئے۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے سب کی طرف ایک تشکرانہ نگاہ ڈالی۔ سب نے انہیں ویو کیا۔ پر جب تک گاڑی نظر آتی رہی سبھی دونوں دونوں بازو لہرالہرا کر انہیں ویو کرتے رہے۔

فرشتوں جیسے ان کے اسٹوڈنٹس نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو انہوں نے بائیں جانب سے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی ایمان آفریدی پر ایک نظر ڈالی۔

وہ ہاتھوں میں چہرہ لئے بے تحاشا رو ہی رہی تھی۔

سر عبدرحمان بڑے خوبصورت انداز میں مسکرائے۔

"ندا فاضلی کا ایک شعر ہے۔" مدہوش کر دینے والی ان کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتی ہوئی بچی کو ہنسایا جائے

اتنے خوبصورت ترنم کے ساتھ انہوں نے شعر پڑھا تھا کہ ایمان آفریدی رونا بھی بھول گئی۔